
خواتین اور دوشیزاؤں کیلئے اپنی طرز کا پہلا ماہنامہ
خواتین ڈائجسٹ
جون 2021

خواتین ڈائجسٹ

بانی و مدیرِ اعلیٰ ——— محمود ریاض

مدیرہ ——— نادرہ خاتون

مدیر ——— آذر ریاض

نائب مدیرہ ——— رضیہ جمیل

مدیرِ خصوصی ——— امت الصبور
بلقیس بھٹی

نفسیات ——— عدنان

اشتہارات ——— خالدہ جیلانی

قانونی مشیر ——— نورالدین سرکی اینڈ کمپنی
ایڈووکیٹس اینڈ لیگل کونسلرز

واٹس ایپ
03172266944

جون 2021
جلد 49 شمارہ 02
قیمت 80 روپے

خط و کتابت کا پتہ
خواتین ڈائجسٹ
37- اردو بازار کراچی

MEMBER
APNS
CPNE
رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپر ایڈیٹرز



خواتین ڈائجسٹ

خط و کتابت کا پتہ

خواتین ڈائجسٹ

37- اردو بازار کراچی

MEMBER APNS CPNE	رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپر ایڈیٹرز

بانیِ و مدیرِ اعلیٰ ——— محمود ریاض

مدیرہ ——— نادرہ خاتون

مدیر ——— آذر ریاض

نائب مدیرہ ——— رضیہ جمیل

مدیرِ خصوصی ——— امت الصبور
بلقیس بھٹی

نفسیات ——— عدنان

اشتہارات ——— خالدہ جیلانی

قانونی مشیر ——— نورالدین سرکی اینڈ کمپنی
ایڈوکیٹس اینڈ لیگل کونسلرز

واٹس ایپ
03172266944

جون 2021
جلد 49 شمارہ 02
قیمت 80 روپے



آپ سے کیا پردہ

خاتون کی ڈائری

مجھ سے ملئے

انٹرویو

ناول

مکمل ناول

ناولٹ

افسانے



نظمیں غزلیں

رنگا رنگ پھول

پکوان

میری بیاض سے

نفسیات

بیوٹی بکس

خط و کتابت کا پتہ: خواتین ڈائجسٹ، 37 - اُردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617 Fax: 92-21-32766872 0317 2266944

Email: info@khawateendigest.com Website www.khawateendigest.com

کہی سُنی

جون کا شمارہ لیے حاضر ہیں۔

عجیب بے کیف سے دن ہیں اور بے سکون راتیں۔ کچھ موسم کی شدتیں اور کچھ موجودہ حالات نے زندگی کے رنگ پھیکے کر دیے ہیں۔ دوست احباب کی محفلیں۔ مل بیٹھ کر دکھ سکھ کی باتیں۔ تقریبات، دعوتیں۔ زندگی کی یہ چھوٹی چھوٹی خوشیاں کتنی انمول ہیں۔ اب احساس ہوتا ہے۔ عید آئی اور خاموشی سے گزر گئی۔ کورونا کی وجہ سے گھروں میں قید، عید کا روایتی جوش و خروش کہیں نظر نہ آیا۔ سوچا بھی نہ تھا کہ ایسا وقت بھی آئے گا۔ زندگی میں ہزار جھمیلے تھے لیکن پچھلے دو سالوں میں انتشار، خوف اور بے یقینی میں تیزی سے اضافے کی وجہ موجود حالات ہیں۔ پڑوسی ملک کے حالات دیکھ کر دل ہولتا ہے۔ زندگی کے حقائق اور وقت کے تقاضوں کو تسلیم کرنے ہی میں عافیت ہے۔ ورنہ وہ خود کو منوا لیتے ہیں۔ پاکستان پہ اللہ تعالیٰ کا خاص کرم رہا ہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ کا جتنا شکر ادا کریں، کم ہے۔

کورونا نے ثابت کر دیا ہے کہ تمام تر سائنسی ترقی کے باوجود قدرت کے سامنے انسان کس قدر بے بس ہے۔ پوری دنیا میں ڈاکٹر اور سائنس دان، دن رات کوشش کے باوجود اس کورونا وائرس کے خاتمے میں کامیاب نہیں ہو سکے ہیں۔ اس کے باوجود انسان بھی کیا چیز ہے کہ اسے تھوڑی سی طاقت اور قوت مل جائے تو وہ اس کے زعم میں مبتلا ہو کر کمزور اور بے بس انسانوں پر ظلم کرنے سے باز نہیں آتا۔

اس وقت جبکہ پوری دنیا کورونا سے خوف زدہ ہے، غزہ کے نہتے اور محصور شہریوں پر اسرائیل کی فضائی بمباری اور فلسطین کے بچوں، عورتوں، بوڑھوں اور جوانوں پر ظلم اس کا ثبوت ہے۔

کشمیر اور فلسطین کے عوام کا جذبہ قابل رشک ہے جو پتھروں کے ہتھیار لیے آزادی کی جدوجہد کر رہے ہیں۔ اور ان لوگوں کے لیے سبق ہے جو آزادی جیسی نعمت کی قدر نہیں کرتے۔

عید سروے،

جولائی کا شمارہ عیدالاضحیٰ سے پہلے آئے گا۔ اس میں عید قرباں کی مناسبت سے تحریریں اور قارئین سے سروے شامل ہوگا۔ سروے کے سوالات یہ ہیں۔

1۔ ذوالحج کا چاند نظر آتے ہی گلی محلوں میں گہما گہمی اور رونق ہو جاتی ہے۔ جانوروں کی خریداری، گلیوں میں ان کے پیچھے بھاگتے بچے اور نوجوان، جانوروں کی دیکھ بھال اس کے بعد قصائی کی آمد، قربانی کے بعد گوشت کے بٹنے تک کی مصروفیت۔ آپ اپنی مصروفیت کا احوال لکھیں؟

2۔ گوشت کی تقسیم ایک اہم مرحلہ ہے۔ آپ اس سلسلے میں کن باتوں کا خیال رکھتی ہیں؟

3۔ گوشت سے بنی آپ کی پسندیدہ ڈش؟ آپ کون سی ڈش شوق سے بناتی ہیں یا آپ سے فرمائش کر کے بنوائی جاتی ہے؟

ان سوالات کے جوابات اس طرح بھجوائیں کہ 22 جون تک ہمیں موصول ہو جائیں۔

اس شمارے میں،

- فرح بھٹو کا مکمل ناول۔ محبت کو رنج ہے سائیں، ، جبیں چیمہ کا ناولٹ۔ صاحب، بی بی اور غلام،
- منشا محسن کا ناولٹ۔ تین قالب، ، صدف آصف کا ناولٹ۔ مہارت،
- حمیرا شفیع، نادیہ جہانگیر خان، منعم ملک، کشف بلوچ۔ ہاجرہ ریحان اور افشین نعیم کے افسانے،
- ماہر غذائیات فائزہ محبوب سے ملاقات، ، باصلاحیت فنکار نوید رضا سے باتیں،
- کرن کرن روشنی، نفسیاتی ازدواجی الجھنیں اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

قرآن پاک زندگی گزارنے کے لیے ایک لائحہ عمل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی عملی تشریح ہے۔ قرآن اور حدیث دین اسلام کی بنیاد ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔
قرآن مجید دین کا اصل ہے اور حدیث شریف اس کی تشریح ہے۔
پوری امت مسلمہ اس پر متفق ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی نامکمل اور ادھوری ہے، اس لیے ان دونوں کو دین میں حجت اور دلیل قرار دیا گیا۔ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔
کتب احادیث میں صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، سنن نسائی، جامع ترمذی اور موطا مالک کو جو مقام حاصل ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔
ہم جو احادیث شائع کررہے ہیں، وہ ہم نے ان ہی چھ مستند کتابوں سے لی ہیں۔
حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ ہم اس سلسلے میں صحابہ کرام اور بزرگان دین کے سبق آموز واقعات بھی شائع کریں گے۔

کرن کرن روشنی

ادارہ

صدقہ نیک اعمال میں اضافہ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ نے تم پر یہ صدقہ کیا ہے کہ وفات کے وقت تمہیں تہائی مال (میں وصیت کا حق) دے دیا ہے تاکہ تمہارے نیک اعمال میں اضافہ ہوجائے۔ (شعب الایمان)

فوائد ومسائل:
1۔ اچھے کام کی وصیت کرنے سے مرنے والے کو یہ فائدہ ہوتا ہے کہ جب اس کی وفات کے بعد اس کی وصیت پر عمل کیا جاتا ہے تو مرنے والے کو اس کا ثواب پہنچتا ہے۔
2۔ اگر پسماندگان اچھے کام کی وصیت پر عمل نہ کریں تب بھی فوت ہونے والے کو اچھی وصیت کا ثواب ضرور ملے گا۔

وصیت

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا: مجھے یہ بات پسند ہے کہ لوگ تیسرے حصے کو کم کرکے چوتھے حصے کی وصیت کیا کریں کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:
"تیسرا حصہ ایک بڑی مقدار ہے۔" یا فرمایا: تیسرا حصہ زیادہ ہے۔" (بخاری)

وارث کے حق میں وصیت جائز نہیں

حضرت عمرو بن خارجہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے کہا:
نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں سے خطاب فرمایا جب کہ آپ اپنی سواری (اونٹنی) پر سوار تھے۔ اور آپ کی سواری خوب جگالی کررہی تھی اور اس کا لعاب میرے کندھوں کے درمیان (پشت پر) گر رہا تھا۔ (اس موقع پر) آپ نے فرمایا:
"اللہ تعالیٰ نے ہر وارث کو ترکے کا حصہ تقسیم کرکے دے دیا ہے، لہٰذا وارث کے لیے وصیت جائز نہیں۔ بچہ بستر والے کا ہے اور بدکار کے لیے پتھر ہیں۔ جو شخص اپنے باپ کے سوا کسی اور کا بیٹا ہونے کا

دعوا کرے یا اپنے آزاد کرنے والوں کے سوا کسی اور کی طرف آزادی کی نسبت کرے تو اس پر اللہ کی، فرشتوں کی اور سب لوگوں کی لعنت ہے۔ اس کا نہ فرض قبول ہوگا اور نہ نفل۔"

یا فرمایا: "نہ نفل قبول ہوگا نہ فرض۔" (ترمذی)

فوائد و مسائل:

1۔ ترکے میں جن رشتے داروں کا حصہ اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمادیا ہے۔ انہیں ان کا مقررہ حصہ ضرور ملنا چاہیے۔

2۔ جن رشتے داروں کا وراثت میں حصہ نہیں، ان کے حق میں مناسب وصیت کرنا بہتر ہے۔

3۔ بعض لوگ یتیم پوتے کی وراثت کا مسئلہ لے کر شریعت کے نظام میراث پر اعتراض کرتے ہیں، مثلاً: ایک شخص فوت ہوتا ہے، اس کا ایک بیٹا زندہ ہے، دوسرا بیٹا فوت ہو چکا ہے لیکن اس فوت شدہ بیٹے کا ایک بیٹا جو اب فوت ہونے والے کا پوتا ہے، وہ موجود ہے۔ اصول میراث کے مطابق یہ پوتا محروم ہے کیونکہ قریبی عصبہ کی موجودگی میں دور کا عصبہ رشتے دار محروم ہوتا ہے۔

اس قسم کی استثنائی اور نادر صورتوں کے لیے اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ قانون میں تبدیلی کرنا بہت بڑی جسارت ہے۔

شرعی طور پر اس کا حل موجود ہے اور وہ یہ کہ فوت ہونے والا اپنے غیر وارث پوتے کے حق میں کچھ وصیت کر جائے۔ اگر وصیت نہ ہو تو وارثوں کے لیے مستحب اور بعض علماء کے نزدیک واجب ہے کہ وارث محروم لاوارث پوتوں وغیرہ کو وراثت میں سے کچھ نہ کچھ حصہ دیں۔

قرآن کریم کی آیت: "وراثت کی تقسیم کے وقت رشتے دار، یتیم اور مساکین آ حاضر ہوں تو تم مال وراثت میں سے انہیں کچھ دے دو۔" (النساء۔ 4،8) سے بھی تائید ہوتی ہے۔

اکثر لوگ اس حکم قرآنی کو محض اخلاقی ہدایت سمجھ کر اپنے نہایت قریبی رشتے داروں (بھتیجوں وغیرہ) کو بالکل نظرانداز کر دیے ہیں۔ جس کی وجہ سے اسلام کا قانون وراثت تنقید و اعتراض کا نشانہ بنتا ہے، حالانکہ اس میں تو ایسی کوئی چیز نہیں جس پر اعتراض کیا جا سکے۔ اگر چاچے، تائے اپنے بھتیجوں وغیرہ کے ساتھ شفقت، ہمدردی اور صلہ رحمی کا معاملہ کریں جیسا کہ اسلامی تعلیمات کا تقاضا ہے تو ایک اسلامی معاشرے میں پوتوں وغیرہ کی وراثت یا عدم وراثت کا مسئلہ زیر بحث ہی نہ آئے کیونکہ صلہ رحمی کے اعتبار سے ان کی محرومی وراثت کا ازالہ خوش اسلوبی کے ساتھ کیا جا سکتا ہے۔

علاوہ ازیں تعجب کی بات ہے کہ اس قسم کے اعتراضات ان غیر مسلموں کی طرف سے بھی پیش کیے جاتے ہیں جن کے ہاں وراثت کا کوئی اصول و ضابطہ سرے سے موجود ہی نہیں، سوائے اس کے کہ مرنے والے کا بڑا بیٹا یا بیٹی تمام ترکے کی مالک بن جاتی ہے، خواہ یہ کروڑوں کی جائیداد ہو۔ میت کی باقی اولاد بالکل محروم ہوتی ہے، حالانکہ اولاد ہونے کے لحاظ سے وہ اس کے برابر حق دار ہیں۔

انصاف سے اس قدر بعید رواج پر عمل کرنے والوں کی طرف سے اسلام کے انتہائی عادلانہ نظام وراثت کی ایک شق تلاش کر کے اس پر غلط سلط اعتراض کرنا اور اس طرح پوری شریعت کو نا قابل عمل قرار دینے کی کوشش کرنا معقول طرز عمل نہیں۔ افسوس ہے کہ بعض نام نہاد مسلمان بھی غیر مسلموں سے متاثر ہو کر ان ہی کی زبان بولنا شروع کر دیتے ہیں اور اپنا ایمان خطرے میں ڈال لیتے ہیں۔

4۔ وارث کے حق میں وصیت سے منع کرنے میں یہ حکمت ہے کہ اگر وہ وصیت قرآن و سنت کے مطابق ہو تو وصیت کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ ان وارثوں کو شرعاً وہی حصہ ملے گا، خواہ وصیت کی جائے یا نہ کی جائے، اور اگر اس کی وصیت قرآن و سنت کے خلاف ہو تو اس وصیت پر عمل کرنا جائز نہیں۔ اس طرح وہ کالعدم ہے۔

5۔ نسبی تعلق ایک نا قابل تبدیل تعلق ہے، اسی

وجہ سے اسلام کی نظر میں متبنّی (منہ بولے بیٹے) کو اصل باپ کے بجائے اپنی طرف منسوب کرنا اور اظہار (بیوی کو ماں بہن قرار دینا) غیر قانونی بلکہ گناہ۔

6۔ولاء (آزادی) کا تعلق بھی ناقابل تبدیل ہے، جس نے کسی کو آزاد کیا ہے، اسی کا آزاد کردہ (مولیٰ) کہنا چاہیے۔ آزاد کرنے والے کے احسان کو فراموش کرکے کسی اور کو مولیٰ قرار دینا بہت بڑا گناہ ہے۔

وارث کے لیے وصیت

حضرت ابوامامہ (صدی بن عجلان) باہلی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا:

''میں نے حجتہ الوداع کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے خطبہ مبارک میں یہ فرماتے سنا:

''اللہ تعالیٰ نے ہر حق والے کو اس کا حق دے دیا ہے، لہٰذا وارث کے لیے کوئی وصیت نہیں۔'' ...... (ابوداؤد)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا: میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اونٹنی کے (منہ کے) نیچے کھڑا تھا جبکہ مجھ پر اس کا لعاب گر رہا تھا۔ (اس وقت) میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے سنا:

''اللہ تعالیٰ نے ہر حق والے کو اس کا حق دے دیا ہے، لہٰذا وارث کے لیے کوئی وصیت نہیں۔'' ...... (دار قطنی)

وصیت پوری کرنے سے پہلے قرض ادا کیا جائے

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وصیت پوری کرنے سے پہلے قرض ادا کرنے کا حکم دیا اور تم یہ آیت پڑھتے ہو:

''اس وصیت کے بعد جو وہ وصیت کرے یا قرض کے بعد۔'' (النساء 11:4) اور سگے بھائی، ایک ماں کے بیٹے وارث ہوں گے، سوتیلے بھائی نہیں۔ (ترمذی)

فوائد و مسائل:

1۔قرض کی اہمیت وصیت کے مقابلے میں اس لحاظ سے زیادہ ہے کہ قرض زندگی میں بھی واجب الادا ہوتا ہے اور موت کے بعد بھی جبکہ وصیت موت کے بعد ہی قابل عمل ہوتی ہے۔ قرض جتنا بھی ہو، ادا کرنا ضروری ہوتا ہے جب کہ وصیت اگر تہائی ترکے سے زیادہ ہو تو تہائی تک قابل عمل ہوتی ہے، زائد نہیں۔

2۔میت کے مال میں سے سب سے پہلے کفن دفن پر خرچ کیا جاتا ہے، پھر قرض ادا کیا جاتا ہے، پھر جو کچھ بچے، اس کے تہائی مال یا اس سے کم کی جو وصیت ہو، وہ پوری کی جاتی ہے۔ اس کے بعد باقی ترکہ وارثوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

3۔آیت میں وصیت کا ذکر قرض سے پہلے ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ پہلے وصیت پوری کی جائے اور ادا کی جائے۔ اگر دونوں (وصیت اور قرض) موجود ہوں تو ترکے میں سے دونوں کی ادائیگی کرنے کے بعد باقی ترکہ تقسیم کیا جائے۔ علاوہ ازیں وصیت کا ذکر پہلے کرنے میں یہ نکتہ بھی ہوسکتا ہے کہ وصیت پر عمل کرنے کو زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی جب کہ قرض تو لوگ زبردستی بھی وصول کرلیتے ہیں۔ وصیت کو پہلے بیان کرکے واضح کر دیا کہ اس پر عمل کرنے میں بھی کوتاہی نہیں ہونی چاہیے، گو اس پر عمل قرض کی ادائیگی کے بعد ہی کیا جائے گا۔

4۔میت کے سگے بہن بھائی اس کے سوتیلے بہن بھائیوں پر مقدم ہیں۔

وصیت کیے بغیر فوت ہو جانے والے کی طرف سے صدقہ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، ایک آدمی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا:

''میرا والد فوت ہو گیا ہے اور اس نے مال چھوڑا ہے لیکن وصیت نہیں کی۔ اگر میں اس کی طرف سے صدقہ کروں تو کیا اس کے گناہ معاف ہو جائیں گے؟''

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہاں۔'' (مسلم)

وصیت

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، ایک آدمی نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا:

''میری والدہ اچانک فوت ہو گئی ہیں اور انہوں نے وصیت نہیں کی اور میرا خیال ہے کہ اگر انہیں بات چیت کرنے کا موقع ملتا تو صدقہ کرتیں۔ اگر میں ان کی طرف سے صدقہ کروں تو کیا انہیں ثواب ملے گا اور کیا مجھے بھی ثواب ملے گا؟''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہاں۔''

فوائد و مسائل:

1۔ انسان کو مرنے کے بعد جس طرح ان اعمال کا ثواب پہنچتا رہتا ہے جو اس نے زندگی میں کیے تھے اور ان کے نیک اثرات بعد میں جاری رہے، اسی طرح اس صدقے وغیرہ کا ثواب بھی پہنچتا ہے جو والدین کی وفات کے بعد اولاد ان کی طرف سے کرے۔

2۔ فوت شدہ والدین کی طرف سے صدقے کے لیے یہ شرط نہیں کہ انہوں نے وصیت کی ہو۔

3۔ آج کل ایصال ثواب کے نام سے جو محفلیں برپا کی جاتی ہیں اور کھانے کھلائے جاتے ہیں ان کی حیثیت محض ایک رسم کی ہے۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ خاموشی سے کسی مستحق کی مناسب امداد کر دی جائے۔

4۔ قرض اور دوسرے مالی حقوق کی ادائیگی میں جس طرح زندگی میں نیابت ممکن ہے، اسی طرح وفات کے بعد بھی کسی کا قرض دوسرا آدمی ادا کر دے تو فوت شدہ شخص بری الذمہ ہو جاتا ہے۔

جو محتاج ہو وہ جائز حد تک کھا لے

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا: ایک آدمی نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا:

''میرے پاس کچھ نہیں (گزارہ نہیں ہوتا) نہ میرے پاس کوئی مال ہے، البتہ ایک یتیم میری کفالت میں ہے، اس کا مال ہے۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اپنے یتیم کے مال میں سے کھا لیا کر لیکن فضول خرچی نہ کرنا اور (اس کے مال سے) مال نہ کمانا۔'' اور غالباً یہ بھی فرمایا: اس کے مال کے ذریعے سے اپنا مال نہ بچانا۔''

فوائد و مسائل:

1۔ یتیم کا مال کھانا بڑا سخت گناہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''جو لوگ یتیموں کا مال ظلم سے کھاتے ہیں، وہ اپنے پیٹوں میں صرف آگ بھر رہے ہیں اور وہ عنقریب (جہنم کی) آگ میں جلیں گے۔''

2۔ اگر یتیم کا سرپرست مفلس ہو تو وہ یتیم کے مال سے اپنے انتہائی ضروری اخراجات پورے کر سکتا ہے لیکن تعیشات اور آسائشات پر اس کا مال خرچ نہیں کر سکتا۔

3۔ مفلس آدمی کے لیے بھی بہتر یہی ہے کہ محنت مزدوری سے اپنے اخراجات پورے کرے اور یتیم کا مال محفوظ رکھے۔

4۔ یتیم کے مال کے ذریعے سے اپنا مال بچانے کا مطلب یہ ہے کہ کسی نے قرض مانگا تو یتیم کا

مال دے دیا، اپنا محفوظ رکھا۔ یا ذاتی ضروریات پر اس کا مال خرچ کیا اور اپنا بچالیا۔

5۔ یتیم کے مال سے تجارت کر کے یتیم کو اس کا حصہ دینا (مضاربت) درست ہے لیکن یہ درست نہیں کہ اس کے مال سے تجارت کر کے سارا نفع خود رکھ لے، یا اس کے مال کو اس طرح خرچ کرے، جس طرح اپنا مال بے روک ٹوک خرچ کرتا ہے۔

دنیاوی چیزوں میں مقابلہ

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''جب تم فارس اور روم (کی سلطنتوں) کے خزانے فتح کرلو گے تو تمہاری کیا حالت ہوگی؟''

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ہم وہی کچھ (شکر کے کلمات) کہیں گے (اور شکر والے عمل کریں گے) جن کا اللہ نے ہمیں حکم دیا ہے۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''یا دوسری بات ہوگی۔ تم ایک دوسرے پر رشک کرو گے، پھر ایک دوسرے سے حسد کرو گے، پھر ایک دوسرے سے منہ پھیرو گے، پھر ایک دوسرے سے ناراض رہنے لگو گے۔ یا اس طرح کا کوئی اور لفظ فرمایا۔

پھر تم غریب مہاجرین میں جاؤ گے اور انہیں ایک دوسرے کی گردنوں پر لاد دو گے۔''

فوائد و مسائل:

1۔ رشک سے یہاں دنیا کے مال کی طرف مسابقت مراد ہے۔ کسی نعمت کے بارے میں یہ خواہش کہ وہ مجھے ملے، دوسرے کو نہ ملے، ناجائز رشک ہے۔ اس قسم کا رشک حسد تک لے جاتا ہے جو ناپسندیدہ ہے۔ جائز رشک کا مطلب یہ خواہش ہے کہ جیسی نعمت کسی کو ملی ہے ویسی مجھے بھی ملے۔ یہ رشک جائز ہے۔

2۔ حسد کے نتیجے میں تعلقات کشیدہ ہوتے ہیں اور دشمنی تک نوبت جا پہنچتی ہے۔ یہ سب عادتیں مذموم ہیں۔

3۔ آخری جملے کا مطلب یہ ہے کہ دولت مند افراد تنگ دست افراد پر سختی کریں گے اور رعب جمائیں گے۔ یہ صفات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں نہیں تھیں، بعد والوں میں ایسے افراد ظاہر ہوئے جن میں ایسی خصلتیں موجود تھیں۔

قربانی کی کھالیں

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں حکم دیا کہ وہ آپ کے (قربانی کے) تمام اونٹوں کا گوشت، ان کی کھالیں اور جھولیں غریبوں میں تقسیم کردیں۔''

(مسند احمد)

فائدہ:

قربانی کا گوشت کھانا اور کھالیں اپنے استعمال میں لانا اگرچہ جائز ہے، تاہم بہتر یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ غریبوں اور مسکینوں کو دیا جائے۔

قربانیوں کا گوشت کھانا

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے ہر اونٹ کی ایک ایک بوٹی لے کر ہنڈیا میں ڈالی گئی (اور پکائی گئی۔) تب انہوں نے (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں نے) کچھ گوشت کھایا اور کچھ شوربہ پیا۔ (احمد)

سلیقہ محفل میں بات کرنے کا

انشا جی

محفل میں اجنبیوں سے کیسے بات کی جائے، ہمسائیوں پر خوش اخلاقی کا کیسے سکہ جمایا جائے، اس کے گر یا تو بخشند خدائے بخشند ورنہ ڈیل کارینگی کی کتابوں کا مطالعہ کیجیے اور کسب کمال کر کے عزیز جہاں ہونے کی کوشش کیجیے۔

مختصر لفظوں میں مقبولیت کا نسخہ زریں یہ ہے کہ

مخاطب کے ڈھب اور دلچسپی کی بات کرو۔ اپنے ذوق یا دلچسپی سے علاقہ مت رکھو۔

شروع میں ہمیں بھی یہ بھید معلوم نہ تھا۔ ہمارے محلے میں سامنے کے گھر میں غلے اور تیل کے بیجوں کے مشہور آڑھتی روپیہ بھائی، پیسہ بھائی جام نگر والے رہتے تھے۔ ہم جب اس مکان میں آئے تو انہوں نے بڑے خلوص سے ہمارا خیر مقدم کیا۔ ان کی بی بی بھی محلے میں ہمارے گھر والوں ہی کو پسند کرتی تھیں اور جب کبھی دونی چونی مانگنی ہو یا گھر میں گھی تیل ختم ہو یا سلائی کی مشین چاہیے ہو تو ہم ہی سے رجوع کرتی تھیں۔

ہم بھی سیٹھ صاحب کی خوشنودی کے لیے اپنی سی ہر کوشش کرتے تھے۔ پہلی اتوار آئی تو ان کو دو غزلیں سنائیں، دوسرے اتوار ایک قصیدہ گوش گزار کیا۔ تیسرے اتوار ہم نے ان کے لیے ایک طویل مختصر افسانہ تیار کر رکھا تھا جو ایک طرح سے نفسیاتی تحلیل کا شاہکار تھا لیکن سیٹھ صاحب نہ آئے۔ آخر ہم ان کے گھر جا کر سنا کر آئے۔ اس کے بعد جانے کیا ہوا کہ انہوں نے نہ صرف ہمارے ہاں آنا بند کر دیا بلکہ ہم جیب میں اپنے ایک عزیز کی شادی کا سہرا رکھ کر ان سے ملنے گئے تو انہوں نے اندر سے کہلوا دیا کہ نہیں ہیں سیٹھ صاحب، لاڑکانہ گئے ہیں۔

کچھ اسی قسم کی واردات ہمارے دوسرے پڑوسی کے ساتھ ہوئی۔ وہ ٹریکٹروں کی ایک کمپنی میں مکینیکل انجینئر ہیں یا شاید فورمین ہیں، معلوم ہوا جالندھر کے ہیں جس کو علمی ادبی ذوق کی بنا پر شیراز ہند کہا جاتا تھا۔ اسی رعایت سے ہم نے علیک سلیک کے بعد پہلے تو جالندھر کے ہندوستان میں رہ جانے پر ان سے تعزیت کی۔ اس کے بعد اپنا تازہ فارسی کلام سنایا۔

ہمارے تعلقات میں سرد مہری تو اسی روز آ گئی، لیکن دوسری بار جو ہم نے اقبال کے فلسفۂ خودی کے ماخذ پر بحث چھیڑی تو نہ جانے کیا ہوا کہ اٹھ کے اندر چلے گئے اور پھر سڑک پر ملتے بھی تو دوسرے فٹ پاتھ پر ہو لیتے۔ ہم نے اپنے اقبال پرست دوستوں سے پوچھا بھی کہ یار و فلسفہ میں ایسی کیا بات ہے، لیکن کوئی ہمیں مطمئن نہ کر سکا۔ اس کے بعد ہم نے ڈیل کارنیگی کی کتابیں پڑھیں۔

یہ قباحت، موضوعات گفتگو کی، اصل میں ہم مردوں کے ساتھ زیادہ ہے۔ خواتین میں تو امیر ہوں، یا غریب، پی ایچ ڈی یا ان پڑھ، پنجابی کہ دکنی، گفتگو کے بندھے ٹکے اصول، آداب اور موضوعات ہیں۔

☆ اے بہن، یہ ٹیکہ بہت خوب صورت ہے، کتنے کا بنا۔

☆ اے آپا! یہ کپڑا کتنے کا ہے، لنڈی کوتل سے منگایا ہوگا۔

☆ ماشاءاللہ کتنے بچے ہیں؟

☆ آپ بالوں میں کون سا تیل لگاتی ہیں؟



☆ یہ نیل پالش کون سی ہے باجی؟

☆ اری رضیہ! تم نے ''مسٹر اللہ دتہ'' دیکھی۔ اس میں نیلو کا کام پسند آیا۔

☆ ہائے اللہ، کتنے اچھے سلیپر ہیں، کہاں سے لیے؟

کاش مردوں میں بھی کچھ اسی قسم کی مفاہمت ہوتی۔ اب تک تو بالعموم یہی دیکھا کہ دو بھلے مانسوں میں تعارف ہوا اور وہ مزاج شریف کہہ کر رہ گئے۔ پھر سگریٹ پینے لگے، وہ بھی یوں کہ یہ اپنا دھواں مشرق کی طرف منہ کر کے چھوڑتے ہیں، وہ مغرب کی طرف۔ اس کے بعد اخبار دیکھنے لگے۔ یہ بھی ہو چکا اور خاموشی زیادہ ہی ناگوار معلوم ہوئی تو ذہن پر زور ڈال کر کوئی سوال پوچھا۔

''آپ کہاں کام کرتے ہیں؟''

''پی ڈبلیو ڈی میں۔''

''وہی جو سڑکیں کھودنے والا محکمہ ہے۔''

''جی ہاں۔''

پھر طویل خاموشی۔ یہ کم آمیزی اور کم گوئی مشرقی نہیں بلکہ انگریزی اثر کا نتیجہ ہے۔ کہتے ہیں کہ کسی تباہ شدہ جہاز سے جان بچا کر دو انگریز کسی خالی جزیرے میں جا نکلیں تب بھی ایک دوسرے سے کلام نہ کریں گے۔ تا آنکہ باقاعدہ تعارف کی رسم ادا نہ ہو جائے۔ وہاں کی ریل گاڑیوں میں بھی جس کو دیکھیے اپنی جگہ دوسرے سے بے تعلق اور بے زار بیٹھا ہے، آنکھیں نہیں ملاتا۔ ہمسائے کے اخبار کے بیچ کے ورق نہیں کھینچتا۔ اس سے بال بچوں کی تعداد، نام اور پتے نہیں پوچھتا، اپنے نہیں بتاتا۔ ہم نے یہ کیفیت دیکھی تو وطن عزیز بہت یاد آیا جہاں کراچی سے ٹنڈو آدم تک دو بھلے مانس جائیں تو ایک دوسرے کے شجرہ نسب سے کماحقہ آگاہ ہو چکے ہوتے ہیں بلکہ باہم رشتے بھی طے پا جاتے ہیں۔

تقریب اس ساری تمہید کی یہ ہے کہ کل رات مسز جمیل نے جو ہماری بھابھی ہیں، اپنی ایک سہیلی کو کھانے پر بلایا، ساتھ ان کے میاں کو بھی۔ خاتون تو آرٹسٹ ہیں لیکن میاں ان کے تاجر اور زمین دار قسم کے آدمی ہیں۔ مظفر گڑھ میں ان کی ایک شوگر مل ہے۔ مریدکے میں کھالوں کی رنگائی کا کارخانہ ہے۔ ملتان میں ولایتی کھاد کی سول ایجنسی ہے اور اس کے علاوہ بی ڈی کے چیئرمین ہیں۔ گویا حیثیات بزرگ ہیں۔ ان کے مقابلے میں ہمارے دوست میاں جمیل نرے شاعر اور صحافی ہیں۔ انہوں نے اپنی بیگم سے پوچھا کہ تمہاری سہیلی کے میاں کوئی شاعر واعر ہیں کیا؟

''نہیں۔''

''فلسفے سے ذوق ہے؟''

''خدانخواستہ۔''

''تاریخ، علم الکلام اور سیاست مدن میں ورک ہے؟''

''تاریخ...... میرے خیال میں جیسی صاف تاریخ بغیر تعمیے اور تخرجے کے تم کہتے ہو ویسی وہ نہیں کہہ سکتے۔ علم الکلام کو بھی اگر پڑھا ہو تو مجھے معلوم نہیں۔ مدن بھائی کو وہ نہیں جانتے۔ باقی رہی سیاست تو ورک کیا معنی؟ اپنی تحصیل کے چوٹی کے سیاست دان ہیں۔ میں نے بتایا نہیں کہ بی ڈی کے چیئرمین ہیں۔''

ان پر جمیل میاں نے کہا۔

"پھر تو بھاگوان تم ہی ان سے گفتگو کرنا۔ مجھے تو رات کو مشاعرے میں جانا ہے۔ زیادہ سے زیادہ انشاء صاحب کو بلالینا، وہ ہر قسم کی گفتگو پر قادر ہیں۔"

ہماری بھابھی نے کھانے کا تکلف بہت کیا تھا۔ ہم ذرا دیر سے پہنچے۔ مہمانوں سے تعارف بھی نہ ہوا۔ اس کے بعد بھابھی تو اپنی آرٹسٹ سہیلی کو ایک طرف لے گئیں اور ان کے جھمکوں کی تعریف سے گفتگو کا آغاز کیا۔ ہم مردوں کے ساتھ ڈرائنگ روم میں آبیٹھے۔ ہم نے قیافے سے دریافت کیا کہ ہماری داہنی طرف جو بزرگ لانبی مونچھوں والے بیٹھے ہیں، یہی چوہدری خیر دین جنجوعہ ہیں، ان کی سہیلی کے میاں۔ ان کا تفصیلی تعارف بھابھی نے فون پر ہی کرادیا تھا، لہٰذا ہم نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

"اب کے گنے کی فصل تو آپ کے ہاں خوب ہوئی؟"

وہ بھونچکے سے ہو کر بولے۔

"جی...... کیا فرمایا؟"

ہم نے دوسرا سوال داغا۔

"البتہ کھالوں پر جنگ کی وجہ سے اثر پڑا ہوگا؟"

اس پر وہ چپ رہے۔ ہم نے جانا کہ اپنے تجارتی بھید کو بھید ہی رکھنا چاہتے ہیں، لہٰذا ہم نے موضوع نمبر تین لیا۔

"شلجموں کے لیے کون سی ولایتی کھاد موزوں رہتی ہے۔ ہم نے اپنے لان میں شلجم بوئے ہیں۔"

اس گفتگو کی بھنک بھابھی کے کان میں پڑی تو وہ بھاگی آئیں اور بولیں۔

"یہ آپ کن سے بات کر رہے ہیں۔ یہ تو مشہور مرثیہ نگار شعلہ بنارسی ہیں، میرے بھانجے کے ہم زلف۔ یہ دوسرے میرے تایازاد بھائی کرنل حبیب اللہ اور یہ میری سہیلی کے میاں چوہدری خیر...... ارے یہ تو سو گئے۔ ابھی اٹھیں گے تو ان سے بات کرنا۔"

اس روز کی محفل میں چوہدری خیر دین کے خراٹوں کی گونج میں ہم نے دو غزلیں شعلہ صاحب کو سنائیں، تین قصیدے اور ایک شہر آشوب سے انہوں نے یہ قرض اتارا۔ کرنل صاحب کو ہم نے کچھ دیر بکتر بند گاڑیوں کے اسرار و رموز میں الجھایا۔ اس کے بعد ان کا ہاتھ دیکھ کر ان کے گھوڑے کے اگلی ریس جیتنے کی خوش خبری دی اور جب چوہدری خیر دین جنجوعہ استراحت سے فارغ ہوئے تو سلسلہ کلام کو یوں مربوط کیا کہ ولایتی کھاد سے نیشکر کی اقسام جدید تک آنے اور بی۔ ڈی کے تازہ ترین الیکشنوں سے بدیں عنوان گریز کیا کہ رشوت خوری اور بدعنوانی کرنے والوں کی کھال میں بھس بھروا دینا چاہیے۔

یہاں سے سررشتہ گفتگو چوہدری صاحب کے ہاتھ میں آیا اور انہوں نے پہلے تو کھالوں کے مسئلے پر تقریر کی۔ پھر بھس کی کمیابی کے اسباب بیان کیے۔ آخر میں کچھ ذکر افریقہ اور مشرق وسطیٰ کے حالیہ انقلابوں اور ویت نام کا بھی ہوا۔ گفتگو کے خاتمے تک وہ ہمیں اپنے ہاں سے کھانڈ کی بوری ریویو کے لیے بھجوانے کا وعدہ کر چکے تھے اور کھالوں کی رنگائی کے سلسلے میں ہم ان کا مشیر اعزازی بننے کی حامی بھر چکے تھے۔

یہاں ہم گزارش کریں گے کہ اس تحریر کو خود ستائی پر محمول نہ کیا جائے۔ من آنم کہ من دانم۔ جس طرح پرانے زمانے میں علوم مجلسی میں یہ شامل تھا کہ ہر شریف زادے کو ہزار دو ہزار اشعار اساتذہ کے ازبر ہونے چاہئیں۔ کچھ اسی قسم کی یہ سائنس ہے جن صاحبوں کو مزید معلومات درکار ہوں، ہمارے ادارہ علوم مجلسی (رجسٹرڈ) میں داخلہ لے سکتے ہیں۔ دس روپے کا منی آرڈر آنے پر پراسپکٹس مفت بھیجا جاتا ہے۔



1 ''نام؟''
''نویدرضا۔''
2 ''پیار سے کیا کہتے ہیں؟''
''نومی......۔''
3 ''تاریخ پیدائش؟''
''7جولائی۔''
4 ''آپ کا ستارہ؟''
''میں سرطان ہوں۔''
5 ''مادری زبان؟''
''اردو۔''
6 ''بہن بھائی/آپ کا نمبر؟''
''چار بہن بھائی اور میں بڑا ہوں۔''
7 ''شادی؟''

باصلاحیت فنکار

باتیں نوید رضا سے

شاہین رشید

''جی، شادی شدہ ہوں اور ماشاء اللہ ایک بیٹی بھی ہے۔''
8 ''تعلیم؟''
''گریجویٹ۔''
9 ''شوبز میں آمد؟ گھر والوں کا ردعمل؟''
''ہیرو بننے کی ترنگ میں حصہ لیا تھا۔ یہ بات ہے 11 سال پہلے کی ......اور کامیابی حاصل کی تھی ......گھر والے بہت خوش ہوئے۔ بہت سپورٹ کیا اور کرتے ہیں۔''
10 ''بچپن کی ایک بری عادت جو مشکل سے گئی؟''
''بری تو نہیں کہوں گا، میں بچپن سے ہی خوش خوراک تھا اور ابھی بھی ہوں۔ آئی لو ایٹنگ فوڈ۔''
11 ''پہلی کمائی کا کیا کیا تھا؟''
''گھر والوں کو ڈنر کروایا تھا اور دوستوں کو ٹریٹ دی تھی۔''
12 ''بچپن کا پہلا پیار؟''
''اسکول کی ٹیچر سے پیار ہوا تھا۔''
13 ''آپ کا سورج کب نکلتا ہے؟''
''میں صبح نو بجے اٹھتا ہوں اور پھر جم چلا جاتا ہوں۔''
14 ''صبح کیا نہ ملے تو صبح نہیں ہوتی؟''
''بلیک کافی یا پھر چائے۔''
15 ''کیا برداشت نہیں بھوک یا غصہ؟''
''بھوک...... برداشت نہیں۔''
16 ''پاکستان کے لیے کیا سوچتے ہیں؟''
''پاکستان دل ہے اور دل صحیح طرح سے دھڑکتا رہے تو سکون ملتا ہے۔''
18 ''کس ملک کی شہریت کی خواہش ہے؟''

"کہیں کی نہیں...... لیکن اگر کہیں اور رہنا پڑا تو پھر دبئی کو ترجیح دوں گا۔"

19 "کیا آپ کورونا کا شکار ہوئے؟ لاک ڈاؤن میں وقت کیسا گزرا؟"

"جی ہوا تھا کورونا......اور دیگر لوگوں کی مدد بھی کی، لاک ڈاؤن میں گھر کے کام کیے اور اچھا وقت گزرا۔"

20 "شوبز میں کیا اچھا ہے اور کیا برا ہے؟"

"شوبز میں کام، شہرت اور پیسہ اچھا ہے جبکہ روٹین بری ہے۔"

21 "کھیلوں سے لگاؤ...... کون سا کھیل پسند ہے؟"

"آئی لو کِک باکسنگ اور دو سال سے سیکھ رہا ہوں۔"

22 "زندگی سے کیا سیکھا؟"

"زندگی سے صرف یہ سیکھا کہ ایک ہاتھ سے کماؤ اور دوسرے ہاتھ سے آگے بڑھاؤ لوگوں کے لیے۔"

23 "چیزیں جنہیں خریدنا آپ کا خواب ہے؟"

"کوئی ایسا خواب نہیں جو میں پورا نہ کرسکوں...... الحمدللہ سب کچھ ہے۔"

24 "کس کی خاطر شوبز چھوڑ سکتے ہیں؟"

"کسی کی خاطر شوبز نہیں چھوڑوں گا۔"

25 "پہلی بار کیمرے کا سامنا کیا تو؟"

"کچھ سمجھ ہی نہیں تھی...... وقت کے ساتھ ساتھ سیکھا اور سینئرز کی مدد شامل حال رہی۔"

26 "دل کی دھڑکن کب تیز ہو جاتی ہے؟"

"بیٹی کو دیکھ کر۔"

27 "تنہائی کا احساس کب ہوتا ہے؟"

"جب گھر والے گھر میں نہیں ہوتے۔"

28 "زندگی میں کچھ واپس ملنے کا موقع ملے تو کیا واپس لینا چاہیں گے؟"

"کچھ واپس نہیں چاہیے۔ اللہ کا بڑا کرم ہے۔ بڑا شکر ہے۔"

29 "گھر میں سب سے زیادہ پیار، ڈانٹ کس سے ملی؟"

"میں اپنے خاندان کا لاڈلا ہوں۔ امی، ابو، ماموں نانی، نانا، خالہ بہت محبت کرتے ہیں۔"

30 "اپنی بیماری کو سیریس لیتے ہیں؟"

"بیماری ایک امتحان ہے اور یہ امتحان گزر ہی جاتا ہے۔"

31 "آپ کے ڈراموں، فلمز اور کمرشلز کی تعداد؟ نام بھی بتائیں؟"

"ڈراموں کی فہرست تو لمبی ہے...... چند ایک کے نام بتا دیتا ہوں......"میرا دل میرا دشمن، فریاد، دل تو کچا ہے جی، وی آر فیملی، محمود آباد کی ملکائیں، جورو کا غلام، چھلاوا، اکیلی، کس دن میرا ویاہ ہوئے گا" اور بہت سارے فلموں میں "راستہ، جوانی پھر نہیں آنی" اور دو زیر تکمیل ہیں۔ کمرشلز بھی کافی کیے ہیں اور مشہور برانڈز کے کیے ہیں۔"

32 "رومانٹک رول آسانی سے کر لیتے ہیں یا نگیٹو؟"

"دونوں انجوائے کرتا ہوں۔ اگر اچھا لکھا ہوا ہو تو۔"

33 "ادب سے لگاؤ...... کس کو زیادہ پڑھتے ہیں؟"

"ادب اب دیکھتا ہوں مختلف ممالک کا، فلمز کے ذریعے سے، پڑھنے کا وقت نہیں ملتا۔"

34 "کوئی فیصلہ جو غلط ثابت ہوا ہو؟"

"صحیح غلط فیصلے زندگی کا حصہ ہیں۔ لہٰذا کوئی پچھتاوا یا افسوس نہیں ہے اگر کچھ غلط بھی ہوا ہے تو......"

35 "کچن سے لگاؤ؟"

"بالکل بھی نہیں......شیف بننے والی بات تو سوچی بھی نہیں ہے۔"

36 "کبھی سوچا کہ کاش سوشل میڈیا نہ ہوتا؟"

"اگر سوشل میڈیا نہ ہوتا تو فینز کی محبت کیسے دکھائی

دیتی۔"
37 "کس شخصیت پر غصہ نہیں کر سکتے؟"
"غلط کو غلط کہتا ہوں۔ خواہ سامنے کوئی بھی شخصیت ہو۔"
38 "کس کے لیے زندہ رہنا چاہتے ہیں؟"
"زندہ رہنا نہ رہنا میرے ہاتھ میں کب ہے لیکن جتنی بھی میری زندگی ہے وہ گھر والوں کے لیے ہے...... اور دوستوں کے لیے، اچھے لوگوں کے لیے، مددگار بن کے رہنا چاہتا ہوں۔"
39 "ایک نصیحت جو گرہ سے باندھ لی؟"
"کرو سب کے لیے، مگر امید کسی سے نہ رکھو۔"
40 "آپ کو نفرت ہے؟"
"کراچی کے ٹریفک سے۔"
41 "کبھی غربت میں وقت گزارا؟"
"زندگی میں حالات بہت تنگ رہے ہیں ......اور تھوڑے میں بھی گزارا کیا ہے، لیکن اللہ کا شکر ہے کہ ہاتھ صرف اللہ کے سامنے ہی پھیلایا ہے...... کسی اور کے آگے نہیں۔"
4 2 "طالب علمی کے زمانے میں کون سا مضمون برا لگتا تھا؟"
"میتھ ......اُف! ہمیشہ ہی جان جاتی تھی میری۔"
43 "حکیم، ہومیو پیتھک اور ڈاکٹر کس پر اعتبار ہے؟"
"سب اپنی اپنی جگہ لوگوں کے لیے بہتر ہی کرتے ہیں...... مگر میں بیمار ہونے پر ڈاکٹر کو ہی ترجیح دیتا ہوں۔"
44 "پاکستان میں کیا چیز فری ہونی چاہیے؟"
"تعلیم فری ہونی چاہیے اور لازمی بھی ہونی چاہیے۔"
45 "کیا دل سے اترا ہوا شخص پہلے جیسا مقام حاصل کر سکتا ہے؟"
"اگر ایک دفعہ کوئی دل سے اتر جائے وہ دوبارہ اپنی جگہ نہیں بنا پاتا۔"
46 "اپنے ہر کام کے لیے کس سے مشورہ لیتے ہیں؟"
"سب سے پہلے اپنے آپ سے اور پھر بیوی سے۔"
47 "موجودہ حکومت سے مطمئن ہیں؟"
"کچھ آئیڈیا نہیں ہے۔ ویسے میرا ووٹ عمران خان کے لیے ہی تھا۔"
48 "ملک سے باہر جاب کی آفر آئے تو؟"
"ملک سے باہر جاب کی آفر آئی تھی ...... مگر میں نے انکار کر دیا کیونکہ مجھے صرف باہر جا کر گھومنے کا شوق ہے...... رہنا مشکل کام ہے۔"
49 "غصے میں آپ کا ردعمل؟"
"میرا غصہ صرف پانچ منٹ کا ہوتا ہے مگر ہوتا بہت زوردار ہے۔"
50 "ٹی وی کے بہترین اینکر؟"
"معین اختر صاحب ہمیشہ سے میرے پسندیدہ رہے ہیں۔"
51 "نصیحت جو بری لگتی ہے؟"
"ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دیتا ہوں۔ تو کچھ برا نہیں لگتا۔"
52 "فیملی پر آپ کا کتنا رعب ہے؟"
"رعب نہیں ہے، سب عزت کرتے ہیں۔"
53 "کون سی تاریخیں یاد رکھتے ہیں؟"
"جن جن سے پیار کرتا ہوں، ان کی سالگرہ یاد رکھتا ہوں۔"
54 "ایک کھانا جو جب ملے کھا لیتا ہوں؟"
"بریانی اور بن کباب۔"
55 "اپنی پرفارمنس میں کیا کمی نظر آتی ہے؟"
"ہمیشہ اپنی خامیاں نکال کر اگلی دفعہ بہتر پرفارمنس دینے کی کوشش کرتا ہوں۔"
56 "اپنا ڈرامہ دیکھ کر کیا سوچتے ہیں؟"
"سوچتا نہیں ...... کہتا ہوں کہ، واہ کیا ایکٹر ہے کہاں سے آیا ہے...... ہاہاہا۔"
57 "کس چینل پر ریموٹ رک جاتا ہے؟"

"فوڈ چینل پر۔"

58 "پہلی فلم جو سینما میں دیکھی؟"

"مشن امپاسبل...... بہت مزا آیا تھا۔"

59 "کوکنگ یا کھانا...... کیا پسند ہے؟"

"صرف کھانا کھانا پسند ہے...... کوکنگ میرے بس کا کام نہیں ہے۔"

60 "کون سا رول کرنے کی خواہش ہے؟"

"مقدر کا سکندر کے سیف الرحمٰن کا رول جو کہ فیصل قریشی نے کیا تھا۔"

61 "آپ کا نا قابل فراموش کردار؟"

"دل تو کچا ہے کا رمضان خان اس رول کو کرنے کے بعد پوری دنیا سے پیار بھرے پیغامات ملے اور خاص طور پر خیبر پختون خواہ کے لوگوں نے بہت پسند کیا۔"

62 "کس رول کو کرنے سے انکار کیا؟"

"کافی کردار منع کر دیے جو مجھے لگے کہ یہ جھوٹ اور کچھ غلط دکھائے جا رہے ہیں...... تو ایسے کردار کرنے سے انکار کر دیتا ہوں۔ یعنی جو کردار حقیقت سے دور ہوتے ہیں۔"

63 "کس سیاست دان کا رول کرنے کی خواہش ہے؟"

"کبھی موقع ملا تو آصف علی زرداری کا کردار کرنا چاہوں گا کیونکہ سیاست دانوں میں کافی دلچسپ شخصیت ہیں۔"

64 "چاند پر پہنچ کر پہلا پتھر کس کو ماریں گے؟"

"انسٹاگرام پر پوسٹ کر دوں گا۔ وہی سب سے بڑا پتھر ہوتا ہے۔"

65 "آپ کی فیوچر پلاننگ؟"

"میرا اللہ ہی میرے لیے پلان کرتا ہے...... میں صرف محنت کرتا ہوں۔"

66 "کس کام کو کرنے کے لیے بہت سوچتے ہیں؟"

"میں ہر کام کرنے سے پہلے بہت سوچتا ہوں۔ بہت زیادہ سوچتا ہوں۔"

67 "پسندیدہ فوڈ اسٹریٹ؟"

"دنیا بھر کے کھانے اور فوڈ اسٹریٹ مجھے پسند ہیں۔ برنس روڈ، بوٹ بیسن، گوالمنڈی اور بہت سارے۔"

68 "آئینے کو کتنا وقت دیتے ہیں؟"

"آدھا دن آئینے کے سامنے ہی گزر جاتا ہے...... کیونکہ ہمارا کام ہی ایسا ہے۔"

69 "کیا شادی کرنا ضروری ہے؟"

"زندگی میں سیٹل ہونا ضروری ہے اور بیوی بچوں سے زندگی مکمل ہو جاتی ہے۔"

70 "اپنا کل سوچ کر کیا احساسات ہوتے ہیں؟"

"اچھا لگتا ہے کہ محنت کرتے کرتے اتنا آگے نکل گیا ہوں۔ الحمدللہ۔"

71 "سگنل پہ کھڑے ہو کر کن چیزوں کا جائزہ لیتے ہیں؟"

"کہ اس نے کیوں سگنل توڑا۔"

72 "بچپن میں کون سے فنکار پسند تھے؟"

"ہمیشہ سے ٹام کروز، شاہ رخ خان، سلمان خان اور شان پسند ہیں۔"

73 "خواتین رائٹرز میں آپ کی پسندیدہ رائٹر؟"

"سب اپنی اپنی جگہ بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔ لیکن پھر بھی "زنجبیل" میڈم کے اسکرپٹ پر کام کرنا چاہوں گا۔"

74 "بچپن میں کون کون سے کھیل کھیلے؟"

"کھوکھو...... کنگ کنگ...... کرکٹ، ساسر اور پٹھو گرم کھیلے۔"

75 "شاپنگ کے وقت سب سے پہلے کس کا خیال آتا ہے؟"

"بیٹی کا...... اس کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور خرید لیتا ہوں۔"

76 ''کب ہواؤں میں اڑتا ہوا محسوس کرتے ہیں؟''
''جب فینز اور سینئرز کی طرف سے تعریفیں سننے کو ملتی ہیں۔''
77 ''کبھی چھپ چھپ کر دوسروں کی باتیں سنیں؟''
''میک اپ روپ روم میں نہ چاہتے ہوئے بھی دوسروں کی باتیں سن ہی لیتا ہوں۔''
78 ''اپنی کمائی کس چیز پر خرچ کرتے ہیں؟''
''زیادہ تر کھانا...... شاپنگ، گھر کے بلز اور چیریٹی پر۔''
79 ''کبھی نجومی کو ہاتھ دکھایا؟''
''نہیں...... کبھی نہیں۔''
80 ''اگر کسی سیلیبرٹی کا انٹرویو کرنے کو کہیں تو؟''
''فواد خان کا۔''
81 ''نیند کتنی پیاری ہے؟''
''بہت پیاری ہے۔ نیند کے معاملے میں بہت سیریس ہوں۔''
82 ''آپ کے گھر میں کون اس فیلڈ میں ہے یا آنا چاہتا ہے؟''
''فی الحال تو میں ہی اس فیلڈ میں ہوں۔ آنا سب چاہتے ہیں۔ لیکن پھر سب کاموں میں مصروف ہو جاتے ہیں۔''
83 ''بچت کس شکل میں کرتے ہیں؟''
''پیسے جمع کرنے یا جوڑنے کا کوئی شوق نہیں ہے...... صرف آج میں جیتا ہوں۔ شاہ خرچ ہوں۔''
84 ''شادی میں کن رسموں کے خلاف ہیں؟''
''کسی بھی رسم کے خلاف نہیں ہوں۔ خوشیوں کے دنوں میں سب اچھا لگتا ہے۔''
85 ''خواتین آئینے کو زیادہ وقت کیوں دیتی ہیں؟''
''میری بیوی اور میری ماں دونوں جلدی تیار ہو جاتی ہیں اس لیے دیر والی سے واسطہ نہیں پڑا۔''
86 ''آج کی فکر زیادہ ہوتی ہے یا کل کی؟''
''میں نے کہا نا کہ میں صرف آج میں جیتا ہوں۔''
87 ''صبح اٹھتے ہی کیا بات لبوں سے نکلتی ہے؟''
''خاموش اٹھتا ہوں اور اٹھنے کے 30 منٹ تک خاموشی پسند کرتا ہوں۔''
88 ''فیملی میں کون مزاج کا گرم ہے؟''
''سب سے زیادہ میں ہی گرم مزاج ہوں۔''
89 ''کس عمر میں موبائل استعمال کرنے کی اجازت ملی؟''
''کالج میں آیا تو موبائل استعمال کرنے کی اجازت ملی تھی۔''
90 ''غصے میں پہلا لفظ کیا نکلتا ہے؟''
''بہت کچھ نکلتا ہے بتایا نہیں جا سکتا۔''
91 ''پسندیدہ تہوار؟''
''مجھے ہر تہوار پسند ہے...... مزا آتا ہے سب سے ملنے ملانے کا...... تہواروں میں ملاقاتیں ہو جاتی ہیں۔''
92 ''مرنے کے سین کرنا کیسا لگتا ہے؟''
''کام کام ہوتا ہے جیسا بھی ہو...... کرنے میں مزا آتا ہے۔''
93 ''اپنے تجربے سے سیکھا ہے یا دوسروں کے؟''
''سینئرز سے سیکھا ہے اور آج بھی سیکھ رہا ہوں۔''
94 ''کون سی چیز نشے کی حد تک پسند ہے؟''
''دال چاول اور چائے۔''
95 ''مہینے میں کتنی بار گھر سے باہر کھانا کھاتے ہیں؟''
''30 دن ہی گھر سے باہر کھانا کھاتا ہوں۔ کیونکہ کام بہت ہوتا ہے تو گھر دیر سے آتا ہوں۔''
99 ''اگر آپ کی شہرت کو زوال آ جائے تو؟''
''اللہ کی دی ہوئی چیز ہے...... کبھی کمی نہیں ہوگی...... شہرت زیادہ ہوگی کم نہیں ہوگی ان شاء اللہ......''

☆

کہانی کا آغاز کب ہوا، پہلی کہانی کب لکھی گئی؟

یہ کہنا تو مشکل ہے لیکن جو حکایتیں اور کہانیاں سامنے آئی ہیں ان سے ایک بات کا پتا ضرور چلتا ہے کہ زمانہ قدیم سے کہانی صرف دل بہلانے کا ذریعہ نہیں۔ اس میں علم و دانش کے قیمتی موتی چھپے ہوتے ہیں۔ آج بھی تخلیق کار لفظوں کا جہان آباد کر کے اپنے پڑھنے والوں کو زندگی برتنے کا سلیقہ سکھاتا ہے۔ وہ اپنی کہانیوں سے زندگی کی مثبت قدروں سے روشناس کراتا ہے۔ اپنے لفظوں سے زخمی دلوں کو سکون دیتا ہے۔ اس کی تخلیقی صلاحیت دوسروں کے لیے رہنما بھی بنتی ہے اور سہارا بھی۔

خواتین ڈائجسٹ بے شمار تخلیق کاروں کی صلاحیتیں سامنے لانے کا ذریعہ بنا۔ انہوں نے اپنی تحریروں کے ذریعے خود کو منوایا۔ شہرت اور مقبولیت حاصل کی۔ آج ملک میں اور بیرون ملک لاکھوں لوگ ان کی تحریریں پڑھتے ہیں۔

یوں تو مصنف کی تحریر ہی اس کی شخصیت کا آئینہ ہوتی ہے لیکن پھر بھی ہر قاری کے ذہن میں کچھ سوالات ابھرتے ہیں جو وہ اپنی پسندیدہ مصنفہ سے کرنا چاہتی ہیں۔

لاکھوں کی تعداد میں قارئین کی اپنی پسندیدہ مصنفہ سے ملاقات یا بات چیت ممکن نہیں۔ اس لیے ہم نے اس بار سالگرہ نمبر میں قارئین کو موقع دیا ہے، وہ اپنی پسندیدہ مصنفہ سے سوال پوچھ سکیں۔ ہم نے صرف ایک سوال کہا تھا لیکن قارئین نے اتنی تعداد میں سوال بھیجے کہ ہم نے تین سوال شامل کیے ہیں۔

آیئے دیکھتے ہیں قارئین نے کیا سوال کیے اور مصنفین نے ان کے کیا جواب دیے ہیں۔

سوال یہ ہے

ادارہ

نگہت سیما

ملتان سے فرخندہ نے پوچھا ہے

س: نگہت یہ بتائیں کہ لکھنا کب شروع کیا اور کس نے سب سے پہلے حوصلہ افزائی کی؟ پہلی تحریر کب شائع ہوئی اور کیا احساسات تھے؟

ج: پیاری فرخندہ! سب سے پہلے تو آپ کی محبتوں کی شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے اور میری تحریروں کو یاد رکھا اور سراہا۔ فروری اور مارچ کے شماروں میں آپ کے خطوط پڑھے اور ایک خوش گوار سی حیرت ہوئی تھی۔ میں نے فوراً ہی خط لکھا تھا جو کہیں کھو گیا۔ کہا جاتا ہے کہ رائٹر پیدائشی ہوتا ہے۔ لکھنے کی صلاحیت اسے قدرت کی طرف سے ودیعت ہوتی ہے لیکن رائٹر کو رائٹر اس کا قاری بناتا ہے اگر کوئی آپ کی تحریر پڑھنے اور سراہنے والا نہ ہو تو قدرت کی عطا کردہ صلاحیت خود ہی دم توڑ دیتی ہے، میرے قارئین میرے لیے بہت محترم ہیں ان کی رائے ان کا تبصرہ ان کی تنقید میرے لیے بہت اہمیت رکھتا ہے۔

آپ نے "بہ نوک خارمی رقصم" کو یاد رکھا ہے۔ خواتین کے ادارے سے چھپنے والے کسی پرچے میں یہ پہلا طویل قسط وار ناولٹ تھا جس کی تقریباً تیرہ اقساط تھیں۔ ایک ہندو لڑکی کی تلاش حق کے سفر کی کہانی تھی یہ۔ یاد رکھنے کا ایک بار پھر شکریہ اور اب آپ کے سوالوں کی طرف آتی ہوں۔

آپ نے پوچھا ہے کہ لکھنا کب شروع کیا تو میں نے "جنگ" راولپنڈی کے بچوں کے صفحے اور بچوں کے ایک رسالے میں کہانیاں لکھنے سے آغاز کیا تب میں چھٹی جماعت میں پڑھتی تھی اور میری پہلی

بی کہانی پر جو میں نے بچوں کے ایک میگزین "بچہ" کے ایک انعامی سلسلے میں بھیجی تھی پہلا انعام مل گیا تو بس پھر سلسلہ چل نکلا۔ بچوں کے "جنگ" کے صفحے کے بعد خواتین کے صفحہ اور پھر ادبی صفحہ پر لکھا۔

ان دنوں ہمارے گھر "سیارہ ڈائجسٹ" اور "اردو ڈائجسٹ" آتے تھے۔ میں نے ایک کہانی لکھی "ایک غریب سپاہی" لیکن چونکہ وہ اخبار کے صفحہ کے لحاظ سے کچھ طویل تھی۔ اس لیے میں نے یوں ہی "سیارہ ڈائجسٹ" میں بھجوا دی اور وہ نہ صرف چھپ گئی بلکہ محترم ستار طاہر صاحب نے بہت تعریف بھی کی تب میں نے ایک اور کہانی لکھی جو کہانی نہیں بلکہ مسجد اقصیٰ پر یہودیوں کے قبضہ کے حوالے سے تاثرات تھے۔ وہ چھپ تو گئے تھے لیکن ستار طاہر صاحب کو جب علم ہوا کہ میں اسکول کی طالبہ ہوں تو انہوں نے مجھ سے کہا کہ مجھے بڑے ادیبوں کو پڑھنا چاہیے۔ اچھا لکھنے کے لیے اچھا مطالعہ ضروری ہے۔ میں اخبار کے صفحات اور بچوں کے رسالے میں تو لکھتی رہی لیکن پھر تقریباً ڈیڑھ سال بعد سیارہ ڈائجسٹ میں اپنی کہانی "بھرم" اور پھر "اولڈ ایج ہاؤس" بھیجی۔ تب میں نویں کلاس میں تھی ہنوز اسکول کی طالبہ۔ محترم ستار طاہر اور قاسم محمود صاحب نے نہ صرف ان کہانیوں کی تعریف کی بلکہ حوصلہ افزائی بھی کی۔

میں سمجھتی ہوں "بھرم" اور اولڈ ایج ہاؤس آج لکھتی تو اس سے بہتر نہیں لکھ سکتی تھی "بھرم" میں ایک جملہ تھا۔ "میرا وجود تو لی پی کے خالی ڈبوں سے بھی زیادہ حقیر تھا جنہیں بھابھی بیگم نے چمکا چمکا کر اپنے سامان میں رکھ لیا تھا۔ (بی پی کی ٹافیاں ہوتی تھیں اور ابو کراچی سے ہم بچوں کے لیے ڈبے لاتے تھے۔ چوکور سے بڑے سے خوب صورت دو دو پونڈ والے ڈبے) ستار طاہر صاحب نے مجھے لکھا کہ کسی بھی حساس شخص کا دل چیر دینے کے لیے یہ ایک جملہ ہی کافی ہے۔ میں چاہوں گا کہ اب ہر ماہ "سیارہ" میں آپ کی کہانی ہو۔ سید قاسم محمود صاحب نے کہا۔

اسکول کی طالبہ اور اولڈ ایج ہاؤس جیسی کہانی۔ جمیل بھائی نے ابو سے کہا It is a Great Story آپ اسے ضرور پڑھنا۔

ادبی صفحہ (جنگ کا) میں چھپنے والی کہانی "جواری" پڑھ کر جاوید بھائی بہت حیران ہوئے تھے۔ "یہ سب کیسے لکھا یہ تاش کی ٹرمز یہ احساسات" تب جمیل بھائی نے کہا تھا۔

"مطالعہ بھائی صاحب! مطالعہ"۔

یوں حوصلہ افزائی ہوتی رہی اور میں سیارہ ڈائجسٹ کے ساتھ ساتھ "اوراق" میں لکھنے لگی۔ محترم وزیر آغا صاحب نے بہت حوصلہ افزائی کی۔ سب سے پہلے حوصلہ افزائی تو "غنچہ" والوں نے پہلا انعام دے کر کی پھر امی ابو بہن بھائیوں نے خصوصاً جمیل بھائی اور جاوید بھائی نے اور پھر ستار طاہر اور قاسم محمود صاحب نے۔ کیا احساسات تھے؟

تو پیاری فرخندہ اس عمر میں تو بس چھپنے کی خوشی تھی اور انعام میں ملنے والی کتابوں کی جو "آدھا شہزادہ" اور بندر یا شہزادی جیسی کہانیوں پر مشتمل تھیں۔ پھر جب "سیارہ ڈائجسٹ" کی طرف سے "ایک غریب سپاہی" کا اعزازیہ 100 روپے ملے تو اس خوشی کا اندازہ ہی نہیں کیا جا سکتا۔ اچھا تو لکھنے پر پیسے بھی ملتے ہیں۔ اس خوشی نے مزید لکھنے پر اکسایا۔ وہ سو کا نوٹ کافی عرصہ تک منی آرڈر کی رسید کے ساتھ پن لگا کر ___ رکھا تو پیاری فرخندہ! بچوں کی کہانی سے جس سفر کا آغاز کیا تھا وہ ادبی پرچوں سے ہوتا ہوا خواتین کے پرچوں تک لے آیا۔

س ۲: کس موضوع پر لکھنے کی خواہش ہے؟

میں نے بے شمار موضوعات پر لکھا۔ فرسودہ رسم و رواج جو تکلیف دہ ہوں۔ جیسے 'سوارہ' اور 'ونی' وغیرہ۔ کرنٹ افیئر ز ملکی حالات بھی میرا موضوع رہے۔ میں نے تقریباً ہر موضوع پر لکھا۔ نفسیاتی پرابلمز، ہجرت، مشرقی پاکستان کی علیحدگی وغیرہ پھر بھی مجھے لگتا ہے جیسے ابھی مجھے بہت کچھ لکھنا ہے۔ میں وہ سب نہیں لکھ پائی جو لکھنا چاہتی ہوں۔

ان دنوں کو بجودہ بدلتے ہوئے حالات ہے،
معاشرے میں تیزی سے جڑ پکڑتی برائیاں، رشتوں میں بڑھتے فاصلے، محبتوں کی کمی کو موضوع بنانا چاہتی ہوں۔ بچوں کے لیے کچھ لکھنا چاہتی ہوں۔ اپنی کہانی ''اللہ صیب جی'' کو مکمل کرنا چاہتی ہوں جس کا ایک حصہ ایک میگزین میں چھپ چکا ہے۔

س ۳: اپنے بچپن اور بعد کی کالج یونیورسٹی کی یادیں جو آپ کا سرمایہ ہیں۔

ج: یادیں بچپن کی ہوں، اسکول، کالج اور یونیورسٹی کی ہوں سب ہی قیمتی سرمایہ ہوتی ہیں۔ ہمارا بچپن بہت سادا اور معصوم تھا۔ ہماری دلچسپیاں، ہمارے کھیل، ہماری مصروفیات سب آج کل کے بچوں سے مختلف تھیں۔ ٹی وی پہ بچوں کا پروگرام اور آٹھ سے نو بجے تک کا ڈرامہ دیکھنا۔ لڈو، کیرم اور کروڑ پتی مناپلی تعلیمی تاش، ڈرافٹ اور چیس کھیلنا۔

رات کو گرمیوں میں چھوٹا بھائی، شاہدہ اور میں چھت پر سوتے تو آسمان پر سب سے روشن ستارا ڈھونڈنا کہ یہ ہمارا ہے۔ بیت بازی کرنا اور اپنے پاس سے الٹے سیدھے شعر بنالینا۔ ایسی ہی چھوٹی چھوٹی یادیں ہیں۔ اسکول، کالج کا زمانہ گولڈن دور تھا۔ ڈراموں، کھیلوں، مباحثوں اور ہر طرح کی غیر نصابی سرگرمیوں میں حصہ لینا۔ پھر تہذیب کے دائرے میں رہ کر شرارتیں کرنا۔ جیسے ''پسندیدہ شخصیت'' پر مضمون لکھنا تھا تو خود پر ہی لکھ ڈالا کہ بہر خاطر کہ ستم خود پر ستم اور ٹیچر کا پورے ایک صفحے کا نوٹ، ہوسٹل میں ڈائننگ روم کے دروازے پر نظم لکھ کر لگا دینا۔ ''صبح آلو، شام آلو'' پھر وارڈن کے سامنے پیشی۔ فٹ بال کھیلتے ہوئے انگوٹھے کا ناخن اتر جانا۔ سیکنڈ ایئر کی لڑکیوں کو سزا ملنے پر ان کا اسکیچ بنا کر نظم لکھنا اور پھر میم کے آفس میں طلبی۔ بہت ساری ایسی ہی یادیں ہیں۔

س: کیا آپ کو اپنی تحریروں میں اپنی جھلک نظر آتی ہے اور وہ کون سا کردار ہے اور کون سی تحریر ہے؟

ج: کہتے ہیں کہ تحریر کسی حد تک لکھنے والے کا عکس ہوتی ہے۔ ہمارے نظریات، ہماری سوچوں اور

احساسات کی جھلک نہیں نہ نہیں کی نہ کی تحریریں ہوتی ہے۔ جب میں کسی کردار کے حوالے سے وطن کی محبت کی بات کرتی ہوں تو وہ میرے ذاتی احساسات ہوتے ہیں جو میں اپنے وطن کے لیے رکھتی ہوں۔ کسی بھی ایشو کے حوالے سے جو خیالات کسی کو مار کے ذریعے بیان کرتی ہوں وہ میری سوچ ہوتی ہے لیکن کوئی ایک خاص کردار یا تحریر پر ذہن میں نہیں ہے۔ نہ بطور خاص کسی تحریر میں اپنا کردار پینٹ کیا کہ میں کہہ سکوں کہ اس کردار میں میری جھلک ہے۔ حمرہ واجد کا سوال ہے

س: آپ نے بے شمار کہانیاں لکھیں۔ جنہوں نے آج بھی قارئین کو اپنے سحر میں جکڑا ہوا ہے اپنی کون سی تحریر یا کون سا ایسا کردار ہے جو سب سے زیادہ پسند ہے۔ کیا اس کردار سے لپٹی کوئی ایسی یاد ہے جو آج بھی دل پر نقش ہے؟

ج: ایسی بہت سی تحریریں اور کردار میں جو مجھے بہت پسند ہیں۔ سب تو لکھنا مشکل ہے۔ البتہ چند ایک جو اس وقت ذہن میں ہیں۔ وہ ہیں۔

''نہ صدف ہوئی نہ گہر ہوئی''، ''مے ڈے، اوپسی''، ''اب سفر کا استعارہ اور ہے۔'' ''تریاق''، ''دشت فراق، شہر تمنا''، ''کتنا سہل جانا تھا۔'' ''زمین کے آنسو۔'' ''راہ جنون'' کشمیر کے حوالے سے لکھا گیا ناولٹ) کوئی شہر ایسا بسا دُں میں ''نایافت''، ''باروفا'' میرے خیال میں آپ کے جواب میں اتنے نام کافی ہوں گے۔ اپنے ہی تخلیق کردہ کئی کردار مجھے بہت متاثر کرتے ہیں۔ اور ایک مزے کی بات بتاؤں مجھے اپنی ''شارٹ اسٹوریز'' سب کی سب بہت پسند ہیں۔ خواتین ڈائجسٹ کے قارئین نے شاید میری وہ کہانیاں نہ پڑھی ہوں۔ خواتین کے پرچوں میں لکھنے سے پہلے اور ساتھ ساتھ میں نے بے شمار مختصر کہانیاں لکھی تھیں۔ جمیل بھائی کہتے تھے۔ مختصر کہانیاں لکھنا ہی اصل فن ہے۔ ان مختصر کہانیوں کے تین مجموعے چھپ چکے ہیں۔ لیکن زیادہ تر پبلشرز

ناول چھاپنا پسند کرتے ہیں چاہے وہ کیسا بھی ہو۔ میری شدید خواہش ہے کہ میں اپنی تمام مختصر کہانیوں کو اکٹھا کر کے کتابی شکل میں محفوظ کر سکوں۔

مجھے اپنے کئی کردار پسند ہیں جیسے ''دھوپ، بارش اور سائے، میں لالہ کا کردار اس کی موت کا منظر لکھتے ہوئے میری آنکھیں نم ہوئی تھیں۔'' ''نہ صدف ہوئی'' میں ''ماہ رو کا کردار''، ''راہ جنوں'' میں عابد شاہ کا کردار ''مجھے تمہارے دل کی خبر تھی'' میں ''نوا'' کا کردار۔ بے شمار کہانیوں کے بے شمار کردار کن کن کا ذکر کروں۔

فاکہہ سہیل نے پوچھا ہے؟

س: اپنے کیریئر کے دوران کوئی ایسا واقعہ ایسی یاد یا کوئی ایسا شخص جس کی وجہ سے آپ کو لکھنے کی تحریک ملی ہو۔ یا جس کے بعد لکھنے میں نکھار آیا ہو؟

ج: پیاری فاکہہ! لکھنے کی تحریک تو کہیں سے بھی مل سکتی ہے۔ کسی کی مسکراہٹ، کسی کا کوئی جملہ، کسی کا کوئی اچھا یا برا رویہ، وقت اور عمر کے ساتھ جب مطالعہ اور مشاہدہ بڑھتا ہے تو تحریر میں نکھار آ جاتا ہے۔ اپنے کیریئر کے دوران چند ایک واقعات نے لکھنے پر اکسایا۔ جیسے ایک جاننے والی ٹیچر تھیں، گورنمنٹ جاب تھی اور ینگ تھیں۔ اچانک ان کی ڈیتھ ہو گئی تو ابھی ان کی تدفین نہیں ہوئی تھی کہ میں نے ان کی ایک کزن اور گہری دوست کو ڈی ای او صاحبہ کے آفس میں درخواست کرتے سنا کہ ان کی خالی ہو جانے والی سیٹ پر ان کا ٹرانسفر کر دیا جائے۔

یہ کیسی تلخ حقیقت تھی جس کا ادراک مجھے اس لمحے ہوا تھا کہ بعض اوقات ذاتی مفاد، قریبی اور خونی رشتوں کی محبتوں پر حاوی ہو جاتا ہے۔ اس تلخ حقیقت نے کئی دن تک مجھے اپنی گرفت میں لیے رکھا اور جب تک اس موضوع پر کہانی نہ لکھ لی، دل پر دھرا بوجھ کم نہ ہوا۔ س: حسنہ احمد پوچھتی ہیں۔

ج: ہر کامیابی کے پیچھے کسی کا ہاتھ ہوتا ہے آپ اپنی کامیابی کا کریڈٹ کسے دینا چاہیں گی؟

ج: زندگی میں کوئی اتنی بڑی کامیابی نہیں ملی جو تھوڑی بہت کامیابیاں ملی ہیں، ان میں والدین کی دعاؤں اور ان کی حوصلہ افزائی کا ہی ہاتھ ہے۔

سائرہ رضا

1۔ مریم انصاری نے پوچھا ہے۔

س ''کیا سائرہ رضا نے قلم جادونگری سے خریدا ہے۔ جذبوں کی عکاسی کا فن انہیں خوب آتا ہے؟''

ج ''جادونگری اور جذبات کی عکاسی آپ نے دو مختلف چیزیں جوڑ دیں۔ مگر خیر جادونگری جاتی تو اور بھی بہت کچھ لے آتی۔''

میرے قلم کی خریداری...... اردو بازار کراچی سے اکٹھے منگوا لیتی ہوں۔ ختم ہو جائیں تو صبح صبح منہ اندھیرے گھر کے سامنے والی شاپ کھلنے سے پہلے ملنے پہنچ جاتی ہوں۔ (میاں صاحب کی سوفٹی پہن کر) بچوں کے بیگ سے چوری کر لیتی ہوں۔ میرا مطلب ہے، نکال کر واپس رکھنا بھول جاتی ہوں۔

رفوگری کا وہ سین جس میں تاباں اپنی حسین ناک سے کاشان کی شباہت کھوج رہی تھی۔ میرا پین چلتے چلتے بند ہو گیا۔ بھائی نیچے کھڑا تھا کہ میں اسے قسط دوں تا کہ وہ آفس جاتے ہوئے آفس لے جائے۔ مجھے کچھ نہ ملا تو میں نے سبز رنگ کی کلر پنسل سے آخری لائنیں لکھ دیں۔

کبھی کبھار شوہر آ کر کہتے ہیں۔ ''دیکھو، میں تمہارے لیے کیا لایا۔'' اشتیاق سے دیکھنے پر وہ ایک بال پوائنٹ ہوتا ہے۔ جسے میں سینے سے لگا لیتی ہوں۔

قلم تو لوکل ہے مریم......! مگر جذبوں کی عکاسی کا آپ نے ذکر کیا ہے وہ خداوند تعالیٰ کی ودیعت کردہ ہے۔ میرا کوئی کمال نہیں۔ ''اور تم اپنے رب کی کون کون سی نعمت کو جھٹلاؤ گے۔''

2...... رضوانہ شکیل راؤ کہتی ہیں۔

س ''میں سرسوں کے پھول'' جیسا ناول ضرور لکھوں، کیا اس ناول کی منظر نگاری کے لیے آپ گاؤں گئی تھیں......؟ کیونکہ بہت زبردست نقشہ کھینچا ہے گھر کے ماحول کا جیسا کہ ہمارے علاقے میں ہوتا

ہے؟"

ج۔اللہ کا حکم ہوگا تو اس جیسا دوسرا کیا دسواں ناول بھی ہو جائے گا ان شاء اللہ اور اب آپ کا سوال......

دیکھیے میں پکی شہری لڑکی تھی/ ہوں۔تو آپ کا اندازہ درست ہے،میں اپنی سسرالی شادی میں گئی تھی۔

بلکہ میں نے شادی کے بعد ہی گاؤں دیکھا تھااور چونکہ مشاہدہ بہت گہرا ہے اور دوئم وہاں کے ماحول کی سادگی وخوب صورتی آپ کو اکساتی ہے۔تو سب کچھ خود بخود ہوتا چلا گیا۔

لیکن اس ماحول میں بڑی بدصورتیاں بھی ہیں۔جن کو ضرور لکھنا چاہوں گی۔مگر ایک تو وقت کی کمی اور دوسرے نقطہ اعتراض وفساد۔میں لکھنے سے گھبراتی ہوں۔سارے ڈنڈا لے کر میرے پیچھے پڑ جائیں گے۔"سرسوں کے پھول کے کردار ان کی زبان و بیان ......ہمارے دیہاتوں کے ہر گھر میں موجود ہے۔

گاؤں اور شہر کے ماحول میں اور رہن سہن میں زمین آسمان کا فرق ہے۔دونوں جگہ رہنے والی لڑکیاں اپنے اپنے حساب سے جفاکش ہوتی ہیں۔مگر شہر کی لڑکیاں چارپائی کمر پر اٹھا کر صحن کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک لا کر بچھانے اور اٹھانے کا سوچ بھی نہیں سکتیں۔کولر تک اٹھا کر رکھنے سے کلائی میں بل پڑ جاتا ہے جبکہ گاؤں کی لڑکیاں درجن سے زیادہ چارپائیاں...پیڈسٹل فین، کولر......اور بڑے سارے صحن کی دو چار بار جھاڑو پلک جھپکتے میں لگا لیتی ہیں۔جانوروں کو سنبھالنا......یا پھر ان کے دودھ کو سنبھالنا اور سب سے مزے کی بات ماتھے پر شکن نہیں آتی۔

گاؤں دیہاتوں میں بزرگوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے اور ان کا ادب، احترام حد سے سوا...... چارپائیوں پر ہر ایک کے آگے چنگیر اور کٹوری میں سالن ادب سے رکھنا۔

زیادہ دلچسپ وہ ماحول ہے۔جو شہر اور دیہات کا امتزاج ہے۔سو اس پر تو بہت بات ہو سکتی ہے۔میں ضرور کوشش کروں گی۔منفی یا ناگوار پہلو پر بھی کچھ لکھوں۔

3......لبنیٰ رضوان کراچی سے

س۔آپ نے بر سبیل تذکرہ میں تاریخ اور مشہور ڈراما ارطغرل پر خاصی تنقید کی جو کسی کو پسند نہیں آئی آپ تنقید کرنے والوں کو کیا کہیں گی؟"

ج"کچھ بھی نہیں ......اور دوسرے میں نے ارطغرل پر تنقید کی ہی نہیں میں نے اس پہ عاشق ہو جانے والوں کا کندھا ہلا کر صرف یہ بتانے کی ناکام کوشش کی تھی......کہ صاحبو! تاریخ صرف یہ نہیں ہے اسلام کا اکیلا مجاہد......یا محی الدین صرف ترک نہیں ہیں۔

مدح سرائی کرنے والوں کے لیے میرا ایک چھوٹا سا مشورہ یہ ہے کہ آپ تاریخ کو پڑھیں۔سب کی تاریخ کو پڑھیں،ہر مذہب علاقے،زبان وبیان کو پڑھیں،اس کے بارے میں جانیں۔

پھر اس کے بعد فیصلہ کریں کہ سب سے اچھا کون ہے سب سے زیادہ قربانیاں کس نے دیں۔بلکہ فیصلہ بھی کیا کرنا......جو وِی بیسٹ ہوگا وہ سامنے آ جائے گا۔

میرے مضمون میں جن الفاظ پر زیادہ اعتراض ہوئے۔وہ تو میرے تھے ہی نہیں،ان الفاظ کو میں نے من وعن ڈاکٹر مبارک علی کی کتاب سے نقل کیا تھا، اب آپ پوچھیں گے،یہ ڈاکٹر مبارک علی کون ہے تو سادہ جواب وہی ہے۔تاریخ ......آپ تاریخ کو پڑھیں بس......

4......ماہا احمد کہتی ہیں۔

س"اپنی زندگی کی کوئی دلچسپ یاد یا واقعہ جو قارئین سے شیئر کرنا چاہیں؟"

ج۔پوری زندگی کا واقعہ ...... وہ بھی دلچسپ......اس سوال کا جواب میں نے سوچا۔بہت سوچا۔ابھی بھی سوچ رہی ہوں۔اوکے،جب میں پیدا

ہوئی تو میری نانی (اللہ انہیں جنت میں جگہ دے) دھاڑیں مار مار کے روئی تھیں کہ بیٹی پیدا ہوئی ہے، بڑی ذمہ داری......(ہنسی آئی کہ نہیں آئی؟)

تب میرے بابا نے اعلان کیا۔ "یہ میری بیٹی ہے جس کو رونا ہے اپنے گھر جا کر روئے۔" نانی نے جھٹ آنسو پونچھ لیے، ٹھیک ہے بھئی جب جس کو پالنا ہے اسے اعتراض نہیں تو وہ کیوں نیر بہائیں۔

میرا رائٹر ہونا میرے لیے خود بھی کبھار بڑی حیرت اور دلچسپی کا باعث بن جاتا ہے کہ میں کیوں......مطلب میں ہی کیوں......؟

ہاں، آج کل کی دلچسپ حیران کن بات میں ضرور بتانا چاہوں گی۔ میری ساڑھے تین سالہ بھتیجی اریج رضا......اسے مجھ سے عشق ہو گیا ہے۔ کسی بھی تھیلی میں اپنے دو جوڑے، ایک جوتا......تین چار پیپر اور دودھ کی تھیلی لے کر مین گیٹ کے پاس کھڑی ہو جاتی ہے کہ ہیں پھپھو چپکے سے نکل نہ جائیں۔ میرے ساتھ لپٹ کر سوتی ہے۔ میری بیٹیاں اگر غلطی سے بھی نزدیک آ بیٹھیں تو جہاں ہو بھاگ کر آ کر انہیں دور کر کے گود میں گھس جاتی ہے۔ میرا منہ تھام لیتی ہے۔

"آئیں میلی پھپھو (یہ میری پھپھو) پانچ پانچ دن تک گھر نہیں جاتی۔ ہم ڈانٹ کر (مصنوعی ڈانٹ) کر بھگاتے ہیں۔ پھر آ جاتی ہے۔ بات بات پر روٹھتی ہے۔ ڈائننگ ٹیبل کی کرسی کے نیچے بانہوں میں سر دے کر الٹا لیٹ کر......منانے سے نہیں مانتی۔

میری سمجھ میں نہیں آتا، اسے مجھ سے یہ عشق ہو کیسے گیا۔ میری بیٹیوں کی جان بند ہے اس میں، اور اس کی مجھ میں، منہ چومتی ہے، ویسے یہ عشق ڈھائی برس کی عمر میں شروع ہوا۔

یہاں میں نانی جان کے اس رویے کی وضاحت دینا ضروری خیال کرتی ہوں۔ تینتیس چونتیس برس کی عمر میں چار بیٹوں اور دو بیٹیوں کے ساتھ بیوہ ہو جانے والی عورت نے زمانے کی وہ وہ سختیاں جھیلی تھیں کہ......زبان و بیان تلخی میں نیم کو

انہیں اپنے تعلیم یافتہ ہونے پر زعم تھا (چار جماعت پاس ہوں، کوئی مذاق ہے بھلا)

بیوگی نے معاشی و معاشرتی حوالے سے نجانے کون کون سے پہلو دکھائے تھے کہ عہد کر لیا۔ چاروں بیٹیوں کو تعلیم دلوائیں گی اور باہنر بنائیں گی تاکہ کل کو حالات کا مقابلہ عزت سے کر سکیں۔

(میری امی سمیت چاروں بیٹیاں گورنمنٹ ٹیچرز بنا دیں۔ سو انہیں محسوس ہوا کہ ان کی بیٹی پر بیٹی کی پیدائش کی صورت ایک بھاری ذمہ داری آ گئی ہے۔)

ماہا آپ نے دلچسپ یاد/ واقعہ پوچھا۔ شکر کرتی ہوں آپ نے دکھ نہیں پوچھے ورنہ نیلا قلم سرخ ہو جاتا اور......ٹپکنے لگتا، جانے دیں۔

5......انعم شاہ کا سوال ہے۔

س "سائرہ آپ کے پاس لفظوں کی بہتات ہے کیا یہ خداداد صلاحیت ہے؟"

ج۔ پیاری انعم ...... کثرت مطالعہ ......آپ کے ذخیرہ الفاظ کو بڑھا دیتی ہے اور میرے جیسی شدید اعتدال پسند بندی کی زندگی میں بس اسی مطالعہ کی بداعتدالی رہی یا کثرت کہہ لیں۔

امی اسکول ٹیچر تھیں اور اردو بہت بامحاورہ بولتی تھیں سو وہاں سے بھی یقیناً اثر آیا ہے۔ اور پھر یہ کہ آپ جو کام کرتے ہیں، اس میں ماہر ہو جاتے ہیں۔ نئی جہتیں نکالتے ہیں۔ تجربات کرتے ہیں۔

جب قلم رواں ہوتا ہے تب مجھے کسی جملے کی خوب صورتی کا اندازہ نہیں ہوتا۔ لیکن شائع ہونے کے بعد جب میں پڑھتی ہوں تو یقین کامل ہو جاتا ہے کہ میں نے تو صرف قلم تھاما تھا۔ لکھا وہی جو لکھوایا گیا۔

سو جو ہوتا ہے وہ اللہ ہی کی طرف سے ہوتا ہے۔ میری کیا مجال کہ کھنچے سانس کو بھی باہر نکال سکوں۔

*

فائزہ محبوب سے ملاقات

شاہین رشید

فاسٹ فوڈ کے اس دور میں لوگوں کی صحت بہت متاثر ہوئی ہے۔ موٹاپا ایسے بڑھ رہا ہے جیسے غبارے میں ہوا...... جب موٹاپا آجائے تو پھر واپس بہت مشکل سے جاتا ہے...... اس بار آپ کی ملاقات ایک بہت ہی اچھی اور قابل Nutritionist سے کرواتے ہیں جو بہت اچھی کارآمد باتیں آپ کو بتائیں گی۔ جن پر عمل کر کے آپ موٹاپے سے نجات پاسکتی ہیں۔

"کیسے مزاج ہیں آپ کے؟"

"جی اللہ کا شکر ہے۔"

"پہلے تو آپ اپنے بارے میں بتایئے؟"

"جی ضرور...... میرا پورا نام فائزہ محبوب ہے۔ میرے ابا جان کا نام محبوب انور جاوید ہے جبکہ اماں کا نام زبیدہ محبوب ہے۔ میرا تعلق ٹوبہ ٹیک سنگھ کے قریب شورکوٹ روڈ پر موجود 298 گ ب سے ہے لیکن ہماری رہائش ٹوبہ ٹیک سنگھ میں ہے...... میری والدہ ہاؤس وائف ہیں جبکہ میرے والد کا سعودی عرب میں اپنا کاروبار ہے...... ہم چھ بہن بھائی ہیں۔ چار بہنیں اور دو بھائی...... اور میرا نمبر چوتھا ہے میں غیر شادی شدہ ہوں۔ میری تعلیمی قابلیت بی ایس سی ہوم اکنامکس ہے اور اسپشلائز Food nutrition ہے...... اور اب میں فاطمہ میموریل اسپتال سے منسلک ادارے نور انٹرنیشنل یونیورسٹی سے گائنا کولوجی میں اسپشلائزیشن کر رہی ہوں۔ اس کے علاوہ کلینکل اور کمیونٹی نیوٹریشنسٹ کے طور پر کام کرنے کا تجربہ بھی ہے۔"

"ہوم اکنامکس سے ذہن میں یہی آتا ہے کہ گھرداری کی کوئی ڈگری ہے...... ایسا ہی ہے نا......؟"

"جی بالکل...... ہوم اکنامکس کا نام آتا ہے تو عموماً لوگ کہتے ہیں کہ گھرداری کی ڈگری ہے جبکہ یہ بالکل غلط تاثر ہے۔ کیونکہ ہوم اکنامکس ایک وسیع مضمون ہے...... جس میں زندگی کے ہر پہلو سے متعلق تعلیم، تجربہ اور سیکھنے کے لیے بہت کچھ شامل ہوتا ہے......

ہوم اکنامکس میں میڈیکل اور نان میڈیکل دونوں ہی مضامین شامل ہیں...... اس ڈگری میں آرٹس، میڈیکل فیشن ڈیزائننگ سائیکالوجی اور ہوم فرنشنگ جیسے مضامین پڑھائے جاتے ہیں۔ میری دلچسپی شروع سے ہی بائیالوجی اور اس سے منسلک مضامین میں تھی اور پھر میں ڈاکٹر عذرا جہاں کے مضامین بہت شوق سے پڑھتی تھی اور ان سے متاثر بھی بہت تھی تو اسی لیے میں نے فوڈ اینڈ نیوٹریشن کو بطور میجر سبجیکٹ اختیار کرنے کا ارادہ کرلیا تھا۔"

"آپ نے کہا کہ آپ کلینکل نیوٹریشنسٹ اور کمیونٹی نیوٹریشنسٹ ہیں سے کیا مراد ہے؟"

"کمیونٹی نیوٹریشن ایک ایسی فیلڈ ہے جس میں ویلفیئر کا کام کیا جاتا ہے...... مثلاً فری کیمپس لگانا...... پاکستان کے پسماندہ علاقوں میں جاکر لوگوں کی فری اسکریننگ کرنا...... خوراک سے متعلق مسائل سے ان کو آگاہ کرنا اور ان کا حل بتانا۔ اسکول جانے والے بچوں اور ماؤں کے لیے نیوٹریشن کے آگاہی پروگرام کے تحت سیشنز کروانا اور لوگوں میں فری سپلیمنٹ بانٹنا...... کمیونٹی نیوٹریشن کی وجہ سے اب لوگوں میں متوازن غذا کو لے کر بہت شعور پیدا ہو رہا ہے۔"

ڈائیٹیشن نیوٹریشنسٹ میں کیا بنیادی فرق ہے؟"



"بنیادی فرق یہ ہے کہ نیوٹریشن ایک جنرل فیلڈ ہے جبکہ ڈائیٹیشن اس فیلڈ سے نکل کر بنتی ہے نیوٹریشنسٹ کا دائرہ کار وسیع ہوتا ہے' وہ آپ کو ہر مسئلہ پر گائیڈ لائن دے سکتا ہے۔ جبکہ ڈائیٹیشن کا تعلق میڈیکل کی ایک مخصوص فیلڈ سے ہوتا ہے اور وہ اس سے متعلق مریضوں کے لیے کام کرتی ہیں۔ جیسے میں اب نیوٹریشنسٹ ہوں لیکن گائناکولوجی میں اسپشلائزیشن کر رہی ہوں جس کے بعد میں گائنا کالوجسٹ ڈائیٹیشن بھی ہوں گی اور عورتوں میں گائنی سے متعلق امراض کا علاج بھی کر سکوں گی۔

بہ حیثیت نیوٹریشنسٹ ہمارا "موٹو" ہے "خوراک سے علاج" کیونکہ دوائیں کبھی بھی خوراک کا متبادل نہیں ہوسکتیں، یہ بات میں آپ کو اس طرح سمجھا سکتی ہوں کہ ایک حاملہ عورت کو پہلے مہینے سے لے کر آخری مہینے تک اپنی اور اپنے بچے کی صحت کا خیال رکھنے کے لیے کس قسم کی خوراک لینی چاہیے تاکہ ماں اور بچہ صحت مند رہیں اور دوران حمل ماں بیمار نہ ہو اور بچہ بھی صحت مند پیدا ہو۔ دیکھیں خوراک سے پیدا ہونے والی کمی آپ کسی بھی صورت دواؤں سے پوری نہیں کر سکتے اور یہ ایک نیوٹریشنسٹ کی ہی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ ایسا پلان دے کہ ڈلیوری کے وقت خون کی کمی یا دیگر پیچیدگیاں جنم نہ لیں۔"

"یہ فیلڈ اپنی مرضی سے لی...... یا گھر والوں کے کہنے سے لی؟"

"جی الحمدللہ، یہ فیلڈ میں نے اپنی مرضی سے لی ہے اور گھر والوں کی طرف سے تو اس بات کی مکمل آزادی تھی کہ میں تعلیم کے معاملے میں اپنی مرضی کر سکتی ہوں۔ اس فیلڈ میں مجھے دلچسپی تو تھی ہی لیکن اس سے بھی زیادہ یہ فیلڈ اس لیے بھی لی کہ پاکستان جیسے پسماندہ ملک میں خوراک اور اس سے پیدا ہونے والے مسائل کی طرف توجہ دینے کی بہت ضرورت تھی۔"

"کبھی اپنی نیوٹریشن اپنے گھر والوں پر بھی آزمائی؟"

"جی ...... جی بالکل ...... میرے گھر والے میرے دیے گئے ڈائیٹ پلان پر عمل کرتے ہیں...... البتہ میری اماں میری روک ٹوک سے تنگ ضرور آجاتی ہیں...... کیونکہ وہ شوگر کی مریضہ ہیں اور انہیں میٹھا کھانے سے روکنا تھوڑا مشکل ہو جاتا ہے۔"

"موٹے اور دبلے افراد کے لیے کیا ڈائیٹ پلان دیں گی آپ؟"

"بہت موٹے اور بہت دبلے افراد کے لیے ضروری ہے کہ وہ سب سے پہلے اپنا اپنا لائف اسٹائل بدلنے کی کوشش کریں...... کیونکہ ہم سب جانتے ہیں کہ انسانی جسم ایک مشین ہے اور کسی بھی مشین سے اگر زیادہ عرصہ کام نہ لیں تو وہ زنگ آلود ہو کر خراب ہو جاتی ہے اور کچھ ہی عرصے میں ناکارہ بھی...... تو اسی طرح اگر ہم صرف کھاتے ہی رہیں اور ورزش یا واک نہیں کریں گے تو ہمارا جسم بھی کچھ ہی عرصے میں ناکارہ ہو جائے گا......

تو ضرورت سے زیادہ دبلے اور موٹے افراد

کے لیے ضروری ہے کہ روزانہ ورزش کو اپنا معمول بنالیں ......اسی طرح عموماً ہم روزمرہ خوراک کو پانچ حصوں میں تقسیم کرتے ہیں جس میں پھل سبزیاں دودھ اور اس سے بننے والے اجزاء اجناس اور چکنائی ہے۔ اگر ہم معمول بنالیں اور ہر روز ان پانچ گروپس میں سے اپنی جسمانی ضرورت کے مطابق کچھ نہ کچھ کھائیں تو ہم بہت زیادہ موٹے اور دبلے ہونے سے بچ جائیں گے۔"

"اس فیلڈ کا کیا اسکوپ ہے......جاب کے سلسلے میں؟"

"نیوٹریشن ایک ایسی فیلڈ ہے جو زندگی کے ہر شعبے اور ہر طبقے کے ساتھ منسلک ہے اسی لیے نیوٹریشنسٹ کے لیے کام کرنے کے مواقع بھی زیادہ ہوتے ہیں۔ اپنا کلینک کھولنے کے ساتھ ساتھ ایک نیوٹریشنسٹ سرکاری، پرائیویٹ اسپتالوں، کھانے کی بڑی بڑی کمپنیوں، ہوٹلز فوڈ سیکورٹی ڈیپارٹمنٹ، آرمی، باڈی بلڈنگ، جمز، کیٹرنگ سروس، این جی اوز اور اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیز میں بھی ملازمت اختیار کرسکتی ہیں......

اس کے علاوہ اسپورٹس نیوٹریشن بھی ایک ایسی فیلڈ ہے جس کے تحت آپ انٹرنیشنل ٹیمز کے اسکواڈ میں بطور نیوٹریشنسٹ کے بھی ملازمت اختیار کرسکتے ہیں۔ میں 2019ء میں NDS کی ممبر بنی تھی اور سر حسنین معاویہ اس کی لیڈ ٹیم کے ہیڈ ہیں۔ NDS کا کام نیوٹریشنسٹ کو درپیش مسائل کا احاطہ کرنا ہے اور ان کے لیے آواز اٹھانا ہے۔"

"آپ کی نجی مصروفیات پر بات کرنے سے پہلے میں چاہوں گی کہ آپ بہ حیثیت نیوٹریشنسٹ کے کسی کو مشورہ دینا چاہیں گی؟"

"جی بالکل......آپ کے ڈائجسٹ کے پلیٹ فارم سے میں ایک تجویز دینا چاہوں گی کہ ہر وہ بڑی انڈسٹری، کارخانہ یا فیکٹری جہاں ہمارے مزدور مرد و خواتین کام کرتے ہیں اور ان کو وہاں کھانا بھی دیا جاتا ہے، وہ کم سے کم ایک نیوٹریشنسٹ ضرور ہائر کریں یا 15، 20 دن میں کسی نیوٹریشنسٹ سے ضرور مشورہ کرلیا کریں' وہ مزدوروں کے کھانے کے لیے پلان تجویز کرے اور پھر اس پلان کے تحت کھانا بنایا جائے تاکہ مزدوروں کی صحت اچھی رہے اور وہ کام میں اپنا سو فیصد دے سکیں۔"

"اور اب کچھ نجی لائف......پڑھائی کے علاوہ کیا کیا مشاغل ہیں آپ کے؟"

"سچ بات تو یہ ہے کہ مجھے دوسرے مشاغل کے لیے وقت ہی نہیں ملتا لیکن پھر بھی میرا زیادہ تر وقت کچھ نہ کچھ لکھنے میں یا پھر کچن میں گزرتا ہے......مجھے کوکنگ کا بہت شوق ہے اور ابھی تو میں کوکنگ سیکھ رہی ہوں۔ شاعری سے شغف ہے جبکہ اردو لٹریچر پڑھنے کی بہت شوقین ہوں۔"

"آپ کی تحریریں کیا آپ کی فیلڈ سے متعلق

دعائے مغفرت

ہماری ساتھی شاہین رشید کے بڑے بھائی محمد ریاض حرکت قلب بند ہونے سے دنیا کو الوداع کہہ گئے۔

اناللہ وانا الیہ راجعون

دو سال پہلے ان کے جواں سال صاحب زادے دنیا سے رخصت ہو گئے تھے۔ بھتیجے کے بعد بڑے بھائی کی اچانک وفات شاہین رشید کے لیے بہت بڑا صدمہ ہے۔ بڑے بھائی باپ کی طرح ہوتے ہیں۔ دکھ کی اس گھڑی میں ہم شاہین رشید کے غم میں برابر کے شریک ہیں اور دعا کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ محمد ریاض کو جنت الفردوس میں جگہ دے۔ شاہین رشید اور دیگر متعلقین کو صبر جمیل عطا فرمائے، آمین۔

قارئین سے درخواست ہے کہ وہ مرحوم محمد ریاض کے لیے دعائے مغفرت فرمائیں۔

ہی ہوئی ہیں؟"

"جی......جی زیادہ تر...... اور مجھے رسائل اوراخبارات میں لکھنے کے لیے میرے گھر والوں نے فورس کیا......اوران ہی کے کہنے پر میں مختلف جگہوں پر لکھنے کے لیے مائل ہوئی۔"

"آپ بتارہی تھیں کہ آپ کتاب بھی لکھ رہی ہیں......اس کے بارے میں کچھ بتائیے؟"

"جی کتاب ابھی زیرِ تکمیل ہے ان شاءاللہ جلد مکمل ہوجائے گی ،اس کتاب میں میرے لکھے ہوئے مضامین ہوں گے اور کچھ نئے مضامین ہوں گے جس میں لوگوں کو یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ متوازن غذا ہمارے لیے کیوں ضروری ہے اور کس طرح ہم بغیر دواؤں کے متوازن غذا کھاکے خودکو صحت مندرکھ سکتے ہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ میں چھوٹے چھوٹے کتابچے بھی لکھ کر تقسیم کرتی ہوں، ان میں کسی ایک مسئلہ کے بارے میں لکھتی ہوں۔ ساتھ ہی ساتھ میری ویب سائٹ بھی بن رہی ہے اورانسٹاگرام پہ بھی لوگوں کوان کے مسائل کے حل کے حوالے سے مشورے دیتی رہتی ہوں۔"

"ٹی وی دیکھنا......گیمز وغیرہ سے کتنا لگاؤ ہے؟"

"ٹی وی سے لگاؤ تو مجھے بچپن سے ہی نہیں تھا......خصوصاًڈرامے اورفلمیں دیکھنے کاتو کوئی خاص شوق نہیں تھا......اورایسا بھی نہیں تھا کہ میں کوئی کتابی کیڑا ٹائپ طالبہ تھی......لیکن میرے شوق اپنی عمر کی لڑکیوں سے تھوڑے مختلف تھے۔ مجھے بچپن سے ہی سوانح عمری پڑھنے، شاعری کرنے اور خبریں سننے کا شوق ہے......سیاست سے مجھے خاص دلچسپی ہے...... اورسیاست سے باخبر رہتی ہوں۔"

"مصروفیات میں سے کتنا وقت گھر والوں کودے پاتی ہیں اورگھر والے شادی کے لیے فورس توکرتے ہوں گے؟"



"شادی کے لیے گھر والے فورس کرتے ہیں مگر یہ سب اللہ کے کام ہیں ،جب نصیب میں ہوگی ہوجائے گی......میں نے اپنے گھر والوں کوکبھی شکایت کاموقع نہیں دیا......کوشش کرتی ہوں کہ انہیں بھرپورٹائم دوں۔"

"اپنی کمائی ہوتو فضول خرچی کوبھی دل چاہتا ہے......آپ اپنی کمائی جمع کرتی ہیں یاخرچ کردیتی ہیں۔مزید کام کیاکرتی ہیں؟"

"نہ فضول خرچ ہوں اور نہ ہی بہت زیادہ کفایت شعار......سوشل ہوں اور دوتین این جی اوز کے ساتھ مل کرکام بھی کرتی ہوں۔ہم مختلف جگہوں پر کیمپس بھی لگاتے ہیں اور ورکشاپ بھی کرتے ہیں لوگوں کوآگاہی دینے کے لیے مختلف سیمینارز کاانعقاد بھی کرتے رہتے ہیں......اورآگاہی کے لیے سوشل میڈیا کااستعمال بھی کرتی ہوں۔"

"فیشن سے کتنالگاؤ ہے؟"

"جی......جی فیشن سے لگاؤ ہے اور میں وقت اور زمانے کے ساتھ چلنے والی لڑکی ہوں...... مجھے فیشن کرنا، بجنا سنورنا بہت اچھا لگتا ہے......لیکن میں اپنی معاشرتی اور روایتی حدود سے باہر نہیں نکلتی...... اور مجھے اصلی پھولوں کے گجرے بہت پسند ہیں۔"

اوراس کے ساتھ ہی ہم نے فائزہ محبوب سے اجازت چاہی۔

[illegible] بیوی کی بیماری کی وجہ سے وہ اپنی دکان منشی اکرم کے پاس گروی رکھتا ہے اور سود بھرتا ہے۔

زمین اور افشاں اسکول سے واپسی پر باتیں کرتی آتی ہیں، راستے میں مراد کا رکشہ کھڑا ہوتا ہے۔ وہ اس میں بیٹھ کہتی ہے، میں تو رکشہ چلاؤں گی۔ اسی وقت سامنے والے گھر کا دروازہ کھلتا ہے، مراد کے باہر نکلنے پر دونوں بھاگ جاتی ہیں۔ زمین اپنا بیگ بھول جاتی ہے۔

گھر پہنچ کر بیگ کا خیال آتا ہے۔ وہ ماں سے کہتی ہے کہ کتا پیچھے لگ گیا تھا، بیگ گر گیا راستے میں۔ فرخ کے ہمراہ ثمینہ اسے بیگ لینے بھیجتی ہے لیکن وہاں رکشہ نہیں ہوتا۔ فرخ کہتا ہے کہ وہ لا دے گا، رکشہ والا اس کا استاد ہے۔

مراد اس کا بیگ گھر دے جاتا ہے لیکن بیگ کھولنے پر اسے زمین کا نام پتا چل جاتا ہے۔ وہ زمین کے بہن بھائی کو پیسے دیتا ہے مونگ پھلی کھانے کے لیے۔

وہ فرخ کے گھر جاتی ہے۔ فرخ کے کمرے کے دروازے میں آٹومیٹک لاک لگا ہوا ہے، وہ بند ہو جاتا ہے۔ زمین ایک دم چیختی ہے۔ ثمرین جو بہن کو بلانے آتی ہے اس کی چیخ سن کر گھر سے باہر نکلتی ہے، جہاں خالی آ رہی تھیں، وہ ان کو بتاتی ہے۔

راحت جبیں

زندگی ہم تجھے گزار آئیں گے



سی اکرم، انور حسین کے گھر آتا ہے جہاں زرمین کو دیکھ کر اس کی نیت پھسل جاتی ہے۔ وہ اس کو پانچ سو روپے دے کر جاتا ہے اور انور حسین سے اس کا رشتہ مانگتا ہے۔ انور حسین انکار کر دیتا ہے۔

ہوٹل میں مراد کو انور حسین ملتا ہے، وہ اسے اپنے رکشہ پر گھر چھوڑ دیتا ہے۔



زمین افشاں اور ان کی امی کے ساتھ بازار جاتی ہے جوتا خریدنے، وہاں مراد اسے دیکھتا ہے وہ جس چیز کو دیکھتی ہے، ہاتھ میں لے کر وہ سب خرید کر اس کے گھر دے جاتا ہے۔
افشاں رکھ لیتی ہے لیکن زمین ڈر کے مارے ثمینہ کو سب بتادیتی ہے۔
مراد کاکے سے کہتا ہے کہ وہ شادی کرنا چاہتا ہے۔ کاکا کہتا ہے کہ وہ اور منشی رشتہ لے جائیں گے۔
ملک صاحب کے بیٹی کی شادی میں پھاتا اور رشیداں کام کر رہی ہیں۔
ثریا کو تھرکتا دیکھ کر رشیداں کو غصہ آیا ہے۔
زمین پانچ سو کی ٹیوشن پڑھانے لگتی ہے۔ انور حسین ثمینہ کے منع کرنے کے باوجود اجازت دے دیتا ہے۔ وہ نمبردار کے گھر بھی ہو آتا ہے۔
ثریا ملک صاحب کے گھر سے کھانا چوری کر کے لے کر آتی ہے۔ وہاں اس کی ملاقات بشیر سے ہوتی ہے۔
رشیداں کو ملک صاحب کے گھر سے چاول ملتے ہیں۔ رفیق اسے گالیاں بکتا ہے۔
مراد کو بخار ہو جاتا ہے۔ کاکا اسے دیکھنے آتا ہے اور مشورہ دیتا ہے کہ اسے اب شادی کرلینی چاہیے۔ وہ انور حسین کی بیٹی زمین کا کہتا ہے۔ کاکا رشتے کے لیے منشی کو لے جانے کا بھی کہتا ہے۔ منشی ہامی بھر لیتا ہے۔
مراد اور کاکا، انور حسین کے گھر منشی کا انتظار کر کے چلے جاتے ہیں۔ منشی بھی وہاں پہنچ جاتا ہے۔ اسے پتا چلتا ہے کہ مراد کو بھی یہیں آنا تھا تو وہ انور حسین سے کہتا کہ تو نے یا تیری بیٹی نے مراد کو پھنسایا ہے۔
مراد منشی کو گھونسا مارتا ہے۔ اس کی ناک سے خون نکلتا ہے۔ کاکا زبردستی مراد کو لے جاتا ہے منشی بھی دھمکیاں دیتا چلا جاتا ہے۔
مراد فرخ کو بتاتا ہے کہ وہ زمین کے لیے رشتہ لے گیا تھا۔ اور منشی کا بھی بتایا ہے۔ فرخ صدمے سے وہاں سے آجاتا ہے۔
ثریا بشیر سے ملنے باغ میں جاتی ہے وہ دوبارہ رشتہ لانے کی بات کرتا ہے۔
رشیداں ثریا کے لیے رشتہ دیکھتی ہے وہ لوگ آئے بیٹھے تھے کہ ثریا بشیر سے مل کر آتی ہے وہ انکار کر کے چلے جاتے ہیں۔ افشاں زمین کو زبردستی مراد کی گلی سے لے کر آتی ہے مراد کے ملنے پر اسے خوش خبری سناتی ہے کہ زمین کے ابا مراد کو ہاں کہنے والے ہیں۔
فرخ اپنی ماں سے زمین کی بات کرتا ہے وہ اسے ڈانٹ کر چپ کرادیتی ہیں۔ وہ غصے میں زمین کے گھر جاتا ہے جہاں افشاں اسے زمین کی شادی کی خبر سناتی ہے۔
منشی انور حسین سے پورے پیسے دینے کا کہتا ہے۔ وہ پریشان گھر آتا ہے ثمینہ اسے کہتی ہے کہ فوراً مراد سے زمین کا نکاح کردو، انور حسین منشی سے کچھ وقت مانگ لیتا ہے۔
رفیق رشیداں سے کہتا ہے کہ اسے اسپتال لے جائے۔ کیوں کہ اس کے زخم پک رہے تھے۔ زمین ٹیوشن پڑھانا چھوڑ دیتی ہے۔ مراد گھر پہنچتا ہے تو اس کا سامان باہر پڑا ہوتا ہے۔
کاکا اس کے گھر میں رنگ وروغن کروادیتا ہے۔ فرخ زمین کو مراد سے شادی نہ کرنے کا کہتا ہے۔ زمین اسے گھر سے بھگا دیتی ہے۔ دروازے پر مراد آتا ہے۔ اس وقت ثمینہ اور افشاں کی امی بھی آجاتی ہیں۔ مراد بچوں کے لیے پزا لے کر آتا ہے۔ ثمینہ کہتی ہے کہ زمین وہ تیرا بہت خیال رکھے گا، بڑے دل والا ہے۔ وہ ثمینہ سے زمین کو بازار لے جانے کا کہتا ہے۔ افشاں اور اس کی امی کے ساتھ ثمینہ، زمین کو بھیج دیتی ہے۔ اسی دوران منشی آجاتا ہے، ثمینہ اسے دروازے سے ہی ٹرخا دیتی ہے۔ منشی کو گلی سے نکلتے ہوئے مراد کا رکشہ نظر آتا ہی، وہ انتقامی کارروائی کا سوچتا ہے۔
رشیداں کے ٹوکنے پر ثریا اس پر گرم چائے پھینک دیتی ہے۔ رفیق کے زخم سڑ جاتے ہیں۔ رشیداں اس کے بھائی کو

بلائی ہے، وہ اسے لاہور لے جاتا ہے لیکن رفیق مر جاتا ہے۔
زمین کے گھر میں بارات کے استقبال کی تیاریاں ہو چکی تھیں۔ زمین دلہن بن چکی تھی۔ انور حسین بارات کا انتظار کر رہا تھا کہ کاکا آ کے بتاتا ہے کہ مراد کو پولیس پکڑ لے گئی۔
شادی کے گھر میں یہ خبر بجلی بن کر گرتی ہے کہ مراد کو پولس پکڑ کر لے گئی ہے۔
رفیق کے مرنے کے بعد اس کا بھائی شفیق اپنے بیٹے سے ثریا کا نکاح کرنے پر تیار ہو جاتا ہے۔ ثریا کو عین وقت پر پتا چلتا ہے کہ اس کی شادی بشیر سے نہیں کسی اور سے ہو رہی ہے تو وہ غصہ کرتی ہے۔ رشیداں کے دیے سوٹ کو آگ میں جھونک دیتی ہے اور بشیر سے رابطہ کر کے عین شادی کے وقت گھر سے بھاگ جاتی ہے، اقصیٰ کو دھمکا کر جاتی ہے۔
نکاح کے لیے آنے والوں کو پتا لگتا ہے تو سب باتیں بناتے ہیں۔
منشی، انور حسین کو دھمکیاں دیتا ہے کہ وہ اس کے سارے بچوں کو اور اسے جیل بھیج دے گا، وغیرہ وغیرہ۔ انور حسین مان جاتا ہے۔ ثمینہ اور خدیجہ زمین سے کہتی ہیں کہ وہ بھاگ جائے لیکن زمین باپ کی حالت دیکھ کر منشی سے شادی پر رضا مند ہو جاتی ہے۔

ساتویں قسط

خبر جنگل میں آگ کی طرح پھیلی تھی۔
ثریا بشیر کے ساتھ بھاگ گئی، عین نکاح کے وقت...... پورا گاؤں اُمڈ آیا۔ عورتیں کمروں میں گھسی آ رہی تھیں۔ صحن مردوں سے بھر گیا۔
خجالت و غیرت سے فیاض شفیق کا چہرہ کالا پڑ گیا۔ بھلے وہ باپ کی خواہش کے احترام میں یہاں موجود تھا۔ مگر ثریا اس کی تایا کی بیٹی اور ہونے والی بیوی تھی۔
وہ ثریا کے پیچھے جانے کے بجائے بس یہاں سے غائب ہو جانا چاہتا تھا۔
رشیداں نے اقصیٰ کو پیٹ ڈالا۔
''جب جا رہی تھی تب کیوں نہ بتایا۔''
''آپا نے کہا تھا، کسی کو بتایا تو جان نکال دوں گی۔'' اقصیٰ دیوار کے ساتھ لگی تھر تھر کانپ رہی تھی۔
''یہاں ہوتی تو تجھے کچھ کہتی۔''
امینہ نے گہری سانس بھری۔ شوہر کی خواہش تھی تو بیٹے کو لے کر آ گئی، ورنہ ثریا ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ جو بھی تھا...... جیسے بھی تھا ایک ان چاہا رشتہ خود بخود جڑنے سے پہلے ہی ختم ہو گیا۔
''کون سا آج کا قصہ ہے، اس سے تو اچھا تھا باپ جیتے جی دو بول پڑھوا دیتا۔ ساری دنیا تماشا دیکھتی رہی۔ کبھی باغوں میں، کبھی کھیتوں میں۔''
''چھلیے ......لوگ کیا اندھے ہوتے ہیں۔''
عورتوں کی بھنبھناہٹیں ......امینہ نے شکر کا کلمہ کئی بار دل ہی دل میں پڑھا۔
''زیادہ دور نہیں گئے ہوں گے۔'' کچھ جذباتی نوجوانوں نے غیرت کھا کر موٹر سائیکل گاؤں کے بیرونی رستے پر دوڑا دیں۔
''واپس آ بھی گئی تو کیا......''
فیاض نے زمین پر نظریں گاڑ دیں۔ جہاں گلاس سے شربت چھلک کر گرا تھا۔ وہاں چیونٹیاں ہی چیونٹیاں جمع تھیں۔

اس نے سر اٹھا کر چیختے چلاتے باپ کو دیکھا۔
"سوتیلی تھی سوتیلی...... اپنی ماں ہوتی تو کچھ اچھا برا سکھاتی۔ میرے مرے ہوئے بھائی کی ایک نشانی نہ سنبھال سکی۔ یہ بدبخت عورت!"
"رہن دے بھرا......" گھڑے سے پانی کا کٹورہ بھرتی رسولاں کو تاؤ آ گیا۔ تو مردوں کی پروا کیے بغیر برس پڑی۔
"ہر کسی کا بس اس نمانی پر نکلتا ہے۔ کبھی ماں بن کے ایک بول بھی کہا تو اس بے چاری کے گٹے سیک دیے تمہارے بھائی نے۔ اتنا غیرت والا تھا تو اپنی زندگی میں دو بول پڑھوا کے جاتا۔"
"چل فیاض! اب یہاں کچھ نہیں بچا۔" کھسیانا ہو کر شفیق کھڑا ہو گیا۔
فیاض نے کھڑے ہونے میں ایک سیکنڈ نہیں لگایا تھا۔

☆☆☆

تین گاؤں گزرنے کے بعد بشیر نے موٹر سائیکل سڑک کے کنارے روکی۔ سبز شیٹ کے سائے میں ریڑھی کھڑی تھی۔ خوش ذائقہ املی، آلو بخارے کا شربت...... ایک بنچ دو کرسیاں...... کیکر کے پیلے پھولوں سے اٹی تھیں۔ پاس سے گزرتا پکا نالا ٹیوب ویل کے صاف پانی سے بھرا کھیتوں کو سراب کر رہا تھا۔ کنارے پر اگے سنبل کے درخت خالی ہاتھ زمین کی گود نارنجی مائل سرخ پھولوں سے بھر چکے تھے۔
ریڑھی پر شربت کے مٹکے سرخ کپڑے سے ڈھکے تھے تاکہ ان کی ٹھنڈک کم نہ ہو۔
"بشیر! ہمیں یہاں نہیں رکنا۔ اگر کوئی پیچھے آ گیا......" ثریا نے گھبرا کر خالی رستے کو دیکھا۔
"پیچھے باپ اور بھائی آتے ہیں اور باقی لوگ...... ایک دو گاؤں کے بعد واپس مڑ گئے ہوں گے۔"
دو گلاس شربت کا کہہ کر وہ نالے کے کنارے بیٹھ کر ہاتھ منہ دھونے لگا۔ دوپٹے سے آدھا چہرہ ڈھانپتے، بیگ سنبھالتے ثریا کرسی ریڑھی کے عقب میں کھینچ کر بیٹھ گئی۔
بشیر نے منہ ہاتھ دھو کر ثریا کی سمت دیکھا اور اوک میں پانی لے کر اس پر اچھال دیا۔ وہ ہڑبڑا کر مڑی۔ بشیر کو شرارت سے مسکراتا دیکھ کر اس کے تنے اعصاب ڈھیلے ہوئے۔ راستوں میں اڑتی خدشوں کی دھول مٹی چند چھینٹوں سے بیٹھ گئی۔
اس نے پہلی بار خود کو آزاد محسوس کیا۔
وہ تیار تھی۔ اپنی زندگی، اپنی مرضی اور من پسند شخص کے ساتھ جینے کے لیے۔
اب اسے اپنی معمولی معمولی خواہش کے لیے دوسروں کے ساتھ ہنسی بانٹنے، ان کا مکروہ لمس سہنے اور لذت کام و دہن کی تسکین کے لیے کسی کو لبھانے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔
وہ تھا اس کے ساتھ...... ہر قسم کے خدشے کو جھٹک کر اس نے شربت کا گلاس تھامتے بشیر کو سر اٹھا کر دیکھا۔ اس کے سانولے چہرے پر پانی کے قطرے بہہ رہے تھے۔ اس کی چمکتی آنکھوں میں بلا کی کشش تھی۔
بشیر نے گلاس ہلایا، جس پر ثریا کا ہاتھ رک گیا تھا۔
ثریا نے ہنس کر گلاس لے کر گھونٹ بھرنا چاہا مگر اس پر تیرتے سیاہ بیجوں کو دیکھ کر بدمزا ہو گئی۔ اسے تخم بالنگا کبھی اچھا نہیں لگا تھا۔ مگر زندگی نے بھی قسم کھائی تھی، اسے جو بھی ملے گا، آدھا ادھورا ہی ملے گا۔
اس نے مایوسی سے بشیر کو دیکھا۔ وہ ایک ہاتھ میں نارنجی پھول مسلتا، دوسرے میں شربت کا گلاس تھامے، شربت والے سے بات کر رہا تھا۔

دستک بہت زور سے ہوئی تھی۔
مگر کسی میں اتنی ہمت نہ تھی کہ اٹھ کر دروازہ کھولے۔
دروازے کے دوسری طرف کوئی عفریت تھا جو ان سب کو نگلنے آ رہا تھا۔
نرمین کچھ اور باپ کی پشت سے لپٹ گئی۔
انور حسین پھٹی پھٹی نظروں سے بند دروازے کو گھورتا رہا۔
''نرمین چلی جا......'' ماں نے آخری التجا کی۔
نرمین نے نفی میں گردن ہلا دی۔
خدیجہ ایک گہری سانس بھر کے آگے بڑھیں اور کنڈی ہٹا دی۔
جب سب ہی خودکشی کرنے کو تیار تھے تو وہ کیا کر سکتی تھیں۔
کاکا تیزی سے اندر آیا۔
''انور بھائی! میں مراد سے مل کر آیا ہوں۔ اس نے کچھ نہیں کیا۔ وہ بے گناہ ہے۔ یہ سارا منشی کا کھڑاک تھا۔ اس نے جان بوجھ کر مراد کو پھنسایا ہے۔ پر ہم اسے باہر نکال لیں گے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔''
کاکے کی آواز کے پتھر گہرے کنویں میں گر کر گم ہوتے رہے۔
کہیں سے کوئی آواز، کوئی تاثر نہ ابھرا۔
کاکا نے چونک کر ایک ایک کو دیکھا۔
زندہ انسان کہاں...... بت تھے۔
اپنی اپنی جگہ چپ چاپ، ایستادہ......
''کیا ہوا؟''
''کیا ہونا ہے...... آ رہا ہے منشی نکاح کے لیے۔'' خدیجہ خالہ تلخی سے گویا ہوئیں۔
''انور حسین......!'' کاکے نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ ''بھائی! تم کیسے مان گئے؟''
''یہ تمہارے سامنے ہی تو بیٹھا ہے، ہاتھ پاؤں چھوڑ کر۔'' خدیجہ غصے سے بولیں۔
''دماغ خراب تو نہیں ہو گیا۔ مراد مرا تو نہیں ہے، آ جائے گا واپس۔ تم کیسے اپنی پھول جیسی بچی کو اس شرابی کبابی کے ساتھ بیاہنے کو تیار ہو گئے؟'' کاکے کا دماغ ہی الٹ گیا۔
''منشی کی مرضی تھی، اس نے پھنسا دیا۔ منشی کی مرضی ہو گی، وہ واپس آ جائے گا۔ وہ بڑا ڈھاڈا بندہ ہے۔'' انور حسین بڑبڑایا۔
''اس ڈھاڈھے کی تو......'' کاکا نے عورتوں کی پروا کیے بغیر بے دریغ گالیاں دیں اور ساتھ ہی نرمین کو بازو سے پکڑ کر کھینچ لیا۔
''میرے بھائی کی منگ، اس کی امانت ہے۔ لے کر جا رہا ہوں۔''
''نہیں چاچا!'' نرمین نے خود کو چھڑایا۔ ''مجھے نہیں جانا۔''
''پتر! اس طرح مت کر۔ مراد تجھ سے بہت محبت کرتا ہے۔ مر جائے گا۔ میں تجھے اپنے ساتھ لے جاؤں گا، اپنے گھر میں رکھوں گا۔ مراد آیا تو وہیں سے رخصت کروں گا۔''
ثمینہ کی بجھی آنکھوں میں امید جاگی۔
انور حسین کی آنکھوں کی جوت اب بھی بجھی تھی۔

"مراد آ گیا تو ابو چلے جائیں گے۔ آپ کس کس کو بچائیں گے بھیا! میری قربانی سے میرے گھر والے بچتے ہیں تو میں یہ قربانی دینے کو تیار ہوں۔"

نرمین نے کمرے میں گھس کر کنڈی لگالی۔

کا کے کا سمجھانا، بجھانا، دھمکیاں کسی کام نہ آئیں کیونکہ اس کی دھمکیوں میں التجا تھی، منت تھی۔ وہ خوف نہ تھا جو منشی کی دھمکیوں میں تھا۔

خدیجہ کی بس ہوگئی۔

اب اس سے زیادہ برداشت نہ تھی۔

وہ ڈوبتے دل کو سنبھالتی گھر کی دہلیز سے نکل گئیں۔

وہ اس سے زیادہ اس گھر کے لیے کچھ نہیں کرسکتی تھیں۔

☆☆☆

کچن سے کھٹ پٹ کی آوازیں آرہی تھیں۔ خدیجہ کچن کی طرف مڑنے کو تھیں کہ نظروں کی گرفت میں چارپائی کے پاس پڑا وہ چھوٹا سا بیگ آیا جو فرخ لے کر گیا تھا۔

وہ تھکے تھکے انداز میں چارپائی پر بیٹھ گئیں۔

"مجھے بھی پانی پلادو۔"

"آپ کیا مراد کا ولیمہ کھانے چلی گئی تھیں۔" فرخ پانی کے گلاس سمیت کچن سے نمودار ہوا۔ لہجے میں ناراضی تھی۔

خدیجہ نے خاموشی سے گلاس لیا اور پانی پینے لگیں۔

فرخ کچھ لمحے کھڑا اپنی گردن کھجاتا رہا، پھر پاس ہی بیٹھ گیا۔

"تمہاری بہن کیسی تھی؟"

"ٹھیک ہیں۔" فرخ نے خالی گلاس ہاتھ میں لے لیا۔

"سب ٹھیک ٹھاک ہوگیا نا۔ نرمین کیسی لگ رہی تھی؟" فرخ نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

"کیسی لگے گی بے چاری۔ جس شادی میں خوشی کی جگہ مجبوری اور خوف ہو۔ وہ شادی والا گھر کم اور میت والا زیادہ لگتا ہے۔"

"اب یہ تو نہ کہیں۔ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔" فرخ کا حلق کڑوا ہوگیا۔

"وہ جو پسند کرتا تھا وہ بے چارہ تو تھانے میں بند ہے۔ نرمین کا نکاح تو اس بدمعاش منشی سے ہو رہا ہے۔"

گلاس فرخ کے ہاتھ سے گر کر کرچی کرچی ہوا۔

"م...... منشی......" اس نے بوکھلا کر ماں کو دیکھا۔

"اس مرن جوگے نے مراد کو تھانے میں بند کروادیا۔ گھر والوں کو وہ...... وہ دھمکیاں دیں کہ انور حسین حواس ہی کھو بیٹھا۔"

خدیجہ جیسے جیسے بتارہی تھیں۔ فرخ کے اپنے اوسان خطا ہونے لگے۔ پسینے پسینے ہوتے وجود کو سنبھالتا اضطراری انداز میں کھڑا ہوگیا۔

"کتنا چھپایا، کتنی راز داری برتی۔ پتا نہیں کس کم بخت نے جا کر منشی کو بتادیا۔ پھول جیسی بچی اس گینڈے کے پلے بندھ گئی۔ اللہ ایسا وقت کسی دشمن پر بھی نہ لائے۔" دل تو پہلے ہی بھرا تھا، وہ رونے بیٹھ گئیں۔

فرخ کا دل چاہا، وہ اسی نہر میں کود جائے جس کے کنارے اس نے منتی کی گاڑی روکی تھی۔ یہ تو سوچا ہی نہیں تھا، آگے کیا ہوگا۔ بس مراد سے حسد کیا تھا۔ اسی سے بدلہ لیا تھا۔ یہ تو سوچا ہی نہ تھا، نرمین کا کیا ہوگا۔

متوحش سے فرخ نے روتی ہوئی ماں کو دیکھا۔

''امی......امی......روک لیں۔ یہ مت ہونے دیں۔'' اس نے نیچے گرتے ماں کے گھٹنے تھام لیے۔

''سب کچھ کر کے دیکھ لیا، اب کچھ نہیں ہوسکتا۔''

''امی!ابو سے بات کریں۔'' اس نے ماں کے پیر پکڑ لیے۔

''اب کچھ نہیں ہوسکتا۔ اب تک تو نکاح بھی ہوگیا ہوگا۔''

اب اس سے نیچے زمین ہی تھی۔ کاش پھٹ جاتی اور وہ اپنے پچھتاوے سمیت اس میں دھنس جاتا۔ اس نے خود اپنے ہاتھوں نرمین کی زندگی برباد کردی تھی۔

☆☆☆

''یہ کیا کہہ رہے ہو بھائی!'' تھانے دار نہیں تھا، سپاہی نے ایک ہرے نوٹ کے بدلے پھر ملاقات کروادی۔

''تیری گرفتاری نے انہیں ڈرادیا۔ تیری نرمین نے کہا وہ اپنے گھر والوں پر مصیبتیں نہیں ڈال سکتی۔'' کاکے نے سر جھکا کر بتایا۔

''اور جو اپنی جان عذاب میں ڈال رہی ہے وہ۔'' مراد تڑپ گیا۔

''کاکا! تمہیں اسے روکنا چاہیے تھا۔ یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ اس نے کیسے یہ فیصلہ کرلیا۔ یہ نری خودکشی ہے۔''

''فیصلہ اس نے نہیں، حالات نے کروایا ہے۔'' کاکے نے دل گرفتی سے کہا۔

''اور حالات ہی مجھ سے منشی کا قتل کروائیں گے، میں لکھ کر دے رہا ہوں۔''

مراد نے غصے سے زمین پر لکیر کھینچی۔

''چپ کر......'' کاکے نے گھبرا کر روکا۔

''کاکا! میں مر جاؤں گا۔ اتنی اندھیر نگری ہے کہ جس کا داؤ چلے دوسرے کو رول کر رکھ دے۔'' مراد نے سر کے بال نوچ ڈالے۔

''مراد! خود کو سنبھال۔'' کاکے کے لہجے میں بے بسی در آئی۔

مراد تیر کی طرح اٹھ کر کھڑکی کے پاس گیا۔

''اپنے صاحب کو بلاؤ، جب میں نے کچھ کیا نہیں تو کوئی کیسے مجھے اس طرح بند کرسکتا ہے۔'' سپاہی کھڑکی سے دور ہٹا۔

''چل اوئے، باہر نکل۔ ہزار کے نوٹ میں اتنی ملاقات ہوتی ہے۔ اپنی نوکری خطرے میں ڈالی ہے۔'' سپاہی نے کاکے کو باہر نکال کر پھر سے کنڈا لگادیا۔

کاکا کھڑکی کے پاس جھکا۔

''فکر نہ کر مراد! میں علاقے کے معتبر لوگوں کو اکٹھا کرتا ہوں۔ تھانے دار نے بات نہ سنی تو سا ہیوال ایس پی کے پاس تفتیش رکھواؤں گا۔ پر میرا وعدہ ہے، اندر نہیں رہنے دوں گا۔''

''دیر ہوجائے گی۔'' مراد کے لہجے میں خوف کنڈلی مار کر بیٹھ گیا۔

مراد کی بے بسی سرسراہٹ بن کے اس کے ہاتھ پیر میں دوڑنے لگی۔

☆☆☆

کسی جھکی ہوئی شاخ کو
پکڑ کے درخت سے نوچ لوں
جہاں جہاں، ننھی منی چیونٹیاں
رزق تلاش کرتی پھرتی ہیں
کیا وہاں وہاں پاؤں رکھ رکھ کے چلوں
اور کیا؟
ہمیشہ ہمیشہ کے لیے
نرم اور دھیمے لہجے میں بولنا چھوڑ دوں
بولو......! آخر کیا کروں؟

(فرحت عباس شاہ)

اس کے اندر کی گھٹن وجود کی دیواروں سے سر پٹخ پٹخ کر سوال کر رہی تھی اور وہ بے حس و حرکت چیونٹیوں کی قطار کو بنا پلک جھپکے دیکھ رہا تھا۔

(پلک جھپک لیتا تو زندہ ہونے کا احساس نہ ہوتا)

وہ تو چاہتا تھا، اسی دیوار سے ٹیک لگائے لگائے مر جائے۔

جو رات قید خانے میں اتری تھی، اس کی کبھی کوئی سحر نہ ہو۔

وہ یہاں سے اب کبھی باہر نہیں جانا چاہتا تھا۔

باہر کی دنیا ظالم اور کٹھور تھی۔

اس کے بنجر ہاتھوں میں خوشی کی ننھی سی کونپل مرجھا گئی۔

اسے تو لگا تھا اس نے جینے کا تاوان بھر دیا ہے۔ بدلے میں اسے مسکراہٹ دان کر دی گئی تھی۔ اس کے من کی ہتھیلیوں پر امید کا نیا چراغ جل رہا تھا۔ مگر یہ نہیں جانتا تھا، آندھیوں کا رخ اسی کی سمت کر دیا گیا ہے۔

''نرمین......!'' کسی چیونٹی نے پیر کے انگوٹھے پر کاٹ لیا تو لبوں سے سسکاری نکلی۔ وہ اس کی محبت کے آسمان کا خوب صورت چاند تھی۔

جسے اماوس کی رات نگل گئی۔

مراد نے باہر دن کی پھیلتی روشنی کو محسوس کیا، ایک ایسا دن جس کے طلوع ہونے کی چاہ اس نے کبھی نہیں کی تھی۔

وہ دونوں بازوؤں میں چہرہ چھپا کر رو دیا۔

بالکل بچوں کی طرح......

''مرد روتے نہیں ہیں۔''

مگر مراد نے بڑے بڑے مردوں کو تین موقعوں پر بچہ بنتے دیکھا تھا۔

جب ماں اور باپ کھوئے ہوں......

اور جب تقدیر محبت چھین لے......

☆☆☆

رات سخت بے آرامی میں گزری تھی۔ اٹھنے کا من ہی نہ تھا پھر بھی خدیجہ نے اٹھ کر نماز پڑھی۔ نرمین کی زندگی میں آسانی کے لیے بہت سی دعائیں کیں اور بے دلی سے اٹھ کر پراٹھوں کے لیے آٹا گوندھا۔ فرخ کے والد کو ناشتہ کروا کے دفتر روانہ کیا۔ فرخ تب بھی کمرے سے باہر نہ آیا۔

انہیں خود ہی جا کر فرخ کو جگانا پڑا۔

مگر اس کی حالت دیکھ کر پریشان ہو گئیں۔

بخار میں دھت...... وہ جیسے ساری رات کا جاگا تھا۔

''ماں صدقے...... ماں واری...... اتنی طبیعت خراب تھی تو مجھے کیوں نہ جگایا۔''

''امی جائیں۔''

''اٹھو، کچھ کھا لو۔ میں دوا دیتی ہوں۔ منہ ہاتھ دھوؤ، میں کچھ لاتی ہوں۔ اتنا تیز بخار ہے، تمہارے ابو بھی چلے گئے۔'' وہ عجلت و گھبراہٹ میں کہتی دروازے کی طرف مڑیں۔

''بخار نہیں ہے امی! احساس ندامت ہے۔ میرا دل چاہتا ہے، میں مر جاؤں۔''

خدیجہ نے رک کر حیرت و پریشانی سے بیٹے کو دیکھا۔

''کس بات کی ندامت؟''

''سب کچھ میری وجہ سے ہوا ہے۔'' وہ ایک دم اٹھ بیٹھا۔ ضمیر کا بوجھ اٹھاتے اٹھاتے ایک ہی رات میں ادھ موا ہو گیا تھا۔

''کیا تمہاری وجہ سے ہوا ہے؟'' خدیجہ پاس آئیں۔

''میں نے منشی کو بتایا تھا، دونوں کے نکاح کا۔'' دھیمے لہجے میں بلا کا احساس ندامت...... اور احساس شرمندگی تھا۔

بے اختیار خدیجہ کا ہاتھ اٹھا۔

فرخ کو لگا یہ ایک تھپڑ تو بہت کم ہے۔ خدیجہ کو اسے اس سے زیادہ مارنا چاہیے تھا۔

مگر وہ تو بیٹھ کر رونے لگی تھیں۔

فرخ چپ چاپ انہیں دیکھتا رہا۔

''یہ کیا کیا تم نے فرخ! یہ کیا کیا......؟''

''میں تو بس شادی روکنا چاہتا تھا۔'' وہ منمنایا۔

''روک دی؟'' وہ غصے سے چلائیں۔ ''اب نرمین کی زندگی میں جو بھی ہو گا، تمہاری وجہ سے ہو گا۔ تم نے اس کی زندگی برباد کر دی۔ شرم آ رہی ہے تمہیں اپنا بیٹا کہتے ہوئے۔''

''امی! میں یہ تو نہیں چاہتا تھا۔''

''دفع ہو جا...... میری نظروں سے دور ہو جا۔'' وہ چلائیں۔

فرخ کے پاس بھی یہاں رکنے کا کوئی جواز نہ تھا۔ نہ مزید ماں کا سامنا کرنے کی ہمت...... تب ہی اٹھ کر چلا گیا۔

''میں نے غلطی کی ہے، تو میں ہی سدھاروں گا۔ میں چھوڑوں گا نہیں اس منشی کو۔'' جوان خون جوش مار رہا تھا۔ یہ تو نہیں پتا تھا کہ کرے گا کیا...... بس اڑتا ہوا گیا مگر دروازے پر تالا تھا۔

منشی، نزمین کو لے کر کہاں چلا گیا تھا۔
کسی انہونی کے احساس سے فرخ کا دل لرز گیا۔
تب ہی ساتھ والے گھر کا دروازہ کھلا اور کوئی باہر نکلا۔
فرخ تیزی سے مڑا۔
وہ بھی فرخ کو دیکھ کر رک گیا۔
''بھائی! یہ...... یہ لوگ کہاں گئے؟''
اس مرد نے غور سے فرخ کو دیکھا۔
''وہ منشی اکرم اور اس کی فیملی......'' فرخ گڑبڑا گیا۔
''لگتا ہے تمہیں کچھ بھی نہیں پتا۔''
''کیا؟'' سوال صرف فرخ کے اندر سے اٹھا تھا۔ خود وہ ٹکر ٹکر سامنے والے کی شکل دیکھتا رہا۔

☆☆☆

صبح یوں نمودار ہوئی، گویا زندگی نے نیا جنم لیا ہو۔
دردزہ میں مبتلا رات تھک ہار کر آنکھیں موند گئی تو نزمین نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھولیں۔ ساری رات ہتھیلیوں پر مہندی کے رنگوں سے لکھے مراد کے نام کو تکتے، کب آنکھ لگی احساس ہی نہ ہوا۔ شاید قدرت ان کے تھکے ہوئے اعصاب کو سکون دینے کے لیے تھوڑا مہربان ہوئی تھی۔
نزمین نے گردن گھما کر دیکھا۔ اس کے بہن بھائی ایک دوسرے کے ساتھ لپٹے سو رہے تھے۔ کسی کو اتنا ہوش نہ تھا کہ رات میں ان پر چادر ہی ٹھیک کر دیتا۔
''رات......'' نزمین نے ہڑبڑا کر کھلے دروازے سے باہر پھیلے دن کو دیکھا اور بھاگ کر باہر آئی۔ اس کے ماں باپ اب بھی کھلے آسمان تلے بیٹھے اتنی ہی حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔
جس دستک کے لیے انہوں نے ساری رات خوف اوڑھا تھا، وہ تو ہوئی ہی نہ تھی۔
جس لمحے کے ڈر سے ان کی روح مردہ ہو رہی تھی۔ وہ آیا ہی نہیں تھا۔
''امی!'' نزمین نے پکارا تو ثمینہ نے بوکھلا کر نزمین کو دیکھا پھر انور حسین کو...... اور انور کو کندھوں سے پکڑ کر جھنجوڑ ڈالا۔
''دیکھیں نمو کے ابو! منشی تو آیا ہی نہیں۔ ساری رات گزر گئی۔ کوئی معجزہ ہو گیا۔''
''معجزے غریبوں کے لیے نہیں ہوتے۔ آ جائے گا ابھی۔'' انور حسین نے سپاٹ انداز میں دروازے کو دیکھا۔
''کیوں، اللہ غریبوں کا نہیں صرف امیروں کا ہے۔ اللہ نے بندوبست کر دیا ہوگا۔ جب کوئی نہیں سنتا، تو وہ سن لیتا ہے۔ اس نے بھیج دیا ہوگا موت کا فرشتہ۔''
فرخ بھاگتا ہوا، ہانپتا کانپتا گھر میں داخل ہوا۔ دروازے کی کنڈی نہیں لگی تھی اور اسے دستک دینے کا خیال بھی نہیں آیا تھا۔
''اللہ نے موت کا فرشتہ ہی بھیجا ہے چاچی!''
''مر گیا؟'' ثمینہ کو لگتا تھا، موت ہی وہ اٹل حقیقت تھی جو منشی کا رستہ روک سکتی تھی۔

☆☆☆

کھڑا ہو۔" تھانے دار کے حکم پر مراد اسی شندگی سے کھڑا ہو گیا۔

تھانے دار نے اسے سرتاپیر دیکھا۔

"میں تو تجھے معمولی سالڑکا سمجھتا تھا، جسے اکرم صاحب نے اپنی دشمنی میں پھنسا دیا۔ پر تو تو کوئی بڑا ہی چھٹا ہوا بدمعاش نکلا۔ کتنوں پر مشتمل گروہ ہے تمہارا۔"

"سر! کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔"

"اپنے ساتھیوں کو بھیج کر منشی اکرم پر قاتلانہ حملہ کروایا ہے تم نے۔"

"وہ مر گیا......" مراد نے یہ تو سنا ہی نہیں تھا کہ تھانے دار نے اس پر الزام کیا لگایا تھا (کوئی کسی کو اتنا کیوں ستائے کہ اس کا مر جانا ہی خوشی کی نوید ہو)

تھانے دار کا ڈنڈا مراد کے پیٹ میں پوری قوت سے لگا۔

مراد درد سے ادھ موا ہو کر گھٹنوں کے بل گرا۔

☆☆☆

اور منشی اکرم کی بیوی ہاسپٹل میں آدھا منہ چادر میں چھپائے بیان دے رہی تھی۔

"میں نہیں جانتی، وہ کون ہیں؟ میرے شوہر سے ملنے آئے تھے۔ جھگڑا ہوا تو......"

اس کی آواز رندھ گئی۔ پاس بیٹھی مریم نے ماں کا بازو جکڑا ہوا تھا۔

"کتنے تھے؟"

"دو۔" مریم کے منہ سے نکلا۔

"ایک......" نسیمہ نے بھی ساتھ ہی جواب دیا۔

پھر دونوں ماں بیٹی نے ایک دوسرے کو دیکھا۔

تب ہی نسیمہ کے بھائی آ گئے۔

"آپ نے اصل بات کیوں نہ بتادی۔" مریم نے ناراضی سے ماں کو دیکھا۔

"چپ رہو۔" انہوں نے ڈانٹا۔

"وہ میرے باپ کو مارنے والا تھا۔"

"تمہارا باپ مجھے طلاق دے رہا تھا۔ گھر سے نکال رہا تھا۔ سب بھول گئی کم بخت۔ کل اس وقت کیا ہوا تھا؟" نسیمہ نے دانت پیسے۔

اور مریم کو اچھی طرح یاد تھا، کل اسی وقت کیا ہوا تھا۔

☆☆☆

نسیمہ کی طبیعت بہت دنوں کے بعد بحال ہوئی تھی۔ اس کے بھائی آئے تھے۔ تو پراپر علاج شروع ہوا۔ منشی تو اسے روگن بنا کر بستر پر ڈال کر دوسری شادی کے چکر چلا رہا تھا۔ علاج شروع ہوتے ہی دنوں میں فرق پڑا۔ آج بہت دنوں کے بعد اس نے کپڑے بدلے، بال بنائے۔ دیسی مرغی بھونی...... بہت سے میوے ڈال کر زردہ بنایا۔ بچے جیسے کھل اٹھے۔

بڑے عرصے بعد گھر...... گھر لگنے لگا تھا۔

"جیسے ہی تمہارے ابا آئیں، کھانا لگا دینا۔ سب مل کر کھائیں گے۔" سارا کام ختم کر کے، بڑی بیٹی کو ہدایات دیتی وہ کمرے میں آرام کی غرض سے آ گئی۔

"بس میرے مالک، اسی طرح صحت و تندرستی والی زندگی عطا کرنا۔"

اس کا رواں رواں شکر گزار ہو رہا تھا۔ تب ہی منشی کمرے میں داخل ہوا۔ حمام سے نہا دھو کر شیوا کروا کے، خوشبوؤں میں بسا بڑی عجلت میں تھا۔

تب ہی نہ صاف ستھری بیوی نظر آئی، نہ اس کے چہرے پر کھلی مسکراہٹ۔

"ابو! کھانا لگادوں۔" مریم آئی۔

"کیا پکا ہے؟" آئینے میں اپنا جائزہ لیا۔ مریم نے خوش ہو کر مینیو بتایا۔

"کیا بات ہے۔" منشی نے آئینے میں پہلی بار بیوی کو دیکھا۔

"تمہیں کیسے پتا چلا، مہمان آرہا ہے۔"

"کون آرہا ہے؟" نسیمہ نے بے حد حیرت سے پوچھا۔

"پتا چل جائے گا۔ اپنی ماں کا سامان اس کمرے سے نکال کر اپنے کمرے میں رکھ لو۔" منشی کے عجیب سے حکم پر ماں بیٹی ہکا بکا رہ گئیں۔

"کیوں؟"

"کیونکہ یہاں تیری نئی ماں آرہی ہے۔" کس اطمینان اور سکون سے اس نے بم پھوڑا۔ دونوں ریزہ ریزہ ہو کر بکھریں۔

"کیا کہہ رہے ہیں؟" نسیمہ تڑپ کر بستر سے اٹھی۔

"عربی تو نہیں بولی۔ نکاح کر کے لا رہا ہوں۔ کمرہ خالی کردو۔ اب تم سے تو گھر سنبھالا نہیں جا رہا۔ وہ کم عمر ہے، گھر بھی سنبھال لے گی اور تمہاری خدمت بھی کرے گی۔"

"خواہ مخواہ بہانے نہ ڈھونڈیں۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ گھر بھی سنبھال سکتی ہوں اور آپ کو بھی۔" نسیمہ نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھنا چاہا تو منشی نے بری طرح دھتکار دیا۔

"میں نے تمہاری بکواس نہیں سننی۔ سامان اٹھا اور دوسرے کمرے میں مر...... اور شکر کر تجھے طلاق نہیں دے رہا۔"

"طلاق دے گا...... چار بچوں کی ماں کو طلاق دے گا۔" نسیمہ پھر سامنے آئی۔ منشی کے جھٹکے سے نسیمہ کی کمر کا مہرہ ہل گیا۔ مگر درد کی پروا کسے تھی، یہاں تو گھر اور گھر والا بچانے کے لالے پڑ گئے تھے۔

"میرے متھے نہ لگیں، ورنہ دے بھی دوں گا۔" وہ بھڑکا۔

"دے پھر...... پہلے طلاق دے پھر دوسری لے کر آنا۔" نسیمہ میدان میں اتر آئی۔ باہر بیل ہونے لگی۔

مریم باہر کی طرف بھاگی۔ شاید کوئی مدد کو آیا ہو۔

منشی کا طمانچہ پورے زور سے نسیمہ کے گال پر پڑا۔

"زبان بند کر لے...... ورنہ ابھی گھر سے نکال دوں گا۔"

"نکال پھر......"

مریم نے دروازہ چوپٹ کھول دیا۔

"گڑیا! نسیمہ پھوپھی سے ملنا ہے۔" آنے والے نے مسکرا کر مریم کے سر پر ہاتھ رکھا۔

"بھیا! ابا، امی کو مار رہا ہے۔" رشتہ دور کا تھا مگر شناسا سا صورت دیکھتے ہی مریم بلکنے لگی۔

"کیا کہہ رہی ہو؟" اس نے حیران ہو کر دہلیز کے اندر قدم رکھے۔ مانا سالوں ملاقات نہ ہوئی تھی مگر پھوپھی اس حال میں رہتی تھی، اس کا تو اندازہ بھی نہ تھا۔ ثریا نے بے زار ہو کر بشیر کو دیکھا۔

تب ہی منشی، نسیمہ کو بالوں سے گھسیٹتا باہر آیا۔

منشی کے دھکے پر وہ زمین پر گرتی تو یقیناً ساری عمر کے لیے معذور ہو جاتی مگر بشیر نے سنبھال لیا۔ بھلے وہ بشیر کی سگی نہیں، دور پار کی پھوپھی تھی مگر حالت دیکھ کر بشیر کا دماغ ہی الٹ گیا۔

"ابو دوسری شادی کر کے امی کو گھر سے نکال رہے ہیں۔" مریم نے دہائی دی۔ باقی بچے اسکول گئے ہوئے تھے اور وہ اکیلی تھر تھر کانپ رہی تھی۔

"ہاں...... کر رہا ہوں دوسری شادی۔ کون روکے گا مجھے۔" منشی نے سینہ پھلایا۔

"دوسری چھوڑ تیسری کر پھوپھا...... پر پھوپھی کو اس طرح گھر سے نہیں نکال سکتے۔"

"یہ گھر میرا...... بیوی میری...... دو دو اینٹیں جوڑ کر چار پیسے کمانے والا میرے منہ کو آ رہا ہے۔"

بشیر کی تڑی پر منشی کو اور تاؤ آ گیا۔

"تیری طرح سود کی دو دو کوڑیاں جمع کر کے محل نہیں کھڑے کیے۔ تو پھوپھی کو گھر سے نکال کے دکھا۔"

"لے...... پھر دیکھ......" منشی، نسیمہ پر جھپٹا اور بشیر، منشی پر...... ثریا اور مریم اس دنگل پر ہکا بکا رہ گئیں۔ نسیمہ کو خود بھی نہیں پتا، وہ لاشعوری طور پر کیا چلا رہی ہے۔

"بشیر اس کو چھوڑنا نہیں۔ اس کی ٹانگیں توڑ دے۔ گھر سے نکلنے کے قابل نہ رہے۔" خمیرے آٹے کی طرح پھولا منشی مضبوط ہاتھ پیر کے بشیر کے سامنے کہاں ٹک سکتا تھا۔ بشیر نے دونوں ہاتھوں میں اس کی گردن دبوچ کر پوری قوت سے دھکا دیا۔ بیرونی دروازے کے عین پاس پانی والی موٹر تھی۔

منشی کا سر ٹکرایا اور بھل بھل لہو بہنے لگا۔

ثریا، نسیمہ اور مریم کی چیخیں ایک ساتھ نکلیں۔

منشی یوں تڑپ کر بے حس و حرکت ہوا، گویا ایک کے بعد دوسری سانس نہ آئی ہو۔

☆☆☆

بیل جا رہی تھی مگر کوئی اٹھا نہیں رہا تھا۔

"ٹھیک ہے، میں نے تو یہ سب پھوپھی کو بچانے کے لیے کیا تھا۔ اچھا ہے طلاق یافتہ کہلانے کے بجائے بیوہ بن کر رہ لے گی۔" اس نے خود کو تسلی دی۔

"تمہارا میاں تو بہت غصے والا ہے۔" اماں نے ثریا سے کہا۔ ثریا نے چونک کر دروازے میں کھڑے بشیر کو دیکھا۔ ٹرین روانی پکڑ چکی تھی۔ بشیر کے بال بکھر رہے تھے۔

"ہاں، ایسا ہی ہے۔" اس پورے سفر میں یہ پہلی اچھی بات تھی جو ثریا کے کانوں نے سنی۔ وہ کھل کر مسکرائی۔

ٹرین زن سے چیچہ وطنی کا اسٹیشن چھوڑ گئی۔

اس کی زندگی کا نیا سفر شروع ہو گیا تھا۔

☆☆☆

اداس لوگو!
نراش لوگو!
وفا کے شانے سے یہ سرکتی
ڈھلکتی امید کی ردا کہہ رہی ہے تم سے
اب اٹھ جاؤ...... اب اٹھ جاؤ

پختہ سڑک پر اس کے قدم بے آواز اٹھ رہے تھے۔ رات بے آواز بارش ہوئی تھی۔ ہلکی مدھم اور متواتر۔
اسی لیے گلی کے اطراف میں پانی کھڑا تھا۔
وہ خاموشی سے اس گھر کے سامنے آ کھڑی ہوئی، جس کے تازہ قلعی شدہ درودیوار دھوپ سے چمک رہے تھے۔

اس نے بند مٹھی کھولی اور ہتھیلی پر رکھی چابی کو دیکھا۔
مکین نہیں تھا مگر اپنا سب کچھ اسی کو سونپ کر گیا تھا۔
وہ گھر کے اندر آ گئی۔
مراد کا پھولوں سے سجا رکشہ باسی ہو چلا تھا۔
وہ نظریں چراتی کمرے کی طرف آ گئی۔ جیسے ہی دروازہ کھلا، باسی خوشبو اس کے وجود سے آ لپٹی۔
جی مرائے...... مرجھائے پھولوں کی خشک پتیاں اس کے جہیز کی نئی چادر پر بکھری نوحہ کناں اداسی سے آنے والی کو دیکھنے لگیں۔
پلنگ کے کنارے بیٹھ کر اس نے ہاتھ سے پتیوں کو نیچے پھینکنا شروع کر دیا۔ ان کے نصیب میں وصال نہ تھا۔

یہ نیلے سمندر اب سرخ ہوتے ہوتے
گگن کی آنکھیں بھی روتے روتے
نڈھال سی، پرملال سی
کہہ رہی ہیں کب سے
کہ میرے آنگن میں سبز وعدوں کو پھر سے اک بار
نئی رتوں کو بلاؤ، خوابوں کی فصل اگاؤ
اب اٹھ بھی جاؤ، اب اٹھ بھی جاؤ
اداس لوگو! نراش لوگو!

زمین نے خاموشی سے اٹھ کر صفائی شروع کر دی۔ سارے پھولوں کو جمع کر کے ایک خالی گتے کے ڈبے میں بھر دیا۔ بیڈ شیٹ جھاڑ کر بچھائی۔ فرنیچر صاف کیا۔ مراد کی ایک ایک کتاب پھر سے جھاڑ کر رکھی۔ موبائل کا چارجر، سیاہ شیشوں والے گلاسز رکھنے کو دراز کھولی تو وہاں سستا مگر خوب صورت نیا موبائل رکھا تھا۔ زمین نے جس سے اٹھا کر بٹن دبایا۔ اسکرین روشن ہوئی۔ موبائل میں کچھ بھی نہیں تھا۔ سوائے مراد کے نمبر کے۔
تب ہی افشاں بھاگتی ہوئی آ گئی۔ دونوں نکل رہی تھیں، جب افشاں کو اس کی امی نے آواز دے دی۔ وہ جلدی جلدی ان کا کام کر کے بھاگی آئی۔
''تم نے اکیلے ہی صفائی شروع کر دی۔ یہ کیا ہے؟'' موبائل پر نظر پڑتے ہی اس نے موبائل اچک لیا۔
''مراد کا ہے۔''
زمین نے نفی میں گردن ہلائی۔
''ہائے لو!'' افشاں نے محفوظ نمبر پر لکھا نام پڑھا۔ ''یہ تو مراد کا نمبر ہے، تم نے سیو کیا ہے؟''
''مراد نے کیا ہے۔'' زمین نے اس کے ہاتھ سے موبائل لے کر دوبارہ ڈبے میں رکھا۔
''اللہ اللہ...... اس نے یہ تحفہ تمہاری منہ دکھائی کے لیے لیا ہوگا۔'' افشاں کے دماغ نے کلک کیا۔
''ایسا ہی ہے۔'' زمین نے باقی چیزیں بھی دراز میں رکھ کر بند کر دیں۔

کر چھوٹے سے کچن میں آ گئی۔
جو اس کے جہیز کے برتنوں سے سجا تھا اور وہاں ایک درمیانی سائز کا نیا فریج بھی رکھا تھا جو پہلے گھر میں کہیں نہیں تھا۔
گویا مراد نے اپنے مکان کو گھر بنانے کے لیے سارے ہی جتن کیے تھے۔
زمین نے فریج کا دروازہ کھولا۔ نیلگوں ٹھنڈک کے مرغولے باہر آئے۔ فریج میں پانی کی بوتلیں، دودھ، پھل، گوشت اور جوس کے ڈبے رکھے تھے۔
زمین کی آنکھیں بھر آئیں۔
اس کی ہر ضرورت کا خیال رکھنے والا تھانے میں بند، اس سے محبت کی سزا بھگت رہا تھا۔
اس نے بنا پانی نکالے فریج بند کر دیا۔
افشاں نے جلدی جلدی باقی گھر کی صفائی شروع کر دی۔
جبکہ زمین کا دل بالکل ہی اچاٹ ہو گیا۔ اس کی حالت دیکھ کر ہی افشاں نے اسے بیٹھ جانے کو کہہ دیا۔
''مراد بھائی!'' فرخ آوازیں دیتا اندر چلا آیا۔ پھر زمین کو دیکھ کر ٹھٹک گیا۔
''وہ...... دروازہ کھلا تھا، میں سمجھا مراد بھائی واپس آ گئے ہیں۔'' وہ شرمندگی سے گویا ہوا۔
''میں اور افشاں ہیں۔'' زمین نے دھیمے لہجے میں بتایا۔
''تم پریشان مت ہونا۔ مراد بھائی واپس آ جائیں گے۔'' فرخ نے زمین سے زیادہ خود کو تسلی دی۔
''وہ آئے گا نا۔ پولیس والے اسے چھوڑ کیوں نہیں دیتے۔'' زمین نے بے تابی سے پوچھا۔
''منشی کی حالت ابھی بھی خراب ہے۔ بچ گیا تو بیان دے گا۔''
''اگر اس نے مراد کا نام لے دیا؟''
''نام لینے سے کیا ہوگا؟ مراد بھائی اس وقت تھانے میں تھے۔''
''ہاں، یہ تو ہے۔'' زمین کو تسلی ہوئی۔
فرخ نے چور نظروں سے مگر بغور اسے دیکھا۔ چند دنوں میں وہ آدھی رہ گئی تھی۔
''کیا میں زمین کو بتاؤں کہ یہ سارا فساد میری بدنیتی کی وجہ سے ہوا ہے۔'' فرخ نے سوچا اور خود ہی گھبرا گیا۔
نہیں...... زمین کو یہ بات کبھی پتا نہیں چلنی چاہیے۔ ابھی تو خدیجہ نے اس سے بات کرنا شروع نہ کی تھی بلکہ مارے شرمندگی کے وہ زمین کے گھر بھی نہ آئی تھیں۔
''میں چلتا ہوں، تمہیں کسی چیز کی ضرورت ہے تو بتاؤ۔''
''نہیں۔ گھر میں سب کچھ ہے۔'' وہ پہلی بار مسکرائی۔
''ٹھیک ہے۔'' فرخ جانے کے لیے مڑا۔
''فرخ......'' وہ زمین کے پکارنے پر رکا۔
''تم مراد سے ملنے جاؤ گے؟''
''میں چاہتا تھا مگر ابو نے اجازت نہیں دی۔'' فرخ نے شرمندگی سے بتایا۔
''اچھا۔ کوئی بات نہیں۔'' وہ مضمحل سا مسکرائی۔
فرخ خاموشی سے باہر نکل گیا۔

چھوٹی سی ٹرے، ٹرے میں دو سفید مگ جن پر چھوٹے چھوٹے دل بنے تھے۔
"ان میں کیوں لے آئیں؟"
"یہ تمہارے جہیز کے تو نہیں ہیں، یقیناً مراد نے بہت دل سے لیے ہوں گے۔ جب تم دونوں ساری ساری رات جاگ کر باتیں کرو گے تو چائے کی طلب تو ہوگی۔" اس نے ٹرے میز پر رکھی۔ "میں نے سوچا مراد کی باتیں کرتے ہیں۔"
"میں کیا باتیں کروں گی؟ دو چار تو ملاقاتیں تھیں۔" زمین کرسی پر بیٹھ گئی۔
"یاد ہے، جب وہ پہلی بار تمہارا بیگ واپس کرنے آیا تھا۔"
"پہلی بار وہ نہیں تھا۔ پہلی بار میں...... میں نے اس کے ہاتھ پر کاٹ لیا تھا۔"

☆☆☆

دور باغوں میں آم کی گھنی شاخوں میں چھپی کوئل کی مدھر کوک دوپہر کی خاموشی میں چھید ڈالتی تھی۔ اقصیٰ بوکھلائی ہولائی خالی دیواروں سے ٹکراتی رہتی۔
ثریا کے ہونے سے کچھ تو رونق رہتی۔
کبھی رشیداں سے جھگڑتی۔ کبھی اسے ڈانٹتی جاتی۔
ثریا بھی گئی اور رشتے دار بھی یوں بھاگے کہ مڑ کے نہ دیکھا۔ کہیں دونوں ماں بیٹی ان میں سے کسی کے پلے نہ بندھ جائیں۔
اقصیٰ نے کمرے میں جھانکا۔ رشیداں بڑی فرصت سے بیٹھی کلام پاک پڑھ رہی تھی۔ وہ فرصت جو اسے ساری زندگی میسر نہ آئی۔ اب چھپر پھاڑ کر برسی تو وہ کلام پاک پڑھ پڑھ کر مرے ہوؤں کو بخشتی رہتی۔
اب پتا نہیں، پہلے والے کو بخشتی تھی یا دوسرے کو۔
اقصیٰ نے جھرجھری لی۔ پتا نہیں کیوں مگر اقصیٰ کو لگتا تھا، کبھی کبھی وہ ثریا کی طرح سوچنے لگی ہے۔
"اماں! اب بس کرو۔"
اور رشیداں نے اس کی بات مان کر آیت مکمل کی۔ قرآن بند کیا۔ مختصر دعا مانگی۔
اور قرآن پاک رکھ دیا۔
اقصیٰ نے محسوس کیا۔ اس کی ماں کے چہرے پر بلا کا سکون اور ملاحت تھی۔
قبل از وقت آئے بڑھاپے کی جھریاں جیسے معدوم ہونے لگی تھیں۔ اسے اپنی ماں پہلے سے کہیں زیادہ خوب صورت لگی۔
"اماں! تم تو جوان ہونے لگی ہو۔"
"ہے...... پاگلے ایسی باتیں کون کرتا ہے، وہ بھی اپنی ماں سے۔" وہ دوپٹے میں منہ دے کر ہنسی۔
"مجھے لگتا ہے، تمہاری زندگی سے ساری فکریں ختم ہوگئی ہیں۔"
"مجھے بھی ایسا لگتا ہے۔" وہ تکیہ سیدھا کر کے لیٹ گئی۔
"تو پھر بتا دوں، آٹا ختم ہوگیا ہے۔ گھر میں دال، چاول کچھ بھی نہیں۔ تمہاری عدت پوری ہونے میں تو بڑا وقت ہے اماں! ہم کہاں سے کھائیں گے؟" اقصیٰ نے فکروں کی گٹھڑی باندھ کر پھر سے ماں کی گود میں دھر دی۔
"رب وارث ہے۔"
"ہاں، وہ تو ہے۔" اقصیٰ لاجواب ہوئی۔

"رب جانے...... پر جہاں بھی ہو، خوش رہے۔"
"اماں! اس کے لیے دل سے دعا کرتی ہو؟" اقصیٰ کو شک ہوا۔
"دعا تو ہمیشہ دل سے دی جاتی ہے۔ آگے رب سوہنے کی مرضی۔"
"ہم شہر نہ چلے جائیں؟" اقصیٰ نے عجیب سی فرمائش کی۔
"شہر میں کیا ہے؟"
"شہر میں میرا بھائی ہے۔" اقصیٰ نے اتنے مان سے کہا، جیسے شہر کے دروازے پر اس کا بھائی انتظار میں کھڑا ہو۔
"کون سے شہر میں؟" رشیداں کو بس اتنا پتا تھا، گاؤں کی دہلیز عبور کرتے ہی شہر در شہر کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور رشیداں نے کبھی گاؤں کی دہلیز عبور نہیں کی تھی۔ اس لیے وہ کیا جانے؟ جس ٹرالی میں بیٹھ کر اس کا بیٹا شہر گیا تھا۔ وہ کہاں جا کر رکی تھی۔
"جا رسولاں کے پاس، اس کو کہہ پانچ کلو آٹا ادھار دے دے۔ میں کام سے لگوں گی تو واپس کر دوں گی۔"
"شام کو چلی جاؤں گی۔" اقصیٰ نے سستی اور مایوسی سے کہا۔ مگر شام ہونے سے پہلے چوہدریوں کے گھر سے گنک کی بوری آ گئی اور رسولاں کا لڑکا آٹا بھی پسوا کر لے آیا۔
"فکر تو وہ پالے، جس کا رب نہ ہو۔"
رشیداں زیر لب بڑبڑاتی، مسکراتی، آٹا گوندھتی رہی۔ یہ جملہ ہمیشہ علی بخش کہا کرتا تھا۔

☆☆☆

"مرا نہیں، بچ گیا ہے۔"
"افسوس۔" مراد نے سر جھٹکا۔
"ان لوگوں نے تمہارے ساتھ مار پیٹ کی ہے۔" کاکے نے اس کا حلیہ دیکھا۔
"چھوڑو یہ باتیں، اختیار ان کے ہاتھ میں ہے تو کچھ نہ کچھ کریں گے۔ آپ بتائیں، نرمین کو دیکھا۔ وہ کیسی ہے؟ ٹھیک ہے نا؟"
کاکا اس کی بے تابی پر مسکرایا۔
"ٹھیک ہے۔ تمہارے گھر کی چابی دے آیا تھا۔ جب تک تم نہیں آ جاتے، وہ خیال رکھے گی۔"
"ہاں، وہ رکھے گی۔" مراد اندر تک شانت ہو گیا۔
"تم نے یہ نہیں پوچھا، منشی نے بیان کیا دیا؟"
مراد نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔
کاکے نے اک گہری سانس بھری۔
"اس نے تم پر شک ظاہر کیا ہے۔"
"کتے کی دم کبھی سیدھی نہیں ہو گی۔" مراد نے غصے سے زمین پر تھوک دیا۔ "وہ تو یہی چاہے گا، میں کبھی باہر نہ آؤں۔"
"خیر...... ان کے پاس کون سا کوئی ثبوت ہے، باہر تو آ ہی جاؤ گے۔"
"وقتی پریشانی تو ہو گی نا۔ وہ نرمین کو دوبارہ ستائے گا۔" مراد کو فکر لاحق ہوئی۔

ابھی تو اسے اپنا ہوش نہیں، پھر اس کی بیوی کا خاندان...... ابھی کچھ نہیں کر سکے گا۔ جن کے سے اس نے فائدہ اٹھانا تھا، وہ ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ اب تو ٹھیک ہو کر دوبارہ ماحول بنائے گا، پھر بات بنے گی اور اللہ نے چاہا تو تب تک تم باہر آ جاؤ گے۔"

"میرا ایک پیغام اس تک پہنچا دینا۔" کچھ لمحے سر جھکانے کے بعد مراد نے سر اٹھایا۔

"کس کو؟"

"اس کو...... جس کا نام لینے سے بھی میری زبان ناپاک ہوتی ہے۔" مراد کا لہجہ نفرت سے سلگنے لگا۔

کاکے نے سمجھ کر اثبات میں سر ہلایا۔

☆☆☆

منشی گھر آ گیا تھا۔ ساتھ ہی خاندان اور علاقے کے لوگ امڈ پڑے۔ جو اس کا پتا کرنے آ رہے تھے۔ وہ بے بسی سے بستر پر پڑا، انہیں آتے جاتے دیکھتا۔ نسیمہ کے میکے والوں کو اس کی دوسری شادی کی کوششوں کا پتا چل گیا۔ وہ الگ بپھرے پھر رہے تھے، اکرم کو لگتا۔ بشیر تو سر پھاڑ گیا ہے۔ یہ لوگ ٹانگیں توڑ کر بستر پر ڈال لیں گے۔ نسیمہ اکیلی کمزور تھی۔ چار بچوں اور خاندان کے ساتھ کھڑی ہوئی تو بھاری پڑ رہی تھی۔

"تم دیکھنا، میں بشیر کو چھوڑوں گا نہیں۔" نسیمہ کو اکیلے دیکھ کر پھنکارتا۔

"تو دیتے پولیس میں نام۔ کسی بے گناہ کو کیوں پھنسا رہے ہو؟" وہ تنک کر کہتی۔

بے یار و مددگار اس کے آسرے پر پڑا تھا۔

"اللہ، آخری وقت بھی دکھا سکتا تھا۔ ٹال دیا ہے، معافی مانگ لو۔ ورنہ لاہور زیادہ دور نہیں ہے۔ جان دیتے ہیں میرے بھتیجے مجھ پر۔" یہ کھلم کھلا دھمکی تھی۔ منشی کھلم کھلا تلملا بھی نہ سکتا تھا۔ کچھ بھی ہو، دل میں خوف تو بیٹھ ہی گیا تھا۔

علاقے کے لوگ تیمارداری کے لیے آئے تھے۔ ان ہی میں کاکا بھی تھا۔ سب لوگ چلے گئے، وہ وہیں بیٹھا تھا۔

"منشی صاحب! رحم کریں۔ غریبوں کی آہ نہ لیں۔ ان بچوں نے کیا بگاڑا ہے۔"

"مجھے سب پتا ہے۔ بھاگ بھاگ کر اس سے ملنے جاتا ہے، اس کے لیے پیسے خرچ کر رہا ہے۔ پر اب رب نے موقع دیا ہے تو چھوڑوں گا نہیں۔ جیل میں سڑا دوں گا۔ نرمین سے نکاح نہیں کرنے دوں گا۔"

بڑی ہی کوئی جہنمی روح تھا۔

کاکے کو تاؤ آ گیا۔

مگر ضبط کرتا تحمل سے کھڑا ہو گیا۔

"اس نے یہی پیغام دیا ہے۔ جوان خون جوش مار رہا ہے۔ کہتا ہے سزا تو بھگت لی، اب جرم بھی کروں گا۔ باہر آ گیا تو چھوڑوں گا نہیں۔"

ایک لمحے کو منشی کا رنگ فق ہو گیا۔

"شریف آدمی کے لیے تو اس کی نیک نامی ہی سب کچھ ہوتی ہے۔ وہ تو نیلام ہوئی۔ تھانے کے احاطے میں، اب تو بے خوفی ہی بے خوفی ہے۔ کہتا ہے، نرمین کے گھر کی طرف آنکھ بھی اٹھا کر دیکھا تو اندھا کر دوں گا۔ لگتا ہے جیل سے غنڈا بن کے نکلے گا۔"

کاکے نے مزا لیا۔

"میرے گھر میں دھمکیاں دے کر جا رہا ہے۔ تیرا ہوٹل بند کروا دوں گا۔"

کاکا ہنس کر مڑا۔ منشی کی طرف جھکا اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

وہ ہنس کر چلا گیا۔
منشی سے تھوک نگلنا مشکل ہو گیا۔
شریف آدمی شرافت چھوڑ دے تو بڑا خطرناک بدمعاش بنتا ہے۔
اس بات کا اندازہ منشی کو اچھی طرح تھا۔

☆☆☆

انور حسین کا بخار نہیں اتر رہا تھا۔ وہ گم صم چارپائی پر اٹوانی کھٹوائی لیے پڑا رہتا۔ ثمینہ دوا دیتی، دوا کھا لیتا۔ جوشاندہ پلاتی، پی لیتا۔ چارپائی پر دھوپ ہے یا چھاؤں، اسے خبر ہی نہ ہوتی۔
وہ کیا سوچتا ہے؟
کیا چاہتا ہے؟
کسی کو خبر نہ تھی۔
نرمین پاس آتی تو منہ پھیر لیتا۔ جیسے اس سے شرمندہ ہو، اس سے نظریں نہ ملا پاتا ہو۔
بات کرتی تو جواب دینے سے پہلے ہکلا جاتا۔
"ابو جی! کیا ہو گیا ہے آپ کو؟" نرمین پوچھ پوچھ کر تھک جاتی۔
"مجھے لگتا ہے، ابو جی مرنے والے ہیں۔" کونے میں مٹی سے گول گول گولیاں بناتے طلحہ کے کہنے پر حذیفہ نے مڑ کر باپ کو دیکھا۔ وہ چارپائی پر دونوں ہاتھ سینے پر باندھے چت لیٹا تھا۔ مکھیاں اس پر بھنبھنا رہی تھیں۔
"مرتے کیسے ہیں؟" حذیفہ نے پوچھا۔
"ایسے ہی......" اس نے باپ کی طرف اشارہ کیا۔
"اچھا۔" حذیفہ کو تعجب ہوا۔ اسے ابھی تک کوئی میت دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ جب کہ طلحہ ایک دفعہ ماں کے ساتھ محلے میں مرگ پر گیا تھا۔
مگر موت کا مفہوم دونوں کے ذہنوں میں واضح نہیں تھا۔
"پھر سارے چارپائی کے پاس بیٹھ کر روتے ہیں۔ ہائے میرا ابا...... ہائے میرا ابا مر گیا......" طلحہ نے زانوں پر ہاتھ مارتے پوری پوری نقل اتاری۔
"ایسے......" حذیفہ کو یہ عمل خاصا دلچسپ لگا۔
"ہاں۔" طلحہ نے واحد دیکھی جانے والی مرگ اور میت کے لواحقین کی نقلیں اتارنا شروع کر دیں۔ حذیفہ نے اس کا پورا پورا ساتھ دیا۔
"ہائے میرا ابا مر گیا......" دونوں لوٹ پوٹ ہونے لگے۔ مرتے ہوئے ابا کے کمزور اعصاب اس شور پر ذرا سا کسمسائے مگر دیوار پار افشاں کی ماں کے ہاتھ سے گلاس چھوٹ گیا۔
"نی افشاں...... بھاگ کے دیکھ انور حسین مر گیا......"
غسل خانے میں نہاتی ثمینہ کی سمجھ میں کچھ نہ آیا، بس شور کا احساس ہوا تو جلدی جلدی صابن اتارنے لگی۔ چھت پر گم صم بیٹھی نرمین نیچے بھاگی۔ ادھر وہ نیچے پہنچی، ادھر دھاڑ سے دروازہ کھول کر افشاں اور اس کی امی اندر آئیں۔
"ہائے میرا ابا مر گیا۔" دونوں نے اپنی اپنی قمیص کے دامن کو دوپٹے بنا کر چہرہ ڈھک لیا تھا۔
"ابو جی......ابو......"

اتنا شور سر پر دھمالیں ڈالنے لگا تو انور نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں۔
افشاں کی اماں کے منہ سے چیخیں نکل گئیں۔
زمین باپ سے لپٹ گئی۔
افشاں نے لپک کر دونوں کی گردنیں دبوچ کر زمین پر لگائیں اور دھم دھمک جتنے دھموکے برسا سکی، ان کی پشت پر برسا دیے۔ جن غریبوں کو پتا بھی نہیں تھا کہ مار پڑی کیوں ہے۔

☆☆☆

''اللہ نے کرم کر دیا پھوپھی! میں نے کون سا جان بوجھ کر کیا تھا۔ بس غصہ آ گیا۔'' بشیر شرمندگی سے کہہ رہا تھا۔
ثریا دوبارہ کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ بشیر نے اس کوٹھی میں ٹائلز لگانے کا ٹھیکہ لیا تھا پھر کسی وجہ سے چند دن کے لیے کام رک گیا۔ کام کے دوران وہ یہیں سرونٹ کوارٹر میں رہتا تھا۔ ثریا کو سیدھا یہیں لے کر آیا۔
یہیں چند دوستوں کی موجودگی میں دونوں کا نکاح ہوا تھا۔
چار پانچ دنوں میں ثریا نے زندگی کو نئے انداز میں دیکھا تھا۔
وہ کسی کی بیوی، کسی کی عزت تھی۔ چوکیدار جب آواز لگاتا......
''بھابھی! ناشتہ لے لیں۔''
اسے بہت اچھا لگتا۔
''بات سن بشیر! وہ جو تمہارے ساتھ لڑکی تھی، وہ کون تھی؟'' گلے شکوؤں کے بعد نسیمہ کو اچانک یاد آیا۔
''میری بیوی ہے۔''
''ہائے میں مر گئی۔ یہ تم نے کیا کیا؟'' نسیمہ ہکا بکا رہ گئی۔
''کیا ہو گیا پھوپھی! ایسی کیا انہونی ہو گئی۔'' بشیر نے ہنس کر ثریا کو دیکھا۔
''جس کام سے روکنے کے لیے تم نے اپنے پھوپھا کا سر پھوڑ دیا، وہی خود کر ڈالا۔''
''اس لیے تو نہیں پھاڑا، میری طرف سے گھر میں چار بٹھا لے۔ وہ تو تمہیں گھر سے نکال رہا تھا، اس لیے غصہ آ گیا۔''
مارے غصے کے پھوپھی نے کال ہی کاٹ دی۔
''چلو، اب غصہ کر لیا۔''
''تم نے بات ہی ایسی کی تھی۔'' ثریا ہنستے ہوئے پاس آ بیٹھی۔
''ہاں بھئی، نیکی کا تو زمانہ ہی نہیں رہا۔''
''بشیر! اب گھر چلو۔ کب تک یہاں بیٹھے رہیں گے۔''
''کیوں، یہاں کیا تنگی ہے؟''
''اپنا گھر تو نہیں ہے نا...... یا پھر تمہارا لاہور میں گھر ہی نہیں ہے۔'' ثریا ایک دم مشکوک ہوئی۔
''چلو، تم عورتوں کی عقل بھی نا بس......''
''گھر ہے نا تمہارے پاس۔'' ثریا کی سوئی اٹک گئی تھی۔
''نہیں ہے۔'' بشیر نے سنجیدگی سے جواب دیا۔
''کیا مطلب...... ؟ گھر نہیں ہے۔'' ثریا ہکا بکا رہ گئی۔
''گھر ہوتا تو تمہیں یہاں لے کر آتا۔'' بشیر نے دونوں ہاتھ سر کی پشت پر باندھ کر دلچسپی سے ثریا کو دیکھا

کا رنگ فق ہو گیا۔ [illegible]

"تو پھر تم مجھے یہاں کیوں لے کر آئے؟"

"تم نے ہی ضد کی تھی۔" بشیر نے سیدھا ہو کر اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

کچھ لمحے ثریا کے منہ سے کچھ نہ نکلا تو بشیر کو ہنسی آ گئی۔

"جھلیے......" اس نے پیار سے ثریا کے گال پر چپت لگائی۔ "کر تیاری، چلتے ہیں۔ میں نے تو سوچا تھا، چار دن سکون سے یہاں رہیں گے، مگر تجھے بہت جلدی ہے گھر کے جھمیلوں میں پڑنے کی۔"

ثریا بے یقینی سے اسے دیکھے گئی۔

"مذاق کر رہا تھا پاگلے!"

"آئندہ نہ کرنا۔ میری جان نکال دی۔" ثریا کی اٹکی ہوئی سانس بحال ہوئی۔

"میں تو ساری کشتیاں جلا کر آئی ہوں، پیچھے تو کوئی رہا نہیں۔ بس ایک تیرے بھروسے......"

"اس بات کو یاد بھی رکھنا۔"

"کون سی بات؟" ثریا بے خیالی میں گویا ہوئی۔

"یہی کہ ساری کشتیاں جلا کر آئی ہو۔" اس کے لہجے میں عجیب سی پراسراریت در آئی۔

☆☆☆

رکشہ ایک چھوٹے سے گھر کے سامنے رکا۔ ثریا نے رکشے سے اتر کر ادھر اُدھر دیکھا۔ گلی کے دوسری طرف تین چار کھانے پینے کی دکانیں تھیں۔ جو جمعہ کی وجہ سے بند تھیں، جس گھر کے دروازے کے سامنے رکشہ رکا۔ وہ سال خوردہ اور بوسیدہ...... جس کے نیچے سے پانی بہہ کر سامنے والی دو سیڑھیوں کو گدلا کر رہا تھا۔ رکشے والے کو پیسے دے کر بشیر نے ثریا کا بیگ اٹھایا اور "آؤ" کہتے ہوئے قدم آگے بڑھائے۔

"یہ ہے تمہارا گھر؟" ثریا نے بدمزا ہو کر پوچھا۔ رکشہ پھٹپھٹاتا ہوا چلا گیا۔

"ہاں، یہی ہے۔" بشیر نے دو انگلیاں دروازے کی درز میں ڈال کر ایک ڈوری کھینچی تو لاک کھل گیا۔

"تم دروازہ اس طرح کھولتے ہو۔ میں نے تو سنا ہے، شہروں میں بڑی حفاظت کرنی پڑتی ہے۔"

بشیر نے ثریا کی بات کا جواب دینے کے بجائے دروازہ کھول کر اسے اندر آنے کی دعوت دی۔ تو ثریا نے بسم اللہ پڑھ کر اپنے گھر میں پہلا قدم رکھا۔ باہر کی نسبت اندر سے گھر زیادہ صاف ستھرا اور سلیقے سے سجا تھا، جیسے ابھی ابھی کسی نے تازہ صفائی کی ہو۔ لگتا تھا بشیر نے اس کو لانے سے پہلے سارا انتظام کر رکھا تھا۔

چھوٹے سے ڈرائنگ روم میں رکھا صوفہ سرمئی کور سے ڈھکا تھا۔

"میں آتا ہوں۔" بشیر کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

ثریا صوفے پر بیٹھ گئی۔

"توبہ...... کتنا بڑا شہر ہے۔ یہاں تک پہنچتے پہنچتے ہی گھنٹہ لگ گیا۔"

"عادت ڈال لو، اب تو یہیں رہنا ہے۔" کمرے سے بشیر کی آواز آئی۔

"ہائے...... یہ چھوٹا سا گھر میرا ہے۔ صرف میرا......" ثریا نے نہال ہو کر دیوار پر لگی مصنوعی بیلوں کو دیکھا۔ سبز پتوں میں جھانکتے آتشی گلابی پھول اسے خوش آمدید کہہ رہے تھے۔ ثریا نے سر ہلا کر ٹانگ پر ٹانگ چڑھائی۔ پھر جوتے اتار کر اوپر پاؤں رکھ لیے۔ پھر جھک کر فرش پر انگلی پھیری۔

"اس فرش پر کون کم بخت جوتے کے ساتھ پھرتا ہوگا۔"

"سامنے کچن ہے، چائے ہی بنا لے۔" بشیر نے آواز لگائی۔

"سب ہے۔"

ثریا اٹھ کر کچن میں آ گئی۔ دھلے دھلائے برتن ریک میں پڑے تھے۔ چینی، پتی کے ڈبے سامنے شیلف پر۔ گیس کا چولہا دیکھ کر تو وہ جیسے نہال ہی ہو گئی تھی۔

"پتا نہیں میری کون سی نیکی کام آ گئی۔ ذرا ہمت کر کے پہلے ہی بھاگ آتی تو کب کی اس جہنم سے جان چھوٹ جاتی۔"

فرط جذبات سے اس نے چھوٹے سے فریج کے سفید دروازے کو چوم لیا۔ کھولا تو اندر ڈبل روٹی کا آدھا پیکٹ، انڈے، گندھا ہوا آٹا، بچا ہوا سالن، پانی کی بوتلیں اور دودھ بھی موجود تھا۔

ثریا کا شاطر و چالاک ذہن جیسے نیند کی گولیاں لے کر سو گیا تھا۔

تب ہی نہ کچھ سوچ رہی تھی نہ سمجھ۔ دل و دماغ فرط و انبساط کی لہروں میں ہلکورے لے رہے تھے۔ تب ہی سب کچھ سامنے دکھائی دے رہا تھا مگر ذہن کی پکڑائی نہ تھی۔

"بشیر! ماچس نہیں مل رہی۔" بہت تلاش بسیار کے بعد بھی ماچس نظر نہ آئی تو اسے پکارنا پڑا۔

"حق ہا...... اپلوں پر پکانے والی کو کیا پتا، شہری چولہے کیسے جلتے ہیں۔"

"تو نے بھی یہیں آ کر سیکھا ہے، میں بھی سیکھ لوں گی۔"

بشیر نے ناب گھمائی۔ چولہا جل گیا۔

"آ...... آ...... آگ کہاں سے آئی؟" مارے حیرت کے ثریا کا منہ کھل گیا۔

"تم سے ادھار لی ہے۔" بشیر نے اس کے کندھے سے کندھا ٹکرایا۔

"چل ہٹ۔" ثریا نے کیتلی چڑھائی۔ پھر ادھر اُدھر دیکھا۔

"میں تو سمجھی تھی، تیرے مکان کو گھر بنانے کے لیے مجھے پتا نہیں کیا کیا کرنا پڑے گا۔ پر یہاں تو سب موجود ہے بشیر!"

"تمہیں اچھا لگا۔"

"مجھے تو خواب لگ رہا ہے۔ ایسی عجیب و غریب چیزیں ہیں جو میں نے زندگی میں نہیں دیکھیں۔"

"بڑی بڑی کوٹھیوں میں کام کرتا ہوں۔ جہاں کوئی اچھی سیکنڈ ہینڈ چیز دیکھی، خرید لی۔"

بشیر نے فریج کھول کر ڈبل روٹی کا پیکٹ اور جیم کی شیشی نکالی۔

"مجھے بازار دکھائے گا؟"

"کون سا بازار؟" وہ سلائس پر جیم لگانے لگا۔

"لاہور کا بازار۔"

"یہاں کوئی ایک بازار تھوڑی ہے۔"

"اچھا......" ثریا کو حیرت ہوئی۔

"یہ کوئی تمہارا چیچہ وطنی ہے؟" بشیر نے چھیڑا۔

"وہ بھی کہاں میرا تھا۔" ثریا نے پتی پانی میں ڈالی۔

"میں نے تو کبھی گاؤں سے نکل کر نہیں دیکھا۔"

"فکر نہ کر۔ تجھے ایسا گھماؤں گا کہ......"

باہر کسی نے دروازہ کھولا تو وہ جملہ بھول گیا۔ ہاتھ میں پکڑی ڈبل روٹی رکھی اور "دیکھتا ہوں" کہہ کر چلا گیا۔

ماہنامہ کرن

جون 2021ء کے شمارے کی ایک جھلک



- ادا کارہ ”فرح نادر“ کی شاہین رشید سے ملاقات،
- اداکار ”حماد فاروقی“ کہتے ہیں ”میری بھی سنیے“،
- اس ماہ ”فہمیدہ فرخندہ جاوید“ کے ”مقابل ہے آئینہ“،
- ”دامن سحاب“ مہوش افتخار کا سلسلہ وار ناول،
- ”میرے ہم نفس میرے ہم نوا“ آسیہ مرزا کا سلسلہ وار ناول،
- ”خبر ہونے تک“ سدرہ حیات کا مکمل ناول،
- ”نمکین پانیوں کا سفر“ منعم ملک کا مکمل ناول،
- ”محبت اب بھی باقی ہے“ اُم ایمان قاضی کا مکمل ناول،
- ”جنہیں راستے میں خبر ہوئی“ نازیہ کنول نازی کا ناولٹ،
- ”بازگشت“ صدف آصف کا ناولٹ،
- ”دل مل گیا“ اُم اقصیٰ کا ناولٹ،
- سیما بنت عاصم، عندلیب زہرا اور عمارہ امداد کے افسانے اور مستقل سلسلے،
- **”کرن کتاب“**

معلوماتی اور دلچسپ مضامین کے ساتھ

جون 2021ء کا شمارہ شائع ہوگیا

آنکھوں والی سکینہ اندر آرہی تھی۔ اس کی ان ہی چمکتی آنکھوں پر تو بشیر فریفتہ ہوا تھا۔ وہ بشیر کو دیکھ کر کھل اٹھی۔

"تم کب آئے؟"

"بس ابھی ابھی۔" بشیر ہلکا سا مسکرایا۔

"اس بار اتنے دن لگا دیے، ذرا بھی ہماری یاد نہ آئی۔" وہ قریب ہوئی۔

"بس اس بار پھنس کر رہ گیا تھا۔"

"پر میں نے تو پل پل تمہیں یاد کیا۔"

"آتو گیا ہوں۔"

"تم جو آئے زندگی میں بات بن گئی۔" اس نے گنگناتے ہوئے بشیر کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

تجسس میں باہر آتی ثریا کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ چیل کی طرح جھپٹ کر دونوں کو الگ کیا۔

سکینہ اس افتاد پر ہکا بکا رہ گئی۔

"شرم نہیں آتی۔ کسی دوسرے کے مرد کو اس طرح جھپیاں ڈالتے۔"

خود تن کر بشیر کے سامنے کھڑی ہوگئی۔

"کیا بکواس ہے بشیر! یہ کون ہے؟" متوحش سے سکینہ نے بشیر کو دیکھا۔

"سکینہ! میں بتاتا ہوں۔" بشیر نے ثریا کو ہٹانے کے لیے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"تم کیا بتاؤ گے؟ خاوند ہے میرا......تو بتا......تو کون ہے؟"

سکینہ نے بے یقینی سے بشیر کو دیکھا۔ وہ نظریں چرا گیا۔

"میں تیری سوکن ہوں کم بخت!" سکینہ نے جھپٹ کر ثریا کے بال پکڑ لیے۔ "اور اس کے بچے کی ماں بھی۔"

☆☆☆

فضہ، ثمرین کی گود میں سر رکھے رو رہی تھی۔ ثمرین کا چہرہ بھی اترا تھا۔ مگر وہ آہستہ آہستہ اس کے سر پر ہاتھ پھیر رہی تھی۔

"کیوں رو رہی ہے؟" اپنی کتابیں نکالتی نرمین نے مڑ کر دیکھا۔

"اس کو بھوک لگی ہے آپا!" ثمرین نے اپنے بھوکے پیٹ پر ہاتھ پھیرا۔

"میں کچھ لاتی ہوں۔"

نرمین کو پتا تھا کچن میں کچھ بھی نہیں۔ پھر بھی نجانے کس آس پر چلی آئی تھی۔

طلحہ اور حذیفہ آٹے کے ڈبے پر جھکے تھے اور کونوں میں چھپے آٹے کو چٹکیوں میں لے کر منہ میں ڈالتے۔

نرمین کو دیکھ کر انہوں نے جلدی سے ڈھکن بند کر دیا۔

نرمین نے آنسوؤں کے گولے کو حلق سے نیچے اتارا اور خواہ مخواہ ڈبے کھول کر دیکھنے لگی۔

کسی ڈبے میں کچھ بھی نہ تھا مگر ایک گڑ کی ڈلی۔

اس نے ماں کی طرح ڈلی توڑی اور دونوں کی ہتھیلی پر رکھ دی۔ وہ خوش ہو کر زبان سے چاٹنے اور چوسنے لگے۔ نرمین باقی کا گڑ لے کر کمرے میں آ گئی۔ فضہ کو ثمرین کی گود سے اٹھا کر اپنی گود میں لے لیا۔

ایک ڈلی ثمرین کے ہاتھ میں رکھی اور دوسری فضہ کے آنسو صاف کر کے اس کے منہ میں ڈالی۔

بھرے فریج اور بھرے دسترخوانوں والے اس ایک "گڑ کی ڈلی کی قیمت کیا جانیں"۔

باہر ثمینہ نے انور حسین کو جھنجوڑ کر اٹھایا۔
"اس طرح نہیں مریں گے۔ بہت ڈھیٹ ہیں۔ ایک ہی بار گلا دبا کر ماردو۔"
اس گھر کے در و دیوار نے کبھی ثمینہ کی اونچی آواز نہ سنی تھی۔
انور حسین ٹکر ٹکر ثمینہ کی شکل دیکھتا رہا۔ وہ چیختی چلاتی روتی، دہائیاں دے رہی تھی۔
محلے والے کب تک آسرا کریں گے، اب اٹھ جاؤ نرمین کے ابو۔ اللہ نے یہ ہاتھ پیر ہلانے کے لیے دیے ہیں۔ توڑ کر بیٹھنے کے لیے نہیں...... کیا چاہتے ہو۔
میں سڑک کے کنارے بھیک مانگنا شروع کر دوں۔ مجھ میں ہمت نہیں بچوں کو بھوکا مارنے کی۔"
انور نے گھر کے کونے میں اوندھی پڑی ریڑھی کو دیکھا۔ اس کے پاس ایک روپیہ بھی نہ تھا کہ ریڑھی پر رکھنے کے لیے کچھ سامان خرید لیتا لیکن دکھ یہ نہیں تھا کہ وہ اپنے بچوں کو روٹی نہیں کھلا پا رہا تھا پڑھا لکھا ہوتا تو شاید کھل کر اپنی کیفیت کو بیان کر پاتا...... کہ کیا چیز اسے اندر ہی اندر کھائے جا رہی تھی۔
ایک باپ کو دیکھ کر پہلا خیال دل میں کیا آتا ہے۔
ایک گھنا بادل......
جو سورج کی ہلکی سی تپش اپنی اولاد تک نہیں آنے دیتا۔
ایک سیسہ پلائی دیوار......
جو ہر طوفان کے سامنے یوں ڈٹ جائے کہ اپنے بچوں پر آنچ نہ آنے دے۔
یہ ہوتا ہے باپ......
اور وہ کیا نکلا؟
ایک کمزور انسان...... جو اپنے بچوں کے لیے کچھ نہ کر سکا۔
بے بسی دنیا کی سب سے بڑی ذلت ہے۔
اور انور حسین نے اس ذلت کے زہر کو چکھ لیا تھا۔ تب ہی تو پورا بدن نیلو نیل ہو رہا تھا۔ باہر آتی نرمین کو دیکھ کر انور حسین تیزی سے کھڑا ہوا اور گھر سے نکل گیا۔
نرمین، ثمینہ کے عقب میں کھڑی ہو کر اس کے کندھے دبانے لگی۔
ثمینہ نے دوپٹے سے چہرہ صاف کیا۔ مزید بات کرنے کی ہمت نہیں تھی۔
"امی! کس کی نظر لگ گئی ہمارے گھر کو۔"
"اللہ ہی جانے...... کیسے کیسے حالات آئے، آج تک تمہارے ابو نے بچوں کو بھوکا نہیں سلایا۔ اور اب کیسے بیٹھے ہیں، جیسے فکر ہی نہیں۔ اب اٹھ کر چلے گئے۔ ریڑھی بھی لے کر نہیں گئے۔"
"امی! میں سوچ رہی ہوں، دوبارہ سے ٹیوشن شروع کر دوں۔"
"نہیں...... نہیں...... تم گھر سے نہیں نکلو گی۔"
"کیوں؟"
"کون جانے وہ بدبخت کہیں راستہ روک کر کھڑا ہو جائے۔ مراد کو کس بری طرح پھنسایا ہے اس نے۔"
"وہ باہر نہیں آئے۔" نرمین نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔
"رب ہی جانے۔ آ جائے تو ایک پل نہ لگاؤں تجھے رخصت کرنے میں۔"

☆☆
باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ

حمیرا شفیع

ڈائٹ پلان

فاریہ بی بی نے ڈرتے ڈرتے ویٹ مشین پر پہلے اپنا دایاں پاؤں دھرا اور پھر بایاں، وزن پڑتے ہی مشین کی سوئیاں تیزی سے حرکت کرنے لگیں اور پھر ایک جگہ ٹھہر گئیں۔

اس نے عرشی کی طرف دیکھا جو سامنے فرش پر آلتی پالتی مارے بیٹھی مشین کے ریڈنگ اسکیل پر نظریں جمائے ہوئے تھی۔

اس کے منہ کے بنتے بگڑتے زاویوں سے کچھ نتیجہ اخذ نہ ہوا تو پوچھا۔

"کیا وزن کم ہوا ہے......؟؟" لہجہ امید افزا تھا۔

عرشی نے بجائے چھٹانک بھر کی زبان کو زحمت دینے کے اپنا تربوز جیسا ڈھائی من کا سر دائیں بائیں ہلایا تو اس کا دل ڈوب گیا۔

"ہائے اللہ جی! کیا ذرا بھی کم نہیں ہوا۔ پہلے جتنا ہی ہے......؟؟"

عرشی اب بھی کچھ نہ بولی اور مسلسل گم صم سی ہندسوں کو تکتی رہی تو وہ بھنا اٹھی۔

"ارے منہ سے تو کچھ پھوٹو......!"

"نہ تو کم ہوا ہے اور نہ ہی پہلے جتنا ہے بلکہ پہلے سے بھی دو کے جی اور بڑھ گیا ہے۔"

اب کے عرشی کی زبان کیا ہلی مانو کہ فاریہ کے سر پر بم پھٹا۔

"ہائے اللہ......اف توبہ......دو کے جی مزید بڑھ گیا مگر کیسے......؟؟"

وہ ایک دل دوز چیخ مار کر ویٹ مشین سے اتری اور دھپ سے پاس رکھے کاؤچ پر ڈھیر ہو گئی۔

"مہینہ بھر سے ابلی ہوئی سبزیاں کھا رہی ہوں۔ چائے بھی پھیکی ہی زہر مار کر رہی ہوں۔ پھر کیوں بڑھ گیا......؟؟ ہائے اللہ جی! اب کیا کروں؟"

اس کا تو صدمہ ہی کم نہیں ہو رہا تھا۔

"اوہو فاریہ! اس قدر واویلا کیوں مچا رہی ہو......؟

سالوں سے بڑھا ہوا وزن ہے۔ اب ایک آدھ مہینے میں تو کم ہونے سے رہا......!" عرشی رسان سے سمجھانے لگی۔

"چلو اگر کم نہیں ہونا تھا تو بڑھتا تو نا......!!"

وہ روہانسی ہو رہی تھی۔

"اف توبہ فاری! صرف دو کے جی ہی تو بڑھا ہے۔ اب بندہ بشر ہو۔ کھانے پینے میں بد پرہیزی تو ہو ہی جاتی ہے۔ میں بھی تو تمہاری طرح اوور ویٹ ہوں۔ مگر راتوں رات دبلا ہونے کا جنون سوار نہیں ہے مجھ پر۔ اب ہم کوشش کر رہے ہیں۔ ان شاء اللہ ایک دن کامیاب ہو جائیں گے۔"

عرشی کافی دیر تک اسے تسلی تشفی دیتی رہی۔ پھر وہ تو اپنے گھر کو سدھاری مگر فاریہ کے دل کو دو کے جی بڑھ جانے کا ایسا صدمہ لگا کہ ہر چیز سے جی اوب گیا۔ بے دلی سے اس نے دوپہر کی ہانڈی روٹی نمٹائی اور منہ سر لپیٹ کر لیٹ گئی۔

☆☆☆

میاں دفتر سے واپس آئے تو بیوی کو یوں بے وقت لیٹا دیکھ کر پریشان ہو گئے۔



"خیریت بیگم! کیا طبیعت ناساز ہے......؟"
انہوں نے چادر کا کونا ہٹایا تو اس کی متورم آنکھیں اور رویا رویا سا چہرہ دیکھ کر مزید گھبرا گئے۔

"خیریت بھئی...... کیا ہوا ہے......؟"

"میرا دو کے جی ویٹ مزید بڑھ گیا ہے۔"
فاریہ نے اپنی دانست میں انہیں نہایت بری خبر سنائی مگر وہ اپنے ازلی پرسکون انداز میں گویا ہوئے۔

"اوہ بیگم...... ! تم اتنی سی بات پر پریشان ہو رہی ہو......؟"

"یہ اتنی سی بات ہے۔" وہ تڑپ اٹھی۔

"آپ کے سامنے مہینہ بھر سے پرہیزی کھانا کھا رہی تھی۔ پراٹھے کا ایک لقمہ تک نہیں لیا تھا۔ آپ

کے سامنے......
''ہاں اور میرے ہی سامنے پرسوں آپ گڈو کے لنچ بکس سے چپس کھا رہی تھیں۔'' وہ اس کی بات کاٹ کر تیزی سے بولے تو حیرت سے اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔
''واہ جی واہ! بڑے چالاک ہیں جی آپ...... مجھے نہیں پتا تھا کہ میرے کھانے پینے پر اتنی کڑی نظر رکھتے ہیں آپ۔ وہ تو بچے نے دو چار قتلے چھوڑ دیے تھے۔ ضائع جانے کے خیال سے کھا رہی تھی میں۔'' وہ نروٹھے لہجے میں بولی۔
''اسی طرح ضائع جانے کے خیال سے تھوڑا تھوڑا کر کے بہت کچھ کھا جاتی ہیں آپ۔'' وہ جتا دینے والے لہجے میں بولے اور اپنے کپڑے اٹھا کر واش روم میں گھس گئے جبکہ وہ تن فن کرتی ہوئی ان کے لیے کھانا لینے کچن کی جانب چل دی۔

☆☆☆

شام کو اس کی دلجوئی کے خیال سے عرشی نے فون کھڑکا دیا۔
''فاریہ چندا! تم پریشان نہ ہو۔ جم والی آنٹی سے بات ہوئی تھی میری۔ وہ کہہ رہی تھیں کہ خالی خولی ڈائٹنگ سے کام نہیں چلے گا۔ تم دونوں ساتھ ساتھ واک بھی کرو۔''
''ہیں کیا واک یعنی مارننگ واک۔''
''جی ہاں! مارننگ واک، وہ کہہ رہی تھیں کہ کم از کم ایک ڈیڑھ گھنٹہ واک کرو۔''
''مگر عرشی! یہ بہت مشکل ہے۔ صبح کے وقت ہزاروں کام ہوتے ہیں۔ بچوں نے اسکول جانا ہوتا ہے اور میاں نے دفتر۔ بھاگم دوڑی سی لگی رہتی ہے۔ یاد کرو ہم نے پہلے بھی کئی دفعہ مارننگ واک شروع کی تھی۔ مگر چند روز سے زیادہ روٹین برقرار نہ رکھ سکے تھے۔ وہ تو گھنٹے بھر کی بات کر رہی ہیں۔ لیکن یہاں تو پندرہ منٹ نکلنے محال ہیں۔''
''تم ٹھیک کہہ رہی ہو فاریہ! میرے ذہن میں ایک آئیڈیا ہے کیوں نہ ہم مارننگ واک کے بجائے ایوننگ واک شروع کر دیں۔''
''ہیں...... کیا شام کی سیر؟''
''ہاں...... شام کے وقت تھوڑی سی فراغت ہوتی ہے۔ گھر کے ساٹھ فیصد کام دوپہر تک نمٹ چکے ہوتے ہیں۔ شام کو صرف تازہ روٹیاں ڈالنی ہوتی ہیں۔''
''ہاں واقعی! بچے بھی ٹیوشن اکیڈمی گئے ہوتے ہیں اور میاں دفتر سے آ کر لمبی تانے سو رہے ہوتے ہیں۔''
''تو بس پھر ٹھیک ہے۔ شام کے وقت نکلیں گے اور برکت مارکیٹ کا ایک لمبا چکر کاٹ کر گھر واپس آ جایا کریں گے۔''
''اور واپس آتے ہوئے مارکیٹ سے اگلے دن کے لیے سبزی، گوشت اور سودا سلف بھی لیتے ہوئے آیا کریں گے۔ شام میں میاں سے کہو تو وہ تھکے ہوتے ہیں۔ سامان لانے میں بہت آنا کانی کرتے ہیں۔''
فاریہ کو ایوننگ واک کے مزید فائدے سوجھے۔
''واؤ سپر آئیڈیا۔'' عرشی بھی متاثر ہوئی۔
''اوکے ڈن۔''
''اوکے ڈن۔''

☆☆☆

اگلے دن شام کے وقت دونوں نے بڑے جوش خروش سے ایوننگ واک کا آغاز کیا۔ پہلے وہ رکشے سے جاتی تھیں مگر اب دونوں نے جاگرز چڑھائے اور پیدل مارکیٹ کی جانب چل دیں۔ زیادہ رش نہیں تھا۔ دونوں نے کچھ دیر واک کی۔ پھر اگلے دن کے لیے ترکاری وغیرہ خریدی عرشی نے اپنے بچوں کی نوٹ بکس لینی تھیں۔ اسٹیشنری شاپ کے ساتھ ہی مشہور برانڈ کی سیل لگی تھی۔ دونوں نہ چاہتے ہوئے بھی اندر گھس گئیں۔ فاریہ کو ایک شرٹ پیس بھا گیا اور عرشی کا دل ایک شیفون کے دوپٹے پر آ گیا۔ شام ڈھلے دونوں لوٹ آئیں۔ اسی طرح سے

دونوں عصر کے بعد نکلتیں۔ گھر کا ضروری سامان خریدتیں اور مغرب سے پہلے پہلے گھر واپس آجاتیں۔ یونہی تانکا جھانکی کرتے ہوئے اکثر اشیائے خوردونوش کے علاوہ تھوڑی اضافی شاپنگ بھی ہوجاتی۔ کبھی فاریہ کو کوئی جوتا پسند آجاتا اور کبھی عرشی کسی جیولری آئٹم پر لٹو ہوجاتی۔

دو ہفتے بعد وزن کم نہیں ہوا، ہاں البتہ گھر کے مہینہ بھر کے سودا سلف کے لیے جو رقم مختص کررکھی تھی اس میں اچھی خاصی کمی ضرور آگئی۔ یوں میاں صاحب کی تنخواہ جو کھینچ تان پچیس چھبیس تاریخ تک چل ہی جاتی تھی وہ بیس تاریخ سے پہلے ہی اڑن چھو ہوگئی۔ پھر ایک دن واپسی پر ایک شاپنگ مال کی سیڑھیاں اترتے ہوئے عرشی پھسل کر گر پڑی۔ پاؤں میں زبردست موچ آئی اور یہ سلسلہ موقوف ہوگیا۔

☆☆☆

فاریہ کی بہن کی شادی کی تاریخ طے ہوگئی تھی۔ میاں نے صاف صاف ہری جھنڈی دکھادی۔

"دیکھو بیگم! ہاتھ اس بار بہت تنگ ہے۔ فالتو خرچا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ پرانی شاپنگ سے کام چلاؤ۔ ابھی دو سال پہلے باقر (دیور) کی شادی پر تو تم سب کے ڈھیروں نئے کپڑے بنے تھے۔"

(اس معاملے میں ان کی یادداشت غضب کی تھی)

اس نے فینسی کپڑوں سے بھرا سوٹ کیس کھولا۔ کامدار جوڑے تو رکھے تھے۔ مگر قمیصوں کی فٹنگ دیکھ کر دل ڈول گیا۔ فقط دو سال کے اندر اندر کمر کا سائز اتنا پھیل گیا تھا کہ اب وہ کسی صورت ان میں پوری نہیں آسکتی تھیں۔ پھر درزن نے اندر اتنا کپڑا بھی نہیں چھوڑا تھا کہ وہ کچھ کھلوا ہی لیتی۔ ابھی اسی کشمکش و پیچ میں تھی کہ ان کی چھوٹی نند چلی آئی۔

"السلام علیکم! بھابھی جان کیا ہورہا ہے......؟"

"ارے فائزہ! سخت پریشان ہوں۔ وزن کم نہیں ہورہا۔ کوئی ٹوٹکا تو بتاؤ۔" اس کے سامنے بھی وہی پرانا دکھڑا رودیا۔

چھٹی کریں۔ خود جھاڑو پوچا کیا کریں۔ گائناکولوجسٹ کا کہنا ہے کہ اس سے نہ صرف وزن کم ہوتا ہے بلکہ کمر اور پیٹ کی بھی اچھی ورزش ہوجاتی ہے۔" اس نے اپنی دانست میں تو گراں قدر مشورہ دیا مگر دس مرلے کے ڈبل اسٹوری گھر کی صفائی کا سوچ کر ہی اس کے ہوش اڑ گئے۔ اور وہ چمک کر بولی۔

"دیکھو فائزہ! دکھادیا نا تم نے بھی آخر اپنا نند پن۔ خود احساس کرو۔ اتنے بڑے گھر کی صفائی کے بعد مجھ میں اتنی ہمت کیسے بچے گی کہ میں تمہارے بھائی اور بچوں کے ہزاروں کام کرسکوں......؟؟

فائزہ اپنی جگہ کچھ کھسیا کر رہ گئی اور پھر کچھ سوچ کر بولی۔

"بھابھی آپ ایسا کریں کہ کوئی مخصوص ڈائٹ پلان اپنائیں۔"

"ہیں......ڈائٹ پلان......؟"

"ہاں بھابھی! ڈائٹ پلان آپ کسی ڈائٹ پلان کو سختی سے فالو کریں۔ آج کل بہت سے ڈائٹ پلان ٹرینڈ میں ہیں مثلاً کیٹو ڈائٹ، کریش ڈائٹ، جوس ڈائٹ، ڈی ٹوکس ڈائٹ وغیرہ وغیرہ" اس کی زبان قینچی کی مانند چل رہی تھی جبکہ وہ منہ کھولے حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"میں خود آج کل جوس ڈائٹ کو فالو کررہی ہوں۔" اس نے فخریہ بتایا۔

"میں آپ کو تمام ڈائٹ پلانز کی تفصیل واٹس اپ کردیتی ہوں۔ آپ اپنی سہولت اور ضرورت کے مطابق کوئی سا بھی منتخب کرلیں۔" پھر گھر جاکر اس نے واقعی کئی قسم کے ڈائٹ پلانز بمع تفصیلات کے واٹس اپ کردیے۔ ہر ڈائٹ پلان کا علیحدہ خوراک کا چارٹ اور خصوصیات وغیرہ مفصل تحریر کی گئی تھیں۔

اس کا تو پڑھ کر سر ہی گھوم گیا۔ کیا اپنائے اور کیا نہ اپنائے۔ عرشی بھی میکے گئی ہوئی تھی۔ اس نے سوچا

کہ وہ آئے گی تو اس سے مشورہ کرنے کے بعد کوئی لائحہ عمل ترتیب دے گی۔ اس طرح عارضی طور پر وزن گھٹاؤ مہم التوا کا شکار ہوگئی۔

☆☆☆

بچوں کی چھٹیاں بڑھ گئیں تو عرشی صاحبہ کا بھی میکے میں قیام طویل ہوگیا۔ مہینہ بھر بعد بھی وہ تو نہ لوٹی ہاں البتہ اس دوران فاریہ کی اپنی خالہ ساس ضرور اس کے ہاں تشریف لے آئیں۔

پورے سسرال میں خالہ ساس وہ فرد واحد تھیں جن سے اسے سسرالی رشتوں کی کڑواہٹ کے بجائے میکے کے اپنوں کی سی مٹھاس محسوس ہوتی تھی۔ اس کا بھی ایک پس منظر تھا۔ دراصل اس کے ولیمے کے چوتھے روز ساس سسر عمرے کی ادائیگی کے لیے روانہ ہوگئے۔ کسی بزرگ کی موجودگی کی وجہ سے وہ خالہ ساس کو اپنے ہاں ٹھہرا کر گئے تھے۔ کنواری اور بیاہی نندوں اور دیوروں پر مشتمل اس کا بھرا پُرا سسرال اور وہ خود نئی نویلی گھریلو کام کاج سے نابلد ایک جھینپی جھینپی سی دلہن۔ ان دنوں خالہ ساس نے قدم قدم پر اس کی رہنمائی کی۔ جس دن اس کا میٹھے میں ہاتھ ڈلوانا تھا تو پتیلا بھر کے کھیر انہوں نے بنائی اور اس نے صرف پیالیوں میں نکال کر دی۔ جب تک ساس سسر لوٹے وہ خالہ ساس کے پُرخلوص ساتھ اور تعاون کی وجہ سے کسی نہ کسی حد تک خود کو گھر میں ایڈجسٹ کر چکی تھی۔

یہی وجہ تھی کہ ان کی آمد پر اس کی خوشی دیدنی تھی۔ جونہی وہ بس ٹرمینل سے گاڑی میں میاں کے ساتھ گھر پہنچیں تو وہ جوش وخروش سے لبریز گیراج تک بھاگی آئی اور ان سے لپٹ گئی۔ دھان پان سی خالہ امی اس کے موٹے تازے وجود میں سما گئیں۔ اور پھر ایک طرح سے اس کے کندھے پر سوار ہی ٹی وی لاؤنج تک آئیں۔

"ہائے میری بچی! ماشاء اللہ سے کتنی پیاری صحت ہے۔"

وہ اس کا منہ سر چوم کر بولیں۔

"خالہ! آپ نے تو آتے ہی شرمندہ کر دیا۔ دعا کریں میں تھوڑی دبلی ہو جاؤں۔" اسے ایک بار پھر ادھورا مشن یاد آیا۔

"چل ہٹ شریر کہیں کی...... نظر لگ جائے گی۔"

☆☆☆

کھانے پر اس نے خالہ امی کے اعزاز میں کئی طرح کے دعوتی پکوان تیار کیے۔ پلاؤ، قورمہ، فروٹ کسٹرڈ وغیرہ۔

پلیٹ میں اس نے ان کے لیے پلاؤ اور قورمہ نکالا اور ساتھ ہی کٹوری بھر کسٹرڈ رکھا۔

"بیٹا! ایک خالی پلیٹ اور کٹوری پکڑانا۔" پھر انہوں نے پلیٹ میں تھوڑا سا پلاؤ اور کٹوری میں چند چمچے کسٹرڈ نکالا۔

"باقی یہ ڈھانپ دو۔" وہ سمجھی کہ خالہ امی سفر سے تھکی ہوئی آئی ہیں۔ شاید ابھی زیادہ کھانے کا من نہیں ہے۔ تھوڑی دیر بعد کھائیں گی۔ کھانا لذیذ تھا۔ انہوں نے تعریف کی۔ بچے بھی رغبت سے کھا رہے تھے۔ مگر جب ٹی وی لاؤنج سے ان کی پسندیدہ کارٹون پروگرام کی آواز آئی تو وہ وہیں سب کچھ چھوڑ کر بھاگ گئے۔

کسی کی پلیٹ میں قورمہ بچا تھا اور کسی کی میں کسٹرڈ، اس نے ایک ایک پلیٹ صاف کی۔

"دیکھ لیں خالہ امی! میری صحت کا راز یہی ہے۔" وہ زیر لب مسکرا دیں۔ وہ دسترخوان سمیٹ کر ان کے پاس بیٹھی تھی کہ لحافوں میں ڈورے ڈالنے والی ماسی چلی آئی۔

وہ اس کے لیے کھانا نکالنے کے ارادے سے اٹھنے ہی لگی تھی کہ خالہ امی نے قریب ڈھکی ہوئی پلیٹ اور کٹوری ماسی کی جانب بڑھا دی وہ متشکرانہ نظروں سے دیکھتے ہوئے لذیذ کھانے سے لطف اندوز ہونے لگی۔

پھر اکثر ایسا ہوتا۔ وہ ان کے لیے نہایت

اہتمام سے پلیٹ سجاتی۔ وہ اپنی طلب کے مطابق تھوڑا سا نکالتیں باقی ڈھانپ کر رکھ دیتیں، تھوڑی دیر بعد وہ دیکھتی کہ ڈھکی ہوئی پلیٹ یا تو اس کی کوئی ملازمہ کھا رہی ہوتی یا پھر وہ کسی صاف شاپر میں ڈال کر بچوں کے ہاتھ دروازے پر صدا دیتی فقیرنی کو بھجوا دیتیں۔

"یہ کیسی عجیب عادت ہے۔" وہ سوچ میں پڑ جاتی۔

دستر خوان پر وہ اس کے بچوں کو بھی رسان سے سمجھاتیں۔

"اپنی پلیٹ ضرورت اور خواہش کے مطابق بھرا کرو۔ اگر کھانا زیادہ ڈل جائے تو کھانے سے پہلے ایک سائیڈ پر علیحدہ پلیٹ میں نکال کر ڈھانپ دیا کرو۔ کسی ضرورت مند کے کام آ جائے گا۔"

بچے تو پھر بچے تھے۔ کبھی عمل کرتے اور کبھی نظر انداز کر دیتے۔ بہرحال اب اتنا ہونے لگا تھا کہ اسے پلیٹوں میں جھوٹا کھانا ملنا کافی کم ہو گیا تھا۔

ابھی انہیں آئے چند روز ہوئے تھے کہ گاؤں سے ان کے پوتے کی ولادت کی اطلاع آ گئی۔ پھر کیا تھا فاریہ نے بہتیرا روکا مگر وہ جھٹ بوریا بستر باندھ کر جانے کے لیے تیار ہو گئیں۔

ان کے جانے کے بعد فاریہ کو یک دم گھر آنگن سونا سونا سا لگنے لگا۔

☆☆☆

ایک ہفتے سے اس کی کام والی چھٹی پر تھی۔ اس کی طبیعت ناساز تھی۔ اس نے پائپ لگا کر سارا گھر دھویا۔ تھکن زیادہ ہو گئی۔ دوپہر کا کھانا بنانے کی ہمت نہ رہی۔ فرج میں ڈونگا بھر دال رکھی تھی۔ اس نے چاول ابال لیے۔ ساتھ رائتہ سلاد تیار کر لیا۔ خوب بھوک لگی تھی۔ پلیٹ میں دال چاول نکالے ابھی کھانے ہی لگی تھی کہ خالہ امی یاد آ گئیں۔ اس نے آدھی پلیٹ دال چاول نکال کر ڈھانپ دی۔ کھانے سے فارغ ہو کر برتن دھوئے۔ کچن سمیٹا۔ لیٹنے ہی لگی تھی کہ ڈور بیل بجی۔

[illegible] سنک ہی کے سیفٹی کو دیکھا جاتا تھا۔ پائپ [illegible] خراب تھی۔ وہی مرمت کرنے آیا تھا۔

وہ کچن میں اس کے لیے روح افزاء بنانے آئی تو تھوڑا سا افسوس بھی ہوا کیونکہ کھانے کا وقت تھا اور کھانا ختم ہو چکا تھا۔ اچانک اسے اپنی ڈھکی ہوئی پلیٹ یاد آئی۔ وہ اسے ٹرے میں رکھ ہی رہی تھی جب اس کی دس سالہ ڈولی بھی ہاتھوں میں ایک پلیٹ تھامے چلی آئی۔

"مما! گڈو نے اپنی پلیٹ لبالب بھر لی تھی۔ وہ اکثر ایسا کرتا ہے۔ پھر کھا نہیں پاتا اور جھوٹا چھوڑ دیتا ہے۔ نانو خالہ نے کہا تھا تم اس کے کھانے سے پہلے ہی اضافی کھانا نکال لیا کرو۔ آپ یہ بھی اپنی والی میں ڈال دیں۔"

اسے خوش گوار حیرت ہوئی۔ خالہ امی اس کے بچوں کو کتنی اچھی عادت سکھا گئی تھیں۔ مکینک کو کھانا بھجوانے کے بعد جب اس نے مزید سوچا تو اس کو ادراک ہوا کہ یہ بھی تو ایک طرح کا ڈائٹ پلان ہی تھا۔ خالہ امی جیسی چٹی ان پڑھ عورت نے کیسا شان دار ڈائٹ پلان ترتیب دے رکھا تھا۔ ایسا کارآمد ڈائٹ پلان جو ایک مکمل پیکج تھا۔ جس میں بچت بھی تھی سلیقہ اور غذا کے ضیاع سے بچاؤ کا طریقہ بھی۔

اور سب سے بڑھ کر اس کے پیچھے کسی ضرورت مند کا پیٹ بھرنے کی نیت کار فرما تھی۔ ایسے عمدہ ڈائٹ پلان کے سامنے سسی اور ڈائٹ پلان کی بھلا کیا ضرورت تھی۔ وہ مستقل طور پر اسی کو اپنانے کا مصمم ارادہ کر چکی تھی اور اب تھوڑی دیر بعد عرشی سے بھی یہ شیئر کرنے جا رہی تھی۔

اس طرح وہ آدھی پلیٹ بچا کر نہ صرف مفت کی نیکی کما سکتی تھی بلکہ "وزن گھٹاؤ" مہم کو بھی کامیابی سے ہمکنار کر سکتی تھی۔

جبیں چیمہ

صاحب، بی بی اور غلام

اندرون لاہور کی وہ ایک پتلی سی گلی تھی۔ جس کے درمیان میں میاں جی پچھلی صدی کے شروع سے آباد تھے۔ ان کے آباؤ اجداد تو کئی دہائیوں سے یہیں بسے اور یہیں سے کوچ کر گئے مگر میاں جی اس خاندان کی آخری نشانی اس بڑے سے گھر کو جس کے چاروں طرف کمرے تھے اور درمیان میں بڑا سا صحن تھا۔ ابھی تک آباد رکھنے میں کامیاب رہے تھے۔ میاں جی اس وقت ساٹھ کے پیٹے میں تھے۔ خوش خوراک، خوش لباس اور خوش گفتار۔ وہ اس گلی کی جان تھے۔

گھر کے باہر بیٹھک کے آگے گلی میں جو تھڑا تھا وہ میاں جی کے دم سے آباد تھا۔ گرمیوں میں ناشتے کے بعد وہ حقہ تازہ کر کے وہاں آ بیٹھتے، تب تک کام والی ماسی یا کوئی لڑکا تھڑے پر جھاڑو لگا کے چارپائی اور کرسیاں رکھ دیتا اور پھر آہستہ آہستہ لوگوں کے دم سے وہ تھڑا یا چبوترہ آباد ہونے لگتا ہنسی مذاق، کھانا پینا، گھریلو جھگڑوں کا تصفیہ۔ ایک دوسرے کے معاشی حالات اور مسائل ان سب پر بات ہوتی۔ میاں جی کی بات حرف آخر سمجھی جاتی۔ کیونکہ وہ ان سب میں معاشی لحاظ سے بہتر تھے۔ وہ تھانیداری سے ریٹائر ہوئے تھے اور پولیس میں ان کی واقفیت تھی۔ جس سے گلی کے لوگ کافی فائدہ اٹھاتے تھے۔

گلی کے آخر میں میونسپل کمیٹی کا پرائمری اسکول



ناولٹ

تھا۔ ننھی منی بچیاں بستے لٹکائے انہیں نیچی آنکھوں سے دیکھتی گزرتی جاتیں۔ اسکول کی استانیاں بھی انہیں دیکھ کے سلام کر کے گزرتیں۔ سوائے اسکول کی کینٹین چلانے والی قمرن کے جودلی والی کہلاتی تھی۔ وہ شروع سے ناک کی سیدھ میں آتی اور ناک کی سیدھ میں جاتی۔



کی تو وہ جوان تھی۔ ننھے بچوں کا ساتھ تھا۔ کئی دفعہ ایسا ہوا کہ کسی نے اسے غلط نظر سے دیکھ لیا۔ یا کوئی فقرہ کس دیا۔ تو پھر اللہ دے اور بندہ لے والا معاملہ ہو جاتا۔ اس کی وہ بے عزتی کرتی۔ اتنا شور کرتی کہ لوگ گھروں سے باہر نکل آتے۔ وہ روتے ہوئے گالیوں اور کوسنوں کی وہ بھرمار کرتی کہ چھیڑنے والے کو کوئی جائے پناہ نہ ملتی۔

آہستہ آہستہ لوگ خاموش ہو گئے۔ وہ بغیر دائیں بائیں دیکھے پچھلے بیس سال سے اس گلی میں آ رہی تھی۔ اس کے بچے بڑے ہو گئے تھے۔ اب وہ اکیلی ہی آتی اور جاتی۔

کہنے والے کہتے تھے کہ اپنی زبان درازی کی وجہ سے اس کی خاوند سے نہیں بنی۔ دو لڑکے ہوئے۔ اور وہ اسے طلاق دے کر چلا گیا۔ انہیں گلیوں میں کسی کے گھر میں ایک کمرہ کرائے پر لے رکھا تھا وہ دو بچوں کے ساتھ زندگی کی گاڑی مردانہ وار کھینچ رہی تھی۔ جو باقی گھر سے الگ تھلگ تھا۔ میاں جی کی بیٹھک کے سامنے سے گزرتے ہوئے بھی نہ اس نے کبھی دائیں دیکھا نہ بائیں۔

جب میاں جی پولیس میں تھے۔ تب بھی نہ کبھی وہ ان سے ڈری نہ جھجکی۔ بس اپنے کام سے کام رکھنے والی کڑوی کسیلی قمرن اور میاں جی اس گلی کے لیے لازم و ملزوم تھے۔ وہ دن آج تک نہیں آیا تھا۔ جب میاں جی باہر تھڑے پر مجلس لگا کے نہ بیٹھے ہوں۔ اور وہ دن بھی کبھی نہ آیا۔ جب کبھی بارش۔ آندھی یا طوفان میں اسکول کھلا ہو اور قمرن نہ آئے۔

☆☆☆

میاں جی کا گھر بھی کیا آباد گھر تھا۔ من چاہی اچھے خاندان کی بیوی دو بیٹے اور ایک پیاری سی بیٹی۔ بیوی ہر فن مولا تھی نہ صرف اپنی گلی بلکہ اردگرد کی گلیوں سے بھی لڑکیاں بالیاں سلائی کڑھائی سیکھنے خالہ مزمل کے گھر آتی تھیں۔ وہ ساری دوپہر لڑکیوں کو مختلف ٹانکے سکھاتیں۔ پھر شام ہونے پر انہیں سبزی بنانے

باری باری روٹی ڈلواتیں۔ اور یوں ہنسی ہنسی میں وہ سلائی کڑھائی کے ساتھ کھانا پکانا بھی سیکھ جاتیں۔

بچے چھوٹے تھے اور معاشرے میں ابھی حیا باقی تھی۔ پنجاب کے ہر گھر میں ایک بات ہر ایک کو ازبر تھی۔ کہ دھییاں سانجھی ہوتی ہیں۔ بچیاں بھی ڈھکے ہوئے اور پورے لباس میں آتیں۔ بڑی بڑی اوڑھنیاں اوڑھے ہوئے اور جس گھر میں جاتیں وہ انہیں اپنی ذمہ داری سمجھتے۔

بچیاں اور ان کی مائیں مزمل خالہ کی گرویدہ تھیں کہ وہ زبان کی بہت میٹھی تھیں۔ ان کے ہاتھ کا بنایا ہوا اچار پورا سال خراب نہیں ہوتا تھا اکثر عورتیں لیموں اور کچے آم لیے آ جاتیں۔ اور وہ مسالوں کا حساب اور ڈالنے کا طریقہ سیکھ کے جاتیں۔ زندگی انتہائی بھرپور تھی۔

جب اچانک ہی میاں جی کی بیوی کو کسی موذی مرض نے آ لیا۔ تینوں بچے اپنی پڑھائیوں میں مصروف تھے۔ بڑا بیٹا گورنمنٹ کالج سے بی۔اے کر رہا تھا۔ چھوٹا انجینئرنگ یونیورسٹی چلا گیا تھا اور بیٹی میٹرک کا امتحان دے رہی تھی اور ابھی اس قابل نہیں تھی کہ گھر کا سارا انتظام سنبھال لیتی۔

تب انہوں نے مجبوراً وقت سے پہلے ریٹائرمنٹ لے لی اور بیٹی کے ساتھ گھر کا نظام چلانے لگے۔ کچھ پنشن اور کچھ ورثے میں ملی چند دکانوں کا کرایہ گھر کے اخراجات کے لیے کافی تھا۔ بیوی کا دوا دارو بھی سرکاری ہسپتالوں میں ہوتا رہا مگر وہ جاں بر نہ ہو سکی۔ تب انہوں نے ایک دم بزرگی اوڑھ لی اور وہ صادق بٹ سے ایک دم میاں جی بن گئے۔

شروع شروع میں انہوں نے بچوں کو سکھایا کہ وہ انہیں میاں جی کہیں اور پھر بچوں کی دیکھا دیکھی عورتیں اور پھر ان کے ہم عمر بھی انہیں میاں جی کہنے لگے۔

بیوی کی وفات کے بعد اکثر لوگوں نے انہیں

ہاتھوں میں چلا جائے۔ مگر جوان ہوتے بیٹوں اور بیٹی کی موجودگی میں انہوں نے کسی کی ایک نہ سنی۔ اور چپ چاپ زندگی کی گاڑی کھینچتے رہے۔

بڑے بیٹے نے ایم۔ اے کرلیا تو اسے مقامی کالج میں لیکچرر شپ مل گئی۔ وہ اپنی ساری تنخواہ لاکر ان کے ہاتھ پر رکھنے لگا۔ تو زندگی کچھ آسان لگنے لگی اور پھر وہ اس کے لیے لڑکی ڈھونڈنے لگے۔ کچھ دوستوں کی وساطت سے ایک پڑھی لکھی لڑکی ان کی بہو بن کران کے گھر کو آباد کرنے آ گئی۔ تب انہوں نے جانا ان کی محنت کافی حد تک وصول ہوگئی ہے۔ لڑکی جتنی صورت کی اچھی تھی۔ اتنی ہی سیرت کی اچھی ثابت ہوگی۔ یہ ان کے بڑے بیٹے عثمان کی بیوی انجم تھی۔ جس کے آنے پر وہ نہال پھرتے تھے۔

اب ان کی اپنی بیٹی اسماء بھی شادی کے قابل تھی۔ اس کے لیے رشتے آرہے تھے۔ مگر ابھی کوئی رشتہ ان کے دل کو نہیں لگا تھا۔ تب ہی کسی کی وساطت سے ڈاکٹر طاہر کا رشتہ آ گیا۔

لڑکا ڈاکٹر تھا۔ ان کے لیے یہی کافی تھا۔ وہ خوشی سے پھولے نہیں سمارہے تھی اور انہوں نے اس رشتے کے لیے ہاں کہنے میں ایک لمحے کی دیر بھی نہیں کی۔ اسماء کی شادی ہوگئی۔ ڈاکٹر طاہر میو ہسپتال میں کام کررہا تھا۔ ہسپتال کے اندر ہی اسے ایک صاف ستھرا چھوٹا سا گھر ملا ہوا تھا۔

وہ دونوں اکثر شام کو ان سے ملنے آجاتے۔ کبھی کبھار وہ انہیں زبردستی اپنے گھر لے جاتے۔ جہاں طاہر ان کو ہسپتال کا چکر بھی لگوالاتا۔ اور ان کا مکمل میڈیکل چیک اپ بھی ہو جاتا۔ چھوٹا ریحان بھی انجینئرنگ سے فارغ ہو چکا تھا اور آج کل وہ اپنی بہو کی مدد سے اس کے لیے لڑکیاں ڈھونڈ رہے تھے۔

مگر اسماء نے جانے کب سے اپنی سہیلی رفعت کو بھابھی بنانے کا سوچا ہوا تھا۔ تب اسماء کے زور دینے پر انہیں ہاں کرتے ہی بنی۔ اب صحیح معنوں میں شام کو کھلے صحن میں کرسیاں لگ جاتیں۔ دونوں بہوویں چائے کے ساتھ کچھ نہ کچھ بنالاتیں، میاں جی خود بھی چونکہ کھانے پینے کے شوقین تھے۔ اس لیے وہ خود بھی لاہور کی مشہور مچھلی لے آتے۔ کبھی کسی مشہور دکان کی مٹھائی لے آتے۔ اور کبھی جلیبیاں اور سموسے، اسماء آجاتی تو گھر اور بھی پررونق ہوجاتا۔ میاں جی بات بات پر قہقہے لگاتے۔ پھلجھڑیاں چھوڑتے۔

کبھی بیٹوں کے ساتھ دل لگی کرتے۔ اور کبھی داماد کے ساتھ، وقت گویا ان کے لیے سکون اور خوشیوں کے خزانے لے کر آیا تھا۔ وہ اکثر اپنی بیٹھک میں بیٹھے دوسروں سے کہتے۔

''کون کہتا ہے کہ سکون اور خوشیاں پیسے میں ہیں۔ سکون اور خوشی تو گھر کے سب افراد کے مل بیٹھنے میں ہے۔''

☆☆☆

ان ہی دنوں انہیں نانا بننے کی خوشخبری ملی۔ انہیں لگا کہ ان خوشیوں کو سمیٹنے کے لیے ان کا دامن تنگ پڑنے لگا ہے۔ اسماء اپنے بچے کی آمد کی تیاریوں میں تھی۔ جب ڈاکٹر طاہر نے امریکہ میں اسپیشلائزیشن کے لیے جانے کا ارادہ کرلیا۔

''بس ابا جی! چند سال کی بات ہے۔ یوں گزر جائیں گے۔'' طاہر نے چٹکی بجائی۔ ''خالی ایم۔ بی بی ایس کی ڈگری سے بات نہیں بنتی۔ امریکہ کی ڈگری کی تو بات ہی اور ہے۔'' اس نے چٹخارہ لیا۔

''ٹھیک ہے بھئی جیسے آپ کی مرضی۔'' میاں جی نے خوشی خوشی اجازت دے دی۔ آخر ان کی لاڈلی بیٹی کے مستقبل کا سوال تھا۔

اسماء کے بیرون ملک جاتے ہی وہ اس کی کمی محسوس کرنے لگے۔ شام کو چائے پیتے ہوئے وہ ان کی خالی کرسیوں کی طرف دیکھتے رہتے اور پھر آنکھوں میں آئے آنسو بھی چائے کے ساتھ پینے لگتے۔ بیٹی تو پرایا دھن ہے۔ اس نے تو جانا ہی تھا۔ وہ

اطلاع ملی۔ وہ اسے دیکھنے کے لیے دنوں بے چین رہتے۔ مگر پھر ایک سال کے بعد ان کے بیٹے بھی باپ بن گئے۔ قدرت نے ان کے دونوں بیٹوں کو بیٹوں سے نوازا اور وہ دو دو پوتوں کے دادا جان بن گئے۔ دادا جان بن کر ان کے پاؤں زمین پر نہیں ٹکتے تھے۔

ان ہی دنوں اسماء اور اس کا میاں بھی ایک مہینے کی چھٹی لے کر آ گئے۔ میاں جی کا گھر بچوں کی قلقاریوں سے بھر گیا۔ وہ خوش تھے اور بہت خوش بھی کبھی خیالوں میں اپنی بیوی سے مخاطب ہوتے۔

''او نیک بخت! تم نے تو یہ رونقیں دیکھی ہی نہیں۔ تم نے تو ان رشتوں کا مزہ چکھا ہی نہیں تم کیا جانو ان رشتوں کی محبتیں اور مزے۔''

اسماء ایک ماہ کے لیے آئی تھی۔ وہ ان سب کے لیے ڈھیروں تحائف لائی تھی۔ میاں جی کے لیے سویٹر، جیکٹیں مفلر، گرم جرابیں، بھائیوں، بھابیوں اور ان کے بچوں کے لیے بھی طرح طرح کی چیزیں۔

بھابیاں ایک ایک چیز کو ہاتھ لگا لگا کے دیکھتیں اور حسرت سے کہتیں بھئی باہر کی چیزوں کی تو بات ہی اور ہے۔

میاں جی بھی اسماء کی لائی ہوئی گرم جرابیں اور سویٹر پہنے اترائے ہوئے پھرتے۔ اور بچوں کے سامنے مسکراتے ہوئے کہتے کہ'' بھئی اس سال تو سردیوں کا پتا ہی نہیں لگا۔ آخر امریکہ کی جرابیں اور سویٹر تھے سردی کیسے لگتی۔''

''اور وہ بھی اسماء کے ہاتھ کے۔'' کوئی بیٹا لقمہ دیتا۔

''یہ بات بھی ٹھیک ہے۔'' وہ اثبات میں سر ہلاتے۔

☆☆☆

سردیاں رخصت ہو رہی تھیں۔ بہار کی آمد آمد تھی۔ جب ایک دن شام میں ان کا بڑا بیٹا اور بہو خوشی

کر صحن میں بچھی کرسیوں پر آ بیٹھے۔

''ابا جی! میں نے پی ایچ ڈی کے لیے اپلائی کیا ہوا تھا۔ مجھے مانچسٹر یونیورسٹی میں پی ایچ ڈی کے لیے داخلہ مل گیا ہے۔ ہمیں اگلے مہینے جانا ہوگا۔''

''اچھا! میاں جی حیران ہوئے۔'' تم نے کبھی ذکر تو نہیں کیا تھا کہ تم باہر پڑھنے کے لیے جانا چاہتے ہو۔ یہ کتنے سال کا کورس ہے؟'' انہوں نے پوچھا۔

''اس میں تین سال تو لگ ہی جاتے ہیں۔ بس دعا کریں میں جلدی کامیاب ہو جاؤں۔'' وہ بولا۔

''اللہ تمہیں کامیاب کرے۔ بیوی بچے کی فکر نہ کرنا۔ میں ہوں نا۔ ان کے سر پر بے فکر ہو کر جاؤ۔ اور پڑھ لکھ کے آؤ۔''

تب انجم نے عثمان کی طرف اور عثمان نے انجم کی طرف دیکھا اور چند لمحوں کے بعد کھنکھارتے ہوئے قدرے جھجکتے ہوئے بولا۔

''ابا جی! مجھے جو وظیفہ ملے گا۔ اس میں میری فیملی بھی بہت اچھی طرح رہ سکتی ہے۔''

''اور پھر ابا جی یہ وہاں جا کر پڑھیں گے یا کھانے پینے کے چکروں میں پڑے رہیں گے۔ ان کو تو انڈا بھی ابالنا نہیں آتا۔'' انجم نے ہنستے ہوئے کہا۔

''تو تم بھی چلی جاؤ گی؟'' میاں جی کچھ پریشان ہوئے۔

''ابا جی تین سالوں کی تو بات ہے۔ یوں گزر جائیں گے۔'' عثمان نے چٹکی بجائی۔

''یوں تو نہیں گزرتے اسماء کے جانے کے بعد میں دن ہی گنتا رہتا ہوں کہ اب اس کے آنے میں کتنے دن باقی ہیں۔ مگر دن ہیں کہ گزرتے ہی نہیں۔''

''اللہ بہتر کرے گا ابا جی!'' عثمان بولا۔

''بہتر مستقبل کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا ہی پڑے گا۔''

اس دن وہ چائے پیے بغیر ہی چلا گیا۔ کہ ابھی اس نے باہر کے سو کام نمٹانے تھے اور پھر ان کے

تو بیوی اور بچے کو لے کر باہر چلا جاتا۔ پاسپورٹ بنوانے تھے۔ ویزے کے لیے ایمبیسی جانا تھا۔ کئی طرح کے انجکشن لگنے تھے۔ انجم نے اپنے کئی طرح کے کپڑے خریدے اور سلوائے۔ بس سارا دن درزیوں کے چکر بازار کے پھیرے انجم لگاتی۔ اور دفتروں کے کام وہ نمٹاتا پھرتا۔

میاں جی اڑی اڑی ہوئی رنگت کے ساتھ یہ ساری کارروائی دیکھتے رہتے۔ انہیں اپنے پوتے ہادی سے بہت پیار تھا۔ وہ سارا دن اپنے پوتوں سے دل بہلاتے تھے۔ اب یہ جا رہا ہے۔ جانے پھر کب ملنا ہو۔ ان کی آنکھیں اکثر ڈبڈبائی رہتیں اور وہ سب سے چھپا کے آنسو پیتے رہتے۔ کئی دفعہ وہ عثمان اور اس کی بیوی سے شکایت کرتے۔

''کہ بھئی تمہارے تو پاؤں زمین پر نہیں ٹک رہے۔ جب سے تم لوگوں نے جانے کا سنا ہے۔ میں تو تمہاری آوازوں کے لیے ترس گیا ہوں۔ نہ اب کبھی تم لوگ چائے میں شریک ہوتے ہو۔ نہ کھانے میں۔''

تب وہ دونوں ان کے پاس آ بیٹھتے۔ ''اباجی! بس یہ سرکاری کاموں نے مت ماری ہوئی ہے۔ کیا کریں۔ شکر کریں گے۔ جب سارے کام ختم ہو جائیں گے۔''

''اباجی ہم آپ کو بہت یاد کریں گے۔ اور خاص طور سے یہ ہادی۔ اس کا جانے کیسے دل لگے گا۔'' انجم کہتی۔

''اسی لیے تو کہتا ہوں۔ تم نہ جاؤ عثمان! پڑھ کے آ جائے گا۔ کنوارے لڑکے تو آخر جاتے ہی ہیں نا۔'' وہ پرامید نظروں سے دونوں کی طرف دیکھتے۔

''اباجی! ان کے اخراجات پورے نہیں ہوتے ہوں گے۔ جو وہ اکیلے رہتے ہیں۔ ہمیں تو اتنے پیسے حکومت دے گی کہ ہمارا آسانی سے گزارا ہو جائے۔'' عثمان فوراً بولتا۔ ''اور پھر اباجی میں بھی اکیلا نہیں رہ سکتا۔ میں پڑھائی کروں یا گھر داری۔''

جاتے۔

☆☆☆

عثمان اور انجم کے جانے سے گھر کی آدھی رونق ختم ہو گئی۔ وہ افسردگی سے سوچتے۔

''اچھا چلو چند سالوں کی بات ہے۔'' وہ اپنے دل کو تسلی دیتے اب جب وہ اپنے تھڑے پر بیٹھتے۔ تو بظاہر بڑے معتبرین کے بیٹھتے ان کا بیٹا پی ایچ ڈی کرنے گیا تھا۔ جو کوئی معمولی بات نہ تھی۔ وہ جانتے تھے کہ واپسی پر ملک کی جس یونیورسٹی میں وہ چاہے گا۔ چلا جائے گا۔ وہ اندر سے جتنے بھی دکھی تھے۔ بچوں کے مستقبل کے لیے دل کو مضبوط کیے بیٹھے تھے۔

اب گھر میں ریحان اور رفعت رہ گئے تھے۔ اپنے ننھے بیٹے عبداللہ کے ساتھ، وہ سارا دن عبداللہ کو کندھوں پر اٹھائے پھرتے۔ اسے گھماتے پھراتے۔ اس کے لیے کھلونے لے کر آتے۔ ابھی وہ سال کا نہیں ہوا تھا کہ وہ اس کے لیے ٹرائی سائیکل لے آئے۔

وہ حسرت سے دوسروں کے بچوں کو سائیکلیں چلاتے دیکھتے اور سوچتے یہ کب بڑا ہو گا اور سائیکل چلائے گا۔

رفعت گھر کے کاموں میں مصروف رہتی۔ اور وہ اپنے پوتے سے دل بہلاتے۔ اسی دوران انہوں نے رفعت کی مدد کے لیے گھر میں ایک لڑکا رکھ لیا۔ بارہ تیرہ سال کا شکورا کاموں میں کافی تیز تھا۔ صفائی اور برتن بڑی جلدی دھو لیتا۔ کپڑے استری کرنے بھی آہستہ آہستہ سیکھ رہا تھا۔ اس کے آنے سے رفعت کو کافی آسانی ہو گئی تھی۔ کاموں کے ساتھ ساتھ سارا دن اس کی زبان بھی چلتی۔ فارغ وقت میں وہ باہر گھومنے پھرنے نکل جاتا۔ اور پھر واپسی پر ہر گھر کی خبر اس کے پاس ہوتی۔

☆☆☆

مگر ان کی زندگی میں بھونچال اس دن آیا۔

پہنچتی آوازوں میں ان کو اطلاع دی کہ وہ بھی اپنی اعلا تعلیم کے لیے بیرون ملک جا رہے ہیں۔ ان کا بلاوا آسٹریلیا سے آیا تھا اور انہوں نے جون میں جانا تھا۔ ان کے جانے میں ابھی چھ ماہ باقی تھے۔

''تم اپنی بڑی بہن اور بھائی کو تو آنے دو۔ تاکہ گھر میں کوئی تو ہو اس طرح میں کیسے گزارا کروں گا۔'' وہ رو دینے کو تھے۔

''ابا جی چانس بار بار نہیں ملتے وہ بھی آجائیں گے۔ مگر ان کے انتظار میں بیٹھ کے میں وقت ضائع نہیں کر سکتا۔ کیونکہ یہ تو آپ خود کہتے تھے کہ جو وقت ضائع کرتا ہے۔ وقت اس کو ضائع کر دیتا ہے۔ بس ہم یوں گئے اور یوں آئے بلکہ آپ یوں کیوں نہیں کرتے کہ میں آپ کا بھی پاسپورٹ بنوا لیتا ہوں۔ آپ چار چار ماہ تینوں بچوں کے پاس رہیں ہمارا بھی دل لگا رہے گا اور آپ کا بھی۔'' ریحان چہکا۔

''نہیں میرا اپنا ملک چھوڑ کے کہیں اور جانے کو دل نہیں کرتا۔'' انہوں نے کمزور سا احتجاج کیا۔

''اچھا چلیں میں آپ کا پاسپورٹ تو بنواؤں پھر جب کبھی آپ کا دل چاہا آپ آجائیں۔'' ریحان بولا۔

''بلکہ ابھی ہمارے ساتھ چلیں۔'' رفعت بولی۔

''عبداللہ آپ کے بغیر کیسے رہے گا۔'' رفعت بولی۔

''نہیں ابھی نہیں۔'' ریحان بولا۔ ''ہم جا کر رہائش وغیرہ کا بندوبست کر لیں۔ پھر ابا جی آئیں گے۔'' گویا اس نے فیصلہ سنا دیا۔

''مگر میں اکیلا کیسے رہوں گا۔'' وہ چاہتے تھے۔ کہ وہ بچوں کے سامنے کبھی کمزور نہ پڑیں۔ مگر اب چاروں طرف سے انہیں لگتا۔ تنہائی نے گھیر لیا ہے یا انہیں تنہا کسی جنگل میں چھوڑ دیا گیا ہے۔ ''میں اکیلے کیسے صبح سے شام کروں گا۔ وہ افسردگی سے بولے۔

''یہ لڑکا شکورا ہے نا آپ کے پاس۔'' ریحان بولا۔

طرف دیکھا۔ جس نے بالکل آنکھیں ماتھے پر رکھی ہوئی تھیں۔

''کیا ملازم اولاد کا نعم البدل ہو سکتے ہیں؟'' انہوں نے دکھ سے پوچھا۔

''ابا جی آپ نے یہ سوال بھائی کی دفعہ کیوں نہیں پوچھا۔ بھائی گیا تو آپ نے خوشی خوشی رخصت کیا اور اب میری دفعہ ساری پابندیاں لگائی جا رہی ہیں۔''

تب انہوں نے زبان بند کر لی۔ مگر جس دن ریحان اور رفعت چلے گئے۔ وہ اپنے کمرے میں بیٹھے کافی دیر تک بہتی آنکھوں سے ان کی بچپن کی تصویریں دیکھتے رہے۔ اس دن نہ انہوں نے کام والے لڑکے کو بلایا۔ نہ کھانا کھایا۔ اور نہ چائے پی۔

اگلی صبح وہ بہت دیر سے گھر سے باہر نکلے ان کے تھڑے پر چھاؤں آچکی تھی۔ شکورے نے چھڑکاؤ کر کے جھاڑو دے کر باہر کرسیاں لگا دی تھیں۔ وہ باہر نکل کر بیٹھے تو چند اردگرد کے لوگ بھی آ کر بیٹھ گئے۔

''میاں جی! یہ کیا پڑھائی اور نوکریوں کے نام سے کالی آندھی اٹھی ہے۔ جس نے گھر کے گھر خالی کر دیے ہیں۔ جدھر دیکھیں گھر میں بڈھا بڈھی پڑے ہیں۔ اور اولاد جہازوں میں بیٹھ کر دوسرے ملک آباد کرنے گئی ہوئی ہے۔'' ان کا سامنے والا ہمسایہ رفیق بٹ بولا۔

''اور کیا اگر اس پڑھائی سے دوسرے ملکوں کو ہی فائدہ پہنچنا تھا۔ تو ہم اس تعلیم سے ویسے ہی بھلے۔'' باقی لوگ بھی اپنی اپنی رائے کا اظہار کرنے لگے۔

''میاں جی آپ بھی ساتھ ہی چلے جاتے۔ پیچھے رہ کے آپ کیا کریں گے؟'' کسی اور نے لقمہ دیا۔

''ہاں ریحان میرا پاسپورٹ اور ویزہ لگوا کے گیا ہے۔ ذرا سیٹ ہو لے پھر میں بھی چلا جاؤں گا۔''

وہ لوگوں سے زیادہ اپنے آپ کو ہی ڈھکے رکھتے تھے۔

وہ دوپہر کو گھر آئے۔ تو شکورے نے کسی سبزی کا ملغوبہ بنا رکھا تھا۔ ساتھ میں خشکہ ڈال ڈال کے پتھر جیسی روٹیاں۔ موٹے کناروں والی انہوں نے کل سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ مگر یہ سالن تو نگلنا ہی مشکل تھا۔ انہوں نے فریج دیکھا۔ تو خالی پڑا تھا۔ کیا تھا جو بہو چند دن کا کھانا بنا کر فریز کر جاتی۔

تب انہوں نے ڈبل روٹی نکالی اور دودھ کے ساتھ چند سلائس زہر مار کر لیے۔ کہ کل سے کچھ نہیں کھایا تھا ایسا کیسے گزارا ہوگا۔ وہ ساری رات سوچتے رہے۔

☆☆☆

پھر وہ سبزی لاتے تو دھونے کاٹنے اور پکانے تک پاس کھڑے رہتے۔ انہیں لگتا اب وہ کچھ بہتر پکانے لگا ہے یا وہ اس کے عادی ہوتے جا رہے تھے۔ جانے کیسے روتے دھوتے چند مہینے گزرے۔ کہ ان کی بیٹی کی طرف سے بلاوہ آ گیا۔ اس دن رات میں اس کا فون آیا کہ آپ کا ویزہ ریحان لگوا کے گیا تھا۔ میں اور ننھی زینب بہت اداس ہیں۔ طاہر بھی آپ کو یاد کرتے ہیں۔ آپ میرے پاس آجائیں۔"

وہ بھی اس سارے جنجال سے تنگ آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے ٹکٹ خریدا۔ شکورے کو اس کے گھر بھیجا اور امریکہ بیٹی کے پاس پہنچ گئے۔ وہ گئے تو کئی دن تک نہال رہے۔ شکر ہے۔ میں اپنے بچوں میں آیا ہوں۔ وہ اللہ کا شکر ادا کرتے نہ تھکتے۔

☆☆☆

وہ دو مہینے جیسے ہواؤں میں اڑتے رہے۔ وہ اپنی نواسی کو لے کر گھر کے قریب ہی ایک لمبا چکر لگا آتے۔ چند منٹوں کے فاصلے پر اسکول تھا۔ جس کی دوسری طرف بڑے بڑے گراؤنڈ اور پارک تھا۔ وہ زینب کو پارک میں لے جاتے۔ وہ دونوں وہاں گھنٹوں گزارتے۔ واپس آنے تک ان کی بیٹی گھر کے کام کاج سے فارغ ہو چکی ہوتی۔ وہ دونوں بیٹھ کے فون کر کے دونوں کی باتیں کرتے۔

بیٹے ان کے یہاں آنے سے بہت خوش تھے۔ ڈاکٹر طاہر شام کو چھ سات بجے تک آتے۔ پھر گھر میں اور بھی رونق ہو جاتی۔ مگر بچی کے — اسکول کھلنے پر جب بیٹی بھی ساتھ ہی تیار ہو گئی اور اس نے انہیں بتا دیا کہ ان کا ناشتہ میز پر رکھا ہے۔ چائے مائیکروویو میں ہے۔ کھانا پکا ہوا ہے۔ وہ دوپہر کو گرم کر کے کھا لیں۔ روٹیاں فریزر سے نکال کے توے پر سینک لیں۔ یا اوون میں گرم کر لیں۔

تو انہوں نے حیرانی سے بیٹی سے پوچھا۔

"تم کہاں جا رہی ہو؟" تب انہیں پتا چلا کہ زینب اسلامک سینٹر کے اسکول میں جاتی ہے۔ جہاں اسماء نے بھی وقت گزاری کے لیے نوکری کر لی ہے۔ تب ان کا بڑا دل چاہا کہ وہ پوچھیں کہ میں وقت کیسے گزاروں گا۔

خیر اس دن انہوں نے ناشتہ اور کھانا زہر مار کیا۔ وہ باہر پارک تک گئے۔ مگر رنگ برنگے بچے دیکھ کر لوٹ آئے۔ خالی گھر اور خالی دیواریں انہیں کاٹ کھانے کو دوڑنے لگیں۔ ٹی وی لگانے کی کوشش کی۔ تو کوئی کام کا اسٹیشن نہیں ملا۔ تب تنگ ہار کر وہ باہر ڈیک پر کرسی نکال کے بیٹھ گئے اور اردگرد کے خالی گھروں کا نظارہ کرنے لگے۔

بڑی مشکل سے شام ہوئی اور چار بجے کے قریب زینب کو لے کر اسماء گھر پہنچی۔ میاں جی ایک دم خوش ہو گئے۔ جیسے قید سے رہا ہوئے ہوں۔ کہ اب چلو باقی وقت تو اچھا گزرے گا۔ مگر اسماء نے آتے ہی ان سے سرسری سا حال پوچھا۔ کپڑے بدلے زینب کا یونیفارم بدلا۔ اس کے اور اپنے لیے کھانا گرم کیا۔

کھانے سے فارغ ہو کر زینب تو اتنی تھکی ہوئی لگ رہی تھی کہ وہ بیٹھے بیٹھے ہی صوفے پر لڑھک گئی۔ اسماء نے اگلے دن کے کھانے کی تیاری شروع کی۔ کھانا بنتے بنتے طاہر آ گیا۔ اس کو کھانا دیتے عشاء پڑھتے اگلے دن کے کپڑے تیار کرتے اسماء اتنی تھک چکی تھی کہ وہ دس بجے ہی سونے چلی گئی۔

ہور پھر یہ کہتے ہوئے اٹھ گئے۔ "کہ آپ ٹی وی دیکھیں ہم سوتے ہیں۔ کیونکہ صبح جلدی اٹھنا ہے۔"

اور پھر یہ روز کا معمول بن گیا۔ اکیلے ڈیک پر بیٹھے بیٹھے وہ اکتا کر اٹھتے اندر سے کوئی فروٹ لا کر کھا لیتے۔ یا باہر کا ایک چکر لگا آتے۔ اور آ کر پھر بیٹھ جاتے۔ چند ہی دنوں میں وہ اس روٹین سے اکتا گئے۔ تب عثمان کے فون آنے لگے۔ کہ وہ ان کے پاس آ جائیں اور آخر کار چار مہینوں کے بعد وہ عثمان کے پاس پہنچ گئے۔

☆☆☆

مانچسٹر ایک خوب صورت شہر تھا۔ وہاں یونیورسٹی کے قریب ہی عثمان نے اپارٹمنٹ لیا ہوا تھا۔ وہ وہاں جا کر ایک دم پرسکون ہو گئے۔ انہوں نے ہادی کو دیکھا۔ جو ایک سال میں کافی بڑا ہو گیا تھا۔ توتلی زبان اب کافی صاف ہو گئی تھی۔ شروع میں وہ ان سے شرمایا شرمایا اور دور دور رہا۔ مگر پھر آہستہ آہستہ دونوں کی دوستی ہو گئی۔

انجم نے گھر کو بڑے سلیقے سے رکھا ہوا تھا۔ دو کمروں کا یہ اپارٹمنٹ ان کی ضرورت کے لیے کافی تھا۔ وہ صبح اٹھتی۔ میاں کا اور اپنا ناشتہ بناتی۔ ناشتے کے بعد میاں کو دفتر چھوڑتی اور واپسی پر گھر کا سودا سلف لیتی آتی۔ تب تک اگر ہادی جاگ جاتا تو وہ میاں جی کے ساتھ کھیلتا رہتا۔

انجم اس کا دودھ فیڈر میں ڈال کر رکھ جاتی۔ میاں جی اسے دودھ پلانے کے ساتھ ساتھ لاہور شہر کی کہانیاں سناتے اور انجم کے آنے پر وہ ناشتہ کرتے اور پھر کسی کھڑکی کے ساتھ کرسی ڈال کے بیٹھ جاتے اور آتی جاتی ٹریفک کو دیکھتے رہتے۔ کبھی کبھار وہ انجم سے کسی مشین کو چلانے کے بارے میں پوچھتے تو وہ انہیں اتنی اچھی طرح سمجھاتی بلکہ انہیں ایک دو دفعہ آ کے دیکھتی کہ وہ اسے ہنس کے کہتے۔

"تم تو بنی بنائی استاد ہو۔"

چند دن ہوئے انجم دودھ بنا کے ہادی کے

جی خود ہی دودھ بنا کر اسے پلا دیتے یا کبھی کبھار وہ میاں جی کو کہہ دیتی۔

"ابا جی! میں جلدی سے ان کو چھوڑ آؤں۔ آپ ڈش واشر میں برتن لگا کے چلا دیں۔ سارے گندے پڑے ہیں۔ میرے آنے تک دھل جائیں گے یا یہ گاربج کا تھیلا نیچے ڈرم میں رکھ دیں۔ یہ دفتر سے لیٹ ہو رہے ہیں میں ان کو چھوڑ آؤں۔"

میاں جی خوشی خوشی سارے کام کر دیتے۔ مگر پلیٹیں کھنگالنے میں ان کے کپڑوں پر چھینٹے پڑ جاتے۔ واشنگ مشین میں کپڑے ڈال کر کبھی وہ بہت گرم پانی پر سیٹ کر دیتے تو کپڑوں کے رنگ نکل نکل کے دوسرے کپڑوں پر چڑھ جاتے۔ مگر وہ بغیر برا مانے ان کو آہستہ آہستہ ہر چیز سکھا رہی تھی۔

پہلے مہینے وہ واشنگ مشین میں کپڑے ڈالنے اور ڈرائر سے سوکھے ہوئے نکالنے کے بعد ان کو تہہ کر کے رکھنے لگے۔ ڈش واشر میں پلیٹیں چمچے اور ڈونگے وہ کھنگال کر ڈالنے لگے۔ صبح کا ہادی کا دودھ وہ بنانے لگے۔ نیچے کوڑے کا تھیلا ڈرم میں رکھ کے آنے لگے اور پھر سارا دن ہادی کے ساتھ کبھی باہر اور کبھی گھر کے اندر وقت گزرنے لگا۔

پہلے مہینے کے آخیر میں عثمان انہیں بازار لے گیا اور ان کے ہزار منع کرنے پر اور نہ نہ کرتے بھی ان کے لیے جینز کی پینٹ اور دو قمیصیں خرید لیں۔

"ابا جی! آپ روز اپنی قمیصوں پر داغ لگا لیتے ہیں۔ انجم کو وہ داغ نکالتے کافی وقت لگتا ہے اور پھر شلوار قمیصوں کی استری وہ بے چاری بھی کیا کیا کرے۔ تھک جاتی ہے۔ صبح سے شام تک مشین بنی رہتی ہے۔ بس یہ کپڑے آپ دھوئیں اور پہنیں نہ استری کی ضرورت نہ کسی اور چیز کی۔"

خیر اس کے بعد وہ جینز اور قمیص پہننے لگے۔ جس میں شروع شروع میں انہیں بہت شرم بھی آئی اور برا بھی لگا۔ مگر مرتا کیا نہ کرتا کہ کپڑے استری کرنے انہیں آتے نہیں تھے۔ نہ ہی انہیں کبھی ضرورت پڑی

تی۔

دو مہینے پلک جھپکتے گزر گئے۔ انہیں گھر میں چلتی پھرتی انجم نظر آتی جو انہیں کبھی چائے، کبھی کوئی پھل یا کبھی خشک میووں کی پلیٹ پکڑا جاتی۔ کبھی کبھار ان کے ساتھ بیٹھ کے وہ حالات حاضرہ پر تبصرہ بھی کرتی۔ جس میں وہ یہاں کی ہوشربا مہنگائی اور ٹیکسوں کے بارے میں بتاتی اور آخر تان یہاں آ کر ٹوٹتی کہ دونوں میاں بیوی کو کام کرنا چاہیے۔ ورنہ وقت نہیں گزرتا۔

وہ بھی بظاہر قائل نظر آتے۔ کیونکہ انجم ان کی پسندیدہ بہو تھی اور وہ اس کی عقل و دانش اور سلیقے کے قائل تھے۔ مگر جب دوسرے مہینے کے آخر میں انجم اور عثمان نے انہیں اطمینان سے اطلاع دی کہ انجم کو ایک اسٹور میں کیشیئر کی نوکری مل گئی ہے۔ تو وہ پریشان ہو گئے کہ اب پھر خالی ڈھنڈار گھر اور کرنے کو کچھ بھی نہیں۔ اب وہ کیا کریں گے۔

☆☆☆

اس صبح جب انجم کی نوکری کا پہلا دن تھا۔ وہ صبح صبح ان کے کمرے میں ہادی اور اس کا بیگ چھوڑ گئی۔

''ابا جی اس میں ہادی کے ڈائپر ہیں۔ ویسے تو اگر آپ چاہیں تو وہ واش روم جانا بتا بھی سکتا ہے۔ بس بار بار پوچھتے رہیں۔ دودھ آپ پہلے بھی بنا لیتے ہیں۔ جب مانگے تب دیں۔ ورنہ اپنے ساتھ جو خود کھائیں۔ وہ اسے بھی کھلا دیں۔ اور ہاں ڈش واشر میں میں نے برتن لگا دیے ہیں۔ آپ ہادی کی بوتلیں اور اپنے کھانے کے برتن لگا کر چلا دیں۔ واشنگ مشین دیکھ لیں۔ اگر کافی کپڑے ہو گئے ہیں تو چلا دیں۔ ورنہ کل چلا لیں گے۔ کھانا فرج میں پڑا ہے۔ اور روٹی فریزر میں آپ کا جب دل چاہے۔ نکال کے گرم کریں اور کھائیں میں شام میں آ کر کھانا بنا لوں گی۔''

تب وہ حیران نظروں سے اسے دیکھتے رہ گئے۔ کہ یہ سارا کام میرے سر پر ڈال گئی ہے۔

اور پھر وہ پہلا دن سارا دن ہادی نے انہیں وہ سنبھالا۔ کبھی وہ ماں کے پاس جانے کی ضد کرنے لگتا۔ دو دفعہ اس نے کپڑے گیلے کیے وہ ان کی نظر بچا کے نل کھول کے کھڑا ہو جاتا۔ ڈائپر بدلتے ہوئے وہ ٹانگیں چلانے لگتا اور اسی دھینگا مشتی میں ان کی عینک گر کر ٹوٹ گئی۔ وہ ٹوٹی ہوئی عینک لے کر پریشان بیٹھے تھے جب عثمان کا فون آ گیا۔ تب انہوں نے پریشانی سے عینک کے بارے میں بتایا کہ ہادی نے کیسے ان کی عینک توڑ دی ہے۔

''ابا جی خیر ہے۔ عینک بن جائے گی۔ ہادی نے کچھ کھایا ہے یا نہیں اور آپ نے ڈش واشر تو چلا دیا ہوگا اور واشنگ مشین بھی بس کپڑے احتیاط سے نکال کے تہہ کر کے رکھ دیں یہاں تو ہر کوئی کام کرتا ہے۔ تو تب ہی گھر کا چولہا جلتا ہے۔ آپ زیادہ بور تو نہیں ہو رہے۔''

وہ اپنی ہی ہانک رہا تھا اور وہ جنہوں نے کبھی پانی کا گلاس تک خود نہیں پیا تھا۔ پوتے کو سنبھالتے اور گھر کے دیگر کاموں کو نبٹاتے ہلکان ہو رہے تھے۔

دوپہر کو ہادی نے جو رونا شروع کیا۔ تو کسی طور چپ نہ ہوا۔ تب وہ اسے اٹھا کے باہر لے گئے۔ تاکہ پارک میں ہی شاید اس کا دل بہل جائے۔ مگر روتے ہوئے بچے کو لے کر سڑک کراس کرتے ہوئے اتنے مشکوک لگ رہے تھے۔ کہ انہیں پولیس نے روک لیا۔ پولیس مین کوئی سکھ تھا۔ اس لیے وہ دبے دبے جوش سے ان کو گدی سے پکڑے کھڑا تھا۔

''ہاں جی تے سرکار فوجاں گھتوں بال چک کے لیار ہیاں نیں۔ (کہاں سے بچہ اٹھا کے لا رہے ہیں)۔''

انہوں نے لاکھ یقین دلایا کہ یہ ان کا پوتا ہے۔ اس کی ماں جاب پر اور باپ یونیورسٹی گیا ہے۔ مگر وہ بھی سردار جی تھے۔ اتنی جلدی مان لیتے۔ تب انہوں نے عثمان کو یونیورسٹی فون کیا۔ اور اس نے آ کر ان کی جان خلاصی کروائی۔

''ابا جی! آپ کو کیا ضرورت تھی ہادی کو باہر لے جانے کی۔ یہ اس کی فیڈ کا وقت تھا۔ آپ اس

کھانے کو کچھ دیتے اور وہ چپ ہو جاتا۔ ان کو ان کی باتوں میں سے سبکی محسوس ہو رہی تھی۔

"تم تو یوں کہہ رہے ہو جیسے میں نے ساری عمر یہی کام کیا ہے۔ میں نے کب بچے پالے ہیں۔ مجھے تو بچوں کو بہلانا بھی نہیں آتا۔" ان کی آنکھوں میں اپنی بے بسی پر آنسو آ گئے۔

"اباجی! وہاں تو آپ ہادی کے لیے اتنے اداس تھے۔ کہ پل پل گنتے تھے اور اب یہاں آتے ہی پہلے دن ہی آپ اس سے تنگ پڑ گئے ہیں۔"

ہادی باپ کے کندھوں سے لگا انہیں دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ وہ بھی اسے دیکھ کے مسکرا اٹھے۔ لو جانے یہ بچے بھی کیسے کیسے امتحان لیتے ہیں۔

عثمان نے گھر آتے ہی پہلے کوڑے دان سے کوڑا نکالا۔ وہاں نیا بیگ چڑھایا۔ اور میاں جی کی طرف بغیر دیکھے بولا۔

"اگر کوڑا وقت پر نیچے نہ رکھیں۔ تو وہ اگلے دن تک ڈرم میں ہی پڑا رہتا ہے۔ شکر ہے میں نے دیکھ لیا۔ ورنہ انجم پریشان ہوتی۔"

میاں جی وہاں چند دنوں میں ہی پریشان ہو اٹھے۔ "گھر میں ہر طرف گند ہے۔" عثمان کہتا تو انجم فوراً بول اٹھتی۔

"میں تو صبح جاتی ہوں۔ شام میں آتی ہوں اور آتے ہی پھر جت جاتی ہوں۔ کیا کیا کروں۔"

"اباجی یہ ویکیوم کلینر ہے۔ یہ یہاں سے چلتا ہے۔ اگر آپ کر دیں تو آپ کا وقت بھی اچھا گزر جائے گا۔ ورنہ فالتو بیٹھے بیٹھے تو دن کاٹنا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔" عثمان نے ویکیوم کلینر گھر میں چلاتے ہوئے کہا۔

تب ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ "یہ سارے کام تم خود کرو۔ یا تمہاری بیوی کرے۔ اور ہادی کے لیے بھی کوئی ملازم رکھو۔ میں اب گھر جاؤں گا بہت دن رہ لیا۔"

انہوں نے دوٹوک انداز میں کہا۔ تب انجم ہاتھ جوڑے ان کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

اباجی! مجھے معاف کر دیں۔ [illegible] کے وظیفے میں گزارا نہیں ہوتا۔ تو میں نے اس لیے نوکری کی ہے۔ کیونکہ ہادی کی تعلیم بھی شروع ہونے والی ہے۔ بس اس کے لیے یہ ساری بھاگ دوڑ ہو رہی ہے۔ آپ کچھ بھی نہ کریں۔ بس ہادی کو اپنے پاس رکھیں۔ تاکہ وہ آپ کے سائے میں پلتا رہے۔" وہ آنکھیں رگڑتی ہوئی بولی۔

"اباجی کام میں عظمت ہے۔ ہم لوگ تو فضول میں اپنے آپ کو بیکار بنا کے بیٹھ جاتے ہیں۔ یہاں تو ہر فرد کام کرتا ہے۔ اسی لیے یہ لوگ ہم سے اتنے آگے نکل گئے ہیں۔" عثمان بولا۔

"تم ابھی سے ان سارے کاموں کی ٹریننگ لے لو۔ تاکہ کل کو تمہارا بیٹا تمہیں محنت کی عظمت پر لیکچر دینے نہ بیٹھ جائے۔ میں نے جو اور جتنا کرنا تھا کر چکا ہوں۔ میری سیٹ بک کراؤ۔ میں اسی ہفتے چلا جاؤں گا۔"

تب وہ دونوں میاں بیوی انہیں منانے میں لگ گئے۔ مگر وہ جس بات کا ارادہ کر لیتے تھے۔ اسے پورا کرتے تھے۔ گھر سے نکلے چھ ماہ ہو گئے تھے۔ اگرچہ وہاں کی زندگی میں بھی کوئی دلکشی نہیں تھی۔ مگر اس طرح غلامی کا احساس بھی نہیں تھا۔

دوسری طرف انجم بے حد پریشان تھی۔ کہ ان کے چلے جانے سے اس کی نوکری کا کیا بنے گا۔ کیونکہ جتنی اس کی تنخواہ تھی۔ اس سے آدھی اگر بے بی سٹر کو دینی پڑتی تو باقی کیا بچتا تھا۔ وہ انہیں ایک ایک ہفتہ کہہ کے ٹالتے رہے۔ ان دنوں ہادی کبھی بستر سے کودتا ہوا گر کے چوٹ لگوا لیتا۔ اور کبھی واش روم میں پھسل جاتا۔ ایسے میں وہ خود اس کے پیچھے بھاگ بھاگ کے ہلکان ہوتے رہتے۔ انہیں لگتا وہ کسی پنجرے میں بند ہو گئے ہیں۔ جہاں سے واپسی کا کوئی راستہ نہیں۔

☆☆☆

وہ بھی ایک ایسا ہی دن تھا۔ دوپہر کو ہادی کو سلا کے وہ اندر کی گھٹن سے تنگ آ کر باہر نکل آئے۔ وہ

تھا۔ مگر سیٹ بک نہیں تھی۔ ان کا خیال تھا کہ جب چھ ماہ پورے ہوں گے۔ تو وہ خوشی خوشی چلے جائیں گے۔ مگر اب ان حالات میں ان ذمہ داریوں میں تو وہ ایک دن بھی رہنا نہیں چاہتے تھے۔ وہ گھر کے آگے ہی بے خیالی میں ٹہل رہے تھے۔ جب کسی نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ''میاں جی۔''

انہوں نے اچانک پلٹ کے دیکھا تو یوں لگا۔ جیسے قارون کا خزانہ ہاتھ لگ گیا ہو۔

''ارے طارق تم!'' طارق ان کے جگری یار صفدر کا بیٹا تھا۔ جو کئی سالوں سے ادھر ہی رہ رہا تھا۔

''میاں جی! آپ کدھر؟'' وہ ابھی تک ان سے لپٹا کھڑا تھا۔

''آؤ گھر میں، تمہیں بتاتا ہوں۔'' وہ اسے لیے ہوئے گھر کے اندر آگئے۔ تب ہی ہادی کے رونے کی آواز بھی آنے لگی۔ میاں جی نے جا کے اسے اٹھایا۔ طارق کے سامنے ہی اس کا ڈائپر بدلا۔ اسے دودھ بنا کے دیا۔ اور پھر اس کے پاس آ کر بیٹھ گئے۔

''طارق! بس تم مجھے اس جنجال سے نکالو۔ اس ہفتے کی سیٹ پکی کرادو۔ ورنہ میں پاگل ہو جاؤں گا۔ وہ دونوں میاں بیوی بچہ میرے سپرد کر کے صبح کے گئے رات کو آتے ہیں۔ اور میں سارا دن یہاں بیٹھ کے بچہ سنبھالتے سنبھالتے ہلکان ہو جاتا ہوں یہ پکڑو۔ میرا پاسپورٹ اور یہ پکڑو ٹکٹ! بس میری سیٹ کنفرم کروا کر مجھے کل اسی وقت آ کر بتا جانا یہ لوگ اس وقت گھر میں نہیں ہوتے۔ اگر ان کو پتا چل گیا۔ تو یہ لوگ مجھے کبھی بھی جانے نہیں دیں گے۔''

طارق سارے حالات دیکھ کے حیران رہ گیا۔

''میاں جی ایسے تو کبھی دیکھا نہ سنا۔ جگہ جگہ ڈے کیئر سینٹر بنے ہوئے ہیں۔ لوگ اپنے بچوں کو وہاں چھوڑتے ہیں۔''

''ہاں ہیں مگر مہنگے۔'' انہوں نے اسے جوس کا گلاس دیا۔ اور وہ ان کا ٹکٹ اور پاسپورٹ لے کر چلا گیا۔ اگلے دن اس نے انہیں سیٹ پکی ہونے کی

☆☆☆

وہ چھٹی کا دن تھا۔ اس دن انجم کو تنخواہ ملی تھی۔ وہ بڑی خوشی خوشی گھر میں داخل ہوئی۔ میاں جی نے گھر میں ویکیوم کر کے گھر کو چمکا دیا تھا۔ برتن دھلے ہوئے پڑے تھے۔ ہادی اور میاں جی آپس میں خوشی خوشی بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔

''اباجی! یہ دیکھیں میں آپ کے لیے کیا لائی۔'' اس نے ایک ڈبہ ان کی طرف بڑھایا اس میں پرفیوم تھا۔ ایک اور ڈبے میں ان کے لیے ٹی شرٹس تھیں۔ ہادی کے لیے چاکلیٹ تھے۔

''بہت شکریہ بیٹی!'' انہوں نے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرا۔

''شکریہ کس بات کا اباجی۔ جتنا آپ نے ہمارے لیے کیا ہے اور کر رہے ہیں۔ یہ تو اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں۔'' انجم بولی۔

''ہیں تو یہ گویا میرا معاوضہ ہے۔'' انہوں نے مسکراتے ہوئے اپنے تحفوں کو دیکھا اور سر جھکا گئے۔

اور پھر یہ اس سے اگلی چھٹی کی بات ہے۔ ان سب کا پروگرام پکنک پر جانے کا تھا۔ مگر میاں جی کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ ان کو صبح سے ہی چکر آ رہے تھے۔ اور پیٹ خراب تھا۔

تب انہوں نے بھی پکنک کا پروگرام کینسل کرنا چاہا۔ مگر میاں جی نے بصد اصرار انہیں جانے پر مجبور کر دیا۔ انہوں نے انہیں بتایا کہ وہ ابھی نیند کی گولی لے کر سو جائیں گے اور شام کو ہی اٹھیں گے۔ تب بادل نخواستہ وہ لوگ جانے پر راضی ہوئے۔

ان کے نکلتے ہی وہ خوشی سے نعرہ بلند کرتے بستر سے نکلے۔ جلدی جلدی اپنا سامان باندھا۔ اور طارق کا انتظار کرنے لگے۔ اور اس کے آتے ہی ایئرپورٹ روانہ ہو گئے۔ جہاز چلنے تک انہیں یہی خدشہ رہا۔ کہ وہ کہیں آ کر انہیں واپس نہ لے جائیں۔ جہاز کے زمین سے بلند ہوتے ہی انہوں نے سکون کا سانس لیا اور سیٹ سے ٹیک لگا کے بیٹھ گئے۔

وہ ایک لمبا سفر تھا۔ لیکن سفر کا ہر لمحہ یوں لگ رہا تھا۔ جیسے وہ دوزخ سے دور اور جنت سے قریب ہو رہے ہیں۔

ان کے آنے کی خبر سن کر ارد گرد خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ انہوں نے گھر پہنچتے ہی شکورے کو بلوا لیا تھا۔ مگر شکورے کے آنے تک لوگ ان کو کھانا بھیجتے رہے اور پھر تھڑے کی محفلیں آباد ہونے لگیں۔

☆☆☆

ان کو آئے دوسرا دن تھا۔ اور وہ گہری غنودگی میں تھے۔ جب فون کی گھنٹی بجنے لگی۔

فون عثمان کا تھا۔ اور وہ ان پر بغیر بتائے جانے پر چیخ چلا رہا تھا۔

''میں نے آپ کو کہاں کہاں نہیں ڈھونڈا۔ پولیس میں اطلاع کی۔ ہسپتالوں میں ہم دونوں میاں بیوی خوار ہوتے رہے اور آپ سے اتنا بھی نہ ہو سکا کہ اطلاع ہی دے کر جاتے۔'' وہ خود ہی چیخ چلا کر چپ ہو گیا اور فون بند کر گیا۔

''جی ہاں بتا کے آتا، تاکہ تم پھر کسی بہانے مجھے روک لیتے۔ وہ تو شکر ہوا کہ میرا ٹکٹ اور پاسپورٹ میں نے چھپا کے رکھا ہوا تھا ورنہ وہ بھی اگر تم اپنے قبضے میں کر لیتے۔ تو میں تو اسی چوہے دان میں پھنسا رہتا۔''

اس کے بعد عثمان ان سے کھنچا کھنچا رہنے لگا۔ ان کا خیال تھا کہ اسماء کو اس ساری صورت حال سے بہت تکلیف ہو گی۔ مگر وہ بھی الٹا عثمان کی طرف داری کرنے لگی۔

''ابا جی! آپ کو ایسے نہیں آنا چاہیے تھا۔ اگر ان کی مصیبت کے وقت آپ ان کے کام آتے تو وہ بھی آئندہ آپ کے کام آنے کی کوشش کرتے۔ آپ کو پتا ہے۔ بھابی انجم کو مجبوراً نوکری چھوڑنی پڑی۔ انہوں نے جو دو کمروں کا گھر لیا تھا۔ وہ بھی آپ کی وجہ سے لیا تھا۔ انہوں نے وہ بھی چھوڑ دیا ہے۔ اب وہ کسی ایک کمرے کے اپارٹمنٹ میں رہ رہے ہیں۔''

تب انہوں نے انتہائی سادگی سے اعتراف کر لیا کہ گھر کے کام ان کے [illegible] نہیں سنبھال سکتے۔ کیونکہ انہوں نے یہ سب زندگی میں کیا نہیں۔

''مگر بیٹا! میں نے جو تم لوگوں کو ماں اور باپ دونوں بن کے پالا ہے۔ کیا اس کا کچھ بھی صلہ نہیں بنتا۔ کیا اب میں نئے سرے سے اپنی ہڈیاں تم لوگوں کے کاموں اور تم لوگوں کے بچے پالنے میں گھساؤں پھر ہی تم لوگ بھی ضرورت پڑنے پر میرے کام آؤ گے۔'' وہ آزردہ سے بولے۔

☆☆☆

ان ہی دنوں ان کے چھوٹے بیٹے کے دن رات بلاوے آنے لگے۔

''ابا جی! میرا بھی آپ پر کچھ حق بنتا ہے۔ آپ ان دونوں کے پاس تو ہو آئے ہیں۔ میرے پاس کب آئیں گے؟''

مگر وہ اس بات کا جواب گول کر جاتے۔ وہ جان چکے تھے۔ کہ ان کی ضرورت محض اتنی سی رہ گئی ہے کہ وہ ان کی عدم موجودگی میں ان کے گھروں کی رکھوالی کریں۔ ان کے گھر کے کام کریں اور اس کے بدلے میں ان کو روٹی کپڑا ملتا رہے گا۔

مگر فی الحال ان کے گزارے کے لیے ان کے پاس کافی تھا۔ وہ اپنے دوستوں اور آس پاس کے لوگوں کے ساتھ وقت گزارتے جا رہے تھے۔ کبھی نرم اور کبھی گرم۔ وقت کا ویسے ہی کام ہوتا ہے گزرنا۔

اور پھر یہ ایک سال بعد کی بات ہے۔ میاں جی کو ان کے بچوں کی آمد کی اطلاع ملی۔ آہ! یہ ماں باپ کے دل اس اطلاع نے ان میں ایک نئی زندگی پھونک دی۔ وہ اپنے گھر میں دوبارہ اپنے بچوں کو چلتا پھرتا دیکھیں گے۔ ان کے گھر میں بھی بچوں کی آوازیں گونجیں گی۔ کیا پتا عثمان اپنے بیوی بچے کو ادھر ہی چھوڑ جائے۔ یا اسماء ہی ان کو یہ خوش خبری سنائے کہ وہ اب یہیں واپس آ گئی ہے۔ کیا پتا ریحان اپنے بچوں کو ان کے پاس چھوڑ جائے۔

سب سے پہلے انہوں نے گھر کو ٹھیک ٹھاک

کمرے شکورے کے ساتھ مل کر صاف کروائے۔ گھر کا کاٹھ کباڑ ایک کمرے میں رکھ کے ایک بڑا کمرہ اسماء اور اس کی بیٹی اور خاوند کے لیے تیار کیا اور پھر کھانے کی فکروں میں لگ گئے۔

اسماء کتنے دن کے بعد آ رہی ہے۔ کتنی چھوٹی سی تھی۔ جب ماں فوت ہوئی اس نے ماں کے لاڈ کہاں دیکھے تھے۔ کتنی چھوٹی سی ہی عمر میں گھر داری میں لگ گئی تھی۔ میاں جی کی بار بار آنکھیں بھر آئیں۔ اسے کھیر پسند تھی اور اس کے لیے میاں جی نے ڈھیر سا دودھ لے لیا تھا۔

عثمان کو جانے کتنا وظیفہ ملتا ہے۔ کیسے کھینچ تان کے پوری کرتا تھا۔ بکرے کا گوشت کبھی کبھار ہی لاتا تھا۔ وہ اس کے لیے کافی سارا گوشت لے آئے اور ریحان بریانی کا شوقین۔ مگر بریانی تو نہ میاں جی کو بنانی آتی تھی۔ نہ شکورے کو۔ وہ کریں تو کیا کریں۔

ان کے آنے سے ایک دن پہلے انہوں نے دھیمی آنچ پر کھیر کا پتیلا پکایا۔ آدھا انہوں نے اس میں چمچہ ہلایا۔ اور آدھا دن شکورے نے۔ گوشت بھی جیسے تیسے انہوں نے بھون لیا تھا۔ مگر بریانی کا کیا کریں۔ کس سے پوچھیں کس کو بلائیں کہ ہمیں بریانی پکا دو۔ گھر میں ایک لڑکا اور ایک مرد۔ کوئی عورت مدت ہوئی گھر میں آئی نہ گئی۔ اب کیا کریں۔ تب انہوں نے سوچا کہ پرانی انارکلی میں ان کی بھانجی رہتی ہے۔ اس کو لے آتے ہیں۔

مگر شکورے کی عجیب عادت کہ ہر بات میں میاں جی کو حیران کر دے۔ اس نے میاں جی کے جاتے ہی فریج سے مرغی نکال کے نل کے نیچے رکھی اور پھر لگا چاولوں کا حساب کرنے کہ کتنے پکائے جائیں۔ مگر میاں جی تو بریانی کہہ رہے تھے۔ وہ کیسے بناؤں اچھا فیر کسی سے پوچھ کے آتا ہوں۔

وہ باہر نکلا تو اتفاق سے قمرن دلی والی اسکول کی طرف جا رہی تھی۔ اوہ شش شی اس نے منہ سے عجیب سی آوازیں نکالیں۔ مگر وہ اپنے دھیان میں گزرتی گئی۔

"اوہ ایدر دیکھو۔" وہ اس کے پیچھے دوڑا۔

"کیا ہے؟" وہ بدک کے کھڑی ہو گئی۔

"وہ جی میاں جی کے گھر والے آ رہے ہیں۔" اس نے خواہ مخواہ دانتوں کی نمائش کی۔

"تو!" اس نے تیوریاں چڑھائیں۔

"اوہ جی اساں کھیر وی پکائی اے۔ بالاں جوگی۔" (وہ جی ہم نے کھیر بھی پکائی ہے۔ بچوں کے لیے) وہ پھر خواہ مخواہ اپنے پیلے دانتوں کی نمائش کرنے لگا۔

"تو!" وہ پھر غصے سے بولی۔

"وہ جی ہم نے بریانی پکانی ہے۔ مگر نہ میاں جی کو پکانی آتی ہے۔ نہ مجھے تو، اگر کسی پکا دیوتے اسکول میں بھی تو کچھ پکاتی ہیں نا۔" وہ اس کی راہ روک کے کھڑا تھا۔

"میں کیوں پکا دوں، مجھے فارغ سمجھ رکھا ہے؟" اس نے اسے گھورا۔

"وہ جی ماسی جی! کسی کی مدد کرنا آپ گناہ سمجھتی ہیں۔"

"او چل بھاگ لونڈے! تم نے مجھے کیا سمجھ رکھا ہے۔ میں راہ چلتے لوگوں کو بریانیاں بنا بنا کھلاؤں گی۔" وہ پھر غصے سے بولی۔

"نہیں جی بس ذرا بتا دو۔ باقی میں کرلوں گا۔" وہ ہکلا کر بولا۔

اسکول میں بچے گرمی کی چھٹیوں کی وجہ سے ابھی تک پورے نہیں آ رہے تھے۔ قمرن کو جانے شکورے پر ترس آیا یا خوف خدا کہ وہ واپس پلٹ کے اس کے ساتھ میاں جی کی حویلی میں آ گئی۔

"وہ بڈھا تو گھر میں نہیں؟" قمرن نے اندر داخل ہونے سے پہلے پوچھا۔

"نہیں جی وہ تو صبح سے ہی کہیں گئے ہوئے ہیں۔" شکورے نے بغیر وجہ کے ہی پھر دانت نکال دیے۔

وہ جیسے تیسے ان کے باورچی خانے میں پہنچی تو باورچی خانے کی حالت دیکھ کر بیہوش ہوتے ہوتے بچی۔

"ارے یہ کچرا دان باورچی خانہ ہے۔ تم لوگ اتنے غلیظ ہو۔ اتنی گندگی اف......" اس نے ناک پہ اپنی چادر رکھی۔ "اس غلیظ اور بدبودار باورچی خانے

"اچھا تسی صرف مجھے بتادو۔" شکورے نے جلدی سے اس کی راہ روکی۔

"تمہارے پاس مسالے ہیں سارے دکھاؤ مجھے ذرا۔" قمرن نے آگے بڑھ کے کیبنٹ کھولی تو لال بیگوں کی فوجیں دنگل کرتی نظر آئیں۔

"یہ تم نے لال بیگ پال رکھے ہیں۔" اس نے کیبنٹ بند کرتے ہوئے کہا۔

"کیا تم یہ گند پکا کے کھاتے ہو۔" قمرن نے ناک چڑھائی۔

"ہی ہی ہی...... نہیں یہ تو نہیں کھاتے۔ ہم تو سبزی پکاتے ہیں ماسی جی!" شکورا پھر ادب سے بولا۔

"یہ ماسی ماسی کس کو کہہ رہے ہو؟" وہ غصے سے بولی۔

"جی آپ کو اور کس کو۔"

"مجھے خالہ کہو اگر اب ماسی کہا تو پھر دیکھنا۔"

"یہ سارے خانے خالی کرو۔" قمرن نے کیبنٹ کی طرف اشارہ کیا۔

شکورے نے سارے ڈبے نکال کر باہر ڈھیر کیے۔ "ان سارے خانوں کو صاف کرو۔ ان ٹاکلوں کو گرم پانی اور سرف سے دھوؤ اور ان سارے کیبنٹ میں اسپرے کرو۔ کوڑا باہر پھینک کے کوڑے والی بالٹی دھو کے دھوپ میں رکھو۔ اور کچن کا فرش ٹائلیں اور سنک سب مانجھ کے رکھو۔ میں اسکول سے واپسی پر آؤں گی۔ اور دیکھوں گی کہ تم نے کیا کیا صاف کیا۔ اگر جالے اترے ہوئے۔ مسالوں والے ڈبے دھلے ہوئے اور سارے مسالے پورے ہوئے تو میں بریانی بنادوں گی۔

قمرن نے اسے مسالوں کی لسٹ پکڑائی۔ اور اسکول کے لیے روانہ ہوگئی۔

پیچھے شکورا سر پیٹ پیٹ کے اور بال نوچ نوچ کے پاگل ہوتا رہا۔ مگر قمرن کی واپسی تک وہ سارے جالے اتار کے پرانی پسی ہوئی کیڑا لگی مرچیں پھینک کے باقی ڈبے دھو کے فارغ ہو چکا تھا۔ محلے کی دکان سے اس نے بریانی کے لیے منگوائے ہوئے مسالے اور دہی بھی لا کر رکھ دیا تھا۔

کرر کھا اور شکورے کو پیاز کاٹنے پر لگادیا۔

خیر اس دن شکورا صرف میاں جی کے چہرے پر حیرانی دیکھنے کے لیے بھاگ بھاگ کر اس کی مطلوبہ چیزیں لا کر دیتا رہا۔

"ثابت زیرہ کدھر ہے؟" قمرن نے پوچھا۔

"وہ تو نہیں ہے۔ ہم تو کسی چیز میں نہیں ڈالتے۔" وہ بولا۔

"نہیں ڈالتے تو نہ ڈالو، مگر میں تو ڈالوں گی۔ بھاگ کے زیرہ لاؤ اور تھوڑا سا پودینہ بھی۔"

تھوڑی ہی دیر میں گھر بریانی کی خوشبو سے مہکنے لگا۔ قمرن نے بریانی کو دم پر رکھا اور گھر کی راہ لی۔ شکورے نے کافی کوشش کی کہ وہ بھی بریانی کھا کر جائے۔ مگر قمرن نے اسے بتا دیا کہ وہ لوگوں کے گھروں میں نہیں جاتی۔

"بس تم نگوڑ مارے پر ترس آ گیا تھا۔" وہ شاید مسکرائی تھی یا اسے ہی ایسا لگا تھا۔

شام میں میاں جی تھکے ہارے کہیں سے لوٹے۔ تو گھر میں بریانی کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ شکورا اندر ٹی وی لگائے میچ دیکھ رہا تھا۔ میاں جی کچن میں داخل ہوئے تو حیران رہ گئے۔ یوں لگا کسی اور کے گھر میں آ گئے ہوں۔ چولہے پر بریانی کا دیگچہ رکھا ہوا تھا۔ آج حیرانی کا دن تھا اور وہ جی بھر کر حیران ہو رہے تھے۔ کم از کم وہ شکورے سے اتنے سگھڑ پن کی امید نہیں کر رہے تھے۔

چم چم کرتا کچن اور صاف ستھرے برتن اور ہی کہانی سنا رہے تھے۔ میاں جی حیرانی سے سر ہلاتے ہوئے لاؤنج میں آئے۔ تو حسب عادت شکورا دانت نکالتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

"میں نے بریانی پکائی ہے۔" اس نے فخر سے گردن اکڑائی۔

"تم نے بریانی پکائی ہے۔" میاں جی نے حیرت سے کہا۔

"تم تو انڈا بھی ٹھیک سے فرائی کرلو تو بڑی بات

"جی!" بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی۔ بس دانت نکالے کھڑا رہا۔

"یہ کس نے پکائی ہے اور باورچی خانہ کس نے صاف کیا ہے؟ کون فرشتہ آیا تھا جو یہ سب کر گیا؟"

"وہ جی میں نے دلی والی ما...... نہیں جی۔" اس نے زبان دانتوں میں دبائی یوں جیسے ماسی کہنے پر ابھی دلی والی اس کی گردن دبا دے گی۔

"خالہ جی دلی والے آئے تھے۔ تو وہی پکا گئے ہیں۔" اس نے بتایا۔

"دلی والی ہمارے گھر آئی تھی اور ہمارے گھر میں کھانا بنا کے گئی ہے۔" میاں جی حیرت کے سمندر میں ڈبکیاں کھانے لگے۔

"جی وہ میں نے منتیں ترلے کیے تھے۔ تو آئے تھے۔" شکورا پھر بولا۔

"چلو اللہ کا شکر ہے۔ ورنہ میں تو جس خاتون کو لینے گیا تھا۔ اس کا خاوند ہسپتال میں داخل تھا۔ اس کے پیچھے ہسپتال جانا پڑا۔ واپسی پر سڑکوں پر رش اور سواری نایاب۔ بس یہ وقت ہو گیا ہے۔ واپس آتے۔"

☆☆☆

اگلے دن شام تک میاں جی کے سارے بچے پہنچ چکے تھے۔ اور رات کے کھانے میں بچی کھچی بریانی کھا کر انگلیاں چاٹ رہے تھے۔

"میاں جی! زندگی میں ایسی بریانی نہیں کھائی۔" ان کے بیٹے بار بار کہہ رہے تھے۔" اس شکورے کو فارغ کر کے کیوں نہ اس دلی والی کو مستقل رکھ لیں۔ میاں جی کھانے کے کتنے عیش ہو جائیں گے۔" وہ سب تصور ہی تصور میں لذیذ کھانے کھا رہے تھے اور چٹخارے لے رہے تھے۔

صبح شکورے کی ڈیوٹی لگائی گئی کہ وہ دلی والی کو بلا لائے اور صبح جب وہ گھر کے سامنے سے گزری تو شکورا تاک میں کھڑا تھا۔

"خالہ جی! آپ کو اندر باجیاں بلا رہی ہیں۔" اس نے حسب عادت دانتوں کی نمائش کی۔

"وہ جی باجیاں۔" اس نے اندر کی طرف اشارہ کیا۔ "جس کو کام ہے وہ خود قمرن کے پاس آئے۔ قمرن کسی کے گھر نہیں جاتی۔ اور آئندہ مجھے راستے میں مت روکنا۔" اس نے غصے سے اس کی طرف دیکھا۔

تین تین خاندان اکٹھے تھے۔ اور ان کے بچے پھر وقت کا اتنا فرق کہ لوگوں کی صبح ہوتی تو امریکہ والوں کو نیند آنے لگتی۔ دس بجے کے قریب انگلینڈ والے سوئے پڑے ہوتے۔ اور پچھلے پہر آسٹریلیا والوں کی رات ہوتی۔

میاں جی شکورے کے ساتھ مل کر سالن بناتے۔ تو کبھی اس میں ہیک ہوتی۔ کبھی کچا ہوتا۔ کبھی جلا ہوا۔

"ابا جی! یہ کھانا ہے۔ اس سے بہتر تھا کہ آپ باہر سے منگوا لیتے۔" وہ سب چلاتے۔

میاں جی پہلے ایک دو دن برداشت کرتے رہے۔ پھر انہوں نے کہہ دیا۔

"جس کا جو جی چاہے۔ پکائے اور کھائے میں تو پچھلے سال ڈیڑھ سال سے یہی کھا رہا ہوں۔"

"ابا جی! آپ اپنی مرضی سے یہاں بیٹھے ہیں۔ ہم نے تو آپ کو کتنا آرام دیا ہوا تھا۔" بڑا بیٹا اور بہو بولے۔ کہ ابھی وہی اٹھے ہوئے تھے۔ "آپ ہمارے ساتھ چلیں اور ادھر آرام سے رہیں۔ آخر کھانا تو پکا پکایا مل ہی رہا تھا نا۔" بیٹا بولا۔

"نہیں بیٹا میرے سے اب مزدوریاں نہیں ہوتیں۔" انہوں نے دوٹوک جواب دیا۔

"اچھا میں ناشتے کے بعد دلی والی سے بات کرتی ہوں کہ وہ کم از کم ہمیں کھانا بنا دیا کرے۔ آخر وہ اسکول میں کینٹین چلاتی ہی ہے نا۔"

ناشتے سے فراغت کے بعد جب انجم اس کے اسکول پہنچی۔ تو جس نے دیکھا۔ اس کے رعب میں آ گیا۔ وہ کنٹین پہنچی۔ تو اسکول میں بریک ہو چکی تھی اور دلی والی کو بچیوں نے گھیر رکھا تھا۔ وہ صاف ستھرے پیالوں میں املی کی پتلی چٹنی میں پکوڑے ڈال کے دے رہی تھی اور بچیاں بھر بھر پیالے کھا رہی تھیں۔

[illegible] منہ میں [illegible] بھر آیا اور اس نے اس
کے پانی میں ڈوبے ہوئے پکوڑے کھانے سے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو روکا۔ وہ ایک طرف کھڑی اس کے فارغ ہونے کا انتظار کرنے لگی۔ اسکول کی گھنٹی بجی اور قمرن اپنی کمر سیدھی کرنے کے لیے پیچھے ٹیک لگا کر بیٹھی تو انجم بھی پہنچ گئی۔

''دلی والی! مجھے تم سے کام ہے۔'' اس نے اسے مخاطب کیا۔

''ارے تمہیں بولنے کی بھی تمیز نہیں۔ دلی والی یہ کیسا نام ہے۔ میں تمہیں کہوں لاہور والی بیٹھ کے بات کرو۔ تو تمہیں کیسا لگے۔''

''بھئی سب یہی کہتے ہیں۔'' انجم شرمندگی سے بولی۔

''ہاں کہو کیا کام ہے۔'' اس نے پوچھا۔

''میں میاں جی کی حویلی سے آئی ہوں، ہم لوگ چاہتے ہیں۔ کہ تم دوپہر کا کھانا ہمارے گھر آ کر پکا دیا کرو۔ تم جتنے پیسے کہو گی ہم دینے کو تیار ہیں۔'' انجم نے مدعا بیان کیا۔

''میں لوگوں کے گھروں میں کام نہیں کرتی۔ اور ایسے گھروں میں تو بالکل بھی نہیں جاتی جہاں صرف مرد ہوں۔'' دلی والی نے دوٹوک جواب دیا۔

''چلو اتنے دن ہی پکا دو۔ جتنے دن ہم سب ادھر ہیں۔ ہم سب کو تمہارے ہاتھ کی بریانی بہت پسند آئی تھی۔'' انجم نے پھر کہا۔

''نہ تو تم خود کیوں نہیں پکا لیتیں۔ اچھی خاصی جوان جہان ہو۔ میں کیوں پکاؤں تمہارے گھر آ کے، مجھے کینٹین سے کافی آمدن ہے۔ مجھے اور پیسے نہیں چاہئیں۔''

دلی والی نے جواب دیا اور منہ دوسری طرف کر لیا۔ جس کا یہ صاف مطلب تھا کہ اب تم جا سکتی ہو۔

انجم برے برے منہ بناتی گھر لوٹ آئی۔ مگر اب سب کے لیے۔ کھانا پکانا مسئلہ بنا ہوا تھا۔

تب سب سے پہلے ڈاکٹر طاہر اور اسماء وہاں سے روانہ ہوئے کہ وہ اپنی خالہ سے ملنے اسلام آباد جا رہے ہیں۔

''اباجی ایسے کچے اور جلے ہوئے کھانوں کے

[illegible] طاہر اور [illegible] کے [illegible] ہنستے ہوئے کہا۔ مگر ان کو جانے کیوں اتنی تکلیف ہوئی کہ وہ باہر تک طاہر کو چھوڑ۔ نے بھی نہ جا سکے۔

اس کے بعد عثمان اور انجم کی رخصتی کا وقت آ گیا۔ کہ انجم نے باقی کے دن اپنی ماں کے ہاں گزارنے کا ارادہ کر لیا تھا اور پھر وہیں سے وہ رخصت بھی ہونے والے تھے۔

''اباجی! ابھی بھی اپنی ضد چھوڑ دیں اور میرے ساتھ چلیں۔'' عثمان انہیں بار بار کہتا۔ اس عمر میں آپ اکیلے نہیں رہ سکتے۔ اگر بیمار پڑ گئے تو کیا ہوگا۔ وہاں کم از کم ہم شام کو تو گھر آ ہی جاتے تھے نا۔''

''نہیں بیٹا! میں وہاں تنہا نہیں رہ سکتا۔ تم لوگ اپنے گھروں کو سدھارو میرا اللہ حافظ ہے۔''

ریحان نے بھی اپنی سی کوشش کر ڈالی کہ اباجی اس کے ساتھ چلے چلیں۔ مگر وہ اتنے بددل ہو چکے تھے کہ کہیں بھی جانے کو تیار نہیں تھے۔ ریحان کے جانے کے بعد ڈیپریشن کا شدید دورہ پڑا۔ وہ اچانک سوچنے لگے کہ وہ دنیا میں بالکل تنہا ہیں۔ ان کی زندگی بالکل بے مصرف ہے اور اب انہیں اس گھر میں جسے بچے گلیوں میں پھنسا ہوا پرانا اور بے آرام قرار دے چکے تھے۔ صرف موت کا انتظار کرنا تھا۔

مگر وہ شاید نہیں جانتے تھے کہ نئی نسل کتنی بے صبری ہے۔ وہ کسی کی بھی موت کا انتظار نہیں کرتی۔

اپنے اپنے ٹھکانوں کو لوٹنے سے پہلے وہ سب ایک دفعہ پھر آ موجود ہوئے۔ اس دفعہ وہ سب اپنے اپنے کھانے پیک کروا کے لائے تھے۔ اور آئے بھی چند گھنٹوں کے لیے تھے کہ اسی رات باری باری ان کی روانگی تھی۔

''اباجی!'' بڑے بیٹے نے باقی بھائی بہن کی طرف دیکھا اور ان کے تائیدی انداز میں سر ہلانے پر بولا۔

''اباجی ہم آپ کو اکیلا چھوڑ کر یہاں سے چلے تو گئے تھے۔ مگر بہت بجھے دل کے ساتھ۔ ہم میاں بیوی تو اس دن سے آرام سے سو ہی نہیں سکے۔ کہ آپ اکیلے ہیں اور شکورے کے ہاتھ کے کچے پکے کھانے کھا رہے ہیں۔''

ہو۔" ان کی آنکھوں کی چمک لوٹ آئی۔ "میں تو پہلے ہی کہتا تھا۔ میرا خون اتنا بے وفا کیسے ہو سکتا ہے کہ بوڑھے باپ کو اکیلے پھینک کے چلا جائے۔"

"اباجی! ہم پہلے بھی آپ کو پھینک کے نہیں گئے تھے۔ بلکہ مجبوری کی حالت میں گئے تھے۔ صرف یہاں کی پڑھائی پر گزارا نہیں ہوتا۔" چھوٹا بیٹا میاں جی کے کندھے سے آلگا۔

"چلو شکر ہے۔ تمہاری پڑھائیاں تو ختم ہوئیں۔" میاں جی مسرور سے بولے۔ "میں تو خود اپنے آپ کو قبر میں پڑا محسوس کر رہا تھا۔"

"اباجی! پڑھائیاں ابھی کہاں ختم ہوئی ہیں۔ یہ تو ابھی جانے کب تک چلیں گی۔" انجم بے زاری سے بولی۔

"تو؟" میاں جی حیران ہوئے۔ "پھر کیا حل سوچا ہے؟" انہوں نے پوچھا۔ تب دونوں بھائیوں نے بہن کی طرف دیکھا۔

"اباجی! حل تو ایک ہی ہے۔ یہ گھر بک جائے۔ اور آپ باری باری تینوں بچوں کے پاس رہیں۔" اسماء نے آسان حل بتایا۔ باقی لوگ بھی اس کی تائید میں سر ہلانے لگے۔

تب میاں جی نے باری باری سب بچوں کی طرف دیکھا۔ جیسے انہیں پہچاننے کی کوشش کر رہے ہوں۔

"تو آپ لوگ میرا ٹھکانا چھیننے آئے ہیں۔ یہ میرے جیتے جی تو ممکن نہیں۔ پہلے مجھے مار کے کہیں پھینک آؤ یا دفن کر آؤ۔ پھر یہ گھر بکے گا۔"

وہ ٹوٹے ہوئے دل کے ساتھ اٹھ کر کمرے میں چلے گئے۔

☆☆☆

دن ایسے ہی بے رونق اور ویران سے گزر رہے تھے۔ جب ایک دن شکورا گلیوں میں پھرتا پھراتا گھر لوٹا۔ تو پریشان سا تھا۔

"وہ جی ایک بات کرنی ہے۔" وہ بات کرتے ڈر رہا تھا۔

"وہ جی خالہ جی ہیں نا؟"

"ہیں خالہ جی۔ میاں جی حیرت میں غوطے کھانے لگے۔ شکورا ہر یک کو ماسی کہنے کا عادی تھا۔

"یہ خالہ جی کون ہیں؟" انہوں نے پوچھا۔ "وہ جی دلی والے۔"

خیر میاں جی کو دلی والوں تک پہنچنے میں چند منٹ لگے۔

"ہاں تو۔" انہوں نے شکورے کی طرف دیکھا۔

"وہ جی سڑک پر بیٹھے سو رہے تھے۔ تو میں نے انہیں کہا کہ وہ ہماری بیٹھک میں رہ لیں۔ وہ جی سڑک پر تو رہ نہیں سکتے۔"

"کیا فضول بول رہے ہو۔ وہ جس خاتون کو لوگ دلی والی کہتے ہیں۔ اس کا تو اپنا گھر ہے شاید۔ اس کے بیٹے بھی ہیں۔ اور پھر کوئی ہمارے گھر میں کیوں رہے گا۔" میاں جی غصے میں آ گئے۔ آج کل وہ بات بات پر غصے میں آ جاتے تھے۔

"وہ جی گل یہ ہے کہ ان کے دونوں بیٹے بہت برے نکلے ہیں، وہ ان کا سب پیسہ دھیلا لوٹ لاٹ کے بھاگ گئے ہیں۔ اس دفعہ اسکول کی دکان (کینٹین) کا ٹھیکہ بھی انہیں نہیں ملا۔ اور وہ بھی جس کمرے میں رہتے تھے۔ وہاں سے بھی جواب ہو گیا ہے۔

میاں جی! اگر ہم انہیں یہ باہر والا کمرہ دے دیں۔ تو کھانے پینے کا کتنا آرام ہو جائے۔ شکورے کو قمرن خالہ کے ہاتھ کی بریانی اور پکوڑے یاد تھے۔

"بھئی ہمارے گھر میں اکیلی عورت کیسے رہ سکتی ہے۔" میاں جی بولے۔

"اکیلی کیسے میاں جی۔ میں اور آپ بھی تو ساتھ ہوں گے۔" شکورا بولا۔

"اچھا تم اپنی عقل کے گھوڑے نہ دوڑاؤ۔ میں اس کے لیے کوئی ٹھکانا سوچتا ہوں۔" میاں جی زچ ہو کر بولے۔

"میاں جی اتنا بڑا گھر ہے۔ خالی بالکل اس میں اگر ایک کمرہ کسی مسکین عورت کو دے دیں گے۔ تو کیا بگڑ جائے گا۔ جبکہ میں نے خالہ جی سے کہا تھا کہ

میاں جی اتنے رحم دل ہیں کہ وہ کبھی نہ نہیں کریں گے۔ میں ان کو لے آؤں جی۔"

میاں جی شکورے کو چھترپریڈ کرانے ہی والے تھے۔ کہ باہر کا دروازہ زور سے بجا۔

میاں جی نے باہر دیکھا۔ تو باہر لٹی پٹی دلی والی کھڑی تھی۔ وہ جس نے کبھی کسی سے کوئی تعلق، واسطہ نہیں رکھا تھا وہ اپنا مختصر سا سامان لیے کھڑی تھی۔

"مجھے چند دن کے لیے رہائش چاہیے۔ پھر میں کسی کے گھر میں کوئی کام ڈھونڈ لوں گی رات ہونے والی ہے۔ اور برسات کا موسم ہے۔ ایسے وقت میں سڑک پر رات نہیں گزار سکتی۔"

میاں جی کے سامنے ایک باکردار باحیا اور محنتی عورت کھڑی تھی۔ جس کی آزمائش ابھی قدرت کی طرف سے باقی تھی۔

"آؤ بہن تمہارا اپنا گھر ہے۔" میاں جی راستے سے ہٹے۔

اور شکورا ہرا کا نعرہ بلند کرتا دروازے تک پہنچ گیا۔

"میں نے کہا تھا نا میاں جی بہت رحم دل ہیں۔ آپ اس کمرے میں آجائیں میں آپ کے لیے منجی بسترے کا بندوبست کرتا ہوں۔"

میاں جی دلی والی کو اس کے سپرد کر کے اوپر کے کمروں میں گم ہو گئے۔

☆☆☆

اگلے دن سے دلی والی نے کچن کا سارا چارج سنبھال لیا۔ اور پھر آہستہ آہستہ پورے گھر کا۔

قمرن کو میاں جی کے گھر آئے دو ہفتے ہو گئے تھے۔ اس نے میاں جی کو اپنے دلی سے لٹنے سے لے کر یہاں دونوں بیٹوں کے آوارہ ہونے اور اس کی جمع پونجی لے کر فرار ہونے کی ساری داستان سنا دی تھی۔ اور اب وہ بظاہر شکورے کے ساتھ دل لگائے چپ چاپ بیٹھی تھی کہ کھانا اور ٹھکانہ اسے میسر آ گیا تھا اور شکورے کی منتیں اور ترلے دیکھ کے وہ فی الحال کوئی اور ٹھکانہ ڈھونڈنا موقوف کیے بیٹھی تھی۔

شکورا دوپہر کو دہی لینے دکان پر گیا۔ تو گھنٹہ لگا دیا۔ قمرن غصے کی تیز تھی۔ اس دن خاص طور سے غصے میں آ گئی۔ جونہی شکورے پر نظر پڑی۔

"اونگوڑ مارے تم کہاں رہ گئے تھے؟" کہتے ہوئے اسے ایک تھپڑ جڑ دیا۔ مگر جونہی اس کی شکل پر نظر پڑی۔ حق دق رہ گئی۔ اس کا گریبان پھٹا ہوا۔ منہ پر خراشیں اور بال نچے ہوئے تھے۔

"ہے نگوڑے یہ کیا کر آئے ہو۔ کسی سے جھگڑا ہے۔ جو یوں لہولہان آئے ہو۔ کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں ہوا۔ باہر لوگ ماریں اور گھر میں تم اور مارلو۔" وہ آنسو پونچھتا ہوا بولا۔

"مگر تم سے لڑا کون اپنے میاں جی کو بتاؤ۔ وہ ابھی اسے ٹھیک کر کے آئیں۔"

"تم کھانا نکالو میاں جی کا۔ میں کھانا دے آؤں۔ جس سے میری لڑائی ہوئی ہے۔ اس سے میں آپے نبڑ لوں گا۔"

"دیکھو شکورے! میں نے تمہیں کتنی دفعہ سمجھایا ہے۔ کہ بڑوں کو تم نہیں کہتے۔ آپ کہتے ہیں اور یہ لو کھانا بھائی صاحب کو دے آؤ۔"

شکورا کھانا دینے گیا۔ تو میاں جی کے پوچھنے پر بھی بتانے پر راضی نہ ہوا کہ کس کے ساتھ جھگڑا کر کے کپڑے پھڑوا آیا ہے۔ "بس جی منڈیاں، منڈیاں (لڑکوں) دی گل ہی۔"

☆☆☆

اس کے چند دن بعد وہ پھر اسی طرح آیا۔ زخمی اور پھٹے ہوئے کپڑے، وہ میاں جی کے پاس دو تین سال سے تھا۔ وہ سب کے ساتھ بہت اچھی طرح پیش آتا اور اب تو ان ساری گلیوں میں ہر کوئی اسے جانتا پہچانتا تھا۔ اس دن قمرن نے تو اس سے کوئی کرید نہیں کی۔ مگر میاں جی کے بہت زور دینے پر وہ راز اگلنے پر تیار ہو گیا۔

"وہ جی لوگ خالہ جی۔ کے بارے میں بہت بری باتیں کرتے ہیں اور میاں جی آپ کو بھی بری باتیں کرتے ہیں وہ کہتے ہیں۔ میاں جی نے دلی والی کو بغیر نکاح کے گھر میں رکھا ہوا ہے۔ میں نے جی ہر بندے کو بتایا ہے کہ وہ دونوں سگے بہن بھائی کی طرح

رہے ہیں۔ مگر میاں جی وہ بہت بری باتیں کرتے ہیں۔ اسی لیے میں روز دو چار کو مار کے آتا ہوں۔"

"ہیں!" میاں جی اچھل پڑے۔ گویا ساری زندگی کی پارسائی اس چھوٹی سی نیکی نے چاٹ لی جو وہ قمرن کے ساتھ اس کی مجبوری اور اپنی ضرورت کی وجہ سے کر چکے تھے کہ آخر اس گھر کو ایک عورت کی ضرورت تو تھی ہی۔

"وہ جی خالہ جی چلے گئے۔ تو جی پھر گھر میں وہی تماشا۔" شکورا فکرمندی سے بولا۔

اگلے دو چار دن میاں جی نے یہ بات شدت سے نوٹ کی۔ کہ لوگ ان کے تھڑے پر آ کر نہیں بیٹھتے بلکہ ان سے کترانے لگے ہیں۔

اور اس شام میں جب وہ انہیں گرم گرم پکوڑے اور چائے دینے گیا۔ تو کسی بڑے بزرگ کی طرح میاں جی سے بولا۔

"میاں جی! آپ نکاح کیوں نہیں کر لیتے۔ کیا اس میں بہت پیسے لگتے ہیں۔"

"او کیا بکواس کر رہے ہو۔" میاں جی کا ہاتھ غصے میں اپنے ڈنڈے کی طرف گیا۔ مگر شکورا ادھر ہی ڈٹا رہا۔

"میاں جی لوگ بہت باتیں کرتے ہیں اور میرے سے برداشت نہیں ہوتا۔ میں کسی دن کسی کو مار کے مر جاؤں گا۔"

"اوئے دفع ہو جاؤ یہاں سے کیا زندگی تماشا بن گئی ہے۔" میاں جی پریشان سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور شکورے نے کچن میں دوڑ لگا دی۔

"بھائی صاحب نے چائے پی لی؟" قمرن نے پوچھا۔

"کون بھائی صاحب؟" شکورا اس کے سامنے چوکی پر بیٹھ گیا۔ "خالہ جی! آپ میری ماں کی طرح ہیں اور میاں جی باپ کی طرح تو کوئی بھی بے غیرت سے بے غیرت بیٹا یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ اس کے ماں باپ کے بارے میں کوئی بری بات کرے۔ مگر لوگ کرتے ہیں جی۔ میں بتا بتا کے تھک گیا ہوں کہ خالہ جی اور میاں جی ایک دوسرے کو بہن بھائی سمجھتے ہیں۔ مگر لوگوں کی زبانیں کون پکڑ سکتا ہے۔ وہ کہتے ہیں۔ میاں جی نے بغیر نکاح کے دلی والی کو رکھا ہوا ہے۔"

"چپ کرو، بکواس بند کرو۔" قمرن چیخ اٹھی۔

"میں اسی وقت چلی جاتی ہوں۔" وہ اٹھی اور اندر کمرے میں گھس گئی۔

"خالہ جی! آپ جہاں بھی جائیں گی۔ یہ لوگ آپ کو جینے نہیں دیں گے۔ لوگ کہتے ہیں۔ بغیر نکاح کے آپ یہاں رہ رہی ہیں، تو آپ نکاح کر لیں میاں جی سے پھر تو کوئی کچھ نہیں کہے گا۔ ورنہ میں تو روز مار کھا کھا کے اور لوگوں کے منہ بند کر کر کے تھک گیا ہوں۔"

قمرن کپڑے تہہ کر کے گٹھڑی میں رکھ رہی تھی۔ اور روئے جا رہی تھی۔

جانے زندگی میں کوئی سکھ تھا بھی یا نہیں اور اب یہاں سے نکلی تو جانے کہاں پناہ ملے۔ ساری زندگی رلتے ہی گزر ی۔ اندر قمرن رو رہی تھی۔ اور باہر شکورا بھوں بھوں روتا تھا۔

اور اوپر اپنے کمرے میں میاں جی سوکھی مکئی جیسے گرم ریت میں تڑختی ہے ایسے تڑخ رہے تھے۔

"وہ جا رہے ہیں جی۔" شکورا میاں جی کو اطلاع دینے اوپر بھاگا۔

"تو میں کیا کروں۔" میاں جی اس کا سر توڑنے کو لپکے کہ یہ بلا اسی کی نازل کردہ تھی۔

"نکاح اور کیا۔ جو اللہ رسول کا حکم ہے۔ میاں جی وہ اس عمر میں کہاں دھکے کھائیں گے جی، خالہ جی!"

"او تمہاری اور تمہارے خالہ جی کی......" آگے میاں جی کے منہ سے جانے کیا گلاب جھڑنے لگے تھے۔ قمرن کا چہرہ سیڑھیوں سے نمودار ہوا۔

"میری وجہ سے آپ کی بنی بنائی عزت گئی۔ میں معذرت خواہ ہوں۔"

"مگر ان کی وجہ سے آپ کی جو عزت خراب ہوئی۔" شکورے نے بیچ میں دخل دیا۔

"اوہ تم تو شکل گم کرو۔" میاں جی نے اسے قہر آلود نظروں سے گھورا۔

"جی تے فیر تسی دونوں راضی ہو۔ میں مولوی

صاحب کو بلا کے لاتا ہوں۔"
شکورا آدھی پنجابی اور آدھی اردو ملا کر بولا۔

"اوئے مولوی صاحب کو کیا کہتا ہے؟" میاں جی پیچھے سے للکارے۔

"خالہ جی! میں ابھی گیا اور ابھی آیا۔" شکورے کے منظر سے ہٹتے ہی میاں جی نے قمرن کی طرف دیکھا۔ اور قمرن نے میاں جی کی طرف۔

"مجھے افسوس ہے کہ میری وجہ سے......"

"اور مجھے بھی کہ میری وجہ سے۔" دونوں بیک وقت بولے۔

"مگر لوگوں کو کیا تکلیف تھی؟" قمرن بولی۔

"بس بات تو ان کی بھی ٹھیک ہے۔ صرف کہنے سے کوئی بہن بھائی بن نہیں جاتا۔"

"راستہ وہی سیدھا اور صاف ہے۔ جو اللہ کا بتایا ہوا ہے۔" میاں جی بولے۔

"مطلب۔" قمرن حیران ہوئی۔

"مطلب نکاح اور اس میں حرج بھی کیا ہے۔ اس گھر کو ایک سمجھ دار عورت کی ضرورت ہے۔ اور آپ کو ایک سائبان کی۔" میاں جی گویا کسی نتیجے پر پہنچ چکے تھے۔

"مگر لوگ کیا۔" قمرن کو میاں جی نے فقرہ بھی پورا نہ کرنے دیا۔ "بھاڑ میں گئے لوگ۔ جب آپ بے گھر اور بے در ہو گئی تھیں۔ تو کتنے لوگوں نے آپ کی پروا کی، کسی ایک نے بھی نہیں نا۔ تو آپ کیوں کسی کی پروا کرتی ہیں۔"

"اور میرے آوارہ بیٹے وہ میرے ساتھ ساتھ آپ کو بھی قتل کر دیں گے۔" قمرن کو اپنے بیٹے یاد آ گئے۔

"اچھا اتنا کمزور سمجھا ہوا ہے مجھے کہ میں اپنی اور اپنی بیوی کی حفاظت بھی نہیں کر سکتا۔" میاں جی نے سینہ پھلایا۔

"بیوی؟" قمرن نے حیرت سے انہیں دیکھا۔

"بھئی نکاح کی صورت میں۔" وہ شاید مسکرا رہے تھے۔ قمرن کو اچانک ہی گھبراہٹ اور شرم نے گھیر لیا۔

"میں چلتی ہوں۔" وہ جانے کو مڑی۔

"مگر کہاں اس وقت کہاں جائیں گی؟"

"اوہ جی خالہ جی آپ کتھے چلے او کلے کلے۔ ہم دونوں کو بھی ساتھ لے جائیں۔"

شکورا نیچے صحن میں بھنگڑا ڈال رہا تھا۔ جب باہر سے کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ باہر گلی کے معززین مولوی صاحب کو ساتھ لے کر کھڑے تھے۔" میں میاں جی کو لے کر آتا ہوں۔" شکورا اوپر بھاگا۔

"میاں جی! نیچے پروہنے آئے ہیں۔" اس نے میاں جی کو اطلاع دی۔

"پروہنے او کون سے پروہنے۔"

"نیچے آ کے دیکھ لیں۔" شکورا نیچے بھاگا۔ ان کے بیٹھنے کا انتظام کرنے۔ ہمسائیاں قمرن خالہ کو گھیرے بیٹھی تھیں۔

اور وہ تقدیر کے اس اچانک پلٹنے پر خوف زدہ اور حیرت زدہ تھی۔ خیر! میاں جی پر اعتبار کر کے اس نے دیکھ لیا تھا کہ وہ انتہائی شریف شائستہ اور مہذب ہیں۔

شام تک نکاح ہو گیا تب گلی کے سب دوستوں نے میاں جی کو بتایا کہ یہ ان سب کی اسکیم تھی۔ جس میں سب سے اہم کردار شکورے نے ادا کیا۔

رات دیر تک شکورا بھنگڑے ڈالتا رہا اور گھڑے بجا بجا کر ٹپے اور ماہیے گاتا رہا۔ مگر صبح سویرے جب میاں جی نے اس کے ہاتھ میں چند کڑکتے نوٹ پکڑائے۔ اور اسے دس دن کی چھٹی پر اس کے گاؤں روانہ کرنا چاہا۔ تو وہ اکڑ گیا۔

"لو جی میں ضرور جانا ایہہ دلی والے آگ لینے آئے۔ تے گھر والے بن بیٹھے۔ (یہ دلی والے آگ لینے آئے اور گھر والے بن بیٹھے) اب میری کسے نوں ضرورت نہیں۔"

"او نگوڑ مارے تم بھی چند دن اپنے امی ابا کو مل آؤ۔ اداس نہیں ہوتے۔"

"خالہ جی اداس تو میں ہو جاتا ہوں۔" مگر جانے سے پہلے یہ نگوڑ مارے کا مطلب تو بتا دیں۔

"اوہ آ کے پوچھنا۔ تمہاری بس جانے والی ہو گی۔" میاں جی آج مسکرا رہے تھے۔

اور قمرن پورے استحقاق سے باورچی خانے کی چوکی سنبھالے پیالوں میں چائے چھان رہی تھی۔

☆

گھپ اندھیرے میں لحظہ بہ لحظہ بڑھتا خوف اس کی سانسوں پر اپنے پنجے گاڑ رہا تھا۔ دل کی دھڑکن بے ربط اور زبان خشک تر ہو چلی تھی۔ اسٹور کی مخصوص سیلن زدہ کڑوی بو اس کی ناک کے ذریعہ حلق تک اتری جاتی تھی۔ حلق جو اپنی سی طاقت لگا کر چیخ چیخ کر تھک چکا تھا۔

اس نے اپنی دونوں ہتھیلیوں سے ایک بار پھر دروازے کو پیٹنا شروع کر دیا۔

''مما مما...... دروازہ کھولو۔''

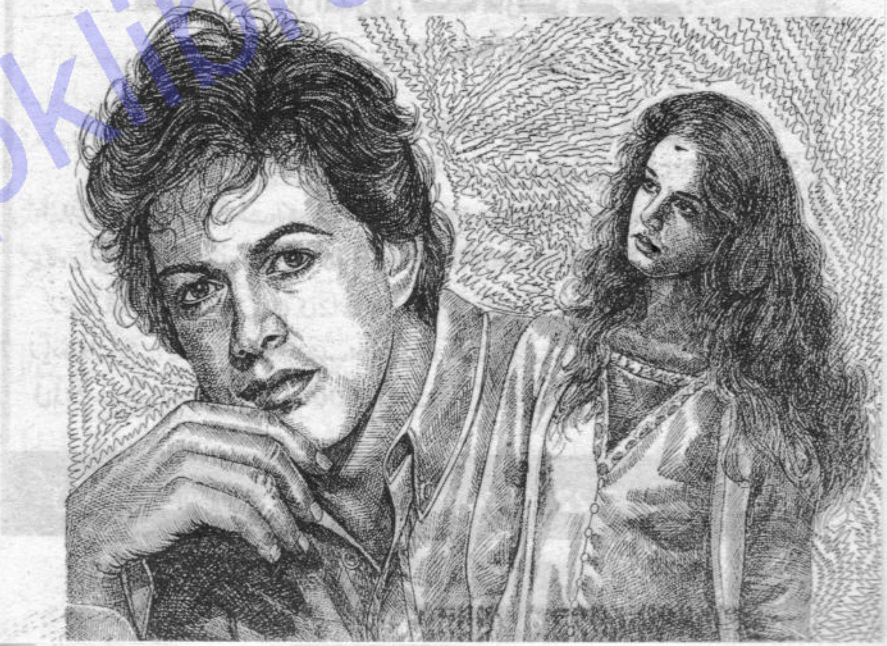
وہ زور لگا کر ایک بار پھر چیخی تھی۔ مگر اس بار بھی اس کا چلانا بے کار گیا۔ دروازے کے اس پار کسی کو اس کی آواز سنائی نہ دی تھی۔ اس نے اپنی درد کرتی ہتھیلیاں دروازے پر ہی ٹکا دیں اور روتے ہوئے ان پر اپنا چہرہ رکھ دیا۔ اچانک ہی کوئی چلبلی چیز اس کی گردن پر آ کر گری۔ وہ بے اختیار چیخ کر اچھلی اور ہاتھ سے اپنی گردن سے اس چیز کو جھٹکا۔

وہ چیز یقیناً کوئی چھپکلی تھی۔ چھپکلی جس سے اس کی جان نکلتی تھی۔ اندھیرے اور اکیلے پن کا خوف اب ایک نئے خوف کے زیر اثر آ گیا تھا۔ بالآخر وہ اس چار فٹ کے تنگ و تاریک اسٹور کے فرش پر بے ہوش ہو کر گر پڑی۔ ☆☆☆

''مما!'' مضراب ایک چیخ مار کر نیند سے جاگی اور اٹھ کر بیٹھ گئی اس کا پورا وجود پسینے میں بھیگا ہوا تھا اور دل کی دھڑکن بے قابو تھی۔ تیز تیز سانسیں لیتے اس نے اضطراری انداز میں چاروں طرف دیکھا۔ نیلگوں روشنی میں نہایا ہوا یہ اس کا اپنا آرام دہ بیڈ روم

فرح بھٹو

محبت کوئی سچ ہے سائیں



مکمل ناول



اللہ...... اس نے اپنا ایک ہاتھ دل پر رکھ کر جیسے خود کو پرسکون کرنے کی سعی کی۔

اس نے سائڈ ٹیبل پر رکھے جگ سے گلاس میں پانی انڈیلا اور اپنے لبوں سے لگالیا۔ گلاس واپس رکھ کر وہ پھر سے تکیہ پر سر رکھ کر لیٹ گئی لیکن اس بار آنکھیں دوبارہ بند نہ کر سکی۔ ایک خوف اس کے خواب سے نکل کر جیسے دل میں آ کر بیٹھ گیا تھا۔ ٹورمینٹر (اذیت پسند) تم زندگی سے نکلنے کے بعد بھی خوابوں میں زندہ ہو۔ اس نے بڑبڑا کر کروٹ بدل لی تھی۔

☆☆☆

صبح اس کی آنکھ کچھ دیر سے کھلی وہ ہڑبڑا کر بستر سے باہر نکل آئی۔ جلدی جلدی تیار ہو کر اپنا اوور آل بیگ اور فائل اٹھا کر نیچے آئی۔ ڈائننگ میز پر پاپا اور عفان پہلے سے موجود تھے۔

''گڈ مارننگ ایوری ون۔'' ڈائننگ ٹیبل کی کرسی کھینچ کر اس پر بیٹھتے اس نے وش کیا۔

''گڈ مارننگ بیٹا۔'' پاپا نے جواباً پیار سے بیٹی کو دیکھا۔

''گڈ مارننگ آپی۔'' عفان نے ناشتے سے انصاف کرتے نظر اٹھائی۔

''مما! مجھے سویرے جگایا کیوں نہیں۔'' مضراب نے ناشتہ میز پر لگواتی ماں سے شکوہ کیا۔

''تمہارے بیڈ روم کا دروازہ مہرو نے بہت بجایا لیکن تم نے نہیں کھولا۔'' انہوں نے اس کے آگے فریش جوس کا گلاس رکھا۔

''اچھا بھئی۔ اللہ حافظ۔ چلتا ہوں۔'' بدر صاحب نے نشست سے اٹھتے ہوئے کہا۔

''پاپا! میں بھی آپ کے ساتھ چلتی ہوں۔ یونی کا پوائنٹ تو مس ہو گیا۔ آپ مجھے ڈراپ کر دیجیے گا۔'' مضراب بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔

''مضراب! ناشتہ تو ٹھیک سے کرتیں۔'' شاہانہ نے آواز لگائی۔

''مما! یونی میں کچھ کھالوں گی۔ اس نے ہاتھ ہلا رہا تھا۔

☆☆☆

''لیٹ ہو گئی ہو مضراب! جلدی نکلو۔''

وہ کلاس میں آئی تو تھرڈ ایر میڈیکل اسٹوڈنٹس کا گروپ سول ہاسپٹل جانے کو تیار کھڑا تھا۔ آج ان کی آٹوپسی کی کلاس تھی۔ وہ وین کے ذریعہ دس منٹ کی ڈرائیو پر ہاسپٹل پہنچے۔ مضراب نے دیکھا، کچھ لڑکیاں بہت ایکسائیٹڈ اور کچھ ڈری ہوئی تھیں۔ لڑکے البتہ بے فکر نظر آ رہے تھے۔ آٹوپسی کی کلاس میں پہلی بار کسی باڈی کا معائنہ کرنا تھا۔

''میری تو ہمت نہیں پڑ رہی، کیسے دیکھوں گی ڈیڈ باڈی۔'' طوبیٰ نے مضراب کا ہاتھ تھام کر گھبراہٹ سے کہا۔

''شرم کرو، ڈاکٹر بن رہی ہو۔ پریکٹس کے دوران کتنی ایمرجنسیز اٹینڈ کرنا پڑیں گی پھر کیا کرو گی۔'' مضراب نے اسے گھر کا مگر طوبیٰ نے ہال میں داخل ہوتے ہی آنکھیں بند کر لیں اور دل میں ورد پڑھنے لگی۔ اسٹوڈنٹس ایک ٹیبل کے گرد جمع ہو گئے۔ جہاں ایک نعش پوسٹ مارٹم کے لیے رکھی تھی۔

''توبہ ہے طوبیٰ! اتنا بھی کیا ڈرنا بہادر بنو۔'' وہ کہہ کر ڈاکٹر عمران کی طرف متوجہ ہوئی جو ٹیبل پر رکھی باڈی کو پیٹ سے کٹ لگا رہے تھے۔ مضراب نے ان کو توجہ سے سنتے نظر باڈی کی طرف ڈالی تو اس کا پسینہ پھوٹ نکلا۔ مردے کے اندرونی اعضاء اور تازہ لہو دیکھ کر اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھانے لگا۔ سر کچھ سمجھا رہے تھے مگر مضراب کے تو کان سائیں سائیں کرنے لگے۔

''طوبیٰ......'' اس نے کمزوری آواز نکالی۔ اور کچھ ہی دیر میں وہ طوبیٰ کے اوپر غش کھا کر گر چکی تھی۔

☆☆☆

سوہنی تو سواہی دلمنھجو چھونہ تو لگے کھڑو جادو کیو
تھئی کھڑو منتر پڑھو تھئی
(سوہنی تیرے سوا یہ دل میرا کیوں نہیں لگتا،
کون سا جادو کیا ہے کیسا منتر پڑھا ہے)

سے دیکھتے گنگنایا۔ مُرک نے شرما کر اپنے نازک ہاتھ کو اس کے ہاتھ سے چھڑایا۔

"کیا کرتے ہو ہالار! کوئی دیکھ لے گا۔" وہ شرمیلی مسکراہٹ سے بولی۔

"دیکھ لینے دو۔ اب تو تمہارے تمام جملہ حقوق میرے نام ہو چکے ہیں۔ اب دنیا کی پروا کیوں کر رہی ہو۔" ہالار نے پھر سے کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"دنیا سے لڑی ہوں تو تمہیں پایا ہے ہالار! دنیا سے ڈری ہوتی تو آج اس حویلی میں بس چکی ہوتی۔" مرک نے آنکھوں میں شرارت سموئی۔

"بس کر تو دکھاتی ادھر۔ دونوں کی جان ایک کر دیتا۔"

ہالار جذباتی ہوا۔ وہ بھی یہی کہتا تھا کچھ نہیں کر سکا۔ "پچھلے ماہ بیاہ لے آیا اپنی دلہن۔ بے چارہ۔" مرک نے ہنس کر کہا۔

"اس کی چاہ کچی تھی، میری چاہ پکی ہے۔" ہالار اب کے سنجیدگی سے بولا۔ "اور ہماری ذاتی باتوں میں تو اپنے چاچے کے پٹ کو کیوں لے آئی ہے۔" پھر اس نے بدمزہ منہ بنایا۔

"کیوں کہ تجھے رقابت کی آگ میں جلتا دیکھ کر سینے میں ٹھنڈ پڑتی ہے۔" مرک نے ایک انداز سے اپنا نازک ہاتھ سینے پر رکھا۔

"ہائے مار دیا ظالم۔" ہالار نے دلبری سے اسے دیکھا جو سورج کی دھیمی نارنجی کرنوں میں اسی منظر کا حصہ معلوم ہو رہی تھی۔

"تم کتنی سوہنی ہو مرک! تم پر فدا ہونے والوں کو میں اپنا رقیب نہیں سمجھتا۔ جو تمہیں دیکھ کر تمہارا دیوانہ ہو۔ اس میں اس کا دوش نہیں، تمہارا حسن ہی ہوش ربا ہے۔" ہالار نے بے خود سا ہو کر اس کا ہاتھ دبایا۔ مرک جھینپ گئی۔ اور شرمیلی مسکان لبوں پر سجا کر نظر گھمائی تو چونک اٹھی۔ چند فٹ دور حسن چاچا کی چھت پر کھڑا ارباب حسن ان دونوں کو ہی دیکھ رہا تھا۔ مرک کو سانجھی (مغرب) کے جھٹپٹے میں بھی اس

"چلو ہالار! نیچے چلتے ہیں۔" وہ منڈیر سے بہ عجلت اتری۔

"کیا ہوا؟" ہالار نے حیرت سے مرک سے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔" اس نے قدم آگے بڑھائے تو ہالار کو بھی اس کی پیروی کرنی پڑی۔

"پھوپھو! آپ کہاں تھیں۔" وہ سیڑھیوں سے اترے تو سنی آ کر مرک سے لپٹ گیا۔

"ادھر ہی تھی تمہاری پھوپھو۔ کبھی ہمیں بھی لفٹ کروا دیا کرو۔" ہالار نے سنی کے کندھوں پر ہاتھ رکھا۔

"یہ اپنی پھوپھو کا دیوانہ ہے۔" مرک نے سنی کے بال پیار سے بگاڑے۔

"ہم بھی تو آپ کے دیوانے ہیں سائیں۔" ہالار نے مرک کی طرف جھکتے شرارت سے کہا۔ مرک دو قدم دور ہٹی۔

"مرک! ہالار کے بابا ہمارے بابا سائیں کے ساتھ شادی کے معاملات طے کر رہے ہیں۔" سجل بھابھی نے آ کر اطلاع دی تو ہالار سنبھل گیا۔

"آج رخصتی کی تاریخ لے کر ہی جائیں گے ہم بھابھی۔" پھر اس نے مسکرا کر کہا۔

"خیر سے ہو رخصتی۔" سجل بھابھی نے دعا دی۔

"آمین۔" دونوں نے بیک وقت کہا۔

"بڑی جلدی ہے بھئی۔" سجل بھابھی کھلکھلائی۔

"وہ تو ہے۔" اس نے مرک کے شفق رنگ چہرے کو دیکھ کر کہا۔ پھر وہ دونوں آگے بڑھ گئے اور مرک وہیں کھڑی ہو کر مستقبل کے سہانے خوابوں میں کھو گئی۔

"پھوپھو! اب آپ کا بیاہ ہو جائے گا۔" سنی نے کچھ اداسی سے پوچھا۔

"ہاں۔" وہ مسکرائی۔

"آپ اس گھر سے چلی جائیں گی۔" سنی بے چین ہوا۔

"ہاں۔" مرک کے چہرے پر لالی بکھری۔

"پھر آپ ادھر کبھی کبھی آئیں گی۔" سنی نے مزید پوچھا۔

"ہاں۔" مرک خیال میں گم بولی۔

"تو پھر میں آپ کو کہیں جانے نہیں دوں گا۔" سنی ایک دم چیخا تو وہ جیسے ہوش میں آئی۔ "آپ یہیں رہیں گی میرے ساتھ۔" وہ مرک سے لپٹ گیا۔

"ارے میں اپنے پیارے سنی سے دور کہیں نہیں جارہی۔ یہ دو قدم پر تو ہالار کا گوٹھ ہے۔ تم سے ملنے روز آؤں گی۔" مرک نے سنی کو بہلایا۔

"آپ روز ادھر آیا کریں گی نا؟" سنی نے گیلی ہوتی بھاری آواز سے بالآخر تصدیق چاہی۔

"ارے میرا بچہ۔ میں کیسے نہیں آؤں گی۔ یہاں تو میری جان ہے، جس کا نام سنی ہے۔" مرک نے اپنے دس سالہ بھتیجے کو بے اختیار خود میں بھینچ لیا۔

☆☆☆

"ہائے یہ جامشورو کی ہوائیں بھی نا کتنی رومانٹک ہوتی ہیں۔ کسی ضدی محبوب کی طرح آپ کو گھسیٹ کر اپنے ساتھ لے جانا چاہتی ہیں۔" طوبیٰ نے اپنا اڑتا ہوا اسکارف گردن کے گرد لپیٹا۔

"ہمارا جامشورو پیچھے رہ گیا ڈیئر! یہ سن شہر ہے بلکہ اب تو ہم سن شہر سے بھی کافی دور نکل آئے ہیں۔" مضراب نے طوبیٰ کی معلومات میں اضافہ کیا۔ وہ ریڈ ٹاپ اور ڈینم میں ملبوس اپنے گلے میں لٹکتا ریڈ اسٹول اور سر پر پہنی کیپ کس کر پکڑنے میں مصروف تھی۔

"او گاڈ میری پی کیپ۔" پھر اس نے کوئی تیسری بار اپنے سر سے اڑ کر زمین پر گرتی کیپ اٹھائی۔

"اسے کسی گلو سے اپنے سر پر چپکا لو، ان ہواؤں میں تو یہ ٹھہرنے والی نہیں۔ بار بار اٹھک بیٹھک کر رہی ہو۔" طوبیٰ اس ایلسر سائز سے تنگ آئی۔

"اور کتنا چلنا ہے، میں تو تھک گئی۔" ماہم نے اونچے نیچے پتھروں پر بہ مشکل پیر جمائے۔

"ابھی تو گاڑی سے اتری ہو محترمہ۔ ابھی سے تھک گئیں۔" رجا نے نازک اندام ماہم کا مذاق اڑایا۔

"مجھے پہاڑی علاقوں میں چلنے کی عادت نہیں۔" رجا نے منہ بنا کر کہا۔ وہ لوگ قدیمی سن گیٹ سے قلعے کے اندر داخل ہوئے۔

"گائز! سب باتیں جانے دو۔ ذرا سامنے تو دیکھو کیا نظارا ہے۔" عظام نے توجہ دلائی تو ان چاروں نے بیک وقت دیکھا۔ سامنے ہی رانی کوٹ کا خوب صورت قلعہ اپنے دامن میں صدیوں کی تہذیب وتمدن اور سحر انگیز خوب صورتی سمیٹے نظر آیا اس کے جنوب میں اونچائی پر حد نگاہ تک پھیلی قلعہ کی طویل بل کھاتی دیوار ان پانچوں کو مبہوت کر گئی۔

"واؤ کتنا دلکش ہے۔" مضراب کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"یہ دیوار سندھ کہلاتی ہے دوستوں۔ جیسے دیوار چین ہے۔" عظام نے ان کی دلچسپی بھانپ کر بتایا۔

"جس نے بنوائی انت کر دیا۔" رجا نے تبصرہ کیا۔

"واقعی کمال ہے۔" طوبیٰ نے تائید کی۔

"یہ برج دیکھو طوبیٰ۔" مضراب نے طوبیٰ کو متوجہ کیا۔

"یہ مورچے ہیں مضراب۔ اس وقت کے بادشاہ ان کو اپنے دفاع کے لیے استعمال کرتے تھے۔" عظام نے اس کی تصحیح کی۔

"اوہ اچھا۔ کاش میں یہاں کی شہزادی ہوتی۔" مضراب نے حسرت سے کہا۔

"ہاہا پھر تم ڈاکٹر کے بجائے طبیب ہوتیں۔" طوبیٰ نے ہنس کر کہا۔

...شہزادی صرف آرام کرتی ہے،
پڑھائی وڑھائی نہیں۔" مضراب بدمزا ہوئی۔

"کاہل شہزادی۔" رجا نے مذاق اڑایا۔

یہ لوگ پھر سے کار میں بیٹھ کر رنی کوٹ قلعے کے درمیان میں بنے مری کوٹ کے قلعے میں داخل ہوئے جو سیاحوں کی من پسند جگہ تھی۔ یہاں کافی سیاح چہل قدمی کرتے دکھائی دیے۔ قلعے کی پہلی سیڑھیاں چڑھ کر یہ لوگ اوپر چلے آئے جہاں طویل راہداریاں بنی ہوئی تھیں ان راہداریوں کی دیواریں بھی مخصوص طرز تعمیر کا شاہکار تھیں۔ وہ پانچوں ایک دوسرے کے آگے پیچھے چلتے اس فن تعمیر کو سراہ رہے تھے مگر مضراب تو دل سے فدا ہو چکی تھی مری کوٹ کی دیواروں سے سارے قلعے کا نظارہ بہ آسانی ہو رہا تھا۔

مضراب ایک دیوار پر اپنی کہنیاں ٹکائے دور تک پھیلے اس عظیم وشان قلعے کو ستائشی نظروں سے دیکھتی رہی۔ پھر اس نے پنجوں کے بل زمین پر بیٹھ کر دیوار کے چوکور سے بنے سوراخوں کا جائزہ لیا۔ ان کو کس مقصد کے تحت بنوایا گیا ہوگا۔ وہ سوچنے لگی۔ اس غور وفکر میں اس کی پی کیپ کب ہوا کے زور سے اڑ کر پیچھے گری پتا ہی نہ چلا۔ کیپ کو کسی نے اس کی طرف بڑھایا تھا۔

"طوبیٰ! یہ دیکھو ان دیواروں میں سوراخ غالباً اس لیے ہیں کہ یہاں سے تیر انداز اپنے دشمن کا نشانہ لیتے ہوں گے۔" مضراب نے کیپ کے ساتھ طوبیٰ کا ہاتھ بھی پکڑ لیا لیکن اگلے ہی پل وہ چونک گئی یہ مضبوط مردانہ ہاتھ طوبیٰ کا نہیں تھا۔ مضراب نے فوراً دائیں طرف گردن گھمائی تو پہلی نظر کالے چمکتے مردانہ جوتوں پر پڑی دوسری بادامی شلوار قمیص اور براؤن اجرک پر اور پھر مونچھوں والے پرکشش چہرے پر ٹک گئی۔ اس نے ایک دم اس بندے کا ہاتھ چھوڑا اور اپنی جگہ سے کھڑی ہوگئی۔

"آپ کون ہیں اور طوبیٰ کہاں گئی؟" مضراب نے یوں پوچھا جیسے طوبیٰ کی غیر موجودگی ...ہو۔

"میں آپ کی طرح ایک سیاح ہوں۔ اور طوبیٰ کہیں گم نہیں ہو سکتی، یہ محفوظ قلعہ ہے۔ آپ بے فکر رہیں محترمہ۔" اس بندے نے سینے پر بازو لپیٹ کر کہا۔

"وہ کوئی بچی نہیں کہ گم ہو جائے۔" مضراب نے منہ بنا کر کہا۔

"اوہ اچھا۔ ویسے یہ سوراخ غالباً نہیں یقیناً دشمن سے دفاع کے لیے بنوائے گئے تھے۔" اس بندے نے جیسے اس کی معلومات میں اضافہ کیا۔

"کسی لیے بھی بنوائے گئے ہوں، مجھے کیا۔" وہ بے نیازی سے سر پر کیپ جما کر آگے بڑھی مگر اپنے پیچھے کسی کی آنکھوں کا ارتکاز دور تک محسوس ہوا۔

"یہ تم لوگ مجھے چھوڑ کر نیچے کیسے پہنچ گئے۔" وہ سیڑھیوں سے اتر کر اس طرف آئی جہاں عظام، رجا، طوبیٰ اور ماہم کو ایک پرانا کنواں دکھا رہا تھا۔

"تم قلعے کی دیواروں پر اپنی کہنیاں جمائے پرنسز کی طرح کھڑی تھیں، ہم نے سوچا کیا پتا خیالوں میں تم شاہی دربار میں گولڈن چیئر پر بیٹھی ہو اور ہمارے آواز دینے سے اس کرسی سے گر جاؤ۔" رجا نے کھلکھلا کر کہا تو مضراب نے اسے دھپ ماری۔

"گائز۔ یہ دیکھو اس کنویں میں ڈول کے بجائے بانس ڈالے جاتے ہیں۔" عظام نے ان چاروں کو مطلع کیا۔

"کیوں بھئی۔" وہ چاروں متجسس ہو کر کنویں پر جھک گئیں۔

"کیونکہ یہ اب پانی سے خالی ہے اس لیے۔" عظام نے دانت نکالے۔

"اوہ گاڈ، تم جیسا اناڑی گائیڈ کسی کو نہ ملے۔ یونی میں کتنی بڑھکیں مار رہے تھے کہ رنی کوٹ کی ہسٹری جانتے ہو اور یہاں آ کر مجال ہے کچھ بھی صحیح بتایا ہو۔" طوبیٰ نے عظام کو آڑے ہاتھوں لیا۔ وہ ڈھٹائی سے ہنسنے لگا۔

"ایک جگہ ہے یہاں جسے پریوں کا مسکن کہتے

ہیں، آؤ تم لوگوں کو دکھاؤں۔"
"پریوں کا مسکن...... واؤ۔ وہاں پریاں آتی ہیں۔" وہ پھر سے ایکسائیٹڈ ہوئیں۔
مری کوٹ سے ڈیڑھ کلومیٹر دور پہاڑوں کے دامن میں یہ صاف وشفاف نہر تھی جو پریوں کا مسکن کہلاتی تھی۔
"کتنی خوب صورتی ہے یہاں۔" مضراب مسمائز سی ہو کر نہر کے قریب ایک پتھر پر بیٹھ گئی۔
"واؤ یہاں تو ننھی منی مچھلیاں بھی ہیں۔" وہ پانی میں تیرتی رنگ برنگی مچھلیاں دیکھ کر خوش ہوئی۔
"یہاں پریاں کہاں ہیں۔" رجا نے چاروں طرف کھوجتی نظر گھمائی۔
"تم لوگ جو ہو پریاں۔ میڈیکل کالج کی پریاں۔" عظام نے ہنس کر کہا۔
"یو چیٹ۔ تمہیں کسی بات کا پتا نہیں۔" طوبیٰ نے اسے منرل کی خالی بوتل ماری۔
"سچ کہہ رہا ہوں، یہ جگہ اسی نام سے مشہور ہے۔" اس نے زور دے کر کہا۔ "اچھا ٹھہرو، مجھ پر یقین نہیں تو میں تم لوگوں کو ایک بندے سے ملواتا ہوں جو اس جگہ کی نالج رکھتا ہے۔ بائے لک آج وہ یہاں آیا ہوا ہے۔" وہ ایک طرف چل پڑا اور کسی کے ساتھ واپس آیا۔
"بھائی! یہ میری یونی فیلوز ہیں ڈاکٹر طوبیٰ ڈاکٹر رجا، ڈاکٹر ماہم اور ڈاکٹر مضراب۔" عظام نے تعارف کروایا۔ تو مضراب نے مچھلیوں سے توجہ ہٹا کر ادھر دیکھا۔ اور چونک گئی سامنے وہی بندہ عظام کے ساتھ کھڑا تھا جو قلعہ میں اسے ٹکرایا تھا۔ ان تینوں کی ہیلو کا جواب دیتے وہ مضراب کو ہی دیکھ رہا تھا۔
"یہ سب آج میرے ساتھ ادھر ٹرپ پر آئی ہیں اور مجھے ایک تاریخ دان سمجھ کر یہاں کی ساری ہسٹری جان لینا چاہتی ہیں۔ اب میں ٹھہرا ایک مسکین سا میڈیکل اسٹوڈنٹ اپنی خشک پڑھائی سے فارغ نہیں سندھ کی تاریخ کیسے کھنگالوں۔ آپ ان کو یہاں کی نالج دے دیں۔" عظام نے اس بندے سے بے تکلفی سے فرمائش کی۔
"کیوں نہیں۔ جو کچھ پوچھنا ہے آپ اس قلعے کے متعلق مجھ سے پوچھ سکتی ہیں۔" اس بندے نے سنجیدگی سے آفر کی۔
"فی الحال تو آپ کا تعارف چاہیے۔ اپنے متعلق کچھ بتائیے۔" رجا نے اس کی وجاہت کو ستائشی انداز میں دیکھ کر کہا تو وہ دلکشی سے مسکرایا۔
"میرا تعارف کچھ خاص نہیں۔ عام سا ہے۔" اس نے کندھے اچکائے۔
"اب اتنی زیادتی مت کریں ہمارے ساتھ سارنگ بھائی۔ آپ کہاں سے عام ہوئے۔" عظام نے فوراً کہا۔
"چلیں، میں ان کا تعارف کرواتا ہوں تو گائز! یہ سارنگ تالپور ہیں۔ لندن سے گریجویشن کیا ہے اور پیشے کے لحاظ سے جدی پشتی زمین دار ہیں۔ آپ آرکیالوجی میں گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔ اور سندھ کے تاریخی مقامات کی بقاء کے لیے دل وجان سے کوشاں ہیں جس کے لیے سندھ ورثہ کے نام سے ایک تنظیم بنائی ہے جس کے تحت آئے دن مختلف سیمینارز اور پروگرامز ارینج کرواتے رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ......"
"بس کر دو بھائی! بہت ہو گیا۔" سارنگ نے عظام کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو اس کی بولتی بند ہوئی۔
"بہت دلچسپ۔" رجا ایک دم متاثر نظر آئی۔
"کہاں لندن جیسا جدید شہر اور کہاں یہ آثار قدیمہ۔ بہت عجیب سنگم ہے آپ کی تعلیم اور مزاج کا۔" رجا کی حیرانی پر وہ مسکرایا۔
"آپ کو شاید اپنی دھرتی کی کشش کا اندازہ نہیں ڈاکٹر رجا۔ یہ ایک بار آپ کے قدم جکڑ لے تو آپ کو دنیا کے کسی اور حصے میں ٹھہرنے نہیں دیتی۔" اس نے جذب سے کہا تھا۔
"اسٹرینج۔" اس کی بات پر رجا نے ابرو اچکائی۔ مضراب اس گفتگو سے کچھ بے چین سی ہو کر

اپنی نشست سے اتری اور ان کے قریب آ کر کھڑی ہوئی۔

''آپ کا تعلق سندھ کے کس علاقے سے ہے۔'' سارنگ کو غور سے دیکھتے اس نے سوال کیا۔

''ساری سندھ دھرتی سے میرا دلی تعلق استوار ہے۔'' سارنگ نے مبہم سا جواب دیا۔

''میں نے پوچھا، آپ کا آبائی گاؤں کون سا ہے؟'' مضراب کے لہجے میں بلا کی بے کلی تھی۔

''میرا گاؤں شیر گڑھ ہے ڈاکٹر مضراب۔'' اس نے مضراب کی آنکھوں میں دیکھ کر سنجیدگی سے جواب دیا تو مضراب جیسے پتھر کی ہو گئی۔

☆☆☆

''مما! میں نانا کے گھر جاؤں۔'' رابی نے اجازت چاہی۔

''نہیں۔'' نجمہ نے فوراً انکار کیا۔

''کیوں؟'' اس نے منہ پھلایا۔

''وہ آپ کے نانا کا گھر نہیں۔ یہ ہے آپ کے سگے نانا کا گھر۔'' نجمہ نے اس کو پونیاں باندھ کر کنگھی ایک طرف رکھی۔

''پہلے تو وہ بھی تھا۔'' رابی نے یاد دلایا۔

''اب نہیں ہے۔'' نجمہ اپنی نشست سے اٹھی۔

''کیوں نہیں ہے؟'' رابی نے الجھ کر پوچھا۔

''توبہ ہے، کتنے سوال کرتی ہو۔ نہیں ہے تو نہیں ہے۔'' نجمہ جھنجلائی۔

''وہاں جو میرے کزنز رہتے ہیں، وہ بھی ہمارے نہیں۔'' رابی نے بھولپن سے مزید سوال کیا۔

''نہیں۔'' نجمہ نے زور دے کر کہا۔

''اور وہ پری جیسی مرک آنٹی۔''

''نہیں ہے وہ تمہاری آنٹی۔ چڑیل ہے پوری۔'' نجمہ نے اسے ایک دم گھرک دیا۔ رابی سہم کر خاموش ہو گئی۔

''کیوں بچی کو منع کر رہی ہو۔ سارا بچپن بڑی حویلی میں آ گزرا ہے تمہارا بھی۔ اور رابی کا بھی۔ اب جو معاملات ہوئے اس میں بچی کا قصور کہ اس پر بھڑک رہی ہو۔ یہ کیا جانے بڑوں کی ناچاقی اور رنجشیں۔'' مہراب بی بی نے رسان سے بیٹی کو سمجھایا۔

''یہ بھی جان لے تو اچھا ہے پھر ان سنگ دلوں سے دور رہے گی۔ میرے اکلوتے بھائی کے ارمانوں کا خون کر کے چڑیل اپنا گھر بسا رہی ہے۔'' نجمہ ماں پر الٹ پڑی۔

''ارمانوں کا خون ضرور ہوا تھا پر اب سنبھل گیا ہے میرا بیٹا۔ اتنی خوب صورت لڑکی سے اس کا بیاہ کیا ہے، سب کچھ بھول بھال گیا ہے۔'' مہراب بی بی نے جیسے نجمہ اور خود کو یقین دلایا۔

''خدا کرے بھول جائے۔ بچپن کی منگ تھی مرک اس کی۔ سگے چاچے کی بیٹی۔ اپنا دل بدل کر دوسرے کا ہاتھ پکڑ لیا۔ شرم اس کے بھائیوں کو بھی نہیں آئی فوراً ہالار سے نکاح پڑھوا لیا۔ خاندانی روایات توڑ دیں اپنی منہ زور بہن کے پیچھے۔ چاچا حیات ہوتے تو دیکھتی کیسے من مانی کرتے ہیں۔'' نجمہ زہر بھرے انداز میں بولی۔

''ان کے فوت ہونے کے بعد ہی تو معاملات بگڑے ہیں۔ لاڈلی چھوٹی بہن ہے۔ جان دیتے ہیں تینوں بھائی مرک پر۔ مجھ سے پوچھو تو ایسی بے دید لڑکی دل سے پسند نہیں تھی۔ تمہارے مرحوم بابا کی پرزور خواہش پر بچپن میں اس کا ہاتھ مانگ تو لیا مگر جوانی میں اس کے رنگ ڈھنگ مجھے تو نہیں بھائے۔ شہر سے پڑھ کر خود کو نہ جانے کیا سمجھنے لگی۔ میرے گھبرو بیٹے میں سو عیب نظر آنے لگے۔ دھول مٹی ڈالو ایسی لڑکی پر۔ اب ہالار کے گھر جا کر بس جائے تو بڑی بات ہے۔''

مہراب بی بی نے اپنا لاوا نکالا۔

اس کے انکار پر میں تو بہت خوش ہوئی اور فوراً اپنے بیٹے کو اپنی من پسند بہو لا دی۔ پھر وہ مطمئن انداز میں بولی۔

''آپ نے اپنی من پسند بہو لا کر دے دی۔ بیٹے کی پسند کا کیا۔'' نجمہ نے منہ بنا کر کہا۔

''ارے مرد کا دل ہے، کب تک سوگ مناتا۔

اب خوش ہے میرا بچہ۔" مہراب بی بی نے مسکرا کر کہا تو ان کی سادگی پر نجمہ نے سر جھٹکا۔

"ہونہہ، بہت خوش ہے۔"

"مما! میں نانا کے گھر جاؤں۔" رابی کا مطالبہ ابھی بھی وہی تھا۔

"جاؤ بچی۔ کون روکتا ہے شاباش۔" نانی کے کہتے ہی اس نے دوڑ لگادی۔

اپنی حویلی کی مشرقی دیوار سے متصل ایک بڑا سا گیٹ جو دونوں حویلیوں کو آپس میں جوڑے ہوئے تھا۔ رابی نے بھاگتے ہوئے عبور کیا اور کشادہ صحن میں داخل ہوگئی۔ "اے امڑ سھال ([illegible]ئی سنبھل کر)" موبل چاچی نے ناک کی سیدھ میں بھاگتی رابی کو ٹھوکر کھانے سے بچایا۔ وہ اس وقت صحن میں حد نظر تک زمین پر بکھری لال مرچیں مزارع عورتوں سے ٹوکریوں میں بھروا رہی تھیں۔

"امن کہاں ہے مامی۔" رابی نے پوچھا۔

"اوپر اپنی دادی سے سر میں تیل لگوا رہی ہے۔" انہوں نے بتایا تو رابی برآمدے سے نکلتی گول سیڑھیوں سے دھڑا دھڑ اوپر چلی آئی۔ یہاں طویل راہداری کے دونوں طرف بنے کمروں میں سے نانی کا کمرہ ڈھونڈنا اسے ہمیشہ کی طرح مشکل لگا۔ یہ حویلی ان کی حویلی سے دوگنی بڑی اور چکردار تھی۔ رابی کبھی ایک طرف کو جانا چاہتی تو کسی اور طرف آنکلتی تھی۔ اس حویلی کے مکین جانے کیسے اس میں رہا کرتے تھے۔ وہ اندازے سے نانی کا کمرہ ڈھونڈنے لگی۔ کچھ کمروں کے دروازے بند، کچھ کے کھلے تھے۔ وہ امن کا نام پکارتی رہی پر جواب نہ ملا۔

"میں واپس جاتی ہوں۔" اس نے مایوس ہوکر واپسی کی راہ لی۔

"ہاہ......" اچانک اس آواز نے رابی کو دہلا دیا۔

"مما۔" وہ بے اختیار چیخی۔

"ڈر گئیں۔ ہاہا ڈرپوک چھوکری۔" سنی کھلکھلایا۔ رابی نے اسے غصے سے دیکھا۔

"میں نہیں ڈرتی۔" رابی نے اپنی تیز چلتی سانس کو قابو کیا۔ اس شرارتی لڑکے کے سامنے ڈرپوک ہونے کا اقرار غضب بن جاتا۔

"اچھا۔ نہیں ڈرتی۔ اس دن مصنوعی سانپ سے کیسے ڈری تھیں۔" سنی نے مذاق اڑایا۔

"وہ تم نے اچانک میرے اوپر پھینکا تھا۔ ورنہ میں نہیں ڈرتی۔" رابی نے اپنا دفاع کیا۔

"اچھا تو تم بہت بہادر ہو۔" سنی نے پوچھا۔

"ہاں بہت بہادر ہوں۔" رابی نے فوراً کہا۔

"چلو پھر آؤ میرے ساتھ، آج تمہاری بہادری کا امتحان ہے۔" سنی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور ایک تنگ سے کمرے میں لے آیا۔ جہاں کاٹھ کباڑ رکھا تھا۔

"یہاں صرف دس منٹ اکیلے گزار کر دکھاؤ، میں تمہیں بہادر مان جاؤں گا۔" سنی نے شرارت سے چمکتی آنکھیں رابی پر ٹکائیں۔

"دس منٹ۔" رابی نے نظریں گھما کر چاروں طرف دیکھا۔

"ہاں صرف دس منٹ۔ میں تمہیں یہاں چھوڑ کر باہر سے دروازہ بند کردیتا ہوں۔ تم نے اگر دس منٹ یہاں گزار لیے تو سمجھو تمہارا ایگزام پاس۔" اس نے مزے سے کہا۔

"پھر تم مجھے کبھی کاورڈ نہیں کہو گے۔" رابی نے تصدیق چاہی۔

"کبھی نہیں۔ اوکے۔ اب میں باہر جاتا ہوں۔ بائے۔" وہ ایک دم اسٹور روم سے باہر نکل گیا۔

"سنی۔" رابی کو اگلے ہی پل گھبراہٹ نے گھیر لیا۔

"سنی......" وہ دروازہ بجانے لگی۔ اچانک اسٹور روم کا اکلوتا بلب بجھ گیا۔ رابی کا دم رکنے لگا۔

"سنی دروازہ کھولو...... لائٹ چلی گئی ہے۔" وہ چلائی۔ پر دروازے کے پار خاموشی تھی۔ تو کیا سنی

سے سوچا اور دہل گئی۔

''مما مما...... دروازہ کھولیں۔'' اس نے ہتھیلیوں سے دروازہ پیٹنا شروع کر دیا۔ اسے اس چار فٹ کے اسٹور سے خوف آ رہا تھا۔ وہ اس تاریکی میں سانس نہیں لے پا رہی تھی۔ اچانک ایک لجلجی چیز اس پر آ گری اور وہ دہرے خوف سے بے ہوش ہو کر گر پڑی۔

☆☆☆

''آپی! کیا بات ہے۔ جب سے ٹرپ سے واپس آئی ہو، بہت خاموش ہو۔'' عفان نے اس کے برابر میں بیٹھتے سوال کیا تو مضراب چونک اٹھی۔

''کچھ نہیں۔'' وہ زبردستی مسکرائی۔

''کچھ کیسے نہیں۔ ٹی وی پر اسپورٹس چینل لگایا ہوا ہے، پاپ کورن کے بجائے اپنے ناخن چبا رہی ہو۔ اور آنکھیں چھت سے لگا رکھی ہیں۔'' عفان نے بہن کو بغور دیکھ کر کہا۔ مضراب نے فوراً اپنا ہاتھ پہلو میں رکھا اور سیدھی ہو بیٹھی۔

''یہ اسپورٹس چینل تو پہلے ہی سے لگا ہوا تھا، میں ٹی وی دیکھ کہاں رہی تھی۔'' اس نے وضاحت کی۔

''وہی تو پوچھ رہا ہوں آپ ٹی وی نہیں دیکھ رہیں مگر کچھ سوچ رہی تھیں، کیا سوچ رہی ہو مجھے بتاؤ۔'' عفان نے رسان سے پوچھا۔

''نہیں تو کیا سوچوں گی بھلا۔ مجھے چھوڑو، تم اپنا بتاؤ، آج کل بہت خوش نظر آتے ہو۔'' مضراب نے اس کے چمکتے چہرے پر نظر ڈال کر سوال کیا۔

''میں...... خوش ہوں۔ واقعی میرا چہرہ بتا رہا ہے کیا؟'' عفان نے سنبھل کر اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔

''اور کیا تمہارا چہرہ بتا رہا ہے، یہ خوشی عام نہیں ہواؤں میں اڑنے والی خوشی ہے۔'' مضراب نے دانستہ شرارت سے پوچھا۔

''ہمم...... اب آپ جان ہی گئی ہیں تو......''

''مجھے ایک لڑکی سے پیار ہو گیا ہے آپی۔'' اس نے سرگوشی میں کہا تو مضراب نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔

''تم اور محبت۔ ام پاسبل۔'' پھر زور سے نفی میں سر ہلایا۔

''کیوں میں انسان نہیں۔ میرے سینے میں دل نہیں، دل کے اندر جذبات نہیں۔ جذبات کے اندر......''

''بس بس۔ معاف کر دو۔'' عفان کی نان اسٹاپ زبان پر اس نے ہاتھ جوڑے۔

''اب سوال کیا ہے تو پوری روداد تو سنو۔'' وہ ہنسنے لگا۔

''مذاق برطرف پلیز، سچ بتاؤ کیا واقعی پیار کا معاملہ ہے۔ اگر ہے تو کون ہے وہ ان لکی لڑکی۔'' مضراب کی آخری بات پر عفان نے شاک لگا۔

''آپی! اپنی ہونے والی بھابھی کو ان لکی کہہ رہی ہو۔''

''میری ہونے والی بھابھی۔ مطلب بات اتنی آگے چلی گئی اور تم نے مجھے بتایا نہیں۔'' مضراب چیخ پڑی۔

''دھیرے بولو، دیواروں کے کان پھاڑو گی کیا۔'' وہ گھبرا کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔

''پیار کیا تو ڈرنا کیا۔'' مضراب ہنسی۔ ''ویسے وہ ہے کون؟ جس نے میرے پیارے سے بھائی کو اپنا دیوانہ بنایا ہے۔'' وہ ہنوز شرارت کے موڈ میں تھی۔

''اس کا نام ایمان ہے۔ آپ ملی تو ہو۔'' اس نے یاد دلایا تو مضراب کو فوراً کلک ہوا۔

''وہ ایمان تمہاری کلاس میٹ۔ نازک سی خوب صورت لڑکی۔ جو تمہارے گروپ میں شامل ہے۔''

''ہاں وہی، پہلے پہل تو رسمی علیک سلیک تھی پھر دوستی ہوئی اور اب اس کے لیے بہت خاص فیلنگو

صاحب کو بلا کے لاتا ہوں۔"
شکورا آدھی پنجابی اور آدھی اردو ملا کر بولا۔
"اوئے مولوی صاحب کو کیا کہتا ہے؟" میاں جی پیچھے سے للکارے۔
"خالہ جی! میں ابھی گیا اور ابھی آیا۔" شکورے کے منظر سے ہٹتے ہی میاں جی نے قمرن کی طرف دیکھا۔اور قمرن نے میاں جی کی طرف۔
"مجھے افسوس ہے کہ میری وجہ سے......"
"اور مجھے بھی کہ میری وجہ سے۔" دونوں بیک وقت بولے۔
"مگر لوگوں کو کیا تکلیف تھی؟" قمرن بولی۔
"بس بات تو ان کی بھی ٹھیک ہے۔صرف کہنے سے کوئی بہن بھائی بن نہیں جاتا۔"
"راستہ وہی سیدھا اور صاف ہے۔ جو اللہ کا بتایا ہوا ہے۔" میاں جی بولے۔
"مطلب۔" قمرن حیران ہوئی۔
"مطلب نکاح اور اس میں حرج بھی کیا ہے۔اس گھر کو ایک سمجھ دار عورت کی ضرورت ہے۔اور آپ کو ایک سائبان کی۔" میاں جی گویا کسی نتیجے پر پہنچ چکے تھے۔
"مگر لوگ کیا۔" قمرن کو میاں جی نے فقرہ بھی پورا نہ کرنے دیا۔" بھاڑ میں گئے لوگ۔ جب آپ بے گھر اور بے در ہو گئی تھیں۔تو کتنے لوگوں نے آپ کی پروا کی، کسی ایک نے بھی نہیں نا۔تو آپ کیوں کسی کی پروا کرتی ہیں۔"
"اور میرے آوارہ بیٹے وہ میرے ساتھ ساتھ آپ کو بھی قتل کر دیں گے۔" قمرن کو اپنے بیٹے یاد آ گئے۔
"اچھا اتنا کمزور سمجھا ہوا ہے مجھے کہ میں اپنی اور اپنی بیوی کی حفاظت بھی نہیں کر سکتا۔" میاں جی نے سینہ پھلایا۔
"بیوی؟" قمرن نے حیرت سے انہیں دیکھا۔
"بھئی نکاح کی صورت میں۔" وہ شاید مسکرا رہے تھے۔قمرن کو اچانک ہی گھبراہٹ اور شرم نے گھیر لیا۔
"میں چلتی ہوں۔" وہ جانے کو مڑی۔
"مگر کہاں اس وقت کہاں جائیں گی؟"
"اوہ جی خالہ جی آپ کتھے چلے او کلے کلے۔ ہم دونوں کو بھی ساتھ لے جائیں۔"

شکورا نیچے صحن میں بھنگڑا ڈال رہا تھا۔جب باہر سے کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ باہر گلی کے معززین مولوی صاحب کو ساتھ لے کر کھڑے تھے۔" میں میاں جی کو لے کر آتا ہوں۔" شکورا اوپر بھاگا۔
"میاں جی! نیچے پروہنے آئے ہیں۔" اس نے میاں جی کو اطلاع دی۔
"پروہنے او کون سے پروہنے۔"
"نیچے آ کے دیکھ لیں۔" شکورا نیچے بھاگا۔ان کے بیٹھنے کا انتظام کرنے۔ ہمسائیاں قمرن خالہ کو گھیرے بیٹھی تھیں۔
اور وہ تقدیر کے اس اچانک پلٹنے پر خوف زدہ اور حیرت زدہ تھی۔ خیر! میاں جی پر اعتبار کر کے اس نے دیکھ لیا تھا کہ وہ انتہائی شریف شائستہ اور مہذب ہیں۔
شام تک نکاح ہو گیا تب گلی کے سب دوستوں نے میاں جی کو بتایا کہ یہ ان سب کی اسکیم تھی۔جس میں سب سے اہم کردار شکورے نے ادا کیا۔
رات دیر تک شکورا بھنگڑے ڈالتا رہا اور گھڑے بجا بجا کر ٹپے اور ماہیے گاتا رہا۔مگر صبح سویرے جب میاں جی نے اس کے ہاتھ میں چند کڑکتے نوٹ پکڑائے۔اور اسے دس دن کی چھٹی پر اس کے گاؤں روانہ کرنا چاہا۔تو وہ اکڑ گیا۔
"لو جی میں ضرور جانا ایہہ دلی والے آگ لینے آئے۔ تے گھر والے بن بیٹھے۔(یہ دلی والے آگ لینے آئے اور گھر والے بن بیٹھے) اب میری کسے نوں ضرورت نہیں۔"
"او نگوڑ مارے تم بھی چند دن اپنے امی ابا کو مل آؤ۔اداس نہیں ہوتے۔"
"خالہ جی اداس تو میں ہو جاتا ہوں۔" مگر جانے سے پہلے یہ نگوڑ مارے کا مطلب تو بتا دیں۔
"اوہ آ کے پوچھنا۔تمہاری بس جانے والی ہو گی۔" میاں جی آج مسکرا رہے تھے۔
اور قمرن پورے استحقاق سے باورچی خانے کی چوکی سنبھالے پیالوں میں چائے چھان رہی تھی۔
☆

گھپ اندھیرے میں لحظہ بہ لحظہ بڑھتا خوف اس کی سانسوں پر اپنے پنجے گاڑ رہا تھا۔ دل کی دھڑکن بے ربط اور زبان خشک تر ہو چلی تھی۔ اسٹور کی مخصوص سیلن زدہ کڑوی بو اس کی ناک کے ذریعہ حلق تک اتری جاتی تھی۔ حلق جو اپنی سی طاقت لگا کر چیخ چیخ کر تھک چکا تھا۔

اس نے اپنی دونوں ہتھیلیوں سے ایک بار پھر دروازے کو پیٹنا شروع کر دیا۔

"مما مما...... دروازہ کھولو۔"

وہ زور لگا کر ایک بار پھر چیخی تھی۔ مگر اس بار بھی اس کا چلانا بے کار گیا۔ دروازے کے اس پار کسی کو اس کی آواز سنائی نہ دی تھی۔ اس نے اپنی درد کرتی ہتھیلیاں دروازے پر ہی ٹکا دیں اور روتے ہوئے ان پر اپنا چہرہ رکھ دیا۔ اچانک ہی کوئی لجلجی چیز اس کی گردن پر آ کر گری۔ وہ بے اختیار چیخ کر اچھلی اور ہاتھ سے اپنی گردن سے اس چیز کو جھٹکا۔

وہ چیز یقیناً کوئی چھپکلی تھی۔ چھپکلی جس سے اس کی جان نکلتی تھی۔ اندھیرے اور اکیلے پن کا خوف اب ایک نئے خوف کے زیر اثر آ گیا تھا۔ بالآخر وہ اس چار فٹ کے تنگ و تاریک اسٹور کے فرش پر بے ہوش ہو کر گر پڑی۔ ☆☆☆

"مما!" مضراب ایک چیخ مار کر نیند سے جاگی اور اٹھ کر بیٹھ گئی اس کا پورا وجود پسینے میں بھیگا ہوا تھا اور دل کی دھڑکن بے قابو تھی۔ تیز تیز سانسیں لیتے اس نے اضطراری انداز میں چاروں طرف دیکھا۔ نیلگوں روشنی میں نہایا ہوا یہ اس کا اپنا آرام دہ بیڈ روم

فرح بھٹو

محبت گونج ہے سائیں کا



مکمل ناول



اللہ...... اس نے اپنا ایک ہاتھ دل پر رکھ کر جیسے خود کو پرسکون کرنے کی سعی کی۔

اس نے سائڈ ٹیبل پر رکھے جگ سے گلاس میں پانی انڈیلا اور اپنے لبوں سے لگالیا۔ گلاس واپس رکھ کر وہ پھر سے تکیہ پر سر رکھ کر لیٹ گئی لیکن اس بار آنکھیں دوبارہ بند نہ کرسکی۔ ایک خوف اس کے خواب سے نکل کر جیسے دل میں آ کر بیٹھ گیا تھا۔ ٹورمینٹر (اذیت پسند) تم زندگی سے نکلنے کے بعد بھی خوابوں میں زندہ ہو۔ اس نے بڑبڑا کر کروٹ بدلی تھی۔

☆☆☆

صبح اس کی آنکھ کچھ دیر سے کھلی وہ ہڑبڑا کر بستر سے باہر نکل آئی۔ جلدی جلدی تیار ہو کر اپنا اوور آل بیگ اور فائل اٹھا کر نیچے آئی۔ ڈائننگ میز پر پاپا اور عفان پہلے سے موجود تھے۔

''گڈ مارننگ ایوری ون۔'' ڈائننگ ٹیبل کی کرسی کھینچ کر اس پر بیٹھتے اس نے وش کیا۔

''گڈ مارننگ بیٹا۔'' پاپا نے جواباً پیار سے بیٹی کو دیکھا۔

''گڈ مارننگ آپی۔'' عفان نے ناشتے سے انصاف کرتے نظر اٹھائی۔

''مما! مجھے سویرے جگایا کیوں نہیں۔'' مضراب نے ناشتہ میز پر لگواتی ماں سے شکوہ کیا۔

''تمہارے بیڈ روم کا دروازہ مہرو نے بہت بجایا لیکن تم نے نہیں کھولا۔'' انہوں نے اس کے آگے فریش جوس کا گلاس رکھا۔

''اچھا بھئی۔ اللہ حافظ۔ چلتا ہوں۔'' بدر صاحب نے نشست سے اٹھتے ہوئے کہا۔

''پاپا! میں بھی آپ کے ساتھ چلتی ہوں۔ یونی کا پوائنٹ تو مس ہو گیا۔ آپ مجھے ڈراپ کر دیجیے گا۔'' مضراب بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔

''مضراب! ناشتہ تو ٹھیک سے کرتیں۔'' شاہانہ نے آواز لگائی۔

''مما! یونی میں کچھ کھالوں گی۔ اس نے ہاتھ ہلا کر کہا تھا۔

☆☆☆

''لیٹ ہو گئی ہو مضراب! جلدی نکلو۔''

وہ کلاس میں آئی تو تھرڈ ایئر میڈیکل اسٹوڈنٹس کا گروپ سول ہاسپٹل جانے کو تیار کھڑا تھا۔ آج ان کی آٹوپسی کی کلاس تھی۔ وہ وین کے ذریعہ دس منٹ کی ڈرائیو پر ہاسپٹل پہنچے۔ مضراب نے دیکھا، کچھ لڑکیاں بہت ایکسائیٹڈ اور کچھ ڈری ہوئی تھیں۔ لڑکے البتہ بے فکر نظر آرہے تھے۔ آٹوپسی کی کلاس میں پہلی بار کسی باڈی کا معائنہ کرنا تھا۔

''میری تو ہمت نہیں پڑ رہی، کیسے دیکھوں گی ڈیڈ باڈی۔'' طوبیٰ نے مضراب کا ہاتھ تھام کر گھبراہٹ سے کہا۔

''شرم کرو، ڈاکٹر بن رہی ہو۔ پریکٹس کے دوران کتنی ایمرجنسیز اٹینڈ کرنا پڑیں گی پھر کیا کرو گی۔'' مضراب نے اسے گھر کا مگر طوبیٰ نے ہال میں داخل ہوتے ہی آنکھیں بند کرلیں اور دل میں ورد پڑھنے لگی۔ اسٹوڈنٹس ایک ٹیبل کے گرد جمع ہو گئے۔ جہاں ایک نعش پوسٹ مارٹم کے لیے رکھی تھی۔

''توبہ ہے طوبیٰ! اتنا بھی کیا ڈرنا بہادر بنو۔'' وہ کہہ کر ڈاکٹر عمران کی طرف متوجہ ہوئی جو ٹیبل پر رکھی باڈی کو پیٹ سے کٹ لگا رہے تھے۔ مضراب نے ان کو توجہ سے سنتے نظر باڈی کی طرف ڈالی تو اس کا پسینہ پھوٹ نکلا۔ مردے کے اندرونی اعضاء اور تازہ لہو دیکھ کر اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھانے لگا۔ سر کچھ سمجھا رہے تھے مگر مضراب کے تو کان سائیں سائیں کرنے لگے۔

''طوبیٰ......'' اس نے کمزور سی آواز نکالی۔ اور کچھ ہی دیر میں وہ طوبیٰ کے اوپر غش کھا کر گر چکی تھی۔

☆☆☆

سوہنی تو سوا ہی د منجو چھونہ تو لگے کھڑ جادو کیو تھئی کھڑ ومنتر پڑھو تھئی

(سوہنی تیرے سوا یہ دل میرا کیوں نہیں لگتا، کون سا جادو کیا ہے کیسا منتر پڑھا ہے)

ہالار مرک کے گلابی پڑتے چہرے کو محویت سے دیکھتے گنگنایا۔ مُرک نے شرما کر اپنے نازک ہاتھ کو اس کے ہاتھ سے چھڑایا۔

''کیا کرتے ہو ہالار! کوئی دیکھ لے گا۔'' وہ شرمیلی مسکراہٹ سے بولی۔

''دیکھ لینے دو۔ اب تو تمہارے تمام جملہ حقوق میرے نام ہو چکے ہیں۔ اب دنیا کی پروا کیوں کر رہی ہو۔'' ہالار نے پھر سے کا ہاتھ پکڑلیا۔

''دنیا سے لڑی ہوں تو تمہیں پایا ہے ہالار! دنیا سے ڈری ہوتی تو آج اس حویلی میں بس چکی ہوتی۔'' مرک نے آنکھوں میں شرارت سموئی۔

''بس کر تو دکھاتی ادھر۔ دونوں کی جان ایک کردیتا۔''

ہالار جذباتی ہوا۔ وہ بھی یہی کہتا تھا کچھ نہیں کرسکا۔ ''پچھلے ماہ بیاہ لے آیا اپنی دلہن۔ بے چارہ۔'' مرک نے ہنس کر کہا۔

''اس کی چاہ کچی تھی، میری چاہ پکی ہے۔'' ہالار اب کے سنجیدگی سے بولا۔ ''اور ہماری ذاتی باتوں میں تو اپنے چاچے کے پٹ کو کیوں لے آتی ہے۔'' پھر اس نے بدمزہ منہ بنایا۔

''کیوں کہ تجھے رقابت کی آگ میں جلتا دیکھ کر سینے میں ٹھنڈ پڑتی ہے۔'' مرک نے ایک انداز سے اپنا نازک ہاتھ سینے پر رکھا۔

''ہائے مار دیا ظالم۔'' ہالار نے دلبری سے اسے دیکھا جو سورج کی دھیمی نارنجی کرنوں میں اسی منظر کا حصہ معلوم ہو رہی تھی۔

''تم کتنی سوہنی ہو مرک! تم پر فدا ہونے والوں کو میں اپنا رقیب نہیں سمجھتا۔ جو تمہیں دیکھ کر تمہارا دیوانہ ہو۔ اس میں اس کا دوش نہیں، تمہارا حسن ہی ہوش ربا ہے۔'' ہالار نے بے خود سا ہو کر اس کا ہاتھ دبایا۔ مرک جھینپ گئی۔ اور شرمیلی مسکان لبوں پر سجا کر نظر گھمائی تو چونک اٹھی۔ چند فٹ دور حسن چاچا کی چھت پر کھڑا ارباب حسن ان دونوں کو ہی دیکھ رہا تھا۔ مرک کو سانجھی (مغرب) کے جھٹپٹے میں بھی اس کے گرد نارات دکھائی دیتے تھے۔

''چلو ہالار! نیچے چلتے ہیں۔'' وہ منڈیر سے بہ عجلت اتری۔

''کیا ہوا؟'' ہالار نے حیرت سے مرک سے پوچھا۔

''کچھ نہیں۔'' اس نے قدم آگے بڑھائے تو ہالار کو بھی اس کی پیروی کرنی پڑی۔

''پھوپھو! آپ کہاں تھیں۔'' وہ سیڑھیوں سے اترے تو سنی آ کر مرک سے لپٹ گیا۔

''ادھر ہی تھی تمہاری پھوپھو۔ کبھی ہمیں بھی لفٹ کروا دیا کرو۔'' ہالار نے سنی کے کندھوں پر ہاتھ رکھا۔

''یہ اپنی پھوپھو کا دیوانہ ہے۔'' مرک نے سنی کے بال پیار سے بگاڑے۔

''ہم بھی تو آپ کے دیوانے ہیں سائیں۔'' ہالار نے مرک کی طرف جھکتے شرارت سے کہا۔ مرک دو قدم دور ہٹی۔

''مرک! ہالار کے بابا ہمارے بابا سائیں کے ساتھ شادی کے معاملات طے کر رہے ہیں۔'' سجل بھابھی نے آ کر اطلاع دی تو ہالار سنبھل گیا۔

''آج رخصتی کی تاریخ لے کر ہی جائیں گے ہم بھا جائی۔'' پھر اس نے مسکرا کر کہا۔

''خیر سے ہو رخصتی۔'' سجل بھابھی نے دعا دی۔

''آمین۔'' دونوں نے بیک وقت کہا۔

''بڑی جلدی ہے بھئی۔'' سجل بھابھی کھلکھلائی۔

''وہ تو ہے۔'' اس نے مرک کے شفق رنگ چہرے کو دیکھ کر کہا۔ پھر وہ دونوں آگے بڑھ گئے اور مرک وہیں کھڑی ہو کر مستقبل کے سہانے خوابوں میں کھو گئی۔

''پھوپھو! اب آپ کا بیاہ ہو جائے گا۔'' سنی نے کچھ اداسی سے پوچھا۔

''ہاں۔'' وہ مسکرائی۔

''آپ اس گھر سے چلی جائیں گی۔'' سنی بے چین ہوا۔
''ہاں۔'' مرک کے چہرے پر لالی بکھری۔
''پھر آپ ادھر کبھی کبھی آئیں گی۔'' سنی نے مزید پوچھا۔
''ہاں۔'' مرک خیال میں گم بولی۔
''تو پھر میں آپ کو کہیں جانے نہیں دوں گا۔'' سنی ایک دم چیخا تو وہ جیسے ہوش میں آئی۔ ''آپ یہیں رہیں گی میرے ساتھ۔'' وہ مرک سے لپٹ گیا۔
''ارے میں اپنے پیارے سنی سے دور کہیں نہیں جا رہی۔ یہ دو قدم پر تو ہالار کا گوٹھ ہے۔ تم سے ملنے روز آؤں گی۔'' مرک نے سنی کو بہلایا۔
''آپ روز ادھر آیا کریں گی نا؟'' سنی نے گیلی ہوتی بھاری آواز سے بالآخر تصدیق چاہی۔
''ارے میرا بچہ۔ میں کیسے نہیں آؤں گی۔ یہاں تو میری جان ہے، جس کا نام سنی ہے۔'' مرک نے اپنے دس سالہ بھتیجے کو بے اختیار خود میں بھینچ لیا۔

☆☆☆

''ہائے یہ جامشورو کی ہوائیں بھی نا کتنی رومانٹک ہوتی ہیں۔ کسی ضدی محبوب کی طرح آپ کو گھسیٹ کر اپنے ساتھ لے جانا چاہتی ہیں۔'' طوبیٰ نے اپنا اڑتا ہوا اسکارف گردن کے گرد لپیٹا۔
''ہمارا جامشورو پیچھے رہ گیا ڈیئر! یہ سن شہر ہے بلکہ اب تو ہم سن شہر سے بھی کافی دور نکل آئے ہیں۔'' مضراب نے طوبیٰ کی معلومات میں اضافہ کیا۔ وہ ریڈ ٹاپ اور ڈینیم میں ملبوس اپنے گلے میں لٹکتا ریڈ اسٹول اور سر پر پہنی کیپ کس کر پکڑنے میں مصروف تھی۔
''او گاڈ میری پی کیپ۔'' پھر اس نے کوئی تیسری بار اپنے سر سے اڑ کر زمین پر گرتی کیپ اٹھائی۔
''اسے کسی گلو سے اپنے سر پر چپکا لو، ان ہواؤں میں تو یہ ٹھہرنے والی نہیں۔ بار بار اٹھک بیٹھک کر رہی ہو۔'' طوبیٰ اس ایلسر سائز سے تنگ آئی۔
''اور کتنا چلنا ہے، میں تو تھک گئی۔'' ماہم نے اونچے نیچے پتھروں پر بہ مشکل پیر جمائے۔
''ابھی تو گاڑی سے اتری ہو محترمہ۔ ابھی سے تھک گئیں۔'' رجا نے نازک اندام ماہم کا مذاق اڑایا۔
''مجھے پہاڑی علاقوں میں چلنے کی عادت نہیں۔'' رجا نے منہ بنا کر کہا۔ وہ لوگ قدیمی سن گیٹ سے قلعے کے اندر داخل ہوئے۔
''گائز! سب باتیں جانے دو۔ ذرا سامنے تو دیکھو کیا نظارا ہے۔'' عظام نے توجہ دلائی تو ان چاروں نے بیک وقت دیکھا۔ سامنے ہی رانی کوٹ کا خوب صورت قلعہ اپنے دامن میں صدیوں کی تہذیب و تمدن اور سحر انگیز خوب صورتی سمیٹے نظر آیا اس کے جنوب میں اونچائی پر حد نگاہ تک پھیلی قلعہ کی طویل بل کھاتی دیوار ان پانچوں کو مبہوت کر گئی۔
''واؤ کتنا دلکش ہے۔'' مضراب کے منہ سے بے اختیار نکلا۔
''یہ دیوار سندھ کہلاتی ہے دوستوں۔ جیسے دیوار چین ہے۔'' عظام نے ان کی دلچسپی بھانپ کر بتایا۔
''جس نے بنوائی انت کر دیا۔'' رجا نے تبصرہ کیا۔
''واقعی کمال ہے۔'' طوبیٰ نے تائید کی۔
''یہ برج دیکھو طوبیٰ۔'' مضراب نے طوبیٰ کو متوجہ کیا۔
''یہ مورچے ہیں مضراب۔ اس وقت کے بادشاہ ان کو اپنے دفاع کے لیے استعمال کرتے تھے۔'' عظام نے اس کی تصحیح کی۔
''اوہ اچھا۔ کاش میں یہاں کی شہزادی ہوتی۔'' مضراب نے حسرت سے کہا۔
''ہاہا پھر تم ڈاکٹر کے بجائے طبیب ہوتیں۔'' طوبیٰ نے ہنس کر کہا۔

[illegible] شہزادی صرف آرام کرتی ہے،
پڑھائی وڑھائی نہیں۔" مضراب بدمزا ہوئی۔
"کاہل شہزادی۔" رجا نے مذاق اڑایا۔
یہ لوگ پھر سے کار میں بیٹھ کر رنی کوٹ قلعے کے درمیان میں بنے مری کوٹ کے قلعے میں داخل ہوئے جو سیاحوں کی من پسند جگہ تھی۔ یہاں کافی سیاح چہل قدمی کرتے دکھائی دیے۔ قلعے کی پہلی سیڑھیاں چڑھ کر یہ لوگ اوپر چلے آئے جہاں طویل راہداریاں بنی ہوئی تھیں ان راہداریوں کی دیواریں بھی مخصوص طرز تعمیر کا شاہکار تھیں۔ وہ پانچوں ایک دوسرے کے آگے پیچھے چلتے اس فن تعمیر کو سراہ رہے تھے مگر مضراب تو دل سے فدا ہو چکی تھی مری کوٹ کی دیواروں سے سارے قلعے کا نظارہ بہ آسانی ہو رہا تھا۔

مضراب ایک دیوار پر اپنی کہنیاں ٹکائے دور تک پھیلے اس عظیم وشان قلعے کو ستائشی نظروں سے دیکھتی رہی۔ پھر اس نے پنجوں کے بل زمین پر بیٹھ کر دیوار کے چوکور سے بنے سوراخوں کا جائزہ لیا۔ ان کو کس مقصد کے تحت بنوایا گیا ہوگا۔ وہ سوچنے لگی۔ اس غور وفکر میں اس کی پی کیپ کب ہوا کے زور سے اڑ کر پیچھے گری پتا ہی نہ چلا۔ کیپ کو کسی نے اس کی طرف بڑھایا تھا۔
"طوبیٰ! یہ دیکھو ان دیواروں میں سوراخ غالباً اس لیے ہیں کہ یہاں سے تیر انداز اپنے دشمن کا نشانہ لیتے ہوں گے۔" مضراب نے کیپ کے ساتھ طوبیٰ کا ہاتھ بھی پکڑ لیا لیکن اگلے ہی پل وہ چونک گئی یہ مضبوط مردانہ ہاتھ طوبیٰ کا نہیں تھا۔ مضراب نے فوراً دائیں طرف گردن گھمائی تو پہلی نظر کالے چمکتے مردانہ جوتوں پر پڑی دوسری بادامی شلوار قمیص اور براؤن اجرک پر اور پھر مونچھوں والے پرکشش چہرے پر ٹک گئی۔ اس نے ایک دم اس بندے کا ہاتھ چھوڑا اور اپنی جگہ سے کھڑی ہوگئی۔
"آپ کون ہیں اور طوبیٰ کہاں گئی؟" مضراب نے یوں پوچھا جیسے طوبیٰ کی غیر موجودگی

اس کی [illegible] کی ہو۔
"میں آپ کی طرح ایک سیاح ہوں۔ اور طوبیٰ کہیں گم نہیں ہو سکتی، یہ محفوظ قلعہ ہے۔ آپ بے فکر رہیں محترمہ۔" اس بندے نے سینے پر بازو لپیٹ کر کہا۔
"وہ کوئی بچی نہیں کہ گم ہو جائے۔" مضراب نے منہ بنا کر کہا۔
"اوہ اچھا۔ ویسے یہ سوراخ غالباً نہیں یقیناً دشمن سے دفاع کے لیے بنوائے گئے تھے۔" اس بندے نے جیسے اس کی معلومات میں اضافہ کیا۔
"کسی لیے بھی بنوائے گئے ہوں، مجھے کیا۔" وہ بے نیازی سے سر پر کیپ جما کر آگے بڑھی مگر اپنے پیچھے کسی کی آنکھوں کا ارتکاز دور تک محسوس ہوا۔
"یہ تم لوگ مجھے چھوڑ کر نیچے کیسے پہنچ گئے۔" وہ سیڑھیوں سے اتر کر اس طرف آئی جہاں عظام، رجا، طوبیٰ اور ماہم کو ایک پرانا کنواں دکھا رہا تھا۔
"تم قلعے کی دیواروں پر اپنی کہنیاں جمائے پرنسز کی طرح کھڑی تھیں، ہم نے سوچا کیا پتا خیالوں میں تم شاہی دربار میں گولڈن چیئر پر بیٹھی ہو اور ہمارے آواز دینے سے اس کرسی سے گر جاؤ۔" رجا نے کھلکھلا کر کہا تو مضراب نے اسے دھپ ماری۔
"گائز۔ یہ دیکھو اس کنویں میں ڈول کے بجائے بانس ڈالے جاتے ہیں۔" عظام نے ان چاروں کو مطلع کیا۔
"کیوں بھئی۔" وہ چاروں متجسس ہو کر کنویں پر جھک گئیں۔
"کیونکہ یہ اب پانی سے خالی ہے اس لیے۔" عظام نے دانت نکالے۔
"اوہ گاڈ، تم جیسا اناڑی گائیڈ کسی کو نہ ملے۔ یونی میں کتنی بڑھکیں مار رہے تھے کہ رنی کوٹ کی ہسٹری جانتے ہو اور یہاں آکر مجال ہے کچھ بھی صحیح بتایا ہو۔" طوبیٰ نے عظام کو آڑے ہاتھوں لیا۔ وہ ڈھٹائی سے ہنسنے لگا۔
"ایک جگہ ہے یہاں جسے پریوں کا مسکن کہتے

ہیں، آؤ تم لوگوں کو دکھاؤں۔"
"پریوں کا مسکن...... واؤ۔ وہاں پریاں آتی ہیں۔" وہ پھر سے ایکسائیٹڈ ہوئیں۔
مری کوٹ سے ڈیڑھ کلومیٹر دور پہاڑوں کے دامن میں یہ صاف و شفاف نہر تھی جو پریوں کا مسکن کہلاتی تھی۔
"کتنی خوب صورتی ہے یہاں۔" مضراب مسمائز سی ہو کر نہر کے قریب ایک پتھر پر بیٹھ گئی۔
"واؤ یہاں تو ننھی منی مچھلیاں بھی ہیں۔" وہ پانی میں تیرتی رنگ برنگی مچھلیاں دیکھ کر خوش ہوئی۔
"یہاں پریاں کہاں ہیں۔" رجا نے چاروں طرف کھوجتی نظر گھمائی۔
"تم لوگ جو ہو پریاں۔ میڈیکل کالج کی پریاں۔" عظام نے ہنس کر کہا۔
"یو چیٹ۔ تمہیں کسی بات کا پتا نہیں۔" طوبیٰ نے اسے منرل کی خالی بوتل ماری۔
"سچ کہہ رہا ہوں، یہ جگہ اسی نام سے مشہور ہے۔" اس نے زور دے کر کہا۔ "اچھا ٹھہرو، مجھ پر یقین نہیں تو میں تم لوگوں کو ایک بندے سے ملواتا ہوں جو اس جگہ کی نالج رکھتا ہے۔ بائے لک آج وہ یہاں آیا ہوا ہے۔" وہ ایک طرف چل پڑا اور کسی کے ساتھ واپس آیا۔
"بھائی! یہ میری یونی فیلوز ہیں ڈاکٹر طوبیٰ ڈاکٹر رجا، ڈاکٹر ماہم اور ڈاکٹر مضراب۔" عظام نے تعارف کروایا۔ تو مضراب نے مچھلیوں سے توجہ ہٹا کر ادھر دیکھا۔ اور چونک گئی سامنے وہی بندہ عظام کے ساتھ کھڑا تھا جو قلعہ میں اسے ٹکرایا تھا۔ ان تینوں کی ہیلو کا جواب دیتے وہ مضراب کو ہی دیکھ رہا تھا۔
"یہ سب آج میرے ساتھ ادھر ٹرپ پر آئی ہیں اور مجھے ایک تاریخ دان سمجھ کر یہاں کی ساری ہسٹری جان لینا چاہتی ہیں۔ اب میں ٹھہرا ایک مسکین سا میڈیکل اسٹوڈنٹ اپنی خشک پڑھائی سے فارغ نہیں سندھ کی تاریخ کیسے کھنگالوں۔ آپ ان کو یہاں کی نالج دے دیں۔" عظام نے اس بندے سے بے تکلفی سے فرمائش کی۔
"کیوں نہیں۔ جو کچھ پوچھنا ہے آپ اس قلعے کے متعلق مجھ سے پوچھ سکتی ہیں۔" اس بندے نے سنجیدگی سے آفر کی۔
"فی الحال تو آپ کا تعارف چاہیے۔ اپنے متعلق کچھ بتائیے۔" رجا نے اس کی وجاہت کو ستائشی انداز میں دیکھ کر کہا تو وہ دلکشی سے مسکرایا۔
"میرا تعارف کچھ خاص نہیں۔ عام سا ہے۔" اس نے کندھے اچکائے۔
"اب اتنی زیادتی مت کریں ہمارے ساتھ سارنگ بھائی۔ آپ کہاں سے عام ہوئے۔" عظام نے فوراً کہا۔
"چلیں، میں ان کا تعارف کرواتا ہوں تو گائز! یہ سارنگ تالپور ہیں۔ لندن سے گریجویشن کیا ہے اور پیشے کے لحاظ سے جدی پشتی زمین دار ہیں۔ آپ آرکیالوجی میں گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔ اور سندھ کے تاریخی مقامات کی بقاء کے لیے دل و جان سے کوشاں ہیں جس کے لیے سندھ ورثہ کے نام سے ایک تنظیم بنائی ہے جس کے تحت آئے دن مختلف سیمینارز اور پروگرامز ارینج کرواتے رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ......"
"بس کر دو بھائی! بہت ہو گیا۔" سارنگ نے عظام کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو اس کی بولتی بند ہوئی۔
"بہت دلچسپ۔" رجا ایک دم متاثر نظر آئی۔
"کہاں لندن جیسا جدید شہر اور کہاں یہ آثار قدیمہ۔ بہت عجیب سنگم ہے آپ کی تعلیم اور مزاج کا۔" رجا کی حیرانی پر وہ مسکرایا۔
"آپ کو شاید اپنی دھرتی کی کشش کا اندازہ نہیں ڈاکٹر رجا۔ یہ ایک بار آپ کے قدم جکڑ لے تو آپ کو دنیا کے کسی اور حصے میں ٹھہرنے نہیں دیتی۔" اس نے جذب سے کہا تھا۔
"اسٹرینج۔" اس کی بات پر رجا نے ابرو اچکائی۔ مضراب اس گفتگو سے کچھ بے چین سی ہو کر

اپنی نشست سے اتری اور ان کے قریب آکر کھڑی ہوئی۔

"آپ کا تعلق سندھ کے کس علاقے سے ہے۔" سارنگ کو غور سے دیکھتے اس نے سوال کیا۔

"ساری سندھ دھرتی سے میرا دلی تعلق استوار ہے۔" سارنگ نے مبہم سا جواب دیا۔

"میں نے پوچھا، آپ کا آبائی گاؤں کون سا ہے؟" مضراب کے لہجے میں بلا کی بے کلی تھی۔

"میرا گاؤں شیر گڑھ ہے ڈاکٹر مضراب۔" اس نے مضراب کی آنکھوں میں دیکھ کر سنجیدگی سے جواب دیا تو مضراب جیسے پتھر کی ہوگئی۔

☆☆☆

"مما! میں نانا کے گھر جاؤں۔" رابی نے اجازت چاہی۔

"نہیں۔" نجمہ نے فوراً انکار کیا۔

"کیوں؟" اس نے منہ پھلایا۔

"وہ آپ کے نانا کا گھر نہیں۔ یہ ہے آپ کے سگے نانا کا گھر۔" نجمہ نے اس کو پونیاں باندھ کر کنگھی ایک طرف رکھی۔

"پہلے تو وہ بھی تھا۔" رابی نے یاد دلایا۔

"اب نہیں ہے۔" نجمہ اپنی نشست سے اٹھی۔

"کیوں نہیں ہے؟" رابی نے الجھ کر پوچھا۔

"توبہ ہے، کتنے سوال کرتی ہو۔ نہیں ہے تو نہیں ہے۔" نجمہ جھنجلائی۔

"وہاں جو میرے کزنز رہتے ہیں، وہ بھی ہمارے نہیں۔" رابی نے بھولپن سے مزید سوال کیا۔

"نہیں۔" نجمہ نے زور دے کر کہا۔

"اور وہ پری جیسی مرک آنٹی۔"

"نہیں ہے وہ تمہاری آنٹی۔ چڑیل ہے پوری۔" نجمہ نے اسے ایک دم گھرک دیا۔ رابی سہم کر خاموش ہوگئی۔

"کیوں بچی کو منع کر رہی ہو۔ سارا بچپن بڑی حویلی میں آ گزرا ہے تمہارا بھی۔ اور رابی کا بھی۔ اب جو معاملات ہوئے اس میں بچی کا قصور کہ اس پر بھڑک رہی ہو۔ یہ کیا جانے بڑوں کی ناچاقی اور رنجشیں۔" مہراب بی بی نے رسان سے بیٹی کو سمجھایا۔

"یہ بھی جان لے تو اچھا ہے پھر ان سنگ دلوں سے دور رہے گی۔ میرے اکلوتے بھائی کے ارمانوں کا خون کر کے چڑیل اپنا گھر بسا رہی ہے۔" نجمہ ماں پر الٹ پڑی۔

"ارمانوں کا خون ضرور ہوا تھا پر اب سنبھل گیا ہے میرا بیٹا۔ اتنی خوب صورت لڑکی سے اس کا بیاہ کیا ہے، سب کچھ بھول بھال گیا ہے۔" مہراب بی بی نے جیسے نجمہ اور خود کو یقین دلایا۔

"خدا کرے بھول جائے۔ بچپن کی منگ تھی مرک اس کی۔ سگے چاچے کی بیٹی۔ اپنا دل بدل کر دوسرے کا ہاتھ پکڑ لیا۔ شرم اس کے بھائیوں کو بھی نہیں آئی فوراً ہالار سے نکاح پڑھوا لیا۔ خاندانی روایات توڑ دیں اپنی منہ زور بہن کے پیچھے۔ چاچا حیات ہوتے تو دیکھتی کیسے من مانی کرتے ہیں۔" نجمہ زہر بھرے انداز میں بولی۔

"ان کے فوت ہونے کے بعد ہی تو معاملات بگڑے ہیں۔ لاڈلی چھوٹی بہن ہے۔ جان دیتے ہیں تینوں بھائی مرک پر۔ مجھ سے پوچھو تو ایسی بے دید لڑکی دل سے پسند نہیں تھی۔ تمہارے مرحوم بابا کی پرزور خواہش پر بچپن میں اس کا ہاتھ مانگ تو لیا مگر جوانی میں اس کے رنگ ڈھنگ مجھے تو نہیں بھائے۔ شہر سے پڑھ کر خود کو نہ جانے کیا سمجھنے لگی۔ میرے گبھرو بیٹے میں سو عیب نظر آنے لگے۔ دھول مٹی ڈالو ایسی لڑکی پر۔ اب ہالار کے گھر جا کر بس جائے تو بڑی بات ہے۔"

مہراب بی بی نے اپنا لاوا نکالا۔

اس کے انکار پر میں تو بہت خوش ہوئی اور فوراً اپنے بیٹے کو اپنی من پسند بہو لا دی۔ پھر وہ مطمئن انداز میں بولی۔

"آپ نے اپنی من پسند بہو لا کر دے دی۔ بیٹے کی پسند کا کیا۔" نجمہ نے منہ بنا کر کہا۔

"ارے مرد کا دل ہے، کب تک سوگ مناتا۔

اب خوش ہے میرا بچہ۔" مہراب بی بی نے مسکرا کر کہا تو ان کی سادگی پر نجمہ نے سر جھٹکا۔

"ہونہہ، بہت خوش ہے۔"

"مما! میں نانا کے گھر جاؤں۔" رابی کا مطالبہ ابھی بھی وہی تھا۔

"جاؤ بچی۔ کون روکتا ہے شاباش۔" نانی کے کہتے ہی اس نے دوڑ لگا دی۔

اپنی حویلی کی مشرقی دیوار سے متصل ایک بڑا سا گیٹ جو دونوں حویلیوں کو آپس میں جوڑے ہوئے تھا۔ رابی نے بھاگتے ہوئے عبور کیا اور کشادہ صحن میں داخل ہو گئی۔ "اے امڑ سنبھا[illegible]ی سنبھل کر)" موہل چاچی نے ناک کی سیدھ میں بھاگتی رابی کو ٹھوکر کھانے سے بچایا۔ وہ اس وقت صحن میں حد نظر تک زمین پر بکھری لال مرچیں مزارع عورتوں سے ٹوکریوں میں بھروا رہی تھیں۔

"امن کہاں ہے مامی۔" رابی نے پوچھا۔

"اوپر اپنی دادی سے سر میں تیل لگوا رہی ہے۔" انہوں نے بتایا تو رابی برآمدے سے نکلتی گول سیڑھیوں سے دھڑا دھڑ اوپر چلی آئی۔ یہاں طویل راہداری کے دونوں طرف بنے کمروں میں سے نانی کا کمرہ ڈھونڈنا اسے ہمیشہ کی طرح مشکل لگا۔ یہ حویلی ان کی حویلی سے دوگنی بڑی اور چکردار تھی۔ رابی کسی ایک طرف کو جانا چاہتی تو کسی اور طرف آنکلتی تھی۔ اس حویلی کے مکین جانے کیسے اس میں رہا کرتے تھے۔ وہ اندازے سے نانی کا کمرہ ڈھونڈنے لگی۔ کچھ کمروں کے دروازے بند، کچھ کے کھلے تھے۔ وہ امن کا نام پکارتی رہی پر جواب نہ ملا۔

"میں واپس جاتی ہوں۔" اس نے مایوس ہو کر واپسی کی راہ لی۔

"ہاہ......" اچانک اس آواز نے رابی کو دہلا دیا۔

"مما۔" وہ بے اختیار چیخی۔

"ڈر گئیں۔ ہاہا ڈرپوک چھوکری۔" سنی کھلکھلایا۔ رابی نے اسے غصے سے دیکھا۔

"میں نہیں ڈرتی۔" رابی نے اپنی تیز چلتی سانس کو قابو کیا۔ اس شرارتی لڑکے کے سامنے ڈرپوک ہونے کا اقرار غضب بن جاتا۔

"اچھا۔ تم نہیں ڈرتی۔ اس دن مصنوعی سانپ سے کیسے ڈری تھیں۔" سنی نے مذاق اڑایا۔

"وہ تم نے اچانک میرے اوپر پھینکا تھا۔ ورنہ میں نہیں ڈرتی۔" رابی نے اپنا دفاع کیا۔

"اچھا تو تم بہت بہادر ہو۔" سنی نے پوچھا۔

"ہاں بہت بہادر ہوں۔" رابی نے فوراً کہا۔

"چلو پھر آؤ میرے ساتھ، آج تمہاری بہادری کا امتحان ہے۔" سنی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور ایک تنگ سے کمرے میں لے آیا۔ جہاں کاٹھ کباڑ رکھا تھا۔

"یہاں صرف دس منٹ اکیلے گزار کر دکھاؤ، میں تمہیں بہادر مان جاؤں گا۔" سنی نے شرارت سے چمکتی آنکھیں رابی پر ٹکائیں۔

"دس منٹ۔" رابی نے نظریں گھما کر چاروں طرف دیکھا۔

"ہاں صرف دس منٹ۔ میں تمہیں یہاں چھوڑ کر باہر سے دروازہ بند کر دیتا ہوں۔ تم نے اگر دس منٹ یہاں گزار لیے تو تمہارا ایگزام پاس۔" اس نے مزے سے کہا۔

"پھر تم مجھے کبھی کاورڈ نہیں کہو گے۔" رابی نے تصدیق چاہی۔

"کبھی نہیں۔ اوکے۔ اب میں باہر جاتا ہوں۔ بائے۔" وہ ایک دم اسٹور روم سے باہر نکل گیا۔

"سنی۔" رابی کو اگلے ہی پل گھبراہٹ نے گھیر لیا۔

"سنی......" وہ دروازہ بجانے لگی۔ اچانک اسٹور روم کا اکلوتا بلب بجھ گیا۔ رابی کا دم رکنے لگا۔

"سنی دروازہ کھولو...... لائٹ چلی گئی ہے۔" وہ چلائی۔ پر دروازے کے پار خاموشی تھی۔ تو کیا سنی

سے سوچا اور دہل گئی۔

''مما مما...... دروازہ کھولیں۔'' اس نے ہتھیلیوں سے دروازہ پیٹنا شروع کر دیا۔ اسے اس چار فٹ کے اسٹور سے خوف آ رہا تھا۔ وہ اس تاریکی میں سانس نہیں لے پا رہی تھی۔ اچانک ایک چپکیلی چیز اس پر آ گری اور وہ دہرے خوف سے بے ہوش ہو کر گر پڑی۔

☆☆☆

''آپی! کیا بات ہے۔ جب سے ٹرپ سے واپس آئی ہو، بہت خاموش ہو۔'' عفان نے اس کے برابر میں بیٹھتے سوال کیا تو مضراب چونک اٹھی۔

''کچھ نہیں۔'' وہ زبردستی مسکرائی۔

''کچھ کیسے نہیں۔ ٹی وی پر اسپورٹس چینل لگایا ہوا ہے، پاپ کورن کے بجائے اپنے ناخن چبا رہی ہو۔ اور آنکھیں چھت سے لگا رکھی ہیں۔'' عفان نے بہن کو بغور دیکھ کر کہا۔ مضراب نے فوراً اپنا ہاتھ پہلو میں رکھا اور سیدھی ہو بیٹھی۔

''یہ اسپورٹس چینل تو پہلے ہی سے لگا ہوا تھا، میں ٹی وی دیکھ کہاں رہی تھی۔'' اس نے وضاحت کی۔

''وہی تو پوچھ رہا ہوں آپ ٹی وی نہیں دیکھ رہیں مگر کچھ سوچ رہی تھیں، کیا سوچ رہی ہو مجھے بتاؤ۔'' عفان نے رسان سے پوچھا۔

''نہیں تو کیا سوچوں گی بھلا۔ مجھے چھوڑو، تم اپنا بتاؤ، آج کل بہت خوش نظر آتے ہو۔'' مضراب نے اس کے چمکتے چہرے پر نظر ڈال کر سوال کیا۔

''میں...... خوش ہوں۔ واقعی میرا چہرہ بتا رہا ہے کیا؟'' عفان نے سنبھل کر اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔

''اور کیا تمہارا چہرہ بتا رہا ہے، یہ خوشی عام نہیں ہواؤں میں اڑنے والی خوشی ہے۔'' مضراب نے دانستہ شرارت سے پوچھا۔

''ہم...... اب آپ جان ہی گئی ہیں تو......''

''مجھے ایک لڑکی سے پیار ہو گیا ہے آپی۔'' اس نے سرگوشی میں کہا تو مضراب نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔

''تم اور محبت۔ ام پاسبل۔'' پھر زور سے نفی میں سر ہلایا۔

''کیوں میں انسان نہیں۔ میرے سینے میں دل نہیں، دل کے اندر جذبات نہیں۔ جذبات کے اندر......''

''بس بس۔ معاف کردو۔'' عفان کی نان اسٹاپ زبان پر اس نے ہاتھ جوڑے۔

''اب سوال کیا ہے تو پوری روداد تو سنو۔'' وہ ہنسنے لگا۔

''مذاق برطرف پلیز، سچ بتاؤ کیا واقعی پیار کا معاملہ ہے۔ اگر ہے تو کون ہے وہ ان لکی لڑکی۔'' مضراب کی آخری بات پر عفان نے شاک لگا۔

''آپی! اپنی ہونے والی بھابھی کو ان لکی کہہ رہی ہو۔''

''میری ہونے والی بھابھی۔ مطلب بات اتنی آگے چلی گئی اور تم نے مجھے بتایا نہیں۔'' مضراب چیخ پڑی۔

''دھیرے بولو، دیواروں کے کان پھاڑو گی کیا۔'' وہ گھبرا کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔

''پیار کیا تو ڈرنا کیا۔'' مضراب ہنسی۔ ''ویسے وہ ہے کون؟ جس نے میرے پیارے سے بھائی کو اپنا دیوانہ بنایا ہے۔'' وہ ہنوز شرارت کے موڈ میں تھی۔

''اس کا نام ایمان ہے۔ آپ ملی تو ہو۔'' اس نے یاد دلایا تو مضراب کو فوراً کلک ہوا۔

''وہ ایمان تمہاری کلاس میٹ۔ نازک سی خوب صورت لڑکی۔ جو تمہارے گروپ میں شامل ہے۔''

''ہاں وہی، پہلے پہل تو رسمی علیک سلیک تھی پھر دوستی ہوئی اور اب اس کے لیے بہت خاص فیلنگز

...کر رہا تھا۔

"یہ فیلنگز یک طرفہ ہیں یا......"

"بالکل یک طرفہ نہیں، وہ بھی مجھ سے محبت کرتی ہے۔" عفان نے اس کی بات تیزی سے کاٹی۔

مضراب خود سے تین سال چھوٹے بھائی کو دیکھنے لگی۔ وہ انجینئرنگ کے تھرڈ ایئر میں تھا۔ کچھ سال پہلے بہت لاابالی اور شرارتی۔ اچانک قد کاٹھ نکال کر بڑا ہو گیا، مضراب سے بھی اونچا۔ جم جانے کے باعث کسرتی جسم۔ مضراب اب بڑی بہنوں والا رعب جھاڑتی تو ہنسنے لگتا۔ اس کی اپنی سرگرمیاں تھیں مضراب کی اپنی۔ پر بہن بھائی میں انڈرسٹینڈنگ بھی بہت تھی۔ عفان اپنی کلاس فیلو لڑکی میں اس حد تک دلچسپی لینے لگا کہ اسے پتا ہی نہ چلا۔ مضراب نے سوچا۔

میں بھی تو سال بھر سے ہاؤس جاب میں اتنی مصروف ہو گئی ہوں کہ وقت بہت کم ملتا ہے۔ ڈے اور نائٹ ڈیوٹی نے سر اٹھانے کی فرصت ہی چھین لی ہے۔ اس نے دل میں جیسے تاویل دی۔

"یہ محبت جسٹ ٹائم پاس ہے یا اس لڑکی سے شادی کا بھی ارادہ ہے۔" مضراب نے سنجیدگی سے سوال کیا۔

"نو وے، ٹائم پاس کیسا۔ آئی ول میری ہر۔" عفان نے زور دے کر کہا۔

"مجھے ایمان سے تفصیلی طور پر ملنا ہے۔" مضراب نے فوراً خواہش ظاہر کی تھی۔

"شیور۔ کل میرے ساتھ یونی چلو۔" عفان بھی فوراً راضی ہوا۔

"اسے ڈنر پر بلواؤ، مما بابا بھی دیکھ لیں۔" مضراب کی بات پر وہ خاموش ہوا۔

"کیوں، نہیں آسکتی؟" مضراب نے اس کی خاموشی محسوس کی۔

"نو آئی ول ٹرائی۔ دراصل وہ ہاسٹل میں رہتی ہے اور اس کو پڑھائی کے علاوہ ادر ایکٹیوٹیز کی پرمیشن

ہیں۔ عفان کی بات پر وہ کچھ حیران ہوئی۔

"کیوں بھلا؟"

"وہ فیوڈل فیملی سے تعلق رکھتی ہے۔ اس لیے۔" عفان نے کندھے اچکائے۔

"فیوڈل فیملی۔" مضراب نے دہرایا۔ "خیر میں کل چلتی ہوں تمہارے ساتھ۔ کل ویسے بھی میری رات کی ڈیوٹی ہے۔" اس نے عفان سے کہا اور وہاں سے اٹھ گئی۔

☆☆☆

"بابا سائیں۔ بھلی کرے آیا۔ خیر سے آئے۔" سارنگ نے باپ سے معانقہ کیا۔

"خوش ہو برخوردار۔"

"جی الحمدللہ۔ آپ نے اسلام آباد میں کافی دن لگا دیے۔" سارنگ ان کے ساتھ ہی صوفہ پر بیٹھا۔

"بس پٹ۔ سیاست کے گورکھ دھندے نمٹانے ہوتے ہیں۔" انہوں نے صوفہ سے ٹیک لگائی۔

"اس بار الیکشن میں تمہیں اپنے حلقے سے ٹکٹ دلواتے ہیں، تم بھی آؤ سیاست کے میدان میں۔ بڑا سوشل نیٹ ورک ہے تمہارا۔ اپنے علاقہ سے باہر بھی تمہاری دھوم مچی ہے۔" وہ سارنگ کے کندھے پر بازو پھیلا کر بولے۔

"میں آزاد پرندہ ہوں۔ سیاست مجھے محدود کر دے گی۔" سارنگ نے سنجیدگی سے کہا۔

"کب تک بھاگو گے۔ آنا تو آخر یہیں ہے۔" وہ اس کی پہلوتہی پر مسکرائے۔

"دیکھتے ہیں، ابھی تو زندگی اپنے طور پر گزار لیں۔" سارنگ بھی مسکرایا۔

"گزار لو اپنے طور کی یہ پھیکی زندگی۔ ہم تو بابا حیران ہی ہوتے ہیں، انگلستان سے پاکستان واپس چلے آئے۔ نہ پہلو میں کوئی میم بٹھائی نہ دل نے کوئی روگ لیا۔" بابا نے قہقہہ لگا کر کہا۔

"ہم روگ لینے والوں میں سے نہیں، روگ

ان کے قہقہہ میں شامل ہوا۔
''صحیح ہے بابا۔ مضبوط مرد ہو، جیتے رہو۔''
انہوں نے اپنے خوبرو بیٹے کی پیٹھ تھپتھپائی۔ پھر دو چار باتیں کرکے وہ اپنے کمرے میں چلے گئے۔
سارنگ اپنے بجتے فون کی طرف متوجہ ہوا۔
''ہاں دلاور۔''
''چھوٹے سائیں۔ مجذوب بابا نے خود کو زخمی کرلیا ہے۔ بہت خون بہہ رہا ہے ان کا۔'' دلاور کی بات پر سارنگ پریشان ہو اٹھا۔
''کیا مطلب، کیسے زخمی ہوئے وہ۔ تم لوگ اندھے ہو گیا۔ صحیح دیکھ ریکھ کیوں نہیں کرتے۔'' وہ بے چینی سے اپنی نشست سے اٹھا اور کمرے سے باہر نکلا۔
''ہم تو دیکھتے ہیں سائیں مگر وہ......''
''بس، اب بکواس مت کرو۔ میں پہنچتا ہوں۔'' سارنگ پورچ میں آکر اپنی گاڑی میں بیٹھا اور پھر کار تیزی سے حویلی کے کھلے گیٹ سے باہر نکالی۔ دس منٹ بعد وہ دلاور کے سر پر کھڑا تھا۔
''اتنی بری طرح سے انہوں نے اپنے ہاتھوں کو زخمی کیا ہے۔''
''یہ جنگلے کی خاردار تاروں میں جا گھسے اور تم سوتے رہے۔'' سارنگ کے کڑے استفسار پر دلاور نے سر جھکالیا۔
''یہ مقام (قبرستان) میں بیٹھے تھے۔ نہ جانے کب وہاں سے اٹھ کر جنگلے کی طرف گئے۔'' وہ دھیمی آواز میں بولا۔ سارنگ دلاور کی بات ان سنی کیے مجذوب بابا کی پھٹی آستینیں اوپر اٹھا کر ان کے سانولے ہاتھوں میں پڑی خراشیں اور ان سے نکلتا خون افسوس سے دیکھنے لگا۔
''بند کرواپنی یہ تاویلیں اور جاکر جلدی سے ڈیٹول اور کاٹن لے آؤ۔'' اس نے غصے سے کہا تو دلاور فوراً منظر سے غائب ہوا۔
''کیوں کرتے ہیں آپ ایسا۔ کیوں دیتے لہجے میں ان سے مخاطب ہوا۔ جو الجھے بال، شکن آلود لباس اور ویران چہرہ لیے آسمان کو دیکھ رہے تھے۔
بتائیں۔
''جواب دیں۔'' سارنگ کا سوال گہری سیاہ آنکھوں میں نمی لے آیا۔
''میں جانتا ہوں، آپ ہوش مندی سے یہ حرکات کرتے ہیں۔ دنیا چاہے آپ کو دیوانہ سمجھے۔ آپ دیوانے نہیں ہیں۔ آپ مجذوب نہیں ہیں۔ یہ ایک ماسک ہے جو آپ نے خود پر چڑھا رکھا ہے۔ اور اس کی وجہ سے بھی میں واقف ہوں۔'' وہ سرگوشی نما آواز میں ان سے مخاطب تھا۔ مجذوب بابا نے چونک کر اپنی نظریں سارنگ پر ٹکادی۔
''آپ دیوانگی کا لبادہ پہن کر دنیا سے کٹ کر ان کے قریب رہنا چاہتے ہیں ناں۔'' سارنگ نے کچھ دور اشارہ کیا تو انہوں نے چونک کر ادھر دیکھا۔ ان کی آنکھوں سے پانی کا ریلا بہہ نکلا۔
''مم......'' ان کی زبان کچھ کہنے کی کوشش میں بے حال ہوئی۔ وہ لڑکھڑا کر اٹھے اور آہستہ آہستہ چلتے ایک قبر کے پاس جاکر دوزانو بیٹھ گئے۔ اپنے دونوں زخمی بازو قبر پر بچھائے اور ان پر اپنا چہرہ رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دیے۔

☆☆☆

مرک اپنے لمبے سیاہ بال سلجھاتے ہونٹوں پر دلفریب مسکان سجائے آئینے کے آگے کھڑی تھی۔ اس کے پیچھے رانی اپنی بڑی بڑی آنکھیں پھیلائے اسے رشک سے دیکھ رہی تھی۔
''آپ کے بال کتنے خوب صورت ہیں مرک آنٹی!'' اس نے مرک کے ریشمی بالوں کو چھوا۔
''ہیں تو......'' مرک اترا کے پیچھے مڑی۔
''میرا دل چاہتا ہے، میرے بال بھی آپ کی طرح لمبے اور حسین ہوں۔''
''تو بڑھاؤ نا اپنے بال چھٹکی۔'' مرک نے اس کے گال پر چٹکی کاٹی۔

"مما کہتی ہیں، ابھی نہیں بڑھانا۔" رابی نے منہ بسورا۔

"جیسا مما کہیں ویسا کرو۔ ماں کی بات ماننی چاہیے۔" مرک نے پھر مڑ کر آئینہ دیکھا۔

"آپ بار بار آئینہ کیوں دیکھتی ہیں؟" رابی نے معصومیت سے پوچھا۔

"تم بھی بڑی ہو کر دیکھو گی۔ جب تمہیں کسی سے محبت ہو جائے گی۔" مرک نے کھلکھلا کہا۔

"محبت......" رابی نے ناسمجھی سے مرک کو دیکھا۔

"پھوپھو! آپ تیار ہو گئیں؟" سنی اچانک ہی کمرے میں آیا تھا۔

"رابی! تم یہاں ہو۔" رابی کو دیکھ کر اس کی آنکھیں شرارت سے چمکیں۔ رابی نے ناراضی سے منہ پھیر لیا۔

"باہر لائن سے بکرے اور گائے قربان ہونے کو کھڑی ہیں۔"

"آؤ رابی! تمہیں نظارہ کرواتا ہوں۔ دیکھو قربانی کیسے ہوتی ہے۔" اس نے رابی کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔

"مجھے نہیں جانا۔" رابی چیخی۔

"چھوڑو اس کا ہاتھ سنی! پچھلی بار بھی رابی کو اسٹور میں بند کر کے بھاگ گئے تھے۔ بچی ڈر کے مارے بے ہوش ہو گئی۔ ہنگامہ کھڑا کر دیا تھا نجمہ باجی نے۔ اب پھر کوئی شرارت کرنی ہے۔" مرک نے سنی کو ڈانٹا۔

"اس کو تو بے ہوش ہونے کی عادت ہے ڈرپوک کہیں کی۔" وہ کہاں خاطر میں لانے والا تھا۔

"میں ڈرپوک نہیں۔" رابی مچلی۔

"پھر آؤ بکرے کٹتے دیکھیں۔" اس نے پھر رابی کا ہاتھ کھینچا۔

"نہیں۔" وہ پیلی پڑ گئی، خون دیکھنے کا تصور سوہانِ روح تھا۔

"سنی آپ دن بدن شرارتی ہوتے جا رہے ہو۔ رابی! ادھر آؤ، بس بیٹھ جاؤ میرے پاس۔" مرک نے رابی کو اپنے بیڈ پر بٹھا دیا۔

"مرک! ابھی تک تیار نہیں ہوئی۔ تمہارے سسرالی آئے بیٹھے ہیں۔" مومل بھابھی نے کمرے کے اندر آتے پوچھا۔ ان کے ساتھ ایک ملازمہ سجا سجایا ٹوکرا لیے اندر آئی۔

"میں بالکل تیار ہوں۔" مرک نے زرتار دوپٹہ سر پر رکھا۔

"پیاری لگ رہی ہو۔ اللہ نیک نصیب کرے۔" بھابھی نے اس کا ماتھا چوما۔ "اب تو خیر سے اگلی عید اپنے سسرال میں مناؤ گی۔" پھر انہوں نے شرارت سے کہا تو مرک شرما گئی۔ دونوں باتیں کرتی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئیں۔

رابی اور سنی اب کمرے میں اکیلے تھے۔ رابی کو خوف ہوا کہ اب سنی اس سے زبردستی بکروں کے پاس نہ لے جائے، وہ فوراً بیڈ سے اتری اور باہر جانے کے ارادے سے دروازے کی طرف بڑھی۔ ساتھ ہی اس نے سنی کی طرف دیکھا جو بالکل خاموش سا صوفہ پر بیٹھا تھا۔ رابی نے غور کیا اس کی آنکھیں نم تھیں۔

"سنی! کیا ہوا؟ رو رہے ہو۔" سدا کی نرم دل رابی فوراً ہی اس کے پاس آئی۔

"نہیں، میں کیوں روؤں گا۔" سنی نے آنکھیں جھپکیں۔

"یہ کیا ہے پھر؟" رابی نے اپنی انگلی اس کے گال پر رکھی۔ سنی نے فوراً اپنے گیلے گال رگڑ ڈالے۔

"تمہیں پتا ہے رابی! میری پھوپھو کی شادی ہونے والی ہے۔" سنی نے بھاری آواز سے بتایا۔

"ہاں میں جانتی ہوں۔" رابی نے سر ہلایا۔

"وہ اب ہمارے ساتھ نہیں رہیں گی بلکہ سارنگ انکل کے ساتھ رہیں گی۔" سنی نے اداس لہجے میں کہا۔

"تم اسی لیے رو رہے تھے۔" رابی نے جیسے اس کے رونے کا راز پا لیا۔ سنی نے نہ چاہتے ہوئے

جی ہاں۔

''کتنے بہن بھائی ہیں آپ؟'' مضراب کی آواز میں کپکپاہٹ درآئی۔

''ہم تین بھائی بہن ہیں۔ بڑے بھائی سارنگ تالپور پھر امن تالپور اور میں ایمان تالپور۔'' اس نے تفصیل سے بتایا تو مضراب نے جیسے سر تھام لیا۔ پھر بے حد خاموشی سے ایمان اور عفان کو دیکھنے لگی۔ دونوں کے چمکتے خوش باش اور ہر فکر سے آزاد چہرے اسے فکر مند کر گئے۔ ایمان جس طرح اس کی باتوں پر جھینپ ہو رہی تھی، مضراب بے چین سی ہوگئی۔

''ایکسکیوزمی۔ مجھے ایک کام یاد آگیا ہے۔ عفان! میں چلتی ہوں۔'' وہ اندرونی اضطراب سے گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

''کیا ہوا آپی!'' عفان اس کی بدلتی کیفیت پر پریشان ہوا۔

''کچھ نہیں، میں ٹھیک ہوں۔ اوکے ایمان!'' مضراب نے ایمان کو زبردستی مسکرا کر دیکھا۔ اور آگے بڑھ گئی۔

''میں آپ کو ڈراپ کردوں؟'' عفان پیچھے آیا۔

''نہیں عفان! میں چلی جاؤں گی۔'' مضراب نے اسے تسلی دے کر گاڑی میں چابی لگائی۔

''اوکے ٹیک کیئر۔'' عفان کہہ کر دور ہٹا مضراب نے گاڑی اسٹارٹ کردی۔ وہ دھند بھری آنکھوں سے ڈرائیو کرتی اپنے گھر تک آئی تھی۔

☆☆☆

آج کل حویلی میں بہت ہلچل مچی رہتی تھی۔ مرک کی شادی کی تیاریاں عروج پر تھیں۔ رابی ماں سے آنکھ بچا کر یہاں چلی آتی امن کے ساتھ اب سنی سے بھی اس کی اچھی دوستی ہوگئی تھی۔ وہ ان دنوں بہت چپ اور اداس رہتا تھا۔ پہلے کی طرح رابی کو تنگ کرتا نہ ڈراتا۔ وہ سنی کے پاس بیٹھ کر اپنے طور اس کا موڈ خوش گوار کرنے کی کوشش کرتی مگر اس کی

کی گرانبات میں ہلایا۔

''اوہ۔ پھر تم بھی چلے جاؤ پھوپھو کے ساتھ ان کے نئے گھر۔'' اس نے مدبر بن کر مشورہ دیا تو سنی بے ساختہ کھلکھلایا۔

''ہونا پاگل لڑکی۔ میرا کیا کام ان کے گھر۔ میرا گھر تو یہ ہے۔''

''پھر روتے کیوں ہو؟'' رابی نے ناک چڑھائی۔

''وہ مجھ سے دور جا رہی ہیں اس لیے۔'' بالآخر اس نے سچ اگل دیا۔ رابی کو اس لمحے منہ بسورتے سنی سے ہمدردی ہوئی۔

''وہ دور جائیں گی تو کیا ہوا، میں تو روز آتی ہوں ناں۔ ہم تینوں مل کر کھیلا کریں گے۔ تم امن اور میں۔'' رابی نے اسے معصومیت سے تسلی دی تو وہ مسکرادیا۔

''تھوڑی ڈرپوک ہو، پر باتیں اچھی کرتی ہو۔'' وہ شرارت سے بولا۔

''فرینڈز......'' پھر اس نے اپنا ہاتھ آگے کیا۔ جسے کچھ جھجکتے ہوئے رابی نے تھام لیا۔

☆☆☆

خوب صورت اور ذہین ایمان سے مل کر مضراب کو بہت اچھا محسوس ہوا۔ وہ بہت سادہ طبیعت کی بے تکلف سی لڑکی تھی۔ اس کی نگاہوں سے چھلکتی محبت بھی مضراب کو اچھی لگ رہی تھی۔ اس کی پسند ناپسند، تعلیم، مشاغل وغیرہ کی بابت جاننے کے بعد مضراب نے اس کی فیملی کے متعلق پوچھا۔

''ہم زمین دار ہیں، پولیٹکس میں بھی ہماری فیملی کا عمل دخل ہے۔'' اس نے ہنس کر بتایا۔

''اوہ اچھا۔'' مضراب بھی مسکرائی۔

''آپ کے بابا کا کیا نام ہے۔ میرے بابا کا نام صادق تالپور ہے۔'' اس نے سادگی سے بتایا تو مضراب چونک اٹھی۔

''آپ صادق تالپور کی بیٹی ہیں۔'' اس نے دھڑکتے دل سے تصدیق چاہی۔

اداسی کسی طور ختم نہ ہوتی لیکن وہ رابی کی باتیں توجہ سے سنتا تھا۔ مرک اپنی خوشی میں اکلوتے بھتیجے پر بھی توجہ نہیں دے رہی تھی۔ دنیا کی تو بات ہی کیا۔ مہراب بیگم بھی اپنی بہو کو لے کر ان کی حویلی میں آجاتیں اور چاچی ہونے کا فرض نبھاتیں۔ ان کی بہو سیرت اور صورت دونوں میں اچھی تھی مرک کی بھابیوں کے ساتھ مل کر جہیز کے جوڑوں کو ٹانکتی۔ سہاگ کے گیت گاتی۔ اور گھر آکر وہاں کی روداد سادگی سے ارباب حسن کو سناتی جو مرک کی شادی کی تیاریوں کا سن کر کانٹوں پر لوٹ جاتا۔ وہ ماں اور بیوی کو ادھر جانے سے روک کر خود کو مرک کا ناکام عاشق بھی ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ بظاہر وہ بے نیاز دکھتا پر اندرونی جلن اسے پہروں بے چین رکھتی۔ ماں مطمئن تھی کہ خوب صورت لڑکی سے بیاہ دیا ہے، اب بیٹا خوش ہوگا وہ جانتی نہیں تھی کہ سو خوب صورت لڑکیاں بھی مرک کا نعم البدل نہیں بن سکتی تھیں۔ مرک نے اپنی خوب صورتی کے ناز میں اسے ٹھکرایا تھا۔ اور اس کا یہ ناز ارباب حسن کے دل کا ناسور تھا۔ وہ اس ناز کو اپنی مٹھی میں بھینچ کر مسل دینا چاہتا تھا۔ ایک مرد کے لیے اس سے بڑی شرمندگی کی کیا بات ہوگی کہ ایک عورت اسے اپنے حسن کے غرور میں ٹھکرا دے۔ اور کسی اور کو اپنا محبوب بنا لے۔

☆☆☆

"عفان! تم ایمان سے اپنا ریلیشن ختم کردو۔"

شام کو جب عفان نے مضراب سے ایمان کے متعلق پرجوش طریقے سے رائے لی تو یہ غیر متوقع بات سن کر ساکت رہ گیا۔

"کک...... کیا کہہ رہی ہو آپی۔ شی از مائی فرسٹ لو۔" وہ بے چین ہو کر کہہ بیٹھا۔

"ایمان کے علاوہ تمہیں اور کوئی نہیں ملا تھا لو کرنے کے لیے۔" وہ جھنجلا کر بولی۔

"کیا مطلب...... اور بائی دا وے ایمان میں کیا خرابی ہے۔ ویل مینرڈ ہے، ویل ایجوکیٹڈ ہے اور ویل آف فیملی سے بلونگ کرتی ہے۔" عفان نے تیکھے لہجے میں جتایا۔

"اس کی فیملی ہی اس کا نیگیٹو پوائنٹ ہے۔" مضراب نے بھی جتایا۔

"کیوں۔ اتنی اچھی فیملی نیگیٹو پوائنٹ کیسے ہوئی۔ یو نو ان کا اسٹیٹس ہم سے بھی اونچا ہے۔" عفان نے بہن کو جتایا۔

"اسٹیٹس کی بات نہیں۔ بات کچھ اور ہے۔" مضراب نے بے بسی سے بھائی کو دیکھا جسے شاید بچپن کا کوئی لمحہ یاد نہ تھا۔

"ایمان، صادق تالپور کی بیٹی ہے عفان! وہ زور دے کر بولی۔

"ہاں تو...... صادق تالپور ایک جانی مانی سیاسی شخصیت ہیں۔ کوئی چور ڈکیت تو نہیں۔" عفان جھنجلایا۔

"وہ جانی مانی سیاسی شخصیت ہونے کے ساتھ ساتھ ہماری مما کے سگے چچازاد بھائی بھی ہیں عفان!" مضراب کے انکشاف پر وہ اچھل پڑا۔

"کیا...... وہ ہمارے رشتہ دار ہیں۔"

"تمہیں اپنے بچپن کا وہ دور یاد نہیں عفان! جب ہم شیر گڑھ میں نانی کے پاس رہتے تھے۔" مضراب نے پوچھا تو وہ سوچ میں ڈوب گیا۔

"وہ بڑی حویلی...... بڑا سا دالان...... گرمیوں کی برسات میں جہاں بیٹھ کر ہم آم کھاتے تھے۔" عفان نے دھندلی یاد کے شیشے کو صاف کرنا شروع کیا۔

"صرف آم نہیں کھاتے تھے بہت سارا کھیلتے بھی تھے۔ تب تم صرف چھ سال کے تھے۔ اسی لیے تمہیں زیادہ یاد نہیں۔" مضراب نے پھیکی مسکراہٹ سے کہا۔

"پھر بھلا تمہیں کیسے یاد ہے سب؟" عفان نے ترنت پوچھا۔

"کچھ یادیں دل پر نقش ہو جاتی ہیں عفان! کیونکہ ان سے دل کے رشتے جڑے ہوتے ہیں۔"

مضراب نے فقط سوچا۔

''تم بچپن میں بیمار ہی اتنے رہے کہ مما تمہیں بستر سے نکلنے نہیں دیتی تھیں۔ نہ کسی سے گھلے ملے نہ کچھ یاد رہا۔ میں تو ہر وقت مما سے نظر بچا کر ان کے کزنز کی حویلی میں بھاگ جاتی تھی۔ وہ بڑی حویلی جہاں امن تھی، سنی تھا اور مرک آنٹی بھی۔'' مضراب کے ہونٹ آخری نام پر کپکپائے۔

''مرک آنٹی تو کچھ کچھ یاد ہیں مجھے۔'' عفان جوش سے بولا۔

''اور ہمارے ماموں ارباب حسن۔ وہ بھی یاد ہوں گے نا؟'' مضراب نے پوچھا۔

''ہمم...... وہ بھی دھندلے سے یاد ہیں۔ مگر ان کا یہاں کیا ذکر۔ ہم تو ایمان کی فیملی کے متعلق بات کر رہے ہیں۔''

''مرک آنٹی کے ذکر کے ساتھ ارباب حسن کی بات ضرور ہوگی۔ اور یہ ہمارا شرم سار حوالہ ہے جس سے چاہتے ہوئے بھی ہم پیچھا نہیں چھڑا سکتے۔'' مضراب کے لہجے میں کچھ ایسا تھا کہ عفان اچنبھے میں پڑ گیا۔

☆☆☆

''رسم و رواج نبھانے کے لیے ہوتے ہیں امڑ۔'' تاج بیگم نے مرک کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

''کیسی عجیب رسمیں ہیں اماں۔ اب دلہن خود جا کر رشتہ داروں کے گھر شادی کا دعوت نامہ دے اور ہر ایک کے گھر ایک رات گزارے بھی۔ مجھ سے نہیں ہوتا بھئی۔'' مرک نے ٹھنک کر کہا۔

''بیٹا! ہر رشتہ دار کے گھر نہیں چند قریبی عزیزوں کے گھر دلہن بننے والی لڑکی کو اپنے ہاتھ سے دعوت نامہ دے کر ایک رات گزارنی ہوتی ہے۔ جیسے چاچا، ماما یا پھوپھی کا گھر ہوا۔ اصل میں اس رسم کے پیچھے یہ حکمت ہے کہ لڑکی شادی جیسے ذمہ داری سے بھرپور بندھن میں بندھنے سے پہلے اپنی زندگی اچھے سے جی لے تا کہ اگلے گھر کوئی تشنگی لے کر نہ جائے۔'' تاج بیگم نے رسان سے سمجھایا۔

چاہے ان عزیزوں سے ملی ہو یا نہ ہی ہو۔ چاہے وہ ہماری شادی پر دل سے خوش نہ ہوں۔'' مرک نے منہ بنا کر کہا۔

''دنیاداری تو نبھانی ہے دھی رانی! ویسے ہی تیری من مانی سے برادری کے لوگ بہت باتیں بنا رہے ہیں۔ تیرے بھائیوں نے تجھے سر پر چڑھایا ہوا ہے۔ اب شادی پر رسم و رواج بھی نہ نبھائے گی تو مزید باتیں سننے کو ملیں گی۔'' تاج بیگم کی بات پر مرک نے سر جھٹکا۔

''بس اماں! آپ دنیا اور لوگوں کا ہی سوچتی رہو۔ میرے بھائی مجھ پر جان چھڑکتے ہیں تو لوگ کیوں جلتے ہیں۔ چل چھوڑ اب یہ باتیں، اپنا موڈ ٹھیک کر۔ باقی دن ہی کتنے ہیں تیرے میکے میں۔ آج شام اپنی مہراب چاچی کے پاس دعوت نامہ لے کر جا۔ پھر کل پھوپھی نسیمہ کے پاس جانا۔'' تاج بیگم نے حتمی انداز میں کہا تو مرک کے منہ میں کڑوی گولی گھل گئی۔

''ابتدا ہی اس منحوس حویلی سے کروں۔''

''مرک! بہت زبان دراز ہو رہی ہو۔'' تاج بیگم نے آنکھیں دکھائیں۔

''پھوپھو! میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گا۔'' پاس بیٹھے سنی نے فوراً کہا۔

''پھوپھو کی پونچھ، میں پھوپھو کے ساتھ جہیز میں بھی تجھے باندھ کر بھیج دوں گی۔ ٹھیک ہے۔'' تاج بیگم نے ہنس کر سنی کو ساتھ لگایا۔

''نہیں، میں جہیز میں نہیں جاؤں گا۔'' بارہ سالہ سنی نے یوں گھبرا کر انکار کیا کہ مرک کی بھی ہنسی چھوٹ گئی۔

''سنی! تمہیں میں گاڑی کی ڈگی میں چھپا کر لے جاؤں گی۔'' اس نے شرارت سے کہا تو اس کا مذاق سمجھ کر سنی بھی مسکرایا۔

☆☆☆

مہراب بیگم اور ان کی بہو فریدہ نے مرک کا استقبال خوش دلی سے کیا۔ البتہ نجمہ کچھ کھنچی کھنچی سی

ی۔ان دنوں اس کے بیٹے کی طبیعت بھی اچھی نہیں تھی۔ٹائیفائیڈ کے بخار سے بے حال ہر وقت نجمہ کو بوکھلائے رکھتا۔ارباب حسن بھی سرد رویے کے ساتھ گھر میں چلتا پھرتا نظر آرہا تھا۔مرک اسے جلانے کے لیے کچھ زیادہ ہی خوش دکھائی دے رہی تھی۔ اماں کے سامنے جتنی بیزار تھی یہاں آکر اتنی ہی شوخ ہورہی تھی۔ہالار کا ذکر کرتے اس کی زبان نہیں تھک رہی تھی۔مہراب بیگم منہ بنا کر اور فریدہ دلچسپی سے اسے سن رہی تھیں۔ہالار اس کا شوہر نہ ہوتا تو مہراب بیگم نے اس کی بے شرمی پر اسے سو باتیں سنائی تھیں پر اب نکاح ہو چکا تھا سو وہ اس کا ذکر کرنے میں آزاد تھی۔

دوسری طرف فریدہ بھی اس بات سے مطمئن تھی کہ یہ شوخ وشنگ لڑکی جو کبھی اس کے شوہر کی پسند رہی تھی اب کسی اور کی ہو چکی تھی۔سو قصہ تمام نظر آرہا تھا یہ آخری بار ہی تھا کہ وہ اس گھر میں رہنے آئی تھی پھر تو اسے اپنے سسرال کا ہی ہو رہنا تھا۔مرک کے ساتھ سنی اور اس کی کم عمر ملازمہ آئی تھی۔رات کے پر تکلف ڈنر کے بعد مرک کو حویلی کا ایک بیڈروم رہنے کو دیا گیا۔جس میں دو مسہریاں موجود تھیں۔مرک اور سنی اپنے اپنے بستر میں رضائی اوڑھ کر لیٹ گئے۔دسمبر کی آخری تاریخیں چل رہی تھیں۔سو سردی بدن میں گھسی جاتی تھی۔مرک کو ہیٹر سے شدید گھبراہٹ ہوتی تھی سو وہ سردی سے کانپتی رہتی پر کمرے میں ہیٹر نہ جلاتی۔آج اس کے ساتھ سنی کو بھی جیسے سردی کی سزا مل رہی تھی۔

اس کا دل چاہ رہا تھا اپنی حویلی جا کر اپنے گرم بستر میں گھس جائے پر پھوپھو کی رخصتی سے پہلے کا سارا وقت وہ اس کے ساتھ گزارنا چاہتا تھا۔رات دیر تک پھوپی بھتیجا ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔پھر نیند نے سنی کو اپنی آغوش میں لے لیا۔رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا جب سنی کی آنکھ ایک دم کھلی۔سماعتوں پر جیسے کسی بم کے پھٹنے کا گمان ہوا تھا۔وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔کمرے میں نیم اندھیرا تھا۔

''پھوپھو۔'' وہ بے چین ہو کر پکار اٹھا۔مرک کے بستر سے کوئی ہیولہ چھلانگ لگا کر اترا اور کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

''پھوپھو'' وہ فوراً اپنے پلنگ سے اتر کر مرک کے بستر کی طرف آیا۔دروازہ کھل جانے سے باہر کی روشنی اندر آرہی تھی۔

''پھوپھو۔'' اس نے پھر پکارا۔مرک لحاف اوڑھے ہوئے تھی۔اور اس کے بازو رضائی سے باہر تھے۔

''پھوپھو۔'' اس بار سنی کو عجیب سا احساس ہوا اس نے بغور دیکھا تو مرک کا چہرہ تکیے سے ڈھکا ہوا تھا۔وہ منہ پر تکیہ رکھ کر بھلا کب سوتی تھی۔سنی نے پریشان ہو کر سوچا۔

''پھوپھو! اٹھو۔'' سنی نے اپنے ہاتھ سے تکیہ ہٹانا چاہا تو تکیہ گیلا گیلا محسوس ہوا۔سنی نے گھبرا کر ہاتھ واپس کھینچ لیا اور ہتھیلی پر لگی چپچپاہٹ کو ناک سے لگا کر سونگھا۔

''آں......'' اسے ابکائی سی آگئی۔

اس نے اپنی ہتھیلی، باہر سے آتی روشنی کی سمت پھیلا دی اور اس کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔وہ تازہ خون تھا۔

''پھوپھو......'' اس نے چیخ کر تکیہ مرک کے چہرے سے اٹھا کر پرے پھینکا۔

دروازے سے اندر آتی ناکافی روشنی میں بھی اس نے مرک کا گولیوں سے مسخ چہرہ دیکھ لیا تھا اور اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔

☆☆☆

مشینوں کے ذریعہ سانس لیتی حیات بھی بھلا زندگی کہلانے کے لائق ہے۔انسان ہوش وخرد سے بے گانہ ہو کر صرف سانسوں کی گنتی ہی پوری کر رہا ہوتا ہے۔ابدی موت آنے سے پہلے موت کی اذیت ناک ریہرسل۔

سارنگ نے صاف ستھرے سفید بستر پر آنکھیں موندے سیدھی لیٹی تاج بی بی کو دیکھ کر دکھ

''آج پورے پندرہ سال ہو گئے اماں کو بستر پر یوں بے حس وحرکت پڑے۔'' زمرد صادق نے افسوس سے کہا۔

''اچھی خاصی چاق و چوبند میری ساس کیسی بے بس ہو کر پڑ رہی۔ اللہ ان کو اس حال میں لانے والوں کو غارت کرے۔'' پھر انہوں بھرے دل سے بددعا دی۔

''وہ اپنے انجام کو تو پہنچ گیا اماں۔ وہیں جیل میں مرکھپ گیا۔'' سارنگ نے نفرت آمیز لہجے میں کہا۔

''موت کسی کا برا انجام کیسے ہو سکتی ہے سارنگ۔ موت تو سب کو ہی آنی ہے۔ ہمارا دل تو تب ٹھنڈا ہوتا جب زندگی اس پر تنگ ہوتی، وہ جیل میں تڑپ تڑپ کر ایڑیاں رگڑتا پر موت اسے نصیب نہ ہوتی۔''

زمرد بیگم ساس کا کمبل درست کرتے زہریلے انداز میں بولیں۔ وہ کوما میں پڑی ساس کی خدمت جانفشانی سے کرتی تھیں۔

''واقعی موت تو سب کو آتی ہے۔ مرنا کسی کا برا انجام کیسے ہو سکتا ہے۔'' سارنگ نے دل میں ماں کی تائید کی۔

''ہمارے سینے میں ناسور بھرے ہیں بیٹے۔ کس درد کو روئیں، کس کو کہیں۔ ارباب کے خاندان کا کیا بگڑا۔ ہمارا ہنستا بستا گھر ہی اجاڑ دیا رذیل نے۔ مرک کے قتل کا سنتے ہی تمہارے چھوٹے چاچا ہارٹ اٹیک سے چل بسے۔ تمہاری دادی اماں بے ہوش ہو کر ہمیشہ کے لیے کوما میں چلی گئیں اور اس بد نصیب کا شوہر دیوانہ ہو کر اپنی ہستی ہی رول بیٹھا۔'' انہوں نے اذیت سے آہ بھری تو ارباب حسن کے خلاف نفرت کی ایک تیز لہر سارنگ کے اندر اٹھی۔

''اماں! میں اگر اس وقت جوان ہوتا نا تو اس گھٹیا انسان کے جسم میں گولیوں سے اتنے چھید کرتا کہ اس کی شناخت مشکل ہو جاتی۔ بابا نے اسے نشان عبرت بناتے۔'' وہ مٹھیاں بھینچ کر غصے سے بولا۔

''وہ کیا کرتے بیٹا۔ پے در پے ملتے صدمات سہارتے یا خود قاتل بن کر پھانسی چڑھ جاتے۔'' زمرد نے اشک صاف کرتے کہا۔

''پھر بھی اماں! قصاص لینا ہمارا حق تھا۔'' سارنگ کی آنکھیں ماضی کے حادثے کو سوچ کر لہو رنگ ہوئیں۔ ''میری پیاری پھوپھو کو جان سے مارنے والے کے ٹکڑے ٹکڑے کر دینے چاہیے تھے۔ وہ آسان موت کے لائق نہیں تھا اماں۔'' لہو رنگ آنکھیں خون چھلکانے لگیں۔

''بس بیٹا! کیا کہیں۔ اوپر اب اللہ کو حساب دے رہا ہوگا۔ بزدل تو اتنا تھا کہ پھانسی چڑھنے کے خیال سے ہی دل کا دورہ پڑ گیا۔ بڑی اپیلیں کی تھیں اس نے سپریم کورٹ تک...... کہ کسی طرح پھانسی کی سزا عمر قید میں تبدیل ہو جائے پر کورٹ نے اپنا فیصلہ نہ بدلا۔ تمہارے بابا نے بھی بڑی جان کھپائی کورٹ کچہری میں، مجھ سے کہتے۔ مرتے مر جاؤں گا مگر بہن کے خون کا انصاف لے کر رہوں گا۔'' وہ ٹھنڈی سانس بھر کر پھر گویا ہوئیں۔

''مرک اپنے بھائیوں کو جان سے زیادہ عزیز تھی۔ بد نصیب کنواری ہی اگلے جہان چلی گئی۔ ہائے کیسے سپنے سجے تھے اس کی آنکھوں میں۔ ہالار کے سنگ رہنے بسنے کے۔ سب ملیامیٹ ہو گئے۔'' زمرد کے آنسوؤں میں روانی آئی۔

''اماں پلیز! آپ مت روئیں۔'' سارنگ نے اپنا مضبوط بازو ان کے کندھے پر پھیلایا۔ وہ بیٹے کو شفقت سے دیکھنے لگیں۔

کیسا کڑا وقت تھا۔ جب ان کے کم سن سنی نے وہ بھیانک حادثہ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اپنی پیاری پھوپھی کے اندوہناک قتل کا صدمہ اسے گنگ کر گیا تھا۔ ہنستا کھیلتا، شرارتی بچہ ایک دم ہی بوڑھا لگنے لگا تھا۔ کتنے ماہ و سال لگے تھے اسے سنبھلنے میں۔

انھوں نے دکھ سے سوچا۔

"کچھ بھی تو ویسا نہیں رہا سارنگ! کبھی یہ حویلی خوشیوں کا گلشن تھی، اب آہوں کا مسکن ہے۔ مرک اور سجل کی ہنسی ان دونوں کی شرارتی باتیں اب بھی یاد آتی ہیں تو دل اداس ہو جاتا ہے۔ میری زندہ دل دیورانی تجل کی شادی کو ایک سال بہ مشکل ہوا تھا کہ بیوگی کی چادر اوڑھ کر واپس میکے چلی گئی۔ تمہارے بابا اور منجھلے چاچا نے اپنا حوصلہ نہ رکھا ہوتا تو ہم بھی بکھر جاتے۔"

"بس اماں! آپ اب اپنا حوصلہ نہ ہاریں۔ آپ کو روتے دیکھ کر مجھے دکھ ہوتا ہے۔ اب تھوڑا سا مسکرا دیں۔" سارنگ نے محبت سے فرمائش کی تو وہ بہ مشکل ذرا سا مسکرائیں۔

"یہ ہوئی نا بات۔" اس پر بھی سارنگ خوش ہوا تھا۔

☆☆☆

مضراب نے عفان کے چہرے کو بغور دیکھا جس پر نا قابل فہم تاثرات درج تھے۔

"عفان! میں نے اس دن سب کچھ تمہیں کھل کر بتا دیا تھا۔ ہمارے اور ایمان کی فیملی کے آپسی تعلقات کس قدر کشیدہ ہیں۔ تم نے ایمان سے یہ سب ڈسکس کیا؟" مضراب نے اپنا سوال دہرایا۔

"رانی! مجھے اور ایمان کو ان سب باتوں اور نفرتوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہمارا پیار سچا ہے۔ اور تم ری ایکشن کا پوچھ رہی ہو تو سنو۔ وہ تو ہماری آپس میں رشتہ داری کا سن کر ہی بہت خوش ہوئی۔ رہی اس حادثے کی بات تو وہ کہتی ہے کہ تمہارے ماموں کے کیے گئے برے عمل کے تم ذمہ دار نہیں ہو۔" عفان نے مطمئن انداز میں کہا تو مضراب نے اپنا سر پکڑ لیا۔

"عفان! تم دونوں پاگل ہو۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں، بہت بڑا ایشو ہے۔ جو تمہارے اور ایمان کے درمیان پہاڑ بن کر کھڑا ہے۔ تمہاری اور ایمان کی شادی میں سب سے بڑی رکاوٹ ایمان کی اپنی

یہی بنے گی۔ وہ بی آپی بہن کے قاتل کے بھانجے کو اپنی بیٹی نہیں دیں گے۔ مارنے مرنے پر تل جائیں گے۔ تم سمجھتے کیوں نہیں۔"

"میں کیوں سمجھوں؟ ہمارا قصور کیا ہے۔ بڑوں کے گناہ ہم کیوں بھگتیں۔ پرانی نسلوں کی غلطیاں ان کے ساتھ قبر میں دفن ہو جانی چاہیے بس۔" عفان جذباتی ہوا۔

"عفان! پلیز۔ اپنی آنکھیں کھولو اور حقائق کا سامنا کرو۔ تمہاری اور ایمان کی شادی ہونا ناممکن ہے۔" مضراب نے بے چارگی سے کہا۔

"دنیا میں کچھ بھی ناممکن نہیں ہوتا۔ ہماری محبت سچی اور جذبے کامل ہیں۔ ہمیں منزل مل کر رہے گی۔ میں مما سے بات کرتا ہوں، وہ جائیں میرا رشتہ لے کر ایمان کے گھر۔" عفان ضدی پن سے بولا۔

"دماغ خراب ہے، اپنی ماں کو بے عزت کروانا چاہتے ہو۔ وہ آگے سے ان کے ساتھ نہ جانے کیسا برتاؤ کریں۔" مضراب نے اسے جھاڑ دیا۔

"تو کیا کروں؟" عفان نے اکھڑ پن سے پوچھا۔

"اپنا یہ جذباتی پن ختم کرو عفان! ایمان کو بھی حقیقت سمجھنی چاہیے۔ وہ بھی بچی بن رہی ہے اور تم بھی بچوں کی طرح ضد لیے بیٹھے ہو۔ اگر لڑکی پسند آ گئی تھی تو اس کا بیک گراؤنڈ تو دیکھتے۔ نہ اس کے خاندان کے متعلق معلوم کیا، نہ فیملی کا پوچھا بس محبت کر لی۔" مضراب کو اب کہ غصہ آ گیا۔

"محبت سوچ سمجھ کر نہیں کی جاتی بہنا۔ اور ایک بار اگر کر لی جائے تو پیچھے نہیں ہٹا جاتا۔ شادی تو مجھے ایمان سے ہی کرنی ہے پھر چاہے بڑوں کی منظوری سے ہو یا پھر کورٹ میرج۔" عفان کے لہجے میں اتنی ضد تھی کہ مضراب لرز گئی۔

"پاگل تو نہیں ہو گئے۔ اپنی جان کے دشمن بن رہے ہو۔"

ملی تو میں مرجاؤں گا آپی! ابھی سے بتا رہا ہوں۔" وہ انتہائی جذبات میں اٹھا اور میز کو زور سے ٹھوکر مارتا کمرے سے باہر نکل گیا۔ مضراب کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔

"یاخدا۔ میں کیا کروں اس ضدی لڑکے کو کیسے سمجھاؤں۔" وہ بے چارگی سے سوچنے لگی۔

عفان ماں باپ کا انتہائی لاڈلا بیٹا تھا۔ خاص طور پر نجمہ تو اسے آنکھوں پر رکھتی تھی۔ بچپن سے کمزور اور مختلف بیماریوں کا شکار رہا جس کی وجہ سے طبیعت میں چڑچڑاہٹ اور ضدی پن در آیا تھا۔ اس کی صحت اور زندگی کے لیے نجمہ ہمیشہ فکرمند رہی۔ ان کی ساری توجہ عفان نے کھینچ لی تھی، ماں کے بھائی کی طرف پورے جھکاؤ نے مضراب کو بھی حسد میں مبتلا نہیں کیا بلکہ وہ بھی اپنے چھوٹے بھائی کے لیے ماں کی طرح فکرمند رہنے لگی۔ پھر وقت کے ساتھ عفان اللہ کے فضل و کرم سے ٹھیک ہوتا چلا گیا مگر اس کی نازک مزاجی اور ضد کی عادت اس کے ساتھ ہی پروان چڑھی تھی اور نجمہ کے لیے اس کی ہر ضد کو پورا کرنا اولین فرض بنا رہا۔ کبھی خوشی سے اور کبھی بے بسی سے اس کی بات مان لی جاتی تھی بصورت دیگر وہ خود کو بڑا نقصان پہنچانے سے بھی گریز نہ کرتا تھا۔ ایک آدھ بار خودکشی کی انتہائی کوشش بھی کر ڈالی تھی۔ اور بروقت بچالیا گیا تھا۔

اس واقعہ کے بعد سے نجمہ تو کیا جواد صاحب اور مضراب بھی اس سر پھرے لڑکے کی ضدوں سے ڈرنے لگ گئے تھے۔ مگر اب جو اس نے ضد باندھ لی تھی، وہ کسی طور مناسب نہ تھی۔ نہ جانے اس ضد کا انجام کیا ہونے والا تھا۔ بہرحال مجھے ان دونوں کو آخری حد تک سمجھانا ہوگا۔ شادی کوئی مذاق نہیں دو خاندانوں کا میل ہے۔ اور جہاں خاندان ہی ایک دوسرے سے نالاں ہوں۔ وہاں میل ملاپ کی گنجائش کہاں نکلتی ہے۔ مضراب نے پریشانی سے سوچا تھا۔

اگلے ہی دن وہ ایک بار پھر ایمان کے سامنے تھی۔

"میرا بھائی ایکسٹرا آرڈنری جذباتی ہے ایمان! مگر تم تو سمجھ دار ہو۔ ماضی کے تلخ حقائق بھول جانے والے تو نہیں۔ یہ سچ ہے ہمارے ماموں نے بہت ظلم کمایا۔ اور یقین کرو، اس بات کی شرمندگی ہماری فیملی کو ہمیشہ رہی ہے اور رہے گی۔ اس ایک قتل نے کتنے ہی رشتوں کو خاموشی سے قتل کر دیا۔ دلوں کے درمیان ناقابل عبور دوریاں بڑھا دیں۔ کتنی نفرتیں پیدا کر دیں۔ ان کا کوئی ازالہ نہ ہوا ہے۔ نہ ہی کبھی ہوسکتا ہے۔"

وہ کہہ کر ذرا سا رکی۔

"بہتر یہی ہے کہ ہم ان دوریوں کو پاٹنے کی کوشش نہ کریں۔ یہ رنجشیں مٹنے والی نہیں ہیں ایمان! اسی لیے سمجھ داری اسی میں ہے کہ ہم ان نفرتوں کے بیچ نئے رشتوں کی بنیاد نہ رکھیں۔ تم عفان کی اچھی دوست ہو، اس کی دوست ہی بنی رہو تو اچھا ہے۔ اس سے قریبی رشتہ جوڑنے کی خواہش تمہیں اور اسے دونوں کو تکلیف دے گی۔" مضراب نے بغور ایمان کے چہرے کو دیکھ کر کہا جو اس کی بات پر رنگ بدل رہا تھا۔

"میں عفان سے دست بردار نہیں ہوسکتی۔ ماضی میں جو کچھ بھی ہوا، اس میں ہمارا حصہ نہیں تھا آپی! پھر سزا ہم کیوں بھگتیں۔" ایمان کی بات پر مضراب نے سر پکڑ لیا۔ وہ جذباتی پن میں عفان کی ہم پلہ نکلی۔

"اچھا ایمان! ایسا کرو۔ اپنے بابا سے عفان کا ذکر کر کے دیکھو۔ بہت بڑا طوفان نہ آجائے تمہاری اس بات سے تو کہنا۔" مضراب نے زچ ہو کر دوٹوک بات کی۔

"میں بابا سے ذکر نہیں کرسکتی۔" ایمان فوراً بدکی۔

"یہی بات تو میں تمہیں سمجھا رہی ہوں ایمان!

مضراب پھیکا سا مسکرائی۔

''میں نہیں مگر میرے بڑے بھائی ان کو منا سکتے ہیں۔ ان تک کسی طریقہ سے میں یہ بات پہنچادوں تو مسئلہ حل ہوسکتا ہے۔'' ایمان نے سوچ کر کہا۔

''تمہارے بڑے بھائی؟'' مضراب نے بھویں اچکائیں۔

''جی میرے اکلوتے بھائی، سارنگ کی بات وہ بہت مانتے ہیں۔'' ایمان نے کہا۔

''سنی سے تو بات کرنا فضول ہے۔'' مضراب روانی میں کہہ گئی۔

''سنی......'' ایمان نے دہرایا تو مضراب خاموش سی ہوئی۔

''امن باجی بتارہی تھیں، آپ سارنگ ادا کی بہت اچھی دوست رہی ہیں۔'' ایمان کی آنکھیں اچانک چمک اٹھیں۔

''ہاں کبھی ہم اچھے دوست تھے۔'' مضراب کی آنکھوں کے آگے ماضی گھوم گیا۔

''واؤ یہ تو پلس پوائنٹ ہے۔'' ایمان ایک دم خوش ہوئی۔

''پلس پوائنٹ کیسا؟'' مضراب الجھی۔

''خیر امن کیسی ہے؟ کیا کررہی ہے آج کل؟ اسے اپنی سہیلی یاد آئی۔''

''وہ الحمد للہ بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں۔ شادی کرکے لندن چلی گئی ہیں۔'' ایمان کے لہجے کی شوخی لوٹ آئی تھی۔

''اوہ اچھا۔'' مضراب نے سر ہلایا۔

''جی۔ ہماری بات وڈیو کال پر روز ہوتی ہے۔ وہ آپ کی فیملی کا ذکر اچھے انداز میں کرتی ہیں۔ انہیں آپ کی فیملی سے کوئی عداوت نہیں ہے۔ مجھے بھی نہیں اور یقیناً سارنگ ادا کو بھی نہیں ہوگی۔ ہم نیو جنریشن اولڈ اسٹوریز کو اون نہیں کرتے تو ہمیں ہماری مرضی پر چلنے دیا جائے۔'' ایمان پھر سے اصل بات کی طرف آئی تو مضراب اسے دیکھ کر رہ گئی۔

ہے، آپ تو ایمان کے بھائی بہن کی دوست رہی ہیں۔ آپ کیوں نہیں ہمارے لیے ایمان کے بڑوں کو قائل کرتیں۔'' عفان جو اتنی دیر سے خاموش بیٹھا تھا اچانک بول اٹھا۔

''میں کیسے قائل کروں؟'' مضراب نے اسے گھورا۔

''وہ تو آپ کو پتا ہوگا۔ کیا آپ اپنے چھوٹے بھائی کے لیے اتنا بھی نہیں کرسکتیں۔'' عفان نے اسے جذباتی بلیک میل کیا۔

''جب ایک بات ناممکنات میں سے ہے تو اس کی کوشش فضول ہے۔'' مضراب نے روکھا جواب دیا۔ وہ ان دونوں کی غضب کی کیمسٹری پر دل میں حیران ضرور تھی۔ ایمان کی ادھوری بات عفان مکمل کررہا تھا۔

''آپ اگر چاہتی ہیں ہم کوئی انتہائی قدم نہ اٹھائیں تو آپ کو کوشش کرنی پڑے گی۔'' عفان کا لہجہ عجیب سا ہوا۔

''عفان! پلیز۔ یہ تم مجھے بات بات پر بلیک میل کرنا بند کرو۔'' مضراب جھنجلائی۔

''آپ کوشش تو کرکے دیکھیں آپی!'' ایمان نے بھی فرمائش کی۔

''کوشش سے کیا مراد ہے۔ میں عفان کا رشتہ لے کر آجاؤں تمہارے گاؤں۔'' مضراب بھرپور خفگی سے بولی۔

''آجائیں ناں۔ رشتہ لے کر نہیں، ایسے ہی کچھ دن گزارنے کے لیے۔ آپ کی نانو کی حویلی کب سے بند پڑی ہے، آکر اسے کچھ دن آباد کریں۔'' ایمان نے جلدی سے کہا۔

''وہاں آکر میں کون سا تیر مار لوں گی۔'' مضراب اسی موڈ میں بولی۔

''آپ آئیں تو سہی۔ وہاں ماحول کافی بدل گیا ہے۔ آپ ہماری حویلی میں بھی آیئے گا۔ میں آپ کی دعوت کروں گی۔ آپ کے آنے سے ہوسکتا

ہے پھر سے ہمارے بڑوں کے آپسی تعلقات بحال ہو جائیں۔" ایمان نے کچھ لجالت سے مضراب کے ہاتھوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیے۔

تو مضراب کو اندازہ ہوا باہر سے کانفیڈنٹ اور ماڈرن نظر آنے والی ایمان اندر سے وہی روایتی لڑکی ہے جو محبت بھی کرتی ہے اور محبوب کو سیدھے راستے سے پانا بھی چاہتی ہے۔

"تم دونوں آخر اتنے جذباتی اور بے صبرے کیوں ہو رہے ہو؟" مضراب نے نرمی سے پوچھا۔

"آپی میرا فائنل ایر ہے اور بابا کا ارادہ میری تعلیم مکمل ہوتے ہی میری شادی کر دینے کا ہے۔ کئی پرپوزلز کو اسی وجہ سے انہوں نے روکا ہوا ہے۔" ایمان نے اصل پریشانی بتائی۔

"پھر آپ آرہی ہیں نا ہمارے گاؤں۔ آپ کا ہاؤس جاب بھی ختم ہو رہا ہے اور ہماری یونی کی چھٹیاں بھی نیکسٹ ویک سے شروع ہیں۔" ایمان نے بڑی بے صبری سے پوچھا تھا۔

"ہمم...... ٹھیک ہے، میں آجاؤں گی۔" مضراب نے پرسوچ انداز میں سر ہلایا۔ ایمان ایک دم خوش ہوئی۔

"مگر میری ایک شرط ہے۔" مضراب نے یکا یک کہا۔

"کون سی شرط؟" دونوں نے حیرت سے مضراب کو دیکھا۔

"اگر تمہارے رشتے کی بات نہیں بنی تو تم دونوں کو کھلے دل سے ایک دوسرے کو ہمیشہ کے لیے گڈ بائے کرنا ہوگا۔" مضراب نے سنجیدگی سے انہیں دیکھا جن کے چہروں کا رنگ اس کڑی شرط پر اڑ گیا تھا۔

"سوچ لو اچھی طرح۔ مجھ سے پکا پرامس کرو۔ تب ہی میں وہاں جاؤں گی۔" مضراب نے اطمینان سے کرسی سے ٹیک لگائی۔ عفان اور ایمان نے ایک دوسرے کو دیکھا۔

"اوکے۔ اگر آپ خدانخواستہ ناکام لوٹیں تو میں عفان کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ دوں گی۔" ایمان نے نم آواز سے کہا۔

"مانو! یہ کیا کہہ رہی ہو؟" عفان نے احتجاج کیا۔

"عفان! میں اپنے پیرنٹس کے گھر سے عزت سے رخصت ہونا چاہتی ہوں، کورٹ میرج میرے نزدیک غلط طرز عمل ہے۔ اور اس کا نتیجہ بھیانک نکل سکتا ہے۔" ایمان نے کہا۔

"وری گڈ ایمان! تمہاری سوچ مجھے پسند آئی۔" مضراب خوش ہوئی جبکہ عفان نے لب بھینچ لیے تھے۔

☆☆☆

"یہ اچانک تمہیں نانی کی حویلی کیسے یاد آگئی مضراب!" نجمہ نے اس کی شیر گڑھ جانے کی فرمائش پر حیران ہو کر پوچھا۔

"ایسے ہی ہاؤس جاب سے بھی فری ہو گئی ہوں تو سوچا اب میڈیسن کی پریکٹس شروع کرنے سے پہلے کا کچھ وقت انجوائے کرلوں۔" مضراب نے لاپروائی کا انداز اپنایا۔

"تو تم انجوائے کرنے کو ناردرن ایریاز بھی جا سکتی ہو، نانی کے گاؤں میں کیا رکھا ہے۔" انہوں نے بیٹی کو یوں دیکھا جیسے پگلا گئی ہو۔

"گاؤں کا کھلا ماحول، کھیت کھلیان اور سب سے بڑھ کر میرے بچپن کی خوب صورت یادیں وہاں رکھی ہیں مما۔" مضراب نے جان کر جذباتی انداز اختیار کیا۔

"وہاں اور بھی بہت کچھ رکھا ہے جس سے تم دور ہی رہو تو اچھا ہے۔" وہ ناگواری سے بولیں۔

"مما! میرا دل چاہ رہا ہے۔ اور میرے ساتھ عفان بھی تو ہوگا، اکیلی تو نہیں جا رہی۔ پلیز جانے دیں۔" وہ ٹھنکی۔

"عفان کو گاؤں کی آب و ہوا راس نہیں۔ یہ بیمار پڑ جائے گا۔" انہوں نے فوراً تاویل گھڑی۔

"مما! میں اب بچہ نہیں رہا۔ بڑا ہو گیا ہوں۔

مجھے کچھ نہیں ہوتا۔" عفان نے منہ بنایا۔

"مما! مان بھی جائیں ناں۔" مضراب نے ان کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

"نجمہ! اب بچے ضد کر رہے ہیں تو جانے دو۔" شہزاد صاحب نے انہیں قائل کرنا چاہا۔

"آپ تو اب بچے نہ بنیں۔ میں ان کو وہاں کیسے جانے دوں۔" انہوں نے پیشانی پر بل ڈال کر شوہر کو دیکھا۔

"برسوں گزر گئے ہیں بیگم! وقت کی دھول نے سب کچھ دبا دیا ہے۔ بہتر ہے تم بھی سب بھلا دو۔" شہزاد نے مبہم انداز میں سمجھایا۔

"ویسے بھی چند دن کے لیے ہی جا رہے ہیں مستقل بسنے تو نہیں۔ میں بھی تو زمینوں کے حساب کتاب کے لیے جاتا رہتا ہوں۔" شوہر کی بات پر وہ خاموش رہیں۔

"بس بیٹا! میری طرف سے اجازت ہے، تم دونوں کل ہی شیر گڑھ کے لیے نکل جاؤ۔" پھر انہوں نے حتمی طور پر کہا تو عفان نے یاہو کا نعرہ لگایا اور نجمہ بڑبڑا کر رہ گئیں۔

☆☆☆

ماحول میں اگر بتی کی سوگوار مہک پھیلی ہوئی تھی۔ مولوی صاحب نے ہاتھ اٹھا کر دعا شروع کی تو ان کی تقلید میں سب نے اپنے ہاتھ اٹھا دیے۔ سارنگ اپنی ہتھیلیاں پھیلا کر مرک اور چھوٹے چاچا کی مغفرت کی دعا میں مستغرق ہوا۔ دل میں جیسے پھوڑا سا رسنے لگا تھا۔ دعا کے بعد وہ مسجد سے اٹھ کر باہر آیا۔

"دیگیں کھلوا دو دلاور!" سارنگ نے دلاور سے کہا تو فوراً ہی لائن سے رکھی بریانی اور زردے کی دیگیں کھلنے لگیں۔

"اچھی طرح غریبوں کو کھلانا۔ اور اچھے سے سب گھروں میں پہنچا دینا۔ کسی کا گھر رہ نہ جائے۔"

وہ اسے ہدایت دیتا مسجد سے متصل قبرستان میں چلا آیا۔ جہاں مرک پھوپھو اور عزیز چاچا کی قبریں ساتھ ہی بنی ہوئی تھیں۔ قبروں پر تازہ پانی کا چھڑکاؤ کیا گیا تھا اور گلاب کی پتیاں جا بجا بکھری ہوئی تھیں۔ آج ان دونوں کی برسی تھی۔ وہ آہستہ سے چلتا ہوا مرک کی قبر کے سرہانے آکر بیٹھ گیا اور سر جھکا کر چنبیلی کے پودے کو دیکھنے لگا جس نے دو چار دنوں میں ہی اپنی کونپلیں نکالنا شروع کر دی تھیں۔

"زندگی بہت آگے بڑھ گئی ہے مرک پھوپھو! مگر میرا دل اپنے لڑکپن کے زمانے میں اٹک کر رہ گیا ہے۔" سارنگ نے ہلکی آواز سے مرک کو مخاطب کیا۔ "وہ لڑکپن جس میں آپ حیات تھیں۔" اس نے آنکھیں میچ کر نمی کو چھلکنے سے روکا۔

"میں زمانے کے ساتھ چلتا ضرور ہوں پھوپھو! مگر اس طرح جیسے دریا کے کنارے چلا جائے۔" وہ سانس بھر کر خاموش ہوا۔ "دنیا جب مجھے اپنی جانب کھینچتی ہے تو میرا ماضی مجھے پتھر کی طرح بھاری کر دیتا ہے پھوپھو! اور پھر دنیا تھک جاتی ہے اور گزرا کل جیت جاتا ہے۔ گزرا ہوا کل جس کی گود میں سانس لیتی ہوئی وہ جاں گسل رات جو میرے لاشعور میں زندہ ہے۔ وہ بدنصیب رات جب میں نے آپ کو......" وہ اذیت سے کراہ کر خاموش ہوا۔

فضا میں سوگواری بڑھ گئی تھی۔ سارنگ نے اپنی سرخ دہکتی آنکھیں کھولیں اور پھر جیسے پلکیں جھپکانا بھول گیا۔ کچھ ہی دور گلابی لباس میں ملبوس وہ کھڑی ہوئی تھی جسے اس نے مری کوٹ میں دیکھا تھا۔ قلعہ کی دیواروں کو عرق ریزی سے کھوجتی خود ایک سربستہ راز جیسی لڑکی۔ اس دن کے برعکس آج اس کا پہناوا مشرقی تھا سر پر گلابی دوپٹہ سلیقے سے جمائے وہ قبر کے کتبوں پر نظر دوڑا رہی تھی۔ اپنی اجرک جھاڑتا وہ فرش سے اٹھا اور مضراب کے پاس چلا آیا۔ آہٹ پر مضراب اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

"ڈاکٹر مضراب! آپ یہاں......؟" سارنگ نے اسے محویت سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"السلام علیکم۔" مضراب نے سلام کیا تو وہ ذرا

شرمندہ سا ہوا۔
"وعلیکم السلام۔کیسی ہیں آپ۔"
"الحمدللہ۔ آپ کیسے ہیں سارنگ تالپور۔"
اس کے سوال پر سارنگ کو حیرت آمیز خوشی ہوئی۔
"آپ کو میرا نام یاد ہے۔"
"آپ کو بھی تو میرا نام یاد ہے۔" وہ جواباً دلکشی سے مسکرائی۔
"کچھ نام بغیر کسی شعوری کوشش کے یاد رہ جاتے ہیں۔" سارنگ نے اس کا خوب صورت چہرہ نظروں کی گرفت میں لیتے ہوئے کہا۔
"اور کچھ نام برسوں سے دل پر لکھے ہوتے ہیں۔" مضراب دھیمے سے بولی۔
"آپ نے بتایا نہیں، آپ یہاں کیسے آئیں۔" سارنگ نے اس کے ہلتے ہونٹوں کو سننے کی ناکام کوشش کرتے پوچھا۔
"حیدرآباد سے بائے روڈ آئی ہوں۔" مضراب نے لب دبا کر کہا تو سارنگ بے اختیار مسکرایا۔
"میرا مطلب ہے، یہاں ہمارے آبائی قبرستان میں آپ کیسے نظر آرہی ہیں۔"
"کیونکہ یہ ہمارا بھی آبائی قبرستان ہے۔" مضراب کے جواب پر سارنگ نے ابرو اٹھائے۔
"آپ کا آبائی قبرستان؟"
"جی ہاں۔ یہاں میرے پرکھوں کی قبریں ہیں۔مگر فی الحال مجھے اپنی نانو کی قبر کی تلاش ہے۔ فاتحہ پڑھنی ہے۔ پاپا نے بتایا تھا ان کی قبر نیم کے درخت کے نیچے ہے، اب یہاں تو ہر طرف نیم کے درخت ہیں۔" مضراب نے بے چارگی سے کہا۔
"آپ کی نانی کا نام کیا ہے؟" سارنگ نے الجھ کر پوچھا۔
"میری نانو کا نام مہراب بی بی ہے۔" مضراب نے بتایا تو سارنگ چونک اٹھا۔
"مہراب حسن تالپور۔" اس نے کسی خدشے کے تحت پوچھا۔

"جی وہی۔" مضراب نے سر ہلایا۔سارنگ کو جھٹکا سا لگا اس کے بدترین خدشے کی تصدیق ہوگئی تھی۔
"آپ بتا سکتے ہیں ان کی قبر کس طرف ہے؟" مضراب نے اس کے چہرے کو دیکھا جو ایک دم بجھ کر رہ گیا تھا۔
"مجھے نہیں معلوم۔" وہ بے نیازی سے کندھے پر اجرک ٹکاتا آگے بڑھا۔
"سنی...... کہاں جا رہے ہو؟ پلیز بات سنو۔" مضراب نے پیچھے سے آواز دی تو وہ پتھر کا ہوگیا۔
"سنی......" وہ اس کے بالکل سامنے آکر کھڑی ہوگئی۔
"ڈاکٹر مضراب! میرا نام سارنگ تالپور ہے۔ اور لوگ مجھے اسی نام سے پکارتے ہیں۔" سارنگ نے سرد لہجے میں کہا۔
"لیکن میرے لیے آپ ابھی بھی سنی ہیں۔ سارنگ تالپور نہیں۔" مضراب نے اس کی آنکھوں میں دیکھ کر کہا جو اچانک ہی سرخ ہونے لگی تھیں۔
"وہ زمانہ گزر گیا ڈاکٹر مضراب! جب آپ مجھے اس نام سے پکارتی تھیں۔" وہ اکھڑ لہجے میں کہتا اس کے برابر سے نکلتا چلا گیا۔ مضراب نے بے اختیار ایک سانس بھری تھی۔
"اور ایمان...... تم کہہ رہی تھیں، سب کچھ بدل گیا ہے۔" وہ بڑبڑا کر پھر سے قبروں پر نظر دوڑانے لگی۔

☆☆☆

"آپ بس ابھی آجائیں بڑی حویلی۔" ایمان نے کہہ کر کال منقطع کردی۔ مضراب نے سیل فون کو گھور کر دیکھا۔
اس بے صبری کو بتایا بھی ہے اس کے بھائی کا ایٹی ٹوڈ پھر بھی نہیں سدھرنی۔ کیا چیز ہو آخر تم دونوں۔
پھر اس نے عفان کو دیکھا جو سر درد اور بخار کا شکار ہو کر گاؤں آتے ہی بستر کا ہوگیا تھا پر محبت پانے

کے لیے حوصلے جوان تھے۔ چکن کارن سوپ پیتے اس کا سارا دھیان مضراب کی طرف تھا۔

"دوسرا دن ہے ہمیں یہاں آئے ہوئے، اب چلی بھی جائیں بڑی حویلی۔" اس نے مضراب سے التجائیہ کہا۔

"ہاں کیوں نہیں، ابھی جاتی ہوں وہاں سب حویلی والے ہار پھول لے کر میرا استقبال کرنے کو بے تاب ہوں گے نا۔" وہ طنزیہ انداز میں بولی۔

"آپ ڈرتی ہیں ان سے۔ ماردیں گے آپ کو۔" عفان نے اسے چڑایا۔

"ڈرتی تو میں کسی سے نہیں۔" مضراب نے گردن اکڑائی۔

"بس تھوڑا سا خون دیکھ کر بے ہوش ہوجاتی ہیں۔ باقی ڈرتی آپ کسی سے نہیں۔" عفان کو ہنسی کا دورا پڑا۔ مضراب نے بھائی کو گھورا۔

"آپ ڈاکٹر کیسے بن گئیں آپی۔ اتنا چڑیا جیسا دل لے کر کس طرح آپریشن تھیٹر میں جائیں گی۔"

"تمہاری یہ ہنسی میرا مزاج خراب کررہی ہے عفان! ایسا نہ ہو، میں ابھی گاڑی نکلوا کر شہر چلی جاؤں۔" مضراب نے دھمکایا تو وہ واقعی دبک کر بیٹھ گیا۔

بڑی حویلی ظاہری طور پر واقعی بدل چکی تھی۔ مضراب کو ایک طویل عرصہ بعد یہاں قدم رکھنا عجیب سی کیفیت میں مبتلا کرگیا۔ ایمان نے اس کا والہانہ استقبال کیا۔ وہ اسے لے کر اندر زنان خانہ کے بڑے ہال میں آئی جہاں اس کی ماں زمرد اس کی چاچی مومل ان کی بہو حسنہ اور اس کے دو چھوٹے بچے موجود تھے۔

"یہ میری بہت اچھی فرینڈ ہے ڈاکٹر مضراب!" ایمان نے پہلے مرحلے میں اس کا تعارف اپنی دوست کے طور پر اس طرح کروایا کہ وہ لوگ بے حد محبت سے اس سے ملیں۔ پھر کچھ دیر اس کے ساتھ ادھر ادھر کی باتیں کرکے سب ہی اٹھ کر چلی گئیں تاکہ ایمان اپنی دوست سے گپ شپ لگا سکے۔

"یہ کیا کیا ایمان! ان لوگوں سے میرا مکمل تعارف کیوں نہیں کروایا۔"

"ابھی ٹھہر جائیں، جلدی کس بات کی ہے۔ ابھی تو آپ کے لیے مزیدار سا لنچ تیار کروایا ہے، اس کا لطف اٹھائیں۔" ایمان نے مزے سے کہا تو مضراب نے اسے گھورا۔

"آئیں، میں آپ کو حویلی دکھاؤں آپ اپنی یادیں تازہ کریں۔" وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اس چکردار حویلی میں لے کر گھومتی رہی۔ مضراب کے تو جیسے بچپن کے تمام لمحے زندہ ہوکر اس کے سامنے آگئے تھے۔ وہ سحرزدہ سی ہوکر چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔ دل میں دبی ہوئی انسیت انگڑائی لے کر بیدار ہوئی۔

"یہ مرک آنٹی کا کمرہ ہے نا ایمان! اور یہ تاج نانی کا۔" مضراب نے پوچھا۔

"ہاں تاج دادی تو کب سے کوما میں ہیں۔"

"کوما میں......" مضراب چونک گئی۔ "ابھی ادھر ہی ہیں یا ہاسپٹل۔"

"نہیں حویلی میں ہی ان کی دیکھ بھال ہوتی ہے۔"

"کیا میں ان کو دیکھ سکتی ہوں؟" مضراب نے فرمائش کی۔

ابھی ایمان کوئی جواب دیتی، تاج نانی کے کمرے کا دروازہ کھلا اور سارنگ باہر نکلا۔ ایمان کے ساتھ کھڑی مضراب کو دیکھ کر وہ بری طرح چونکا۔

"السلام علیکم۔" مضراب نے مسکرا کر سلام کیا۔

"وعلیکم السلام۔" اس نے الجھ کر ایمان کو دیکھا۔

"یہ میری بہت اچھی فرینڈ ہیں ادا! شہر سے یہاں گھومنے آئی ہیں۔" ایمان بھائی کو اچانک سامنے دیکھ کر گڑبڑا گئی۔

"ایمان...... میں آپ کی کزن بھی ہوں۔ یہ

مضراب نے اعتماد سے کہا۔ ایمان کا بھائی سے اس قدر ڈرنا اسے غصہ دلا گیا۔

"یہ چلی ہیں محبت کرنے...... مجھے خوامخواہ خوار کیا ہے۔"

"ہاں، مضراب آپی ہماری کزن بھی ہیں۔" ایمان نے مضراب کی نظروں سے خائف ہو کر اعتماد پکڑا۔

"ہمم...... میں ان کو اور ان کی فیملی کو اچھے سے جانتا ہوں۔" سارنگ نے عجیب لہجے میں کہا اور قدم آگے بڑھا دیے۔ مضراب نے نکلس کر اس پرکشش تیکھے نقوش والے شخص کی پیٹھ دیکھی۔ جس کا مزاج بھی مرچ کی طرح تیکھا تھا۔

"چلیے آپی! نیچے چلیں۔" ایمان ایک دم ہی کنفیوز نظر آئی۔ نیچے ڈائننگ ٹیبل پر پرتکلف کھانا چن دیا گیا تھا۔ حویلی کی خواتین ایک اچھے میزبان کی طرح اصرار کر کے اسے ایک ایک ڈش پیش کر رہی تھیں خالص دیسی ڈشز اور کچھ بدیسی بھی۔ مضراب ان کے ہاتھ کے ذائقے کی معترف ہوئی۔ خوش گوار ماحول میں کھانا کھایا گیا پھر چائے کا دور چلا۔

زمرد بیگم اور موتل چاچی ایک دوسرے سے سرگوشیاں کر رہی تھیں۔ مضراب کچھ چونک سی گئی۔ ان کو شاید میرے بارے میں شک ہو گیا ہے۔ اب مجھے اپنے متعلق بتا ہی دینا چاہیے۔ مضراب نے حتمی انداز میں سوچ کر انہیں دیکھا۔ جو میٹھی سی نظروں سے اسے ہی دیکھ رہی تھیں۔

"آپ کی کہیں منگنی یا بات پکی تو نہیں ہوئی بیٹا!" پھر زمرد بیگم نے مسکرا غیر متوقع سوال پوچھا۔

"نہیں آنٹی! ابھی تک تو نہیں ہوئی۔" مضراب ان کی بات سمجھ گئی۔ اسے بے اختیار ہنسی آئی۔

"ایمان نے بتایا، آپ بھی ہماری ذات سے تعلق رکھتی ہو، آپ کا گوٹھ کون سا ہے بیٹی۔" چاچی نے بھی حصہ لیا۔

گوٹھ بھی یہی ہے شیر گڑھ......"

"شیر گڑھ...... آپ کس کی بیٹی ہو مضراب!" زمرد بیگم نے تجسس سے پوچھا۔

"میرے بابا کا نام شہزاد تالپور ہے۔" اس نے کہا تو زمرد بیگم اور موتل چاچی نے چونک کر ایک دوسرے کو دیکھا۔

"حسن احمد کی نواسی ہو؟" زمرد بیگم کا لہجہ ایک دم بدلا تھا۔

"جی۔" مضراب نے اعتراف کیا۔ "حسن احمد سے آپ کا بھی ایک رشتہ ہے، وہ آپ کے چچا سسر تھے۔" مضراب نے جتا دیا۔

"ہمارا ہر رشتہ ان سے ختم ہو چکا ہے۔" زمرد بیگم نے سرد نگاہوں سے مضراب کو دیکھا۔

"خون کے رشتے کبھی نہیں ٹوٹتے آنٹی۔" مضراب نے اعتماد سے کہا۔

"خون کے رشتوں کا جب خون کر دیا جائے تو وہ ٹوٹ کر ختم ہو جاتے ہیں لڑکی۔" زمرد بیگم بھڑک اٹھی تھیں۔

"ایمان! تم نے مہراب بیگم کی نواسی سے کیوں اور کس طرح دوستی کر لی؟" پھر انہوں نے دبے دبے غصے سے بیٹی کو دیکھا۔ جو ان کی گفتگو سے پزل سی ہو گئی تھی۔

"یہ میری مہمان ہے اماں۔ آپ آئے کو عزت دیں۔ غصہ مت کریں۔" ایمان نے ماں کے رویے سے خائف ہو کر کہا۔

"مہمان کو عزت دینے کی روایت مانع نہ ہوتی تو میں مہراب بیگم کی نواسی کو حویلی سے نکال باہر کرتی۔" وہ کڑے لہجے میں کہہ کر اپنی نشست سے اٹھیں۔

"زمرد آنٹی! میں وہی رابی ہوں جس سے آپ بہت پیار کرتی تھیں۔ میرا تمام بچپن اسی حویلی میں گزرا ہے۔ اور آج آپ میرے ساتھ اس طرح بے ہیو کر رہی ہیں۔" بہت حقیقت پسند ہونے کے

"ہماری نیت صاف تھی۔ تمہاری ساری فیملی کو محبت دی۔ رشتوں کو مان دیا لیکن تمہارے ماموں نے بدلے میں ہم پر جو وار کیا اس کا کوئی حساب دے سکتی ہو۔ میری نند کا قصور ہی کیا تھا۔ شادی سے انکار ہی کیا تھا۔ نا کون سے پہاڑ توڑ دیے تھے ارباب پر کہ اس گھٹیا شخص نے اس کی جان لے لی۔" وہ آپے سے باہر ہو گئیں۔

"لیکن اس واقعہ میں ہمارا کیا قصور۔ ہم کیوں بڑوں کے گناہ جھیلیں۔" ایمان ایک دم بول پڑی۔

"تم چپ رہو۔ یہاں دلوں کے زخم رس رہے ہیں اور تمہیں احساس ہی نہیں ہے۔ دوستی رکھنے سے پہلے دیکھتیں تو سہی کہ اگلا ہے کون۔" انہوں نے بیٹی کو بری طرح جھاڑ دیا۔

"آپ کیوں اپنا بی پی بڑھا رہی ہیں بھابھی۔ بچی ہے۔ غلطی ہو گئی۔" چاچی نے زمرد بیگم کو ٹھنڈا کیا۔

"آپ اندر چلیں، میں اسے سمجھاتی ہوں۔" وہ بازو سے پکڑ کر زمرد بیگم کو اندر کی طرف لے چلی۔

"اسے کہو اس لڑکی کو جلدی یہاں سے روانہ کرے۔" وہ جاتے ہوئے بھی کہتی گئیں۔ مضراب نے زخمی نظروں سے ایمان کو دیکھا جو شرمندہ سی دکھائی دے رہی تھیں۔

"اماں ایسی ہیں تو نہیں۔ نہ جانے آج اتنا غصہ کیسے کر گئیں۔ آپی! یقین کریں ہمیں بھی کچھ نہیں کہتیں۔" ایمان نے شرمساری سے کہا۔

"ہاں اب تم کہو گی، بھائی بھی ایسے ہیں تو نہیں۔ نہ جانے اس طرح کیوں بی ہیو کر رہے ہیں۔" مضراب نے اسے گھورا۔

"اماں کچھ بھی کہہ لیں، گھر میں بابا کی مرضی چلتی ہے۔ وہ اگر راضی ہو جائیں تو اماں کچھ نہیں کر سکتیں۔" ایمان نے دھیرے سے کہا۔

"تم سمجھتی ہو جسے تمہاری ماں نے معاف نہیں کیا اسے، تمہارے بابا معافی دے چکے ہوں گے۔"

مضراب نے کہا۔

"ایک کوشش کر لینے میں کوئی حرج نہیں۔ آپ کسی طرح سارنگ بھائی کو ہماری محبت کے متعلق بتا دیں، وہ بابا کو خود ہی راضی کر لیں گے۔"

"ایمان یار! تم عقل سے پیدل ہو۔ تمہارا وہ خونخوار بھائی تمہاری محبت کا سنتے ہی بس تمہارا نکاح عفان کے ساتھ پڑھوا دے گا۔ جو مجھے دیکھ کر خون کے گھونٹ بھرتا ہے۔" مضراب نے اپنا سر پیٹ لیا۔

"ایک بار...... صرف ایک بار آپ ان سے بات کر لیں۔ اللہ کی قسم پھر میں آپ کو کبھی نہیں کہوں گی۔ بھائی مجھے بہت چاہتے ہیں۔ انہیں میری خوشی عزیز ہے۔ آپ بات تو کریں پھر وہ مجھ سے پوچھیں گے تو میں انہیں منا لوں گی۔ پھر آپ کا کام ختم۔ میرا شروع۔ پلیز آپی!" ایمان ہلکی آواز میں التجا کرنے لگی۔

"او کے۔ میں کوشش کرتی ہوں، وہ میری بات سن لے۔" مضراب نے ناچار ہامی بھری تھی۔

☆☆☆

"تم یہاں صرف سونے کے لیے آئے ہو؟" مضراب نے عفان کے اوپر سے کمفرٹ کھینچا۔

"ہاں تو کیا کروں۔ اتنی سردی میں بھنگڑے ڈالوں۔ مما صحیح کہہ رہی تھیں۔ گاؤں کی فضا مجھے راس نہیں۔ جب سے آیا ہوں چھینکیں مار مار کر حشر برا ہو گیا ہے۔" عفان نے سرخ ناک رگڑتے دہائی دی۔

"میں تمہاری اس نام نہاد سسرال کے ہاتھوں زلیل و خوار ہو رہی ہوں اور تم مزے سے بیمار ہو کر پڑے ہو۔" مضراب نے جھنجلا کر کہا۔

"تو کیا کروں جو کرنا ہے، آپ نے ہی کرنا ہے۔ اور بیمار بھی مزے میں نظر آتے ہیں آپ کو۔ کیسی ڈاکٹر ہو۔" وہ زوردار چھینک مار کر بولا۔

"اٹھو ناشتہ کر کے وہ ٹیبلٹس لو جو بتائی ہیں۔ ڈاکٹر کے کہنے پہ عمل کرنا نہیں ہے بس طعنے دینے

ہیں۔ مضراب بھی کسے ہی باہر نکل آئی۔

ایمان نے سویرے سویرے میسج کیا تھا کہ ادا سارنگ لان میں واک کر رہے ہیں۔ یہ بہترین وقت ہے ان سے بات کرنے کا کہ باقی افراد خانہ اس وقت سو رہے ہوتے ہیں۔ سو وہ اس دیوانی لڑکی کی بات مان کر بڑی حویلی جانے کے لیے نکلی پھر کچھ سوچ کر مین گیٹ سے باہر جانے کے بجائے اپنے بچپن والا شارٹ کٹ راستہ اپنایا اور اس درمیانی دروازے کی طرف آئی جو بڑی حویلی سے جڑا ہوا تھا۔ گہرے کتھئی رنگ کا لوہے کا وہ دروازہ اب بہت چھوٹا اور زنگ آلود نظر آرہا تھا۔

''دلوں کی طرح اس میں بھی زنگ لگ گیا ہے۔'' مضراب نے اداسی سے سوچا۔ پھر کنڈی کھولنے کی کوشش کی۔ تھوڑی کوشش کے بعد ہی وہ کھٹاک کی آواز کے ساتھ کھل گئی۔ مضراب نے دروازے کو دھکا دیا تو وہ کھلتا چلا گیا۔ اسے حیرت ہوئی کہ دوسری طرف کوئی تالہ نہیں لگایا گیا تھا۔ وہ کچھ جھجک کر اس کے اندر داخل ہوئی۔ حویلی کے اس طرف اب خاردار جھاڑیاں اگ آئی تھیں۔ وہ ان سے احتیاط سے دامن بچاتی آگے بڑھی۔ کافی چلنے کے بعد وہ اس طرف نکل آئی جہاں کبھی وسیع وعریض صحن ہوا کرتا تھا اب بڑا سا خوب صورت لان اپنی چھب دکھلا رہا تھا۔ سردیوں کی نرم دھوپ سبز گھاس پر اتری ہوئی تھی۔ لان کے چاروں طرف واکنگ ٹریک بنا ہوا تھا۔ اس ٹریک پر بلیک ٹراؤزر شرٹ میں ملبوس سارنگ اسے واکنگ کرتے ہوئے نظر آگیا۔

''او گاڈ۔ یہاں ٹھنڈ ہمارے جسموں میں گھسی جارہی ہے اور یہ موصوف اتنے ہلکے کپڑوں میں واک کر رہے ہیں۔'' مضراب نے سوچا۔ پھر وہ ٹریک پر چڑھ کر بھاگتے ہوئے اس کے پاس آئی۔

''گڈ مارننگ۔'' وہ اس کی آواز پر چونک کر پیچھے مڑا۔

''تم...... کہاں سے آگئیں؟'' سارنگ نے اچنبھے سے پوچھ کر مین گیٹ کی طرف دیکھا جو بند تھا۔

''اپنے بچپن والے شارٹ کٹ سے آئی ہوں۔'' مضراب نے دور اشارہ کیا، سارنگ نے ادھر دیکھا پھر اس دلکش چہرے پر نظر ٹکائی جو رپڈش کلر کی پڈی میں اپنے سنہری بالوں کو اڑنے کی کوشش کر رہی تھی۔

''آج ہوا بھی غضب کی چل رہی ہے۔ ایک بات تو ماننی پڑے گی شہر کے مقابلے میں گاؤں میں زیادہ ٹھنڈ ہوتی ہے۔'' مضراب نے کپکپا کر کہا۔

''ہمم......'' سارنگ نے بہ مشکل نگاہ پھیر کر ٹریک پر چلنا شروع کیا۔

''یہاں کتنا بڑا صحن تھا، کیوں ختم کروا دیا۔ کتنا مزا آتا تھا جب بارش میں نہاتے تھے۔'' مضراب نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے بات کہا۔

''وقت کے ساتھ ہر چیز بدل جاتی ہے۔'' سارنگ نے اپنے موبائل پر انگلیاں چلاتے کہا۔

''میں بھی تو تم سے یہی کہنا چاہتی ہوں کہ وقت کے ساتھ ہر چیز بدل جاتی ہے اور ہر چیز کو بدل جانا چاہیے کہ تغیر ہی زندگی کی علامت ہے۔ کھڑا پانی اور رکا ہوا وقت فقط تعفن ہی پھیلاتے ہیں۔'' مضراب فوراً ہی مطلب کی بات پر آئی تھی۔ سارنگ نے سیل سے توجہ ہٹا کر اسے دیکھا۔

''تم یہاں کیوں آئی ہو مضراب!'' اس نے سنجیدگی سے پوچھا تو وہ گڑبڑا گئی۔

''کیا مطلب؟'' پھر بے نیاز بنی۔

''مطلب یہ کہ اتنے سالوں بعد ایمان کے ذریعہ اس حویلی میں کس مقصد کے تحت داخل ہونا چاہتی ہو۔'' وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا مضراب سے کچھ بھی چھپانا مشکل ہو گیا۔

''ایک مقصد ہے۔ جس میں میرا کوئی نفع نہیں لیکن دو دلوں کو کسی بڑے نقصان سے بچانا ہے۔'' وہ سنجیدگی سے بولی۔

''کون سے دو دل؟'' سارنگ پوری طرح اس

کی طرف متوجہ ہوا۔
"تم روایتی مرد بننے کے بجائے ایک محبت کرنے والے بھائی بن کر سنو تو کہوں۔" مضراب نے اپنی بھوری آنکھیں اس پر جمائیں۔ سارنگ اس کی بات پر چونکا تھا۔
"تم کہو، میں کس طرح بھی سنوں میری مرضی۔" وہ سخت لہجے میں بولا۔
"تمہاری بہن ایمان میرے بھائی کی کلاس فیلو ہے، وہ دونوں ایک دوسرے کو بے پناہ چاہتے ہیں۔ اور شادی کرنا چاہتے ہیں۔" مضراب ایک تواتر سے بول کر خاموش ہوئی۔ سارنگ کے چہرے کے تاثرات ناقابل فہم تھے۔ وہ بالکل خاموش ہو گیا تھا۔
"ایمان کو تم پر بہت اعتماد ہے۔ وہ چاہتی ہے تم اپنے بابا تک اس کی شادی کی بات پہنچاؤ اور......"
"او کے۔ بس ہو گیا پورا تمہارا مقصد۔ پہنچا دی مجھ تک میری بہن کی کارگزاری۔ ناؤ اسٹاپ۔" سارنگ نے اسے ٹوک کر عجیب انداز میں کہا۔
"نہیں سارنگ۔ ابھی تو مجھے تمہاری فیور چاہیے، تم کیا کہتے ہو کھل کر بتاؤ۔" مضراب اس کے رویے سے بے قرار ہوئی۔
"میں تمہیں کیوں بتاؤں، میں ایمان کو بتاؤں گا۔" وہ ماتھے پر بل ڈال کر بولا۔
"وہ تمہیں بہت براڈ مائنڈڈ اور لونگ سمجھتی ہے، اسے تم پر بھروسا ہے کہ تم اسے مایوس نہیں کرو گے۔ اس کا مان نہیں توڑنا پلیز۔" مضراب نے جلدی جلدی کہا، مبادا وہ منظر سے غائب ہو جائے۔ سارنگ اس بات پر خاموش رہا۔
"چھوٹے سائیں! ناشتہ لگ گیا ہے۔ تشریف لائیے۔" اتنے میں ایک ملازم نے آ کر اطلاع دی۔
"بابا سائیں کہاں ہیں؟"
"وہ وہاں آپ کے منتظر بیٹھے ہیں۔" اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا تو مضراب نے دیکھا کچھ دور سارنگ کے بابا میز پر ناشتہ سجائے اس کے منتظر تھے۔ ان کی آنکھیں سارنگ اور مضراب پر ہی جمی تھیں۔
"ادھر آؤ میرے ساتھ۔" سارنگ نے کچھ سوچ کر مضراب سے کہا۔
"مجھے ناشتہ نہیں کرنا۔ ایکسکیوز می۔" مضراب نے واپس جانے کے لیے رخ موڑا۔
"اب کہاں بھاگ رہی ہو، بہادری دکھائی ہے تو پوری دکھاؤ۔ آؤ تمہیں بابا سے ملواؤں۔" سارنگ نے اس کا بازو پکڑ لیا، ناچار اسے اس کے ساتھ چلنا پڑا۔
"واہ سائیں واہ۔ آج کا سورج کہاں سے نکل پڑا ہے بابا۔" سارنگ پٹ سویرے سویرے کسی لڑکی کے ساتھ دکھائی دیے ہیں۔" صادق تالپور نے بڑا سا قہقہہ لگا کر بیٹے کو چھیڑا۔
"بابا! یہ کوئی عام لڑکی نہیں ہے ڈاکٹر مضراب تالپور ہے۔" سارنگ نے کرسی پر بیٹھتے بتایا۔
"ڈاکٹر مضراب تالپور۔" انہوں نے بیٹے کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔
"جی، حسن احمد تالپور کی نواسی مضراب۔" سارنگ نے حوالہ دیا تو ان کے چہرے کے عضلات سکڑ گئے۔
"کیسے ہیں آپ انکل؟" مضراب نے اعتماد سے پوچھا۔
"الحمدللہ۔" وہ کھنکھار کر بولے۔
"یہاں خیر میں دکھائی دے رہی ہے۔" پھر انہوں نے ٹھیٹ سندھی میں سارنگ سے پوچھا۔
"جی، میں بتاؤں گا آپ کو۔" سارنگ نے کہہ کر اپنی پلیٹ میں آملیٹ کا ٹکڑا ڈالا۔
"آپ ناشتہ کرو مضراب! ہم گھر آئے مہمان کو عزت دیتے ہیں۔ چاہے وہ ہمارا دشمن ہی کیوں نہ ہو۔ یہ ہماری روایت ہے۔" صادق تالپور نے ملازم کو اشارہ کیا تو اس نے مضراب کے آگے رکھی پلیٹ میں لوازمات بھر دیے۔
"اچھی روایت تو برسوں پرانی دشمنی کو ہمیشہ

کہا۔ "اور یہ روایت ہمارے دین نے ہمیں سکھائی ہے۔ دشمنی کو نسلوں تک کھینچنے سے سوائے اذیت کے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔" وہ مزید بولی تو سارنگ نے ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر اطمینان سے ناشتہ کرتی مضراب کو دیکھا۔ جو صادق تالپور سے ذرا بھی خائف نہیں تھی۔ صادق تالپور غیر متوقع طور پر جواباً خاموش رہے۔

"ویل۔ تھینک یو انکل اور تھینک یو سنی۔ مجھے ناشتے کی آفر کرنے کے لیے۔ اوکے بائے۔" مضراب نے ناشتہ ختم کر کے اٹھتے ہوئے کہا۔ جہاں سارنگ کو اس کا سنی بلانا شدید ناگوار گزرا وہیں صادق تالپور نے معنی خیز طریقے سے ان دونوں کو دیکھا تھا۔

"ہاں سارنگ اب کھل کر بتاؤ۔ یہ شہزاد کی بیٹی شیر گڑھ کیوں آئی ہے۔ کہیں تم سے تو دل نہیں لگا لیا ہے؟" مضراب کے جاتے ہی صادق تالپور نے کھوجتی نظروں سے اسے دیکھا۔

"کیسی باتیں کر رہے ہیں بابا سائیں!" سارنگ نے پہلو بدلا۔

"اچھا...... تمہیں کتنے پیار سے سنی بلا رہی تھی۔" ان کی بات پر سارنگ نے غصے کا گھونٹ بھرا۔

"بابا سائیں! بات کچھ اور ہے۔" سارنگ نے تذبذب سے کہا۔

"جھجک کیوں رہے ہو بابا! جو بات ہے کھل کر بتاؤ۔" انہوں نے نرمی سے کہا تو سارنگ نے محتاط انداز میں ایمان اور عفان کی بات ان کے گوش گزار کر دی۔ وہ سن کر کتنی ہی دیر خاموش رہے۔ سارنگ ان کے چہرے کے تاثرات کھوجتا رہا۔

"بابا سائیں! ایمان تو بے وقوف ہے۔ اسے کیا معلوم دنیا کا۔ دشمنوں سے دل لگا کر بیٹھی ہے۔ آپ اس کا یونی جانا بند کروا دیں۔ آخری سمسٹر ہیں، وہ پرائیویٹلی دے سکتی ہے۔ بس اب وہ شیر گڑھ میں ہی رہے۔" سارنگ نے دبے لفظوں میں باپ کو

"ہمم......" وہ کتنی ہی دیر گہری سوچ میں غرق رہے۔

"سارنگ پٹ۔" پھر انہوں نے اسے پکارا۔

"جی بابا۔" وہ جی جان سے متوجہ ہوا۔

"بیٹا! مضراب سے کہو کہ وہ اپنے والدین اور بھائی کو یہاں رشتہ ڈالنے بھیج دے۔" ان کی بات تھی یا دھماکا سارنگ پر ہل گیا۔

"یہ کیا کہہ رہے ہیں بابا سائیں! آپ ارباب حسن کے بھانجے کو اپنی بیٹی دیں گے جس نے......" حیرت کے مارے اس کی زبان لڑکھڑا گئی۔

"دل جائے کر پٹ۔ (دل کو سنبھالو بیٹا) میں نے جو کہا ہے بس وہ کرو۔" وہ بارعب انداز میں کہہ کر وہاں سے اٹھے تو سارنگ مزید ایک لفظ ان سے نہ کہہ سکا بس الجھن زدہ نظروں سے انہیں اندر جاتا دیکھنے لگا۔

☆☆☆

"میں نے کہا تھا نا۔ ہمارے جذبے سچے ہیں، دیکھ لیا، کتنی آسانی سے انہوں نے رشتہ بھیجنے کا عندیہ دے دیا۔" عفان نے خوشی سے بے حال ہوتے کہا۔ مضراب نے اسے مسکرا کر دیکھا۔ اسے بھی اتنی جلدی انکل کے مان جانے کی امید نہیں تھی۔

"اب گھر جا کر مما، پاپا کو تم نے منانا ہے اوکے۔ میں نے پہلے ہی یہاں اپنی بہت انرجی ویسٹ کر لی ہے۔" مضراب نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"ان کو منانا تو میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ چلو اب سامان پیک کرو، جلدی شہر کے لیے نکلیں پھر واپس آنا ہے۔" عفان نے وارڈ روب کھول کر کپڑے نکالنے شروع کیے۔

"پھر میں تم لوگوں کے ساتھ نہیں آؤں گی۔ خود ہی رشتہ وشتہ طے کر کے آنا۔" مضراب نے بیگ کی زپ بند کی۔

"تھینک یو سو مچ آپی! آپ نے میرا بڑا مسئلہ حل کر دیا۔" عفان نے مضراب کا ہاتھ تھام کر کہا۔

بھائی۔ تمہارے لیے تو آپی کی جان بھی حاضر ہے۔" مضراب نے اس کا گال تھپتھپایا۔

"بس خیر سے تم دونوں کی شادی ہو تو میں مور تور ٹلے راٹا گانے پر لڈی ڈالوں۔" پھر وہ شرارت سے بولی۔

"نہیں پہلے، آپ کی شادی ہوگی پھر میری۔ میں ابھی صرف منگنی کروں گا۔" عفان نے کچھ سوچ کر کہا۔

"مجھے ابھی شادی نہیں کرنی ڈھیر سارا پڑھنا ہے اور کمیشن کے ایگزام کی تیاری کرنی ہے۔" مضراب نے اطمینان سے کہہ کر پرس اور سیل فون اٹھایا۔

"چلو، اب جلدی نکلیں۔ حیدر آباد پہنچتے تک رات ہو جائے گی۔" پھر اس نے احساس دلایا تو عفان نے بیگ اٹھا کر کندھے پر ڈالا۔

☆☆☆

عفان نے شہر آتے ہی نجمہ کا پیچھا لے لیا۔ نجمہ افتاں و خیزاں اس کی روداد سنتی رہی اور حیران ہوتی رہی۔ حسب توفیق دونوں بہن بھائی کو ملامت بھی کی کہ بنا اصل بات بتائے پہاڑ سر کرنے چلے گئے۔ پھر شہزاد صاحب کی باری آئی اور نجمہ نے شوہر کو پکڑ کر بچوں کی بے وقوفی کے قصے سنائے۔ ان کے نزدیک بڑی حویلی والوں سے رشتہ جوڑنا بے وقوفی ہی تھی۔ ان کے بھائی کے بے رحم طرز عمل کے بعد وہ خود بھی مرک کی تمام فیملی سے شرمندہ تھیں۔ مگر بڑی حویلی والوں کا رویہ اس کے بعد دشمنوں جیسا ہو گیا تھا۔ ارباب کی جیل میں موت کے بعد ان کی ماں بھی چل بسی تھیں۔ تب شہزاد نے گاؤں چھوڑنے کا فیصلہ کیا کیونکہ وہاں اب صرف ان کے لیے پچھتاوے اور لعنت ملامت رہ گئی تھی۔ وہ اپنا گاؤں چھوڑ کر شہر آ بسے اور اپنے تئیں ماضی کا اذیت ناک باب بند کر دیا۔ پر کیا خبر تھی کہ ماضی پھر سے ایمان کی صورت امتحان بن کر سامنے آ کھڑا ہوگا۔ اپنے لاڈلے بیٹے

کچھ پس و پیشت کے بعد وہ شوہر اور بیٹے کے ساتھ شیر گڑھ روانہ ہو گئیں۔

☆☆☆

مضراب ان کے جاتے ہی جی بھر کے سوئی۔ اور سارا دن خوب سو کر تازہ دم ہو کر اٹھی۔ اتنے دن ٹینشن میں گزارے تھے۔ پھر بڑی حویلی کے مکینوں کا سرد رویہ اس کو پریشان کرتا رہا تھا۔ کسی ایک نے بھی تو اس کے ساتھ اچھا برتاؤ نہیں کیا تھا۔ بس نفرت ہی بھری تھی سب کے دلوں میں۔ حتیٰ کہ سنی بھی عجیب مزاج کا ہو گیا تھا۔ اسے سارنگ یاد آیا تو بہت دیر تک وہ خواہ مخواہ اسے سوچتی رہی۔

"خیر، مجھے کیا اب عفان جانے اور اس کی سسرال۔" اس نے کندھے اچکا کر کافی پھینٹنی شروع کی۔ پھر کافی تیار کر کے ٹی وی لاؤنج میں چلی آئی۔ اور صوفہ پر بیٹھ کر ابھی کافی کا ایک گھونٹ ہی بھرا تھا کہ کار کا ہارن بجا۔ اس نے کھڑکی سے جھانکا تو مین گیٹ سے پاپا کی گاڑی اندر داخل ہو رہی تھی۔ وہ فوراً بیرونی دروازے کی طرف بڑھی۔

"السلام علیکم۔" اس نے خوش دلی سے ان تینوں کو سلام کیا۔ جو سست چال سے اندر آ رہے تھے۔

"وعلیکم السلام۔" پاپا نے تھکا ہوا سا جواب دیا۔

"کیا ہوا سب کچھ ٹھیک تو ہے۔" نجمہ کا پھولا منہ دیکھ کر مضراب فکر مند ہوئی۔

"رابی بیٹا! پانی تو پلاؤ۔" پاپا صوفہ پر بیٹھتے ہوئے بولے۔

"جی پاپا۔" وہ فوراً پانی لے آئی۔ مما نے بھی چادر اتار کر ایک طرف رکھی۔

"آپ کو اس طرح خاموش نہیں رہنا تھا شہزاد۔ صاف کہہ دیتے، بیٹی دینی ہے تو دو، اس طرح کی الٹی سیدھی شرطیں مت رکھو۔" نجمہ غصے سے شوہر سے مخاطب ہوئیں۔

مضراب نے بھائی سے سرگوشی کی جو صوفہ پر آنکھیں بند کیے پڑا تھا۔

''میں بھلا کیا کہتا۔ ہمارے خاندان میں یہ سب ہوتا آیا ہے۔ ادلے بدلے کی شادی تو برسوں پرانی روایت ہے۔'' شہزاد صاحب نے ہلکے سے جواب دیا۔

''تو اس روایت کے پیچھے میں اپنی بیٹی دشمنوں کے حوالے کر دوں۔'' نجمہ نے چمک کر کہا۔

''دشمن کے گھر سے بیٹی لے بھی تو رہی ہو نجمہ بیگم!'' شہزاد رسان سے بولے۔

''آپ کا مطلب ہے، میں اپنی پڑھی لکھی ڈاکٹر بیٹی کو بے قدروں میں رول دوں۔'' نجمہ کا بی پی بے قابو ہوا۔ مضراب نے چونک کر انہیں دیکھا۔

''کیا ہوا ہے مما!'' اس نے بے چینی سے پوچھا۔

''ہم گئے تھے اپنے بیٹے کا رشتہ ڈالنے اور صادق بھائی نے تمہیں اپنے بیٹے کے لیے مانگ لیا کہ ہم ادلے بدلے کا رشتہ کریں گے۔'' نجمہ نے غصے سے بتایا۔

''سارنگ کے لیے۔'' مضراب کے لب بے آواز ہلے۔

''ہاں سارنگ کے لیے۔''

''پر میں کیوں بڑی حویلی کی نفرتوں کی آگ میں اپنی بیٹی جھونکوں۔ دفع دور، ایسی بہو مجھے نہیں چاہیے۔'' انہوں نے ہاتھ جھلایا۔

''مما! آپ ایمان کے لیے اس طرح مت کہیں۔'' عفان تڑپ اٹھا۔

''تو اور کیا کہوں۔''

''بیگم! اپنا بلڈ پریشر مت بڑھاؤ۔ ٹھنڈے دل سے سوچو تو سارنگ ایک بہترین لڑکا ہے۔ میں اس کی ذہانت اور رکھ رکھاؤ کا اس ایک ملاقات میں ہی قائل ہو گیا ہوں۔ تمہیں پتا ہے انگلینڈ کی ٹاپ یونیورسٹی کا گریجویٹ ہے، وہاں عام ذہن والوں کو زمین داری۔ باہر رہے یا وطن میں دونوں جگہ اس کے لیے ترقی ہے۔ اس لڑکے کا مستقبل بہت روشن ہے۔'' شہزاد صاحب نے سارنگ کی تعریف کے پل باندھ دیے۔

''وہ جتنا بھی اچھا سہی، بڑی حویلی والوں کا سپوت ہے، آپ سمجھتے کیوں نہیں۔'' نجمہ جھنجلائیں۔

''ایمان بھی بڑی حویلی کی بیٹی ہے۔ وہ جب کھلے دل سے تمہیں اپنی بیٹی دے رہے ہیں تو ہم کیوں انکار کریں۔ تحفظات تو ان کو بھی ہوں گے۔ اور پھر پرانی دشمنیاں پرانی نسل کے ساتھ دفن ہو جائیں گی، نئی نسل ان کو نبھانے والی نہیں ہے۔'' شہزاد پوری طرح سارنگ کے رشتے پر مطمئن نظر آئے۔

''آپ اپنی شہزادی بیٹی سے تو پوچھ لیں۔ جو آگے پڑھنے اور ملازمت کرنے کے خواب دیکھ رہی ہے پھر مجھ سے بات کریں۔'' نجمہ نے لاجواب ہو کر گیند مضراب کے کورٹ میں پھینک دی۔

''ادھر آؤ مضراب بیٹا۔'' شہزاد نے اپنے برابر اس کے لیے جگہ بنائی۔

''آپی پلیز! پاپا کو اس رشتے کے لیے ہاں کہہ دیں۔'' عفان نے اس کا ہاتھ تھام کر التجا کی۔ وہ اٹھ کر پاپا کے پاس آ بیٹھی۔

''رابی بیٹا! اب ساری بات تمہارے سامنے ہے، وہ لوگ ادلے بدلے کا رشتہ کرنا چاہتے ہیں۔ میں اس بات کی مخالفت ضرور کرتا اگر مجھے سارنگ دل سے پسند نہ آ جاتا۔ جیسا داماد میں چاہ سکتا ہوں وہ ایسا ہی ہے۔ ڈیسنٹ، انٹیلی جنٹ اور ہینڈسم۔ باقی زندگی تمہیں گزارنی ہے، جیسا کہو گی ویسا کریں گے۔'' انہوں نے بغور بیٹی کا چہرہ دیکھا جو تذبذب کا شکار تھی۔

''کیا عفان اور ایمان کی شادی کی یہ حتمی شرط ہے۔'' مضراب نے بھائی کی طرف نگاہ کی جو پرامید نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

ہاں۔ [illegible] سانس بھری۔ وہ کہتے ہیں ابھی دونوں کی بات پکی کر کے پہلے سارنگ کی شادی کریں گے اور ایک ڈیڑھ سال بعد ایمان کی۔" ان کی بات پر مضراب چونکی۔

"دونوں کی ایک ساتھ کیوں نہیں۔" اس نے بے چینی سے کہا۔

"کیونکہ تم دونوں بڑے ہو اور اپنی تعلیم مکمل کر چکے ہو، ان دونوں کی تعلیم ابھی ادھوری ہے۔" پاپا کی بات پر وہ خاموش رہ گئی۔

"میں عفان کے لیے اپنی من پسند بہو ڈھونڈ لوں گی، نہیں چاہیے ہمیں بڑی حویلی کی بیٹی۔ نہیں کرنا مجھے یہ رشتہ۔" نجمہ پھر بول پڑیں۔

"مما! ایک بات آپ اچھی طرح سمجھ لیں۔ مجھے شادی تو ایمان سے ہی کرنی ہے بصورت دیگر میں زہر کھا کر مر جاؤں گا۔ اور آپ اچھے سے جانتی ہیں، میں یہ کر سکتا ہوں۔"

عفان ایک دم صوفہ سے اٹھا اور چیخ کر ان کو دھمکی دی۔ کمرے میں موجود ان تینوں نفوس کو جیسے اچانک ہی سانپ سونگھ گیا تھا۔

☆☆☆

رنگ و بو کے ایک سیلاب کو وہ اپنی آنکھوں کے آگے امڈتا ہوا دیکھ رہی تھی۔ چہلیں کرتے ہوئے ہنستے مسکراتے میک اپ سے سجے چہرے اس کے قریب آ کر اسے تہنیت کے پھول اور تحائف پیش کر رہے تھے۔ ملک بھر سے ہائی فائی لوگوں کی کریم اس بینکوئٹ میں آ کر جمع ہو گئی تھی۔

"مضراب بھابھی۔ الرٹ ہو کر بیٹھ جائیں، سارنگ بھائی آ رہے ہیں۔" ایمان تھوڑا جھک کر اس کا ٹیکا سیٹ کرنے لگی۔ مضراب کا دل خوامخواہ دھڑکا۔

آف وائٹ کرتا شلوار میں ملبوس سر پر بلوچی کلاہ پہنے وہ شہزادوں کی آن بان سے اسٹیج پر آیا اور مضراب کے برابر میں آ کر بیٹھ گیا۔ کافی پنک اور ڈل گولڈن لہنگے میں دلہناپے کے روپ میں سجی مضراب آج عام دنوں سے بڑھ کر حسین لگ رہی تھی۔ رجا نے حسد سے پہلو بدلا۔

"سارنگ ادا! آپ اپنے شوز ہٹائیے، بھابھی کے لہنگے پر آ گئے ہیں۔" ایمان نے توجہ دلائی تو سارنگ نے نیچے دیکھا اس کا جوتا واقعی مضراب کے پھیلے ہوئے لہنگے پر رکھا تھا۔

"اس صوفہ پر تو تمہاری بھابھی اپنے لہنگے سمیت پوری آ گئی ہیں، مجھے بٹھانے کی کیا ضرورت تھی۔" اس نے پیر ہٹاتے ہوئے معمول کے لہجے میں کہا۔

"شادی کے بعد تو آپ کو اتنی ہی جگہ ملنی ہے جیجا جی! کیونکہ ہماری مضراب آ گئی ہے اور چھا گئی ہے۔" پاس کھڑی طوبیٰ نے شرارت سے کہا تھا۔

"مری کوٹ کی ملاقات اب کے بعد آپ مضراب کو ہمیشہ کے لیے کیسے مل گئے۔ ہمیں تو پھر کہیں دکھائی نہ دیے۔" رجا نے سارنگ کی بے پناہ وجاہت کو حسرت سے دیکھ کر کہا تھا۔

"آپ بھی مجھے ڈھونڈتی ہوئی اگر میری حویلی تک آ جاتیں تو ہو سکتا ہے۔ میں آپ کو مل جاتا۔" سارنگ نے ذو معنی انداز میں کہا تو رجا کا منہ کھلا۔

"مضراب! تم انہیں سرچ کر کے ان کی حویلی جا پہنچیں۔ بہت گھنی میسنی ہو، ہمیں بتایا ہی نہیں۔" رجا نے دلہن بنی مضراب کو اونچی آواز سے سنایا تو مضراب اپنی جگہ کٹ کر رہ گئی۔ سارنگ اپنی بات سے اسے اپنا دیوانہ ثابت کر رہا تھا۔

"ویسے جیجا جی! آج آپ بہت پراؤڈ نظر آ رہے ہیں۔ ہماری باربی ڈول جیسی فرینڈ لے اڑے، اس وجہ سے تو مغرور نہیں ہو گئے۔" طوبیٰ نے اپنی سہیلی کا پندار سنبھالا۔ وہ مضراب کے اندرونی معاملات سے آگاہ تھی۔

"میں ہمیشہ سے ایسا ہی رہا ہوں۔" سارنگ نے بے نیازی دکھائی۔

"چلیں، آپ دونوں کیک کاٹیے۔ نئی زندگی کی میٹھی شروعات کریں۔" ماہم نے پنک کلر کا خوب صورت سا کیک جس پر ہیپی میرج لکھا تھا، میز پر رکھ

دیا اور مضراب کے ہاتھ میں چھری تھمائی۔
"جیجا جی! اپنی دلہن کا ہاتھ پکڑیے اور چھری کیک پر پھیریے۔" اس نے اصرار کیا تو سارنگ نے مضراب کا نازک ہاتھ تھام کر کیک کاٹا۔
"اب یہ کیک پیس لیجیے اور اپنی دلہن کو کھلائیے۔" ماہم نے ایک ٹکڑا کاٹ کر اسے دیا۔ سارنگ نے کیک پیس مضراب کی طرف بڑھایا تو پہلی بار اس کے ہوش ربا حسن پر نظر پڑی۔ وہ مبہوت رہ گیا۔
"کھلائیے نا۔" ماہم کی آواز پر وہ چونکا پھر مضراب کے ذرا سے کھلے منہ میں پورا کیک پیس ڈال دیا۔
"اف جیجا جی! اس کی لپ اسٹک خراب کردی۔" آدھا مضراب نے آپ کو کھلانا تھا۔ ماہم نے فوراً ٹشو لے کر نزاکت سے اس کے ہونٹ صاف کیے۔
"پلیز آپ دونوں کیمرہ کو دیکھیے اور اسمائل کیجیے۔" کیمرہ مین نے اپنی موجودگی کا احساس دلایا تو سب اس طرف متوجہ ہوئے۔

☆☆☆

آج پندرہ سال بعد وہ اسی حویلی میں دوبارہ موجود تھی۔ جس کی طرف بچپن میں بار بار کھنچی چلی آتی تھی۔ مما کی ڈانٹ کھانے کے باوجود اسے اس حویلی اور اس کے مکینوں سے پیار تھا بالخصوص نرم لہجے والی تاج نانی اور پریوں جیسے حسن کی مالک مرک آنٹی اپنی ہم عمر امن اور نک چڑھے سارنگ سے وہ خصوصی لگاؤ رکھتی تھی۔
مرک کی شادی کے دنوں میں وہ سارنگ کی بہت اچھی دوست اور ہمدرد بن گئی تھی۔ دس سال کی عمر میں وہ اسے کسی بڑے کی طرح تسلی دلاسے دیتی تھی۔ اور وہ بہل بھی جاتا تھا۔ پھر وہ سیاہ ترین دن طلوع ہوا جب الفت، محبت، دوستی سب کچھ دھواں بن کر کہیں اڑ گیا۔ مرک کے مردہ وجود سے ابلتے گاڑھے خون کی ایک جھلک دیکھ کر وہ ہوش سے بیگانہ ہوگئی تھی۔ بے ہوش ہونے سے چند لمحے قبل اس نے سارنگ کا سفید اور ساکت چہرہ دیکھا تھا۔ پھر چند ماہ بعد جب وہ لوگ ہمیشہ کے لیے گاؤں چھوڑ کر جا رہے تھے۔ وہ بڑی حویلی کے گیٹ پر کھڑا ہوا تھا۔
مضراب نے اپنی گاڑی میں بیٹھتے اس کا چہرہ دیکھا جو ان لوگوں کو دیکھ کر سرخ ہوگیا تھا۔ مضراب خود بھی سہمی ہوئی تھی۔ اس کے ماموں کی قبیح حرکت کو لے کر ان دنوں جتنی باتیں ہوئی تھیں، وہ اس سے ڈھکی چھپی تو نہیں تھیں۔
اس نے سر جھٹک کر ماضی سے چھٹکارا حاصل کیا اور کمرے کی آرائش دیکھنے لگی جو بیش قیمت فرنیچر سے آراستہ تھا لیکن شب عروسی کے لحاظ سے بہت سادہ نظر آرہا تھا۔ ایئر فریشنر کی بھینی بھینی مہک البتہ سانسوں کو مہکا رہی تھی۔ اس نے بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائی۔ اور کلاک پر نظر کی رات کے تین بج رہے تھے۔ اتنی دیر سے ادھر بیٹھے ہوئے وہ صرف اپنا گزرا کل ہی سوچ رہی تھی۔
اب حال کو سوچا تو تھکن کا شدید احساس جاگا۔ سوائے ایمان کے حویلی میں اس کی آمد پر کوئی خوش نہ ہوا تھا۔ پر اب یہ گمان ہو رہا تھا وہ جس کے نکاح میں آئی ہے وہ بھی خوش نہیں ہے۔ تب ہی ابھی تک کمرے سے غیر حاضر تھا۔ مضراب کا دل برا ہونے لگا۔ وہ تھک کر چینج کرنے کے لیے اٹھی کہ دروازہ کھول کر سارنگ اندر آیا۔ مضراب دوبارہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ وہ بیڈ پر اس کے پاس آکر بیٹھا۔ اور بغور اسے دیکھنے لگا۔ کافی دیر گزر گئی۔ مضراب نے جھکی نظریں اٹھائیں وہ محویت سے اسے دیکھ رہا تھا۔
"سنی! کچھ تو کہو۔" وہ بدبدائی کہ کمر تھکن سے دوہری ہو رہی تھی۔
"کچھ کہہ رہی ہو رابی۔" اس کے ہونٹوں کی جنبش پر وہ قریب جھکا۔ اس کے منہ سے عجیب سی بو آئی تھی۔ مضراب نے بری طرح چونک کر اسے

دیکھا۔ سارنگ کی آنکھوں کے ڈورے سرخ ہو رہے تھے۔

"آپ کی آنکھیں لال کیوں ہو رہی ہیں سارنگ!"

"ہاں۔ وہ تھوڑی سی ڈرنک کرلی ہے۔ زیادہ نہیں بس تھوڑی سی۔" سارنگ نے کچھ اور پاس آکر کہا۔ مضراب کا دل دھک سے رہ گیا۔

"کک...... کیوں ڈرنک کی؟" اس نے لرز کر پوچھا۔

"تمہاری قربت میں بیٹھنے کے لیے۔ ہوش میں تمہیں کیسے برداشت کرتا۔" اس کی بات نے مضراب کے اندر چھید سے کر دیے۔

"میں تمہیں اتنی بری لگتی ہوں؟" اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

"شاید ہاں۔ شاید نہیں۔" اس نے مضراب کی گود میں سر رکھ دیا۔ مضراب کو کرنٹ سا لگا۔

"تم بہت خوب صورت لگ رہی ہو رانی۔" پھر اس نے مضراب کے گال کو چھوا تو اس کے اشک بہہ نکلے۔

"کیا فائدہ ایسی خوب صورتی کا۔" اس نے دکھ سے سوچا۔

"مجھ پر آنسوؤں کی بارش تو مت کرو۔" سارنگ کے چہرے پر دو تین قطرے گرے تو وہ ہنسنے لگا۔ وہ واقعی بہکا ہوا تھا۔

مضراب نے گھبرا کر اسے پرے سرکایا۔ سارنگ کی باتیں اور اس کی حالت اسے رلا رہی تھی۔

"ابھی سے تھک گئی ہو۔ ابھی تو سفر کی شروعات ہے رانی۔" وہ اس کے مہندی سے سجے ہاتھ لبوں سے لگاتے ہوئے بولا۔

"ابھی مجھے ڈھیر سارا پیار تو کرنے دو، بعد میں تھکتی رہنا۔"

اس نے مضراب کی گردن میں بازو حمائل کرتے سرگوشی میں کہا تھا۔

☆☆☆

صبح اس کی آنکھ دستک کی آواز پر کھلی۔ اس نے دروازہ کھولا تو ایمان مسکراتی ہوئی سامنے کھڑی تھی۔

"گڈ مارننگ مضراب بھابھی۔ دس بج گئے ہیں، آپ کا ناشتہ بھی آگیا ہے چھوٹی حویلی سے۔"

"دس بج گئے۔" مضراب نے اپنی آنکھیں مسلیں۔

"جی ہاں اور مرغ کی بانگ کے ساتھ اٹھنے والے ہمارے سارنگ بھائی بھی ابھی تک سو رہے ہیں۔" ایمان نے کھلکھلا کر پوچھا تو جواباً مضراب زبردستی مسکرائی۔

"اوکے، آپ فریش ہو جائیں تو ناشتہ بھجواتی ہوں۔" وہ واپس چلی گئی۔ مضراب دروازہ بند کر کے مڑی تو سارنگ ابھی تک سو رہا تھا۔ وہ واش روم میں چلی گئی۔

کچھ دیر بعد واپس نکلی تو سارنگ بیڈ پر بیٹھا ہوا تھا۔ اسے نکلتے دیکھا تو بکھرے بالوں میں ہاتھ پھیرتا واش روم چلا گیا۔ مضراب نے بالوں میں برش پھیر کر ہونٹوں پر میٹ گلوس لگایا۔ پھر آئینے میں اپنے آپ کو بغور دیکھا۔ وہ ایک ہی رات میں خود کو بہت بدلی ہوئی نظر آئی۔ سارنگ نہا دھو کر باہر نکلا تو وہ آئینے سے ہٹ کر بیڈ پر پڑا کمبل تہہ کرنے لگی۔ وہ خود پر پرفیوم چھڑکتے اسے دیکھ رہا تھا جو بے نیازی سے بیڈ شیٹ درست کر رہی تھی۔ اتنے میں دستک دے کر ایمان ملازمہ کے ساتھ ناشتہ لیے اندر آئی۔

"ارے بھابھی! آپ ہٹیں۔ صفائی وغیرہ ہو جائے گی، آپ ناشتہ کریں۔" اس نے مضراب کا ہاتھ پکڑا تھا۔

"میں جانتی ہوں، بس عادت ہے۔" وہ صوفہ پر بیٹھتے ہوئے معمول کے لہجے میں بولی۔

"سارنگ بھا! آپ کہاں جا رہے ہیں؟ بھابھی کے ساتھ ناشتہ کریں نا۔" ایمان نے سارنگ کو دروازے کی طرف بڑھتے دیکھ کر کہا۔

"تم اپنی بھابھی کے ساتھ ناشتہ کرو ایمان۔ میں یہاں بیٹھا تو مجھے بدہضمی ہو جائے گی۔" وہ کہہ کر

باہر نکل گیا۔

ایمان نے الجھی نظریں مضراب پر ٹکا دیں۔ مضراب نے نگاہ چرا کر بوائل انڈہ پلیٹ میں رکھا۔ پھر ابھی ناشتہ کیا ہی تھا کہ نجمہ چلی آئیں۔ ماں کو دیکھ کر وہ بے اختیار ان کے گلے لگ گئی۔

"کیسی ہو؟" انہوں نے بیٹی کو بغور دیکھا۔ مضراب جواباً مسکرا دی۔

"زیور کیوں نہیں پہنا۔ میک اپ بھی نہیں کیا۔ کل ہی شادی ہوئی ہے۔" انہوں نے اس کی سادگی کو ناپسندیدہ نظروں سے دیکھا۔

"جی مما۔" مضراب نے فقط اتنا کہا۔

"ایمان! تمہاری امی اور چاچی کو نئی دلہن کے کمرے میں آتے شرم آتی ہے کیا۔ سب رکھ رکھاؤ تمہارے ہی کندھے پر ڈال دیا ہے۔" نجمہ نے ایمان کو آڑے ہاتھوں لیا تو وہ گھبرا گئی۔

"نہیں آنٹی! ایسی بات نہیں۔"

"مما! آپ جانتی تو ہیں، مجھے یہاں ویسی محبت نہیں ملنی۔"

"پھر بھی ایمان کو کہہ رہی ہیں۔" مضراب ایمان کا اترا چہرہ دیکھ کر ماں سے بولی۔

"لو میں کب کہہ رہی تمہارے واری صدقے جائیں مگر دنیاداری بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔" وہ چمک کر بولیں۔ ایمان شرمندہ ہو کر باہر چلی گئی۔

"مما! اس میں ایمان کا کیا قصور۔ آپ اسے کیوں سنا رہی تھیں۔"

"کیوں نہ کہوں۔ ادلے بدلے کا رشتہ ہے۔ میری بیٹی سے جیسا رویہ رکھیں گی۔ میں بھی ایمان کے ساتھ ویسا ہی کروں گی۔" ان کی بات پر مضراب نے افسوس سے انہیں دیکھا۔

"مما پلیز۔ آپ تو ان خواتین جیسی نہ بنیں۔"

"دل جل رہا ہے میرا۔ ہمیں کوئی عزت ہی نہیں دی۔ بس سوکھا ہاتھ دیا اور نوکروں کے حوالے کر کے چلی گئیں۔"

"مما! عفان کہاں ہے اور پپا۔ مجھے ملنا ہے۔"

"وہ نیچے بیٹھے ہیں۔ تمہارے سسر تو موجود نہیں، سارنگ بیٹھا ہے بس ان کے ساتھ۔" انہوں نے بتایا تو مضراب کو خوشگوار حیرت ہوئی۔

"چلیں، پپا سے مل آؤں۔"

وہ ان کے ساتھ نیچے مردانہ بیٹھک میں آئی۔ جہاں پپا اور عفان کے ساتھ سارنگ بھی بیٹھا تھا۔ ان کو آتے دیکھا تو ایکسکیوز کر کے باہر چلا گیا۔

"کیسی ہو رابی؟" پپا نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

"اچھی ہوں۔" مضراب نے ضبط سے کہا۔ عفان نے بہن کے کندھے پر بازو پھیلایا۔ مضراب کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

"اب ہم نکلتے ہیں رابی۔ خوش رہو اور دبنا کسی سے نہیں، ٹھیک ہے؟" نجمہ نے اس کی پیشانی چوم کر کہا۔

"اتنی جلدی جا رہے ہیں آپ لوگ۔ آج تو ولیمہ ہے۔" مضراب بے چین ہوئی۔

"کیا کریں ایسے ویسے کو۔ بس مردوں کو انوائٹ کیا ہے۔ یہ دونوں دعوت میں چلے جائیں گے۔ میں اکیلی حویلی میں رہ کر کیا بین بجاؤں گی۔" نجمہ نے اس انداز سے کہا کہ ان تینوں کو ہنسی آ گئی۔

"مما! آپ بھی بس۔" عفان نے بہ مشکل ان کی گھوری پر ہنسنا بند کیا۔

"تو غلط کہہ رہی ہوں میں۔ ویسے ہی ہماری حویلی سالوں سے بند پڑی ہے۔ مجھے تو شام ہوتے ہی خوف آتا ہے۔ خیر گاؤں کی سردی نے تمہارے پپا کی کمر ہی جکڑ لی ہے، گھر جا کر بس آرام کریں گے۔" انہوں نے کہا تو مضراب نے ناچار سر ہلایا۔

"او کے، اللہ حافظ۔"

ان لوگوں کو بھرے دل سے رخصت کر کے وہ اوپر اپنے کمرے میں آ گئی۔ یہاں ایمان صفائی کروا کر اس کی منتظر بیٹھی تھی۔

"چلے گئے آنٹی لوگ۔" اس نے بے تابی سے پوچھا۔

ہاں چپے تھے۔ تمہارے سسرالی۔“ مضراب نے اسے چھیڑا تو وہ جھینپ گئی۔ پھر ایمان کے ساتھ اس نے ڈھیروں باتیں کیں۔ ایمان نے اسے اچھا سا تیار کر دیا تھا۔

دوپہر کے بعد گاؤں کی خواتین کا آنا جانا اس کے کمرے میں رہا جو نئی کنوار کو دیکھنے آ رہی تھیں۔ اس دوران زمرد بھی آ کر ادھر بیٹھ گئی دل میں کچھ بھی سہی۔ اکلوتے بیٹے کی شادی کی تھی سو دنیا کے آگے خوشی دکھانا تھی۔

ولیمہ میں مردوں کی گیدرنگ تھی۔ سو سرِ شام سارنگ تیار ہو کر چلا گیا تھا۔ وہ رات کا کھانا کھا کر چینج کر کے اپنے بستر پر لیٹ گئی۔ کافی دیر کروٹیں بدلتی رہی لیکن نیند آ کر نہ دی۔ گزری رات اور سارنگ کا رویہ یاد کر کر کے کڑھتی رہی۔ میں اگر اتنی ہی ناپسندیدہ تھی تو شادی کیوں کی۔ پینے کی بری لت پہلے سے لگی ہوئی ہوگی اور الزام میری قربت پر لگا دیا۔ اس نے سلگ کر سوچا۔

”پاپا! آپ نے سارنگ کو کتنا اچھا سمجھا اور وہ کیسا نکلا۔“ اسے رونا آنے لگا۔

”تم بھی تو اس کی محبت میں مبتلا ہو۔“ دل نے چپکے سے اعتراف کیا۔

”میں نے عفان کی جذباتیت سے ڈر کر شادی کی ہامی بھری تا کہ وہ انتہائی قدم اٹھانے سے بچ جائے۔“ مضراب نے کمزور دلیل پیش کی۔

”وہ تمہارے لاشعور سے کبھی نکلا ہی نہیں۔ خوابوں میں بھی اسے سوچتی رہی ہو۔“ دل نے ہار نہ مانی۔ مضراب نے سر جھٹک کر سونے کی کوشش کی۔ دروازہ کھلنے کی آواز پر وہ سمجھ گئی سارنگ آیا ہے۔ وہ سیدھا واش روم میں گیا پھر چینج کر کے باہر نکلا۔ مضراب بظاہر سوتی بن کر اس کی آہٹیں محسوس کر رہی تھی۔ وہ اس کے برابر میں آ کر لیٹ گیا تھا۔ پھر اس نے مضراب کی طرف کروٹ لی۔

”میں جانتا ہوں، تم جاگ رہی ہو۔“ وہ ہموار لہجے میں بولا تو مضراب نے اپنی آنکھیں کھولیں۔

سارنگ اس کے بہت قریب تھا، اس نے غور سے دیکھا وہ آج نارمل لگا۔

”کیا دیکھ رہی ہو؟“ سارنگ کے سوال پر وہ خاموش رہی۔

”آج میں نے تمہیں برداشت کے لیے کسی نشے کا سہارا نہیں لیا رابی۔“ اس نے سرگوشی میں کہا تو مضراب کا دل خوش کن انداز میں دھڑکا۔ ”آج میں تمہیں ہوش و حواس میں رہ کر برداشت کروں گا۔“ اس کی اگلی بات پر مضراب کی خوش فہمی ہوا ہوئی۔

”مجھے برداشت کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ میں جا کر صوفہ پر سو جاؤں گی۔“ وہ مچل کر اس کی گرفت سے نکلی۔

”کہیں بھی سو جاؤ، رہو گی تو اسی کمرے میں۔“

”مجھ سے محبت کرو یا نفرت۔“ مضراب نے بھیگے لہجے میں کہا۔

”دونوں ایک وقت میں ایک ساتھ کر تو رہا ہوں۔ محبت بھی اور نفرت بھی۔“ وہ تلخی سے مسکرایا تھا۔

☆☆☆

آنے والا ہر نیا لمحہ دوسرے لمحہ کے آتے ہی پرانا ہو جاتا ہے۔ وقت بہت دیانت داری سے اپنے دامن میں جمع ہونے والا آج آنے والے کل کے لیے جھٹک کر پیچھے پھینک دیتا ہے۔ بھلا وقت سے بڑا سخی اور بے نیاز بھی کوئی ہوگا۔ مضراب نے سوچا اور سر جھٹک دیا۔ اسے اس حویلی میں بیاہ کر آئے دوسرا مہینہ تھا مگر حویلی کے مکینوں کا اس کے ساتھ برتاؤ پہلے دن جیسا تھا۔ جہاں زمرد اسے کسی کھاتے میں نہیں رکھتی تھیں، وہیں موبل چاچی اور ان کی بہو بھی حد درجہ بے نیازی برتتی تھیں۔ بچے البتہ اس سے مانوس ہو گئے تھے مگر دادی اور ماں سے ڈر کر کم ہی اس کے پاس آتے۔ باقی ایک ایمان اس کی ہمدرد تھی وہ بھی واپس یونی چلی گئی تھی۔ اس کی ذات کی وجہ سے مضراب کو کچھ ڈھارس رہتی تھی ورنہ حویلی کی تو دیواریں بھی اس کا منہ چڑاتی تھیں۔

کے نا قابلِ فہم رویے اور اندازِ تغافل پر۔ چند دن اس کے ساتھ گزار کر وہ اپنی الیکشن کمپین میں لگ گیا تھا۔ اچانک ہی اس کا رجحان سیاست کی طرف بڑھ گیا تھا۔ دن رات حویلی سے باہر گزارتا۔ مضراب سب کے عجیب رویے سہتی زود رنج سی ہو جاتی۔ کبھی زیادہ گھبراتی تو مرک آنٹی کی قبر پر چلی آتی۔ وہاں اسے سکون ملتا تھا۔

ہالار جو مجذوب بابا کے نام سے مشہور تھا اس کے پاس بیٹھ کر وہ ماضی کی باتیں یوں کرتی جیسے اسے سب یاد ہو۔ وہ بھی مضراب کو اتنی توجہ سے سنتا کہ گمان ہوتا، وہ سب سمجھ رہا ہے۔ ہالار کی کڑیل جوانی اسے یاد تھی۔ اب اس ناگفتہ حالت میں اسے دیکھ کر مضراب کو افسوس ہوتا تھا۔

ان ہی بیزار کن دنوں میں اسے اپنے ماں بننے کی خوش خبری ملی۔ ایک سرخوشی کی کیفیت اس کے اندر جاگی تھی۔ اس نے بہت مسرت سے سارنگ کو یہ خوش خبری سنائی لیکن سارنگ نے اس خبر پر کسی خاص خوشی کا اظہار نہ کیا۔ وہ بجھ کر رہ گئی۔ اپنا گھر، اپنا فیوچر سب کچھ چھوڑ کر جس کے نکاح میں آئی تھی۔ اسے مضراب کی کسی بات میں دلچسپی ہی نہ تھی۔

☆☆☆

سارنگ الیکشن جیت گیا تھا۔ اس کے خوشی کے جشن اور دعوتیں ہی ختم نہ ہو رہی تھیں۔ وہ پہلے ہی طبیعت خرابی کی وجہ سے اکتائی رہتی۔ اب چڑچڑی بھی رہنے لگی تھی۔

"میں اسلام آباد شفٹ ہو رہا ہوں۔" ایک رات اپنے کپڑے وارڈ روب سے نکالتے سارنگ نے اطلاع دی۔

"کیوں؟" مضراب جو اپنا کھایا پیا الٹ کر نڈھال سی لیٹی تھی۔ ایک دم سیدھی ہوئی۔

"کیوں کا کیا مطلب۔ ایم پی اے بن کر ادھر بیٹھا رہوں۔" وہ مصروف انداز سے بولا۔

"آپ اب مستقل وہاں رہیں گے؟" اسے یوں دیکھا جیسے دیوانے کو دیکھا جائے۔

"ظاہر ہے۔"

"مجھے بھی آپ کے ساتھ چلنا ہے۔" وہ فوراً بولی۔

"نہیں، تم یہیں رہو۔" سارنگ نے بیگ کی زپ بند کی۔

"یہاں رہ کر کیا کروں؟" وہ چڑ گئی۔

"تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں۔ ادھر اکیلے گھر میں کیا کرو گی۔ میں تو اپنی مصروفیات میں بزی رہوں گا۔"

"وہاں اکیلے گھر کے خاموش در و دیوار کے ساتھ میں یہ سوچ کر صبر سے گزارا کر لوں گی کہ ان کی زبان نہیں۔ یہ بھی خاموش ہیں لیکن یہاں جیتے جاگتے صاحبِ زبان لوگ بھی مجھ سے نہیں بولتے۔ ادھر میں کیسے گزارا کروں۔" وہ چیخ کر بولی۔

"میں تمہیں ادھر ہی رکھنا چاہتا ہوں۔ آئی سمجھ۔" سارنگ نے سرد لہجے میں کہا۔

"کیوں میں نے حویلی سے نکاح کیا ہے۔ جو اس کے ساتھ بندھی رہوں۔" مضراب تلخ ہوئی۔ سارنگ بے نیازی سے کمرے سے نکل گیا۔ وہ کڑھنے لگی۔

☆☆☆

دن اور زیادہ پھیکے اور بے رنگ ہو گئے تھے۔ سارنگ کی موجودگی سے جو تھوڑی بہت تسلی تھی، وہ بھی رخصت ہوئی۔ وہ ایمان کو فون کر کے اس سے اپنے دل کا احوال کہہ لیتی تھی۔ نجمہ سے تو کچھ بھی کہنا ان کے غضب کو دعوت دینا تھا، ان کو جب سے سارنگ کی اسلام آباد رہائش کا معلوم ہوا تھا۔ وہ مضراب کے سر ہو گئی تھیں کہ وہ بھی شوہر کے ساتھ جا کر رہے۔ مضراب کیسے بتاتی کہ سارنگ اسے وہاں رکھنا ہی نہیں چاہتا۔ وہ بہانے گھڑتی رہتی تھی مگر وہ بچی نہیں تھیں۔ سب سمجھتی تھیں۔ اور اس کی طرح کڑھنے کے بجائے اونچی آواز میں اپنا غصہ بیٹی پر ہی

"میرے ہاتھ بس عفان کی شادی تک بندھے ہوئے ہیں پھر دیکھنا میں اس زمرد کو کیسا مزہ چکھاتی ہوں۔ میری پڑھی لکھی بیٹی کو گوٹھ میں باندھ رکھا ہے جیسے وہ کوئی ڈھور ڈنگر ہو۔ اور وہ ماں کا چمچہ، زمرد کے کہنے پر تمہیں اس حال میں ڈپریس کر رہا ہے۔ ظالم کی اپنی اولاد ہی تمہاری کوکھ میں پل رہی ہے کوئی پرایا بچہ تو نہیں جو ماں کو تنگ کر کے اسے بھی مارنا چاہتا ہے۔"

وہ چیخیں تو مضراب اپنا سیل بند کر دیتی۔ اس کے اعصاب ان دنوں ویسے ہی کمزور ہو رہے تھے۔ ایسی حالت میں جب پل پل اس کی کیفیات بدل رہی تھیں نہ کوئی ہمدردی کرنے والا تھا نہ ناز اٹھانے والا۔ اسے کھانے میں کچھ بھی ہضم نہیں ہوتا تو سارا دن خالی پیٹ ہی پڑی رہتی تھی۔ حالانکہ ڈاکٹر ہونے کے ناتے وہ جانتی تھی یہ کتنا خطرناک ہو سکتا ہے لیکن وہ پھر بھی بھوکی رہتی۔ کچھ ایسی ہی بددلی اس پر طاری تھی۔

سارنگ بھی گاؤں کا چکر ہی نہ لگاتا بس اسلام آباد کا ہو کر رہ گیا تھا۔ فون کرتا نہ ہی اس کا فون اٹھاتا۔

"نہ جانے کس جنم کے بدلے لے رہا ہے مجھ سے۔" وہ کڑھ کے سوچتی۔

وہ پورے دنوں سے تھی جب اچانک بچے نے حرکت کرنا بند کر دیا۔ مضراب بے چین ہو گئی۔ ڈاکٹر سے بات کی تو اس نے فوراً ہاسپٹل ایڈمٹ ہونے کا مشورہ دیا۔ مضراب نے زمرد کو بتایا تو انہوں نے بے نیازی سے حویلی کی دو ملازمائیں ساتھ کر دیں کہ ان کے ساتھ اسپتال چلی جاؤ۔ وہ آنسو پیتی گاڑی میں آ بیٹھی۔ قریبی شہر کے بڑے پرائیویٹ اسپتال میں اس کا نام لکھوایا گیا تھا۔ ڈاکٹر نے فوری آپریشن کا مشورہ دیا کہ بچے کے دل کی دھڑکن بہت کم تھی۔

اس وقت مضراب کو لگا کہ جیسے اس کا دل دھڑکنا بند ہو گیا ہو۔ وہ رو رو کر اللہ سے بچے سلامتی [illegible] اس نے سارنگ کو موبائل پر پیغام چھوڑ دیا کہ وہ ہاسپٹل میں ہے۔ فارم پر بھی اس نے بھری آنکھوں سے خود ہی دستخط کیے۔ متوقع موت آپ کے کسی ہمدرد کے آپریشن تھیٹر سے باہر کھڑے ہونے سے نہیں رکتی۔ لیکن بس ایک اطمینان ہوتا ہے کہ کوئی ہے جو ہمارے لیے بھی پریشان ہے، دعا کر رہا ہے۔ اور مضراب کو یہ اطمینان بھی حاصل نہ تھا۔ وہ خود ہی خود کو کسی ہمدرد کی طرح تسلی دیتی۔ اور دعا کر رہی تھی۔ اگر ماں کو بتاتی تو وہ ادھر آ کر پورا اسپتال سر پر اٹھا لیتیں کہ سارنگ یا سسرالیوں میں سے کوئی اس کے ساتھ کیوں نہیں۔

ذہنی اور جسمانی اذیت سے گزر کر شام کے چھ بجے اس نے ایک بے حد خوب صورت مگر کمزور سی بچی کو جنم دیا۔ جس کی پیدائش پر اس کے ساتھ نہ کوئی خوش ہونے والا تھا نہ ہی اس کا صدقہ اتارنے والا۔ اسپتال کا اسٹاف مستعد تھا اور ڈاکٹرز ماہر اور مہربان مگر یہ سارنگ کا نعم البدل نہیں بن سکتے تھے۔ حویلی کی ملازمائیں ہی اس کے ساتھ ایک رات اسپتال میں رہیں۔ ان کے خاص ملازم نے آ کر اسپتال کے ڈیوز کلیر کیے۔ اور وہ اپنی بچی اٹھائے چپ چاپ حویلی واپس آ گئی۔

☆☆☆

بچے کے ساتھ بہلنا کسے کہتے ہیں، اسے اب سمجھ میں آیا تھا۔ ننھی پریسہ اسے ہر دم مصروف رکھتی۔ ساری رات اس کے ساتھ جاگ کر مضراب کو دن میں تارے نظر آتے۔ حالانکہ ملازمائیں اس کا ہاتھ بٹانے کو ہر وقت موجود رہتیں پر وہ اپنی بچی کے سارے کام خود کرتی۔ اس کا جلنا کڑھنا بہت حد تک ختم ہو گیا تھا۔

بھابھی کے بچے ننھی پریسہ کی کشش میں مضراب کے کمرے میں دوڑے آتے۔ زمرد اور موہل چاچی ایک آدھ بار بچی دیکھ کر گئی تھیں پھر زمرد ملازمہ کے ہاتھ روز صبح بچی کو اپنے پاس بلواتیں اور مالش کر کے نہلا کر کپڑے وغیرہ پہنا کر واپس

تھی۔ پوتی کے لیے مختلف ضرورت کا سامان منگوا کر کمرے میں رکھوا دیا تھا۔ مضراب اس تبدیلی پر شاد ہوئی کہ پتھر میں جونک تو لگی۔ بس اسی کو اپنی بچی اور مضراب کی پروا نہیں تھی جسے دراصل کرنی چاہیے تھی۔ وہ سوگواری سے سوچتی اور اداس ہو جاتی۔ اس رات حسب عادت پریسہ نے رو رو کر کمرہ سر پر اٹھا رکھا تھا جب سارنگ کمرے میں داخل ہوا۔ مضراب بچی کو گود میں لے کر لوری سنا رہی تھی۔ سارنگ کو آتے دیکھ کر ساکت ہو گئی۔

پورے چار ماہ بعد اسے دیکھا تھا۔ نک سک سے تیار اور تروتازہ سا سارنگ۔ لگتا تھا اسلام آباد کی فضا اسے راس آ گئی تھی۔ مضراب کی آنکھیں نہ جانے کیوں دھندلا گئیں۔ وہ بہت دقت سے پھر سے بچی کو تھپکنے لگی۔ سارنگ کمرے کو ناقدانہ نظروں سے دیکھتا آگے بڑھا جہاں اسی فیصد بچی کے سامان کا قبضہ تھا۔ چھوٹا سا پنگوڑا۔ خوب صورت کاٹ۔ چار خانوں والی الماری۔ پرام۔ کپڑوں کی باسکٹ۔ وہ آ کر بیڈ پر بیٹھ گیا اور مضراب کو بغور دیکھنے لگا جو سر جھکائے بچی کو تھپک رہی تھی۔

''کیسی ہو؟'' سارنگ نے معمول کے لہجے میں پوچھا۔ مضراب نے کوئی جواب نہ دیا۔

''میں نے کچھ پوچھا ہے مضراب!'' سارنگ کے لہجے میں سختی در آئی۔

''جب پوچھنا چاہیے تھا تب کیوں نہیں پوچھا۔'' وہ بڑبڑائی اور زور سے بچی کو تھپکنے لگی۔

''یہ تمہاری بڑبڑانے کی عادت بہت بری ہے۔ جو کہنا ہو، واضح کہا کرو۔'' سارنگ جھنجلایا اور جھک کر جوتے اتارے۔

''یہ تکیہ دینا مجھے، ٹیک لگانی ہے۔'' پھر اس نے کہا تو مضراب نے پاس پڑا تکیہ اٹھا کر اس کی طرف پٹخا۔

''شوہر تھک کر دور سے آیا ہے اور تم کھانا پانی پوچھنے کے بجائے لڑائی پر آمادہ ہو۔ شرم کرو۔'' وہ بولا۔ مضراب نے ایک زخمی نظر اس پر ڈالی۔

''جہاز سے آنے میں کون تھکتا ہے۔''

''سفر تو سفر ہوتا ہے چاہے ٹرین کا ہو یا جہاز کا۔'' سارنگ نے سنجیدگی سے کہا۔

''سفر آرام دہ ہو تو نہ پہنچنے میں دیر لگتی ہے نہ تھکن کا احساس ہوتا ہے۔'' وہ جتا کر بولی۔

''کہنا کیا چاہتی ہو؟'' سارنگ نے بھنویں اٹھائیں۔

''اگر آپ چاہتے تو میری ڈیلیوری کے وقت اسپتال پہنچ سکتے تھے۔ مجھے جذباتی سہارا دے سکتے تھے۔ لیکن آپ نے اتنے ماہ بعد اپنی شکل دکھائی۔ میں کتنی اکیلی تھی وہاں۔ دردزہ کی تکلیف سے تڑپ رہی تھی، کوئی بھی تو ہمدردی کرنے والا نہیں تھا۔'' وہ سلگ کر بھیگی آواز میں بولی۔

''تم عام لڑکی نہیں ایک ڈاکٹر ہو مضراب۔ پھر بھی امیچور باتیں کر رہی ہو۔ وہاں سارا پروفیشنل عملہ تمہارے ساتھ تھا۔ تمہیں ہمدردی سے زیادہ اچھی ڈاکٹرز اور جدید سہولیات سے آراستہ ہاسپٹل کی ضرورت تھی جو تمہیں مہیا ہو گئے پھر میری بیوی ہونے کی حیثیت سے تمہیں پروٹوکول بھی خوب ملا۔ اور کس بات کی کمی رہ جاتی ہے۔'' سارنگ کا مغرور انداز مضراب کا دل جلا گیا۔

''بعض معاملات میں مادی چیزوں کے ساتھ محبت کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ میں ڈاکٹر بن کر کیا انسان نہیں رہی۔ میرا شوہر اتنے نازک وقت میں میرے ساتھ نہیں تھا، یہ ہرٹ کرنے والی بات نہیں ہے؟'' وہ نا چاہتے ہوئے بھی اپنا دل اس کٹھور کے آگے کھول بیٹھی۔

''میں وہاں کچھ اہم کاموں میں مصروف تھا۔'' سارنگ نے غور سے اس کا غصے سے تمتمایا چہرہ دیکھا۔

''بیوی اور بچے سے زیادہ اہم ہیں آپ کے کام۔'' وہ تلخی سے بولی۔

رہی ہو۔ اگر یہ اپنی اہمیت جتانے کی کوشش ہے تو بے فائدہ کوشش ہے۔'' سارنگ نے عجیب انداز میں کہا تو اس کے دل کو دھکا سا لگا، وہ بالکل چپ رہ گئی۔ کافی دیر یونہی گزری پھر سارنگ خود ہی سرک کر ذرا سا نزدیک ہوا۔

''یہ بچی اتنی چھوٹی اور کمزور کیوں ہے۔'' اس نے پریسہ کی طرف جھکتے ہوئے پوچھا۔

''اس بچی کا نام پریسہ ہے۔'' مضراب نے نروٹھے پن سے جتایا۔

''اچھا نام رکھا ہے۔ پریسہ!'' سارنگ نے بچی کے سر پر ہاتھ پھیرا تو وہ اجنبی لمس پر حلق پھاڑ کر رونے لگی۔ وہ گھبرا کر دور ہٹا۔

''کتنا روتی ہے یہ۔ کچھ دو اسے کچھ دودھ وغیرہ۔''

''اپنی قسمت پر روتی ہے کہ کس انسان کے گھر پیدا ہو گئی جسے نہ اس سے دلچسپی ہے نہ ہی اس کی ماں سے۔'' مضراب نے بچی کو کندھے سے لگا کر تلخی سے کہا۔

''نہیں خیر، اب ایسی بھی بات نہیں۔ دلچسپی تو اس کی ماں سے مجھے بہت زیادہ ہے۔'' اس نے مضراب کی الجھی لٹوں کو چھوا مضراب کا دل دھڑ کا۔

''پریسہ کو ذرا اماں کے پاس چھوڑ کر آؤ تو میں تمہیں اپنی دلچسپی دکھاؤں۔'' پھر وہ مبہم سی مسکراہٹ سے بولا تو مضراب سلگ اٹھی۔

''اپنے پاس رکھیں اپنی یہ دلچسپی، میں دوسرے کمرے میں سونے جا رہی ہوں۔'' وہ بچی کو گود میں لیے بیڈ سے اتری اپنی ضرورت کی کچھ چیزیں اٹھائیں اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

☆☆☆

ایمان لاسٹ سمسٹر سے فارغ ہو کر گھر آ گئی تھی، سو ہر وقت پریسہ کے ساتھ رونق لگائے رکھتی۔ اس کی شوخی آج کل عروج پر تھی۔ نجمہ نے عفان اور ایمان کی شادی کی تاریخ طے کرنے کے لیے گاؤں

... مضراب نے سسر سے بات کرنے کی ٹھانی۔ جو ہفتہ بھر سے بڑی حویلی میں ہی موجود تھے۔

''انکل! مما پپا عفان کی شادی کی تاریخ طے کرنے کے لیے ادھر آنا چاہتے ہیں۔'' اس نے موقع دیکھ کر سسر سے بات کی۔

''انہیں منع کر دو بہو۔'' صادق تالپور نے اطمینان سے انکار کیا۔

''کک...... کیا مطلب۔'' وہ دنگ رہ گئی۔

''مطلب سیدھا ہے، ہمیں اپنی بیٹی تمہارے بھائی کو نہیں دینی۔'' وہ اسی انداز سے بولے۔

''مگر کیوں؟ آپ نے تو خود یہ رشتہ طے کیا تھا۔ ادلے بدلے کی شرط رکھی تھی۔ اب آپ اپنی بات سے مکر رہے ہیں۔'' وہ صدمے میں گھر کر انہیں دیکھنے لگی۔

''ہاں تو صرف رشتہ ہی طے کیا تھا ناں نکاح تو نہیں کر دیا تھا۔'' ان کے اطمینان میں ذرا فرق نہ آیا۔

''تو رشتہ بھی کیوں طے کیا؟ ہم سے دھوکا کرنے کے لیے۔ میری شادی سارنگ سے ہو گئی۔ اب ایمان کی بھی میرے بھائی سے ہونی چاہیے۔'' وہ ضبط کھونے لگی۔

''تمہاری شادی ایک وسیع و عریض زمینوں کے وارث اور ایک کامیاب سیاست دان سے ہوئی ہے۔ ہم اپنی بیٹی ایک بے روزگار اور اپنے سے کم حیثیت لڑکے کو کیوں دیں۔'' وہ مغرور انداز بولے تو مضراب خون کے گھونٹ بھر کر رہ گئی۔

''یہ تو آپ کو پہلے سوچنا چاہیے تھا۔'' وہ تلخ ہوئی۔

''بحث مت کرو بہو۔ بات سیدھی سی ہے میں اپنی بہن کے قاتل کے بھانجے کو بیٹی نہیں دوں گا۔ سن لیا۔ اب جاؤ اندر شاباش۔'' انہوں نے حتمی انداز میں کہا۔ مضراب اپنا غصہ دباتی ناچار وہاں سے اٹھ آئی۔

عفان کا کیا ہوگا۔ وہ جذباتی لڑکا نہ جانے کیا کر بیٹھے گا۔'' مضراب نے سر تھام لیا۔ پھر سارنگ کو فون ملایا جو حسب سابق اٹینڈ نہیں کیا گیا۔

آپ بس اپنی مصروفیات میں گم رہنا۔ میرا فون نہیں اٹھانا۔ اس نے غصے سے میسج بھیجا۔

''میٹنگ میں ہوں، ڈونٹ ڈسٹرب می۔''

جوابی پیغام آیا۔ مضراب جل کر راکھ ہوگئی۔

''یہ اپنے بابا سے کون سا کم ہے، دونوں کی ملی بھگت ہے۔'' مضراب نے کڑھ کر سوچا پھر نجمہ کو فون ملایا۔ وہ تو یہ بات سن کر ہی بھڑک اٹھیں۔

''پھر ادلے بدلے کا رشتہ کیوں طے کیا تھا۔ ہم نے اپنی بیٹی نفرتوں کے جہنم میں جھونک دی۔ جہاں نہ شوہر قدر کرتا ہے نہ سسرالی۔ اب اپنی بیٹی کی باری پر مکر گئے۔'' وہ غصے کی انتہا پر تھیں۔

''پتا نہیں مما۔'' مضراب کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

''اب تم گاؤں کی جان چھوڑو، اپنی بیٹی کو اس کے باپ کے حوالے کرو اور وہاں سے نکل آؤ۔ غضب خدا کا، میری ڈاکٹر لڑکی کو گائے بنا کر چالاک لڑکے نے اپنی جی حضوری میں لگا رکھا ہے۔'' وہ چمک کر بولیں تو مضراب دہل گئی۔

''پریسہ کو چھوڑ دوں۔ نن...... نہیں مما! میں اپنی بیٹی کو نہیں چھوڑ سکتی۔'' اس نے پریشانی سے کہا۔

''تو ساری زندگی وہیں پڑی رہو گی۔ سارنگ تو تمہیں اپنے ساتھ کبھی شہر نہیں لے کر جائے گا۔ نہ جانے اکیلے رہ کر وہاں کیسی عیاشیاں کر رہا ہے۔''

''عیاشیاں......'' مضراب کا دل سکڑ کے پھیلا۔

''اور کیا، بیوی سے دور ایسے ہی تو نہیں بیٹھا۔ آخر تمہیں اپنے ساتھ نہ رکھنے کی کوئی وجہ تو ہوگی نا۔'' نجمہ نے وثوق سے کہا۔ مضراب چپ سی ہوگئی۔ اس طرف تو اس کا دھیان بھی نہیں گیا تھا۔

''خیر، اپنی بیٹی نہیں دے رہے تو نہ دیں۔ بھاڑ

تمہارے پاپا آکر تمہیں لے جائیں گے۔'' نجمہ جذباتی ہوتی جا رہی تھیں۔

''مما پلیز۔ ابھی میں سارنگ سے بات کروں، ہوسکتا ہے وہ بابا کو منالے۔'' مضراب نے بے چین ہو کر کہا۔

''ارے دونوں ایک ہی تھالی کے چٹے بٹے ہیں۔ ایک کو چھپاؤ۔ دوسرے کو نکالو۔'' وہ بھڑک کر بولیں۔

''مما! مجھے سارنگ سے ڈسکس تو کرنے دیں۔ اور آپ عفان کو یہ بات ابھی مت بتانا۔ وہ کہیں مایوس ہو کر کچھ کر نہ بیٹھے۔'' اسے اپنے بھائی کی بھی فکر لگی تھی۔

''کیوں نہ بتاؤں اسے، پتا تو چلے بڑا ایمان ایمان کرتا ہے۔ ایمان بے ایمان بڑی حویلی جا کر بیٹھ گئی ہے۔ اب کسی اور سے بیاہ رچالے گی۔'' نجمہ نے تنک کر کہا۔

''مما! اس میں ایمان کا کوئی قصور نہیں۔ اس بے چاری کو تو کچھ پتا ہی نہیں۔'' مضراب نے فوراً کہا۔

''ارے جانتی ہوں، میں بڑی حویلی کی لڑکیوں کو۔ بڑی ہی بے وفا ہوتی ہیں۔ مرک یاد نہیں کیسے ارباب کو دغا دے گئی تھی۔'' انہوں نے چمک کر کہا تو مضراب نے گہری سانس بھری۔ نجمہ سے بحث کرنا فضول تھا۔

''اوکے مما۔ اب رکھتی ہوں۔'' اس نے بھرے دل سے فون بند کر دیا۔

☆☆☆

ماحول میں اداسی رچ بس گئی تھی۔ ایمان بالکل مرجھایا ہوا پھول لگتی تھی۔ اسے دیکھ کر مضراب بے چین رہتی۔ اپنے بھائی کا خیال بھی دامن گیر تھا۔ جو فون پر بھڑکتا تڑپتا رہتا۔ وہ بھائی کو سمجھانے کی کوششوں میں ہلکان ہوتی رہتی۔ اس نے اپنی سی ہر کوشش کر کے دیکھ لی تھی۔ مگر صادق تالپور کا انکار

بات میں نہ بدلا تھا۔ سارنگ تو اس معاملے میں خود کو بے بس ظاہر کر کے ایک طرف ہو گیا تھا۔ مضراب نے اس سے کافی بحث کی۔ پر وہ بھی عجیب پتھر قسم کا انسان تھا جس کو نہ بیوی کے جذبات کی پروا تھی نہ بہن کے احساسات کی۔

گھر کی باقی خواتین صادق صاحب کی حامی تھیں وہ تو برملا کہتیں کہ ارباب حسن کی بھانجی بھی بہو بن کر ادھر نہ آتی تو اچھا ہوتا۔ اور مضراب سوچتی واقعی میں شادی کر کے ادھر نہ آتی۔ جب ان کو اپنی بیٹی دینی نہیں تھی تو میری زندگی سے کیوں کھیلا گیا۔ مجھے نفرت بھرے رویوں کے بیچ لا بٹھانے کا کیا مقصد تھا۔ وہ سوچتی اور الجھتی۔

ادھر اچانک ہی ایمان کا رشتہ طے کر دیا گیا اور فوراً ہی شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ ایمان کی آنکھیں ہر وقت نیر بہاتی رہتیں۔ وہ مکمل مشرقی اور والدین کی وفادار بیٹی تھی۔ اپنی ادھوری محبت پر ماتم کناں مگر والد کی ناانصافی کے باوجود بھی ان کی تابع دار۔ مضراب اس کی واحد ہمدرد تھی۔ اور سوائے ہمدردی کے وہ کچھ اور کرنے سے قاصر تھی۔ ایک طرف ایمان کو رونے کے لیے اپنا کندھا مہیا کرتی تو دوسری طرف بھائی کے جذباتی پن پر اسے فون پر سمجھاتی۔ مگر عفان کسی طور نہیں سمجھتا تھا۔ ایک ایسے ہی وقت جب وہ کال پر عفان سے سر کھپا رہی تھی ایمان نے اس کے ہاتھوں سے سیل لے لیا۔

''عفان! ہم نے آپی سے وعدہ کیا تھا کہ اگر وہ اپنی کوشش میں ناکام ہو گئیں اور ہم دونوں کا ملن ممکن نہ ہوا تو ہم دونوں اپنی محبت سے پیچھے ہٹ جائیں گے۔ میں اپنے وعدے پر قائم ہوں تو تم کیوں مکر رہے ہو۔'' ایمان نے بہت ضبط سے عفان کو یاد دلایا تو دوسری جانب جلتا بھڑکتا عفان بالکل خاموش ہو گیا۔

''کیا تم مجھے آسانی سے بھلا سکو گی ایمان!'' اس نے شکستہ دل سے پوچھا۔

''کوشش کروں گی۔'' ایمان نے آہستہ سے کہا۔ ''عفان! مجھ سے ایک آخری وعدہ کرو، تم خود کو کوئی بھی نقصان نہیں پہنچاؤ گے۔'' ایمان نے کہا تو وہ چپ رہا۔

''پلیز عفان! تم آنٹی، انکل کے اکلوتے بیٹے اور بھابھی کے لاڈلے بھائی بھی ہو۔ اپنوں کو کوئی دکھ نہ دینا، یہ سب تم سے بہت پیار کرتے ہیں۔''

''اور تم......؟'' عفان کے سوال پر اس نے ایک سانس بھری۔

''میں بھی۔ تم کو سلامت دیکھنا چاہتی ہوں۔ پلیز میری خاطر ہماری محبت کی خاطر تم یہ وعدہ کر لو۔'' وہ لجاجت سے بولی تو اس کی آنکھوں میں جھلملاتے اشک دیکھ کر مضراب تڑپ اٹھی۔

دوسری جانب عفان نے وعدہ کر لیا تھا تب ہی وہ روتے میں بھی مسکرائی تھی۔ مضراب کو اس وقت ایمان پر ٹوٹ کر پیار آیا تھا۔

عفان کو صبر آ گیا لیکن نجمہ کسی حال میں سمجھنے کو تیار نہ تھیں، ان کا اصرار بڑھتا جا رہا تھا کہ مضراب میکے آ کر بیٹھ جائے اور سارنگ سے خلع لے کر اس جہنم سے جان چھڑا لے۔ لیکن مضراب سارنگ سے علیحدگی پر کسی صورت آمادہ نہ تھی۔ سارنگ صرف اس کی محبت نہیں تھا، وہ اس کا مجازی خدا اور اس کی بیٹی کا باپ بھی تھا۔ اس کی کچی عمر کا ایسا پہلا پکا خواب جو عمر بھر اس کی آنکھوں میں رہا تھا۔ وہ اسے بھلا کیسے چھوڑ سکتی تھی۔

ایمان روتے دھوتے اپنی سسرال سدھاری مضراب کا دل اتنا برا ہوا کہ وہ منہ سر لپیٹ کر پڑی رہی۔ رو رو کر اس کے اپنے سر میں درد ہو رہا تھا۔ اس حویلی نے مرک کی کھلکھلاہٹیں بھی دیکھی تھیں اور مضراب کا جلنا کڑھنا بھی۔ اور اب یہ حویلی ایمان کی بے بسی بھی دیکھ رہی تھی۔

☆☆☆

زندگی بے مہری سی گزرنے لگی۔ ایمان اپنے سسرال خوش تھی یا نہیں۔ وہ کچھ بھی ظاہر ہونے نہ دیتی تھی۔ سارنگ کی وہی مصروفیات تھیں۔ مگر پریسہ سے

اس کا ایک [illegible] بن گیا تھا۔ وہ بڑی ہو رہی [illegible]
تو پریسہ اس کے گرد چکراتی رہتی۔ خون کی کشش اتنی زیادہ تھی کہ وہ ٹی وی پر سیاسی ٹاک شوز میں نظر آتا تو پریسہ ٹی وی کے آگے سے ہٹنے کا نام نہ لیتی تھی۔ سارنگ بھی اب بیٹی کی طرف ملتفت ہونے لگا تھا۔ جب بھی آتا، شہر سے بیٹی کے لیے ڈھیروں کھلونے اور نہ جانے کیا کچھ خرید لاتا۔ پریسہ چیزیں پا کر بے حد خوش ہوتی تھی۔

مضراب کو اب سارنگ کافی حد تک بدلا ہوا نظر آتا۔ وہ مضراب کے ساتھ بھی بہت نرم انداز سے پیش آتا۔ مگر مضراب اس کی طرف سے ملی بے رخی اور بے التفاتی کے زخموں کو با آسانی بھلا نہیں سکتی تھی۔ سو درمیان میں ایک اجنبیت کی دیوار اٹھائے رکھتی۔

☆☆☆

''پریسہ کتنی پیاری ہوگئی ہے بھابھی۔ اس کی نظر اتارا کریں۔'' ایمان نے دو سالہ پریسہ کو گود میں بٹھایا۔

''صدقہ بھی دیتی ہوں اور نظر بھی اتارتی ہوں ایمان!'' مضراب نے پریسہ کے کھلونے سمیٹتے کہا۔

''بچے بھی اللہ کی نعمت ہوتے ہیں۔'' وہ حسرت سے بولی۔

''اللہ تمہیں بھی نوازے گا ان شاء اللہ۔'' مضراب نے کہا تو وہ پھیکا سا مسکرائی۔

''نہ جانے کب۔ میری ساس بہت واویلا کرتی ہیں بھابھی۔ ہر وقت مجھے سناتی رہتی ہیں۔''

''کیوں؟ اولاد کیا تمہارے اختیار میں ہے۔'' مضراب نے ناگواری سے کہا۔ ''ابھی ایک سال ہی تو ہوا ہے شادی کو، ابھی سے واویلا۔''

''بس ان کو اپنا وارث چاہیے۔'' وہ آہستہ سے بولی تو مضراب کو دکھ ہوا۔

شادی کے بعد ایمان کبھی خوش دکھائی نہ دی تھی۔ ایمان کی شادی اگر عفان سے ہوتی تو کیا تب بھی وہ ایسی مرجھائی نظر آتی۔ مضراب نے سوچا۔

''میری ساس کہتی ہیں، ان کی زندگی کے دن کم ہیں، ان کو اپنا پوتا دیکھنا ہے۔ اس لیے وہ آہل کو

[illegible]
مضراب پریشان ہوئی۔

''آہل کیا کہتا ہے۔''

''وہ بھی ماں کا ساتھ دیتا ہے بھابھی۔'' ایمان کی اگلی بات مضراب کو دہلا گئی۔

''دماغ خراب ہے آہل کا۔ اتنا بے صبرا ہو رہا ہے۔ بھئی ڈاکٹر نے جب کہا ہے سب نارمل ہے تو انتظار کیوں نہیں کرتا۔ آج نہیں تو کل اللہ اولاد دے ہی دے گا۔''

''بھابھی! ان کے ارادے یہی ہیں۔ اچھا آپ بتائیں اگر وہ دوسری کر لے تو میں کیا کروں۔'' ایمان نے معصومیت سے پوچھا۔

''وہ ایسا کرے ہی کیوں؟'' مضراب نے الٹا اس سے پوچھا۔ ''اسے یقین کیوں نہیں کہ اللہ اسے تم سے اولاد دے گا۔''

''اس کی ماں کو جلدی ہے۔''

''اور یہ دودھ پیتا بچہ ہے جو ماں کے کہنے میں ہے۔'' مضراب کو غصہ آگیا۔

''سارنگ بھائی بھی تو بابا کے کہنے میں ہیں۔ پہلے آپ سے شادی کی پھر خواہ مخواہ ٹارچر کرتے رہے۔ ابھی تک کرتے ہیں۔'' ایمان نے کہا تو وہ چپ رہ گئی۔ ''میں بھائی کو کشادہ ذہن اور ہمدرد سمجھتی تھی مگر وہ بھی پیور فیوڈل ذہنیت کے نکلے۔'' ایمان نے دل کا غبار نکالا۔ مضراب نے بغور دیکھا، ایمان اس ایک سال میں بہت تلخ ہوگئی تھی۔

''او کے بھابھی اب چلتی ہوں۔''

وہ رخصت لے کر گئی تو مضراب گہری سوچوں میں ڈوب گئی۔ ایمان کی باتوں نے اسے بے چین کر دیا تھا، کچھ بھی سہی اس کا گھر ٹوٹتا ہوا وہ نہیں دیکھ سکتی تھی۔ مگر جو نصیب میں لکھا ہو وہ ہو کر رہتا ہے۔

☆☆☆

ایمان ایک ماہ بعد ہی طلاق کا بدنما داغ لے کر بڑی حویلی واپس آگئی۔ بڑی حویلی کے در و دیوار جیسے ہل کر رہ گئے۔ گھر کی جملہ خواتین صدمے سے

...ہوتے۔

"صادق تالپور کی بیٹی کو طلاق دینے کی ہمت کیسے ہوئی آہل خان کی۔ میں ان کی اینٹ سے اینٹ بجادوں گا۔" صادق تالپور کف اڑا رہے تھے۔

"دوسری شادی کررہا ہے بے غیرت۔ میں دیکھتا ہوں، اس کے گھر میں شادیانے بجتے ہیں یا موت کا ماتم ہوتا ہے۔" وہ آپے سے باہر ہورہے تھے۔

سارنگ اور شاہ میران کو ٹھنڈا کرنے کی کوششوں میں لگے تھے لیکن ان کا بلڈ پریشر بڑھتا جارہا تھا۔

☆☆☆

صادق تالپور کو فالج کا زبردست اٹیک ہوا تھا، ان کو فوری طور پر کراچی کے اسپتال پہنچایا گیا۔ جان تو بچ گئی مگر وہ ایک ماہ کے علاج کے بعد جب واپس آئے تو نہ زندوں میں تھے نہ مردوں میں۔ زمرد کا سارا طنطنہ شوہر کی یہ حالت دیکھ کر جاتا رہا۔ سارنگ کو الگ چپ سی لگ گئی تھی۔ ایمان جو اپنا گھر اجڑنے پر نڈھال تھی باپ کی پریشانی میں گھر گئی۔

بڑی حویلی پے در پے صدموں میں ڈوب گئی تھی۔ حویلی کی سوگوار فضا کو پریسہ کی قلقاریاں بھی نہ بدل سکی تھیں۔ سب کچھ اپنی جگہ پر جامد سا ہوگیا تھا۔

ان ہی دنوں سترہ سال کوما میں رہنے والی تاج بی بی بھی داغ مفارقت دے کر اگلے جہاں سدھاریں۔ صادق تالپور اتنے لاچار تھے کہ اپنی ماں کی موت سے بے خبر رہے۔

مضراب کو ان پر اب ترس آتا تھا۔ ایسی رعب ودبدبہ والی شخصیت اپنی ہر ضرورت کے لیے دوسروں کی محتاج ہوکر رہ گئی تھی۔ وہ ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے ان کا صبح شام چیک اپ کرتی اور ایک بہو کی طرح بہترین دیکھ بھال کرواتی تھی۔ ان کا جسم مفلوج تھا پر آنکھیں متحرک تھیں جو اپنا کرب بیان کرتی تھیں۔ اور ہر وقت پانی سے بھری رہتیں۔

کبھی مضراب کو لگتا ان کی آنکھیں دکھی ہیں، کبھی لگتا کہ بہت شرمسار ہیں اور کبھی کچھ کہنے کو بے تاب نظر آتیں۔ زمرد بھی اب ان کی یہ زبان سمجھنے لگی تھیں۔ وہ شوہر کی آنکھوں سے ظاہر ہوتے پچھتاوے دیکھتی تھیں جو ایمان کو سامنے دیکھ کر اور بڑھ جاتے تھے۔

☆☆☆

"مضراب بہو!" زمرد نے آواز دی تو مضراب جو بابا کا شوگر لیول چیک کرکے کمرے سے باہر جارہی تھی، واپس پلٹ آئی۔

"جی آنٹی۔"

"بیٹا! ادھر بیٹھو، میرے پاس۔" انہوں نے اپنے برابر اشارہ کیا تو وہ بیٹھ گئی۔

"جی آنٹی! کچھ کہنا تھا آپ کو۔" اس نے ان کو خاموش دیکھ کر کہا۔

"بس بیٹا! کیا کہوں۔ کس منہ سے کہوں۔" انہوں نے اپنے ہاتھ آپس میں ملائے۔

"آپ کہیے پلیز۔" مضراب نے ان کے ہاتھوں پر اپنا ہاتھ رکھا۔

"بیٹی! اس حویلی میں تمہیں لاکر ہماری طرف سے جو بھی تم پر زیادتیاں کی گئی ہیں، اس پر ہمیں معاف کردو۔" انہوں نے یکا یک مضراب کے ہاتھ تھام کر لجاجت سے کہا تو مضراب چپ رہ گئی۔

"میں مانتی ہوں، ہمارے رویے اور ہماری باتیں با آسانی معاف کرنے والی نہیں ہیں پھر بھی کوشش تو کرو۔ شاید تمہاری بددعائیں ہیں کہ میرے سر کے سائیں ایسے بستر کے ہوگئے ہیں۔"

"میں نے آپ لوگوں کو کبھی بددعا نہیں دی آنٹی۔" وہ تڑپ کر بولی۔

"پھر بھی دل تو دکھا ہے نا، دکھتا دل خود ایک بددعا کی طرح ہے۔" ان کی بات میں وزن تھا، مضراب لب چبانے لگی۔ "ہمارے اوپر پے در پے آزمائشیں آپڑی ہیں، تمہاری معافی سے یہ سلسلہ رک سکتا ہے۔" زمرد نے پریقین انداز میں کہا۔

"میں نے آپ سب کو معاف کیا آنٹی۔" وہ آنکھوں میں امڈتے آنسو روک کر بولی۔

"دل سے معاف کیا نا بیٹا؟" انہوں نے بے تابی سے پوچھا تو مضراب نے جھلملاتی آنکھوں سے

[illegible]

چوم لیا۔ "تمہارے ماموں کے جرم کی سزا ہم جانے انجانے تمہیں دے رہے تھے، اللہ کا یہ فرمان بھول گئے کہ باپ کا گناہ بیٹے کے سر نہیں، نہ ہی بیٹا باپ کے گناہ کا ذمہ دار ہے۔ تم تو پھر ارباب کی بھانجی ہو۔" ان کی بات مضراب کا دل دکھا گئی۔

"بیٹا! ایک گزارش اور کرنی ہے۔ تم لوگ اگر مان جاؤ تو کسی کے دل کو سکون نصیب ہو جائے گا۔" پھر وہ جھجک کر بولیں۔

"آپ میری ماں کی جگہ ہیں آنٹی! گزارش کیسی، حکم کریں۔" اس نے ان کا حوصلہ بڑھایا۔

"بیٹا! اگر تمہارا بھائی اب بھی ایمان سے شادی کرنا چاہتا ہے تو اپنا رشتہ بھیج سکتا ہے۔" ان کی اگلی بات پر مضراب نے چونک کر انہیں دیکھا۔

"میں جانتی ہوں، اب ہماری ایمان ایک مطلقہ لڑکی ہے۔ اسی لیے کہا اگر یہ جاننے کے بعد بھی وہ ایمان سے شادی کرنا چاہے تو......" انہوں نے شرمندگی سے وضاحت دی۔

"ایمان کی طلاق میں اس کا اپنا کوئی قصور نہیں آنٹی۔ اور میرا بھائی اتنا تنگ نظر نہیں کہ ایسی باتوں کو خاطر میں لائے۔" مضراب نے فوراً کہا۔

"اچھا۔" زمرد خوش ہوئیں۔

"میں عفان سے بات کرتی ہوں آنٹی۔ وہ وقتی طور پر بد دل ہوا تھا، مجھ سے بہت ناراض بھی رہا مگر ایمان اس کی محبت ہے۔ اسے پانا آج بھی اس کے دل کی سب سے بڑی خواہش ہوگی۔" مضراب نے ان کو یقین دہانی کروائی تو ان کی آنکھیں نم ہوئیں۔

"ہم نے اپنی بیٹی کے ساتھ بھی بہت برا کیا ہے۔ اب میں چاہتی ہوں اس کا دل بھی کھلا دوں۔ ان کی بھی یہی خواہش ہے۔" زمرد نے شوہر کی طرف دیکھ کر کہا تھا جن کی آنکھیں مسکرا رہی تھیں۔

☆☆☆

ایمان کا نکاح سادگی سے عفان کے ساتھ ہوگیا۔ نکاح صادق تالپور کے کمرے میں ہوا۔

[illegible]

جوڑے میں اپنے من پسند ساتھی کے ساتھ رخصت ہوتے دیکھا تھا۔ اطمینان کی ایک زبردست لہر ان کے وجود سے اٹھتی صاف دکھائی دی تھی۔ زمرد کا شرمندہ رویہ نجمہ کو بھی کسی حد تک اپنا دل صاف کرنے پر مجبور کر گیا۔ ورنہ وہ تو بدلہ لینے کا ٹھانے ہوئے تھیں۔ مگر اس ایک سال میں عفان جتنا مرجھا گیا تھا، ان سے دیکھا نہ جاتا تھا۔

جب سے مضراب نے رشتے کی بات چھیڑی اس کے وجود میں زندگی کی دوڑنے لگی تھی۔ اور بیٹے کی خوشی میں ان کی خوشی تھی۔ مضراب بھی بھائی کو حد سے زیادہ خوش دیکھ کر مطمئن تھی۔ سارنگ اور شاہ میر نے عفان کو جاتے وقت پر جوش طریقے سے گلے لگایا تھا۔ اور بہن کے سر پر پیار کا ہاتھ رکھ کر رخصت کیا۔

"کیا ہو جاتا اگر وقت پر یہ فیصلہ ہو جاتا نہ ایمان کو صعوبتیں جھیلنی پڑتیں، نہ عفان لاحاصل کے کرب سے گزرتا۔" اس نے یہ منظر دیکھ کر سوچا۔

"نفرت اور انا کی جنگ میں ہمیشہ محبت ہی قربان ہوتی ہے۔" مضراب نے ایک سانس بھری تھی۔

☆☆☆

ایمان کے رخصت ہوتے ہی حویلی میں ایک ان دیکھے سکون کی لہر دوڑ گئی تھی۔ یوں جیسے سب کچھ اپنی اصلی جگہ پر واپس آ گیا ہو۔ بد دلی اور نفرتوں کے بادل چھٹ گئے تھے۔ زمرد کا رویہ مضراب سے انتہائی شفقت آمیز اور دوستانہ ہو گیا تھا۔ موتل چاچی بھی پہلے جیسی جان چھڑکنے والی بن گئی تھیں، ان کی بہو اور بچے مضراب کے ساتھ یوں گھل مل گئے جیسے ہمیشہ سے یونہی رہتے آئے ہوں۔

نجمہ الگ شاد تھیں ایمان بے حد اچھی بہو ثابت ہوئی تھی۔ وڈیو کال پر عفان اور ایمان کے چمکتے چہرے اور خوشی بھری کھلکھلاہٹیں مضراب کو اندر تک سرشار کر دیتی تھیں۔

سب کچھ بہت اچھا ہو گیا تھا۔ بس ایک سارنگ ہی تھا جس سے وہ ابھی تک ایک ان دیکھے فاصلے پر

بھی اسی سے ہوا تھا۔ حالانکہ وہ ہر ممکن طریقے سے یہ دوریاں پاٹنے کی کوشش کرتا مگر مضراب ابھی تک میں نہ مانوں والی کیفیت کا شکار تھی۔

اب تو وہ ہر ہفتے دوڑا دوڑا گاؤں آتا تھا۔ مگر مضراب اس کے آنے پر کسی قسم کے جوش و خروش کا مظاہرہ نہ کرتی۔ وہ اپنی بیٹی کا دیوانہ اور بیٹی اس کی دیوانی تھی۔ ہر وقت پاپا، پاپا کی رٹ لگائے سارنگ کے پیچھے پھرتی، اس کی وجہ سے مضراب کو بھی زیادہ وقت سارنگ کے قریب رہنا پڑتا تھا۔ لیکن وہ سارنگ کی پیش قدمی کو بالکل قبول نہ کرتی تھی۔ سارنگ اس کا گریز شدت سے محسوس کر رہا تھا۔

☆☆☆

محبت کونج ہے سائیں
ہجرت اس کا مقدر ہے
یہ ناموافق موسموں میں کوچ کرتی ہے
اجنبی آب گاہوں پر بہت پیاسی اترتی ہے
محبت کونج ہے سائیں!
یہ دل کے ایوانوں میں سر اپنا پٹختی ہے
اذیت کے پل صراط پر ننگے پیر چلتی ہے
محبت درد ہے سائیں!
بدن کے اندر بلکتی ہے
اشک بن کر آنکھوں سے چھلکتی ہے
محبت کرب ہے سائیں!
گیلی لکڑی کی طرح من میں سلگتی ہے
دھواں بن کر مچلتی ہے، جلا کر راکھ کرتی ہے
بڑا بے ساکھ کرتی ہے!

"پاپا!" پریسہ نے اپنی آنکھوں پر بازو رکھ کر لیٹے سارنگ کی آستین کھینچی۔

"بولو پاپا کی جان۔" اس نے بیٹی کو اٹھا کر اپنے سینے پر بٹھالیا۔

"پاپا۔" اس نے اس کے ہلکے گھنگریالے بالوں کو اپنی مٹھیوں میں جکڑا اور کھلکھلائی۔

"پری! ایسے نہیں کرو۔" مضراب فوراً بولی۔

سارنگ نے پریسہ کو بانہوں کے گھیرے میں لے کر چوم لیا۔ مضراب نے اس کی ہلکی گلابی ہوتی آنکھوں کو دیکھا۔

"آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں لگتی۔ پری کو میں لے جاتی ہوں۔" مضراب نے پری کو لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو سارنگ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"تم مجھ سے دور بھاگنے کے بہانے کیوں ڈھونڈتی ہو رانی۔" اس نے اچانک سوال کیا۔

"ایسی تو کوئی بات نہیں۔" مضراب نے دھیمے سے کہا۔

"ایسی ہی بات ہے۔ میں جب ادھر کا چکر لگاتا ہوں۔ تم اپنا کمرہ بدل لیتی ہو۔ کوشش کرتی ہو، دن میں بھی کم سے کم مجھ سے سامنا ہو۔" سارنگ نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ مضراب نے نگاہیں جھکا لیں۔

"مجھے ناپسند کرتی ہو؟" اس نے پوچھا تو وہ خاموش رہی۔ "میں بہت برا ہوں ناں۔"

"پتا نہیں۔" مضراب پری کو دیکھنے لگی جو باپ کے سینے پر سر رکھے آرام سے لیٹی تھی۔

"مجھے دیکھ کر کہو۔" سارنگ نے اصرار کیا۔

"کیا کہوں؟" مضراب نے نگاہ اس پر ٹکائی۔

"یہ کہو کہ میں نے تمہارے ساتھ کچھ بھی اچھا نہیں کیا۔ میں ایک برا شوہر اور بے پروا باپ ہوں۔ تم دونوں کو خود سے دور رکھ کر شہر میں اپنی آزاد زندگی گزار رہا ہوں۔" سارنگ کی بات پر مضراب کی آنکھیں بھر آئیں۔

"میرے کہنے سے کیا ہوگا؟" اس نے الٹا اس سے پوچھا۔

"تمہارا دل ہلکا ہو جائے گا۔" سارنگ نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ "مجھے ملامت کرو، مجھ سے لڑو۔ کچھ بھی کرو مگر یوں اجنبی بن کر چپ نہ رہو مضراب!" وہ بے چینی سے بولا۔

"آپ نے بھی تو ایک عرصہ مجھ سے تغافل برتا ہے۔" مضراب نے دھیمے سے کہہ کر اپنا ہاتھ چھڑایا۔

کی آنکھوں میں دیکھا۔
''بددل ہوگئی ہوں سنی!'' مضراب کی بات پر وہ لیٹے سے اٹھ بیٹھا، پریسہ کو ایک طرف سلایا اور مضراب کے کندھے پر اپنا ہاتھ پھیلایا۔
''میں جانتا ہوں، تم سے بے رخی برت کر میں نے بہت برا کیا ہے مضراب! مگر یقین کرو، تمہیں ناخوش کر کے میں خود بھی خوش نہیں رہا۔'' سارنگ نے سرگوشی کی تو مضراب چونک اٹھی۔
''ہاں مضراب! تم سے بہت نفرت کرنے کا ارادہ تھا۔ مگر میں اپنے ارادے پر ثابت قدم نہ رہ سکا۔''
''انکل کی بیماری نے سب کو بدل دیا ہے، ایک آپ بھی سہی۔'' مضراب نے خفیف سا طنز کیا۔
''نہیں رابی! اس بات کا بابا سائیں کی بیماری سے کوئی تعلق نہیں۔'' اس نے رسان سے کہا۔ ''تمہاری فیملی سے بے انتہا نفرت مجھے اس وقت محسوس ہوئی تھی، جب تمہارے ماموں نے میری پھوپھو کی زندگی سفا کی سے ختم کی اور میں نے اپنی پھوپھو کا خون میں لت پت وجود دیکھا تھا۔'' سارنگ کی بات پر مضراب کی نگاہوں میں وہ تکلیف دہ منظر گھوم گیا۔
''تم لوگوں نے گاؤں چھوڑ دیا تھا مضراب! لیکن برسوں گزر جانے کے بعد بھی میرے ذہن سے وہ نفرت نہیں نکل سکی تھی۔ مجھے جب جب وہ لمحہ یاد آتا، میں جنونی سا ہو جاتا تھا۔ کیونکہ تاج دادی کا بے بس وجود اور ہالار چاچا کی دیوانگی میرے دل سے یادوں کے کھرنڈ اترنے نہ دیتی تھی۔ یہ دونوں اس اذیت ناک کہانی کے مظلوم کردار بن کر میرے سامنے موجود تھے۔'' اس نے تکلیف سے لب بھینچے۔
مضراب نے پہلو بدلا۔
''لیکن ان دردبھرے لمحوں کے ساتھ مجھے تم بھی بہت یاد آتی تھیں۔ تم جو میری اشک شوئی کیا کرتی تھیں۔ نہ جانے کیوں تمہیں یاد کرتے میرے اندر بھڑکتی آگ مدہم ہو جایا کرتی تھی۔ اور میں یہ بات شدت سے محسوس کرتا تھا۔ میں نہیں جانتا تھا، ایسا کیوں

میرے گمان میں بھی نہیں تھا کہ زندگی کے کسی موڑ پر تم پھر کبھی مجھ سے ٹکرا جاؤ گی۔
اس دن جب برسوں بعد تمہیں مری کوٹ میں دیکھا۔ تو یقین کرو، میں تمہارے وجود سے نظریں نہیں ہٹا سکا۔ وہی خدوخال، وہی چہرہ لیے دوشیزگی کی بے انتہا کشش میں لپٹی مضراب میرے سامنے تھی۔ میں نے خود کو بہت جھٹلایا کہ ضروری نہیں تم وہی ہو مگر پھر تمہارا نام جان کر دل نے تصدیق کی۔ تم چھوٹی حویلی والی مضراب ہی ہو، جو اب بھی میرے دل میں بسی تھیں۔ پھر تمہاری حیرت جو میرا مکمل تعارف سن کر تمہارے چہرے پر آئی، مجھے بے چین کر گئی۔ اس کے بعد کئی دن تمہارا سراپا میری نگاہوں میں گھومتا رہا۔ بہت مشکل سے میں نے تمہاری سوچ سے جان چھڑائی تھی کہ ایک بار پھر تم مجھ سے ٹکرا گئیں۔
اس دن مرک پھوپھو اور چاچا کی برسی تھی۔ میں بہت بوجھل دل سے ان کی قبر پر بیٹھا تھا کہ تمہیں دیکھا۔ میرے دل نے خوش گوار حیرت محسوس کی۔ میں بے اختیار تمہاری طرف کھنچتا ہوا آیا۔ تمہیں دیکھ کر بے خودی والی کیفیت تب ٹوٹی جب تم نے اپنی نانو کا نام لیا، میں وہیں ساکت ہو گیا۔ تم سے روڈ ہو کر بات کی اور وہاں سے جلد نکل کر بڑی حویلی چلا آیا۔ عجلت ایسی تھی کہ تھوڑی دیر بھی تمہارے سامنے رکا تو تمہارے سحر سے نہ نکل پاؤں گا۔ بڑی مشکل سے خود کو سنبھالا اور سوچا بس یہ اتفاق آخری ہے، اب کہاں تم سے دوبارہ سامنا ہو گا۔ مگر میرا یہ خیال غلط ثابت ہوا۔ تم ایک بار پھر میرے حویلی میں میرے سامنے کھڑی تھیں۔ پھر تمہاری مجھ سے بہانے بہانے سے ملنے کی وجہ جب مجھ پر واضح ہوئی تو میں تمہاری بہادری پر دنگ رہ گیا۔ تم جانتی تھیں، یہ ایک ناممکن بات ہے کہ بڑی حویلی والوں سے تم لوگوں کا رشتہ جڑے، پھر بھی سینہ سپر ہو کر میدان میں اتری تھیں۔ پھر بابا سے تمہاری ملاقات ہوئی۔ تمہارے جاتے ہی ان کے استفسار پر میں نے تمہارا مطالبہ ان کے سامنے رکھا۔ مجھے لگا وہ غصہ ہوں گے اور نہ جانے کیا

انہوں نے ادلے بدلے کی شرط رکھ کر اس رشتے کی منظوری دے دی۔ میں حیران ہوا اور غصہ بھی کہ ہماری پھوپھو کے قاتل کے گھر وہ با آسانی رشتے جوڑ رہے تھے۔ مگر انہوں نے مجھے بحث نہیں کرنے دی، نہ اپنے ارادے کی ہوا لگنے دی کہ وہ کیا چاہتے ہیں۔ میں اپنے جذبات کی کشمکش میں الجھ گیا تھا۔ دل کہہ رہا تھا تم کو اپنا لوں، دماغ سرزنش کر رہا تھا۔ اسی کشمکش میں تم سے نکاح کرلیا۔" وہ کہتے کہتے ایک لمحے کو رکا مضراب سانس روکے اسے سن رہی تھی۔

"شادی کی رات میں نے دل و ذہن کی جنگ سے عاجز آ کر تھوڑی سی ڈرنک لی۔ یقین کرو پہلی بار اس گندی چیز کو ہاتھ لگایا تھا۔ تمہیں پریشان کیا تو اپنا بھی براحال ہوا۔ خیر اس کے بعد تو پینے سے توبہ کرلی۔ لیکن تم پر میری شخصیت کا غلط تاثر بیٹھ گیا۔ اور میں نے اس تاثر کو مٹانے کی کوشش بھی نہیں کی۔ تمہاری قربت ایک نشہ بن کر مجھ پر چھانے لگی تھی۔ دل خوش تھا تو دماغ نا خوش۔ ذہن کہتا تھا مرک پھوپھو کے قتل کو بھول کر ان کے قاتل کی بھانجی کے ساتھ محبت کر کے گناہ کر رہے ہو۔ یہ سوچ بہت اذیت ناک تھی۔ مگر میں اس حویلی میں ایک ہی چھت تلے رہ کر تم سے بے نیاز بھی نہیں رہ سکتا تھا۔ سو میں نے تم سے دور رہنے کا فیصلہ کیا اور نا چاہتے ہوئے بھی الیکشن لڑنے کے لیے تیار ہوگیا۔ اب دن رات باہر مصروف گزرتے۔ دماغ خوش تھا اور دل نا خوش۔ ان ہی دنوں تمہارے پریگننٹ ہونے کی خبر ملی۔ فطری خوشی ہوئی۔ پر یہ بھی لگا کہ تم میرے وجود پر اپنی محبت کی زنجیریں نئے انداز میں کس رہی ہو۔ سو جیسے ہی الیکشن جیتا۔ اسلام آباد رخت سفر باندھ لیا۔ وہاں ایک دن تمہارا میسج ملا، تم اسپتال میں تھیں۔ میں نے اماں کو تمہارا خیال رکھنے کا کہا۔ انہوں نے بتایا نہیں کہ وہ تمہارے ساتھ اسپتال میں نہیں ہیں۔ پھر بیٹی ہونے کی خوش خبری سنی۔ دل نے چاہا فوراً حویلی چلا جاؤں۔ مگر میں نے دل کی خواہش رد کردی۔ چار ماہ بعد گاؤں آیا تو تمہیں ایک نئے روپ میں دیکھا۔ سرتاپا ممتا کے رنگ

بے نیازی ہضم نہیں ہو رہی تھی۔ لیکن تم سے یہ کہنا بھی انا کی توہین تھی۔ سو میں چپ چاپ واپس آ گیا۔ پھر ایمان کی تعلیم مکمل ہوئی تو تم لوگوں نے شادی کی جلدی مچائی۔ اس موقع پر بابا نے فوری انکار کر کے اپنی چال واضح کردی۔ جسے وہ کب سے چھپائے ہوئے تھے۔ میں پہلے دل سے اس رشتے کے حق میں نہیں تھا لیکن اب جب دونوں طرف سے ذہن بنا لیا گیا تھا اور تم بھی میری ہو چکی تھیں تو ایمان کی شادی پر مجھے کوئی اعتراض نہیں تھا۔

میں نے بابا کو سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ اپنی بات پر اڑے ہوئے تھے۔ اسی دوران انہوں نے ایمان کا رشتہ دوسری جگہ طے کر کے آناً فاناً شادی بھی کردی۔ تمہارا اور ایمان کا رونا تڑپنا میں دیکھ رہا تھا پر بابا کو اپنی بات سے ہٹانا میرے بس میں نہیں تھا۔ ان کو وہی کرنا تھا جو وہ طے کیے بیٹھے تھے۔ اور پھر وہ ہوگیا جس کا ہمیں گمان بھی نہیں تھا۔ بابا پیرالائز ہوگئے۔ بعد کی سچویشن تمہارے سامنے ہی ہے۔"

وہ ایک طویل سانس کھینچ کر خاموش ہوا اور مضراب کو بغور دیکھا جو بالکل خاموش اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

"میرے اتنا کچھ بیان کرنے کا مقصد تمہیں اپنی محبت کا یقین دلانا ہے رابی۔ اور یہ بتانا بھی کہ یہ محبت آج سے نہیں جانے کب سے ہے۔ اسے میری نفرت بھی نہیں ہرا سکی۔ اب میں مکمل دل کی آمادگی سے تمہارے قریب ہونا چاہتا ہوں تو تم مجھ سے بھاگ رہی ہو۔" سارنگ نے مضراب کو خود سے لگاتے پیار سے کہا۔

"مجھے دل سے معاف کر کے قبول کرلو نا مضراب!" وہ سرگوشی میں بولا تو مضراب کے ہاتھ پیر سن ہونے لگے۔

"پلیز۔" سارنگ نے اصرار کیا مضراب کو اس کا شوخ انداز اچھا لگ رہا تھا۔

"مجھے آپ سے محبت تھی، ہے اور ہمیشہ رہے

ی سارنگ!" ساری ناراضی ایک طرف رکھ کر وہ بالآخر بول پڑی۔

"اچھا ایک بات سنو۔ ہم اگلے ماہ لندن جارہے ہیں یعنی تم، میں پری اور بابا سائیں۔" سارنگ کی بات پر وہ چونکی۔

"کیوں؟"

"بابا سائیں کے علاج کے لیے۔ میں نے وہاں ان کی رپورٹس بھیجی تھیں، اب حوصلہ افزا جواب آیا ہے تو بابا سائیں کو لے چلتے ہیں۔ اللہ نے چاہا تو وہاں سے بھلے چنگے ہو کر واپس آئیں گے۔"

"ان شاءاللہ۔" مضراب نے بے اختیار کہا۔

"پھر وطن آکر ہم کراچی میں رہیں گے، ٹھیک ہے۔ تم وہاں اپنی میڈیسن کی پریکٹس شروع کرنا یا اگر آگے ڈگری لینا چاہو...... جو بھی تمہارا دل چاہے۔" سارنگ نے پیار سے کہا تو مضراب کی آنکھیں بھر آئیں۔

"ارے جانم! اب رو کیوں رہی ہو؟" وہ بے چین ہوا۔

"آپ کی اتنی محبت پر دل بھر آیا ہے۔ کیا ہوتا اگر آپ پہلے ہی دن مجھے یہ محبت کا مان دے دیتے۔ مجھے تین سال جلنا کڑھنا تو نہ پڑتا۔" مضراب نے منہ بسور کر شکوہ کیا۔

"اپنی غلطی مان تو رہا ہوں۔" سارنگ نے شرمندہ ہو کر کہا۔

"غلطی مان لینے سے کیا میری زندگی کے گزرے قیمتی تین سال واپس آسکتے ہیں؟" مضراب نے دکھ سے کہا۔

"بالکل آسکتے ہیں۔" سارنگ سوچ کر بولا۔

"کیسے؟" مضراب چونکی۔

"وہ ایسے کہ تم اس رات کو ہماری شب عروس سمجھ لو۔ ہم دونوں نئی زندگی کی شروعات آج رات سے کرتے ہیں۔" سارنگ نے کہا تو وہ جھینپ گئی۔ سارنگ نے ساختہ قہقہہ لگایا۔

☆

نادیہ جہانگیر خان

بے ادب یا باادب

"میری بیوی بے ادب ہے۔" میرے کہنے کا مطلب یہ نہیں کہ وہ میری بے ادبی کرتی ہے یا پھر مجھ سے بھی کسی بڑے، بندے کی بے ادبی کرتی ہے۔

بلکہ وہ بے ادب ہے تو اس لحاظ سے کہ اسے "ادب" کا "ادب" کرنا نہیں آتا۔ میں "زرتاش علی زرتاش" جو ادبی دنیا میں ایک اہم اور خاص مقام (وہ بھی کوئی چھوٹا موٹا نہیں بلکہ بہت اعلا) رکھتا ہوں، جب اپنی بیوی کو دیکھتا ہوں تو دل خون کے آنسو روتا ہے (خون نہ بھی نکلے، مگر روتا تو ہے نا)

کہاں میں اتنا بڑا شاعر، مصنف، نقاد، کالم نگار اور ایک مشہور معروف جریدے کا ایڈیٹر اور کہاں وہ چار جماعتیں پاس، پانچویں فیل، مگر پھر بھی اپنے ابا کی گاؤں میں عزت کی بدولت چھٹی میں بیٹھ کر آٹھویں تک سفارشی اور رعایتی پاس ہونے والی، نری کی نری بے ادب عورت جسے سوائے "قائداعظم، علامہ اقبال اور ہمارا اسکول" کے مضمون کے علاوہ اور کوئی بھی چیز رٹی ہوئی نہیں۔

اب تو وہ ہر وقت گھر اور چولہے میں لگی رہتی ہے۔ اگر کبھی جو اس کے سامنے میری "شاعرانہ یا ادیبانہ" رگ پھڑک اٹھے اور میرا بہت دل چاہے کہ فوراً" کسی کو سنا دوں اور اس وقت سوائے اس کے مجھے اور کوئی بھی میسر نہ ہو تو مجبوراً" اسے سنانے لگوں تو الٹا وہ آلو، پیاز کا بھاؤ، مجھے سنانے لگتی ہے اور ایسے میں، میں تپ کر اگر لکھنے بیٹھ جاؤں تو ساتھ ہی اسے چینی، گھی اور آٹے کی مہنگائی یاد آجاتی ہے اور یہ یاد ایسی ہوتی ہے کہ جب تک وہ مجھ سے وہ اپنی "یاد" شیئر نہ کرلے تب تک نہ اس کو چین ملتا ہے اور نہ ہی وہ اپنے میرے جیسے "باادب" شوہر کو چین لینے دیتی ہے۔ اور ایسے میں ہمیشہ مجھ کو اپنا قلم روک کر اس کو سننا پڑتا ہے اور صرف اسی کو سننا پڑتا ہے، کیونکہ اگر میں اس کو نہ بھی سنوں تو ماشاءاللہ سے اس کے پاس یہ ہنر ہے کہ وہ مجھے سنا کر ہی رہتی ہے۔

ایک تو اس کی آواز کا والیوم بہت زیادہ، بہت اونچا ہے اور دوسرا یہ کہ اسے بولنے بلکہ "بہت زیادہ" بولنے کا خبط ہے۔ بلکہ مجھے تو اس کا یہ بولنا کسی بیماری سے کم نہیں لگتا کیونکہ وہ ایک منٹ میں ساٹھ الفاظ نہ بول لے تو اس کے پیٹ میں درد ہونے لگتا ہے اور کم از کم میں یہ درد کسی بھی صورت برداشت نہیں کرسکتا۔ کیونکہ اگر ایسا ہو جائے تو وہ فٹ بستر پر چڑھ جاتی ہے اور ایسے میں مجھے سب لکھنا لکھانا چھوڑ کر اس کی پٹی سے لگ کر بیٹھنا پڑ جاتا ہے اور ایسا میں کوئی اپنی خوشی سے نہیں کرتا بلکہ یہ میری مجبوری ہے کیونکہ اگر میں ایسا نہ کروں تو پھر میری شامت ایسے آتی ہے کہ میں اتنا بڑا شاعر اور ادیب ہو کر بھی "اس شامت" کے لیے کہیں سے بھی بلکہ دنیا کے کسی بھی کونے کھدرے سے وہ الفاظ نہیں ڈھونڈ سکتا۔ "حادثہ"...... نہیں "حادثات"۔

مجھ پہ ایک ساتھ کئی "حادثات" ٹوٹ پڑتے ہیں، جن کا سامنا کرنا میرے لیے محال تو ہے، ہی ساتھ میں جس طرح حال سے بے حال ہو جاتا ہوں وہ حال میں کسی کو نہیں سنا سکتا۔

جیسے ہی ادھر میری عزت مآب بیگم، محترمہ عاقلہ (صرف نام کی) صاحبہ بستر پہ پڑتی ہیں، ادھر عاقلہ کے تمام میکے والے اپنا بوریا بستر باندھنا شروع کردیتے



ہیں۔

خدا جانے وہ ایک ہی گھنٹے میں کیسے اتنی ساری تیاری کرلیتے ہیں کہ دوسرے ہی گھنٹے وہ اپنے بکسے' صندوق اور اٹیچی کیس اٹھائے بھاگم بھاگ فکر مندی کی شدید ترین علامت بنے میرے گھر پہ موجود ہوتے ہیں۔

میری اور عاقلہ کی ارینج میرج ہے ناتو اس لیے وہ عقلمند عورت میری بے مروتی' بے رحمی اور سنگ دلی کو خود تو بہت بری طرح محسوس کرتی ہی ہے۔ ساتھ وہ یہ سب کو محسوس کرانے کے لیے اپنا میکہ تو ایک طرف "میرے میکے" والوں کو بھی گھسیٹ لیتی ہے۔ جب اگلا پچھلا سارا خاندان جمع ہو کر میرے گھر پہ دھاوا بولتا ہے تو میں کیا' میرا سارا گھر حتیٰ کہ گھر کا سازو سامان بھی ،ل کردہ جاتا ہے۔

ان "خاندانیوں" کا میرے گھر دھاوا بول دینا اس بات کا ثبوت ہے کہ انہوں نے دو جمع دو "پورے چار ہفتے" تو ادھر ہی پڑاؤ ڈالے رکھنا ہے ۔اس بات کا ثبوت صرف میری زبان نہیں ان سب کے لائے گئے گٹھڑے' صندوق اور بکسے ہیں جو میری بیوی کو ان سے محبت اور ان کی میری بیوی سے محبت کا کھلم کھلا اظہار ہوتے ہیں۔

اور میں اک مسکین سا (بقول عاقلہ کے میسنا شخص) بھلا یہ سب کچھ اپنے نازک دل پر کیسے برداشت کر سکتا ہوں۔

ابھی ایک ہفتہ پہلے کی بات ہے' جب میں ملک میں ہونے والے ایک بہت بڑے مشاعرے میں جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا (میک اپ وغیرہ سے نہیں بلکہ اپنی تمام تر نئی اور پرانی نظمیں' غزلیں نکالے ان میں سے اچھی اور عمدہ نظموں' غزلوں کا انتخاب کر رہا تھا) اور تب میں بہت جلدی میں تھا کہ دعوت نامہ مجھے رات کو ملا تھا اور دن میں مشاعرہ تھا' میں بدحواس سا دھڑا دھڑ اپنی ڈائریاں' کاپیاں اور کاغذوں کے پلندے دائیں بائیں گرائے' بکھرائے اور کچھ اٹھائے اپنی پسندیدہ چیزوں کو سرخ پنسل سے مارک کر رہا تھا اور اس کام میں بری طرح مشغول کیا بلکہ پوری طرح "کھبا" ہوا تھا جب مجھے اپنے سے کچھ فاصلے پر "شوں" کی آواز سنائی دی۔

میں نے تیزی سے سر اٹھا کر اس "شوں" کے تعاقب میں دیکھا تو میری اپنی "شوں" نکل گئی۔

عاقلہ بی بی بڑی سے چادر کا ڈھاٹا مارے' منہ سر لپیٹے لمبا سا ڈنڈا اور ڈنڈے پہ گول سا کپڑا لپیٹے میری طرف تیر کی سی تیزی سے بھاگی آرہی تھی۔ میرا دل تو دل کلیجہ بھی منہ کو آگیا (اچھل کر) میں ایک دم سے دو فٹ کیا' اکھٹے سات' آٹھ فٹ اوپر اچھل گیا عاقلہ نے مجھے دیکھا تو بھنویں اچکا کر مجھے دیکھنے لگی۔ (شکر ہے وہیں رک کر)

"کیا ہے صاحب؟" (وہ مجھے "صاحب" کہتی ہے)

"تت تم..." میری تو گویا بولتی ہی بند ہو گئی تھی'

زبان تالو سے چپکی تھی اور اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے تھا۔

"ارے ہٹیں، آگے سے۔ آپ کے پیچھے جالا لگا ہے۔"

"نہیں.....؟" میں چونکا۔ "جالا؟" میں اچھلا۔

کیونکہ میں نے ابھی ابھی تو نیا نکور، دھلا دھلایا استری شدہ سوٹ پہنا تھا۔

"آپ کے کپڑوں پہ نہیں۔ آپ کے پیچھے....."

اس نے سر پہ ہاتھ مار کر ایسے کہا جیسے اس سے بڑا عقل مند کوئی اور ہو ہی نہ۔

"تو یوں کہو نا....." پیچھے مڑ کر دیکھا تو دیوار پہ بڑا سا جالا لٹکا تھا، میں کھسیانا سا ہو کر وہاں سے ہٹ گیا۔

"ارے سنیے۔" میں اپنی ڈائری اٹھا کر گھر سے نکلنے ہی والا تھا کہ پیچھے سے اس کی سریلی (پھٹے ڈھول) جیسی آواز میرے کانوں سے آن ٹکرائی۔ میں جو منہ ہی منہ میں اپنی ایک نظم کا مصرعہ مکمل کرنے کی کوششوں میں تھا، بد مزہ سا ہو کر پیچھے دیکھنے لگا۔

"جی....." (کیا تکلیف ہے؟) دل تو چاہا دل کی بات لبوں پہ لے آؤں مگر اس وقت میں اپنا موڈ خراب کرنا نہیں چاہتا تھا، اس لیے "جی حضوری" کرنے پہ مجبور ہو گیا۔

"آتے ہوئے میرے لیے "مونگ پھلی" لے آیئے گا۔" کالی بلی نے راستہ کاٹ کر بات بھی کو تو کیا، مذاق میں نہیں حقیقتاً" میرا جی چاہا اس کا سارے کا سارا سر پھاڑ دوں۔

"میں ادبی مشاعرے میں جا رہا ہوں مونگ پھلیوں کی ریڑھی پہ نہیں۔" میں نے چبا چبا کر اور دانت کچکچا کر کہا تو وہ شرمندہ ہونے کے بجائے دانت نکالنے لگی۔

"میں نے کون سا کہا ہے کہ جاتے ہوئے مونگ پھلی لایئے گا، میں نے آتے ہوئے کہا ہے۔" اس کا اتنا کہنا تھا کہ میرا میٹر گھوم گیا۔ اس سے پہلے کہ میری زبان گرم ہو کر کچھ اگلنے لگتی، میرا موبائل بج اٹھا۔

"بے ادب عورت۔" غصے سے اسے گھورتے ہوئے میں نے فون کان سے لگا لیا۔ وہ میری گھوری سے "تھوڑا سا" متاثر ہو کر دوسرے کمرے کے جالے اتارنے چلی گئی۔ اور یہ آج کا اس "بے ادب" عورت کا قصہ ہے کہ صبح صبح جب میں جاگا تو اسے اپنے پاس ہی سوتے پایا۔ میں حیرانی سے پہلے اسے اور پھر سامنے دیوار پہ لگی گھڑی کو دیکھنے لگا۔

"کیا بات ہے بھئی..... ابھی تک تم جاگی نہیں۔"

کیونکہ پہلے وہ فجر کی اذانوں کے ساتھ ہی جاگ جایا کرتی تھی اسے لیے میرا حیران اور متفکر ہونا لازمی تھا۔ میں نے اسے کندھے سے پکڑ کر ہلایا تو وہ آنکھیں کھول کر مجھے دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھیں بہت سرخ ہو رہی تھیں۔ میرے دل کو کچھ ہوا۔

"میری طبیعت ٹھیک نہیں۔" اس کا کہنا تھا کہ میں وہیں دل کو پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اس کی طبیعت کی فکر سے نہیں بلکہ اپنی فکر سے.....

"حادثات..... ٹبروں کے ٹبر..... صندوق، پیٹی کیس۔ کپڑوں کی گٹھڑیاں سب میری آنکھوں کے سامنے گھومنے لگے..... میرا تو سانس اوپر کا اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ کیونکہ آج میں ایک ادبی محفل میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے جا رہا تھا اور اگر آج عاقلہ کی طبیعت خراب ہو گئی تھی تو اس کا مطلب تھا کہ اگلے دو چار ہفتے میری طبیعت بھی سنبھلنے والی نہیں تھی کیوں کہ اس کے میکے والوں کے آنے کی گھنٹی ابھی سے میرے کانوں میں "کھڑکنے" لگی تھی۔

"نن۔ نہ..... نہیں پلیز عاقلہ، اپنی طبیعت آج خراب نہ کرنا۔" میں روہانسا سا ہو کر اس کی منتیں کرنے لگا۔

"کیا مطلب؟" وہ آنکھیں پٹپٹا کر مجھے دیکھنے لگی۔

"دیکھو، آج مجھے بہت ضروری کام ہے، آج اس طرح مت کرنا۔" میں تو گویا رونے والا تھا۔

"صاحب یہ کیا کہہ رہے ہیں..... آپ کا کیا مطلب ہے، میں بہانہ کر رہی ہوں؟"

"نہ، نہ میرا مطلب ایسا بالکل بھی نہیں ہے۔ میں تو....."

"صاحب آپ بالکل بھی اچھے نہیں ہیں۔" اس نے روتی سی آواز میں کہہ کر کروٹ بدل لی تو میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے کیونکہ ایسے میں مجھے اپنے "میکے" والوں کے آنے کا بھی خطرہ ہونے لگا۔ میں نے اسے پھر اپنی طرف کیا۔

"عاقلہ۔۔۔ عاقلہ تم اپنی طبیعت ٹھیک کرو، پلیز۔" میرا منت کرنا تھا کہ وہ جھٹکے سے اٹھی اور بیڈ سے اچھل کر نیچے اتر گئی۔

"امی ابھی یہ فون کرے گی اور ابھی سے بھرے پرے خاندان۔۔۔" میری آنکھوں کے سامنے تارے ناچنے لگے۔ اس سے پہلے کہ وہ باہر جاتی میں دوڑ کر اس کے سامنے آنا چاہتا ہی تھا کہ میرا پاؤں پھسل گیا، گرتے گرتے میرا ہاتھ سامنے پڑے ٹیبل پر جا پڑا جہاں بہت سی کتابیں، ڈائریاں اور میری فائلیں پڑی تھیں۔ میرا ہاتھ لگتے ہی بہت سے کتابیں اور ڈائریاں نیچے گر گئیں، عاقلہ نے دھڑام کی آواز پہ جھٹکے سے مڑ کر پیچھے دیکھا۔

"صاحب۔" اس کے منہ سے صرف اتنا نکلا اور وہ دوڑ کر میری طرف آئی اور بے حد تیزی نیچے گری کتابیں اٹھانے لگی۔ میں حیرانی سے اسے دیکھنے لگا۔

"کیا ہے صاحب، نرے بے ادب ہیں آپ، کتابوں کا ادب کرنا آپ کو آتا ہی نہیں، خود گرنا تھا تو گر جاتے، ساتھ انہیں کیوں گرا لیا۔" وہ کتابوں کو اٹھا کر اپنے دوپٹے سے صاف کرتی یوں کتابوں کو دیکھ رہی تھی جیسے بہت ہی پاک چیز اس کے ہاتھوں میں ہو اور میری آنکھیں یہ منظر دیکھتیں، وہیں ساکت ہو گئی تھیں۔

"میری بے ادب بیوی کیا واقعی "بے ادب" تھی؟" خود سے سوال کرتا میں شرمندگی کے گڑھے میں گر کر رہ گیا۔ اس نے کتابیں صاف کر کے بہت آرام سے ٹیبل پر رکھیں اور پھر میری طرف دیکھا۔ ایک کتاب میرے بازو کے نیچے پڑی تھی، اس نے پھر مجھے اٹھانے کے بجائے میرے بازو کے نیچے سے کتاب نکالی، کتاب کا ایک صفحہ تھوڑا سا پھٹ گیا تھا، وہ ناراضی سے مجھے دیکھنے لگی۔

"صاحب! ایک ورق پھٹ گیا ہے آپ سے۔"

اور میں اس کی بات سننے کے بجائے کہیں اور ہی گم تھا۔ مجھے یاد نہیں پڑتا تھا کہ میں نے کبھی اپنی کتابوں پہ دھول جمی دیکھی ہو، کبھی انہیں دائیں بائیں بکھرا دیکھا ہو (حالانکہ میں کتاب جہاں پڑھتا تھا وہیں رکھ دیتا تھا مگر اگلی بار پھر وہ مجھے اپنی جگہ پہ ملتی تھی) کتابوں میں، میں نے کبھی کوئی بے ترتیبی نہیں دیکھی تھی۔

میرے کاغذ، قلم، کتابیں، ڈائریاں، اوراق کس طرح اتنی ترتیب سے اپنی اپنی جگہ پہ رکھے ہوتے ہیں، میں نے آج سے پہلے کبھی اس بات پہ غور نہیں کیا تھا۔ اب جبکہ آج غور کیا تو شرمندگی، ندامت کی اتھاہ گہرائیوں میں گرتا چلا گیا۔

"صاحب کدھر کھو گئے آپ۔۔۔؟" میں ایک دم سے چونکا۔ وہ میرے سامنے ہاتھ لہرا رہی تھی میں غور سے اسے دیکھنے لگا۔ وہ مسکراتے ہوئے مجھے اٹھانے لگی۔ میں آہستہ سے اٹھ گیا۔

"کیا میری بیوی بے ادب ہے؟" میرے اندر سے سوال ابھر رہا تھا۔

"نہیں، نہیں۔۔۔" میرے اندر "نہیں" کی تکرار جاری تھی۔

"آپ آرام سے بیٹھیں میں چائے بنا کے لاتی ہوں۔" میں بیڈ پہ بیٹھا تو وہ چائے بنانے کے لیے جانے لگی، میں نے بڑی تیزی سے اسے کلائی سے پکڑ لیا۔ وہ مڑ کر حیرت سے مجھے دیکھنے لگی۔

"تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ تم ادھر بستر میں آؤ، میں تمہارے لیے دودھ گرم کر کے لاتا ہوں۔" میرے نرمی بھرے لہجے پہ کم میری بات پہ زیادہ اس کی آنکھوں میں حیرانی اتری، میں نے مسکراتے ہوئے نرمی سے اسے اپنے پاس بٹھایا۔

"آج میں کہیں نہیں جا رہا، آج کا سارا دن میں اور تم اکٹھے بتائیں گے، تمہارا کھانا، پینا سب میرے ذمے، تم آرام کرو گی اور میں۔۔۔ میں تمہیں دیکھوں گا۔" میرا ایک دم سے لہجہ بھاری سا ہو گیا۔ وہ جو حیرت سے مجھے دیکھ رہی تھی، آہستہ سے پلکیں جھکا گئی۔ شاید اسے یقین آ گیا تھا کہ میں بدل چکا ہوں۔

منشا محسن

تین قالب

"کیا کہوں؟"
"کیسے کہوں؟"
مجھے کیا کیا نہیں مل رہا؟
اور میں کیا کیا ڈھونڈ رہی ہوں؟

دیوانہ وار...... بھاگم دوڑ میں۔ آنکھوں میں شوق لیے۔
آج کی اس صدی میں کسی کو آنکھوں میں شوق

ناولٹ

لے کر کبھی انار کلی جیسے گنجان بازار میں لور لور پھرتے دیکھا ہے؟

مجھے یقین ہے نہیں دیکھا ہوگا...... کہا تھا ناں......

جو میری آنکھیں دیکھ سکتی ہیں وہ کسی اور کی آنکھیں کہاں دیکھ پائیں گی...... پتا ہے کیوں؟

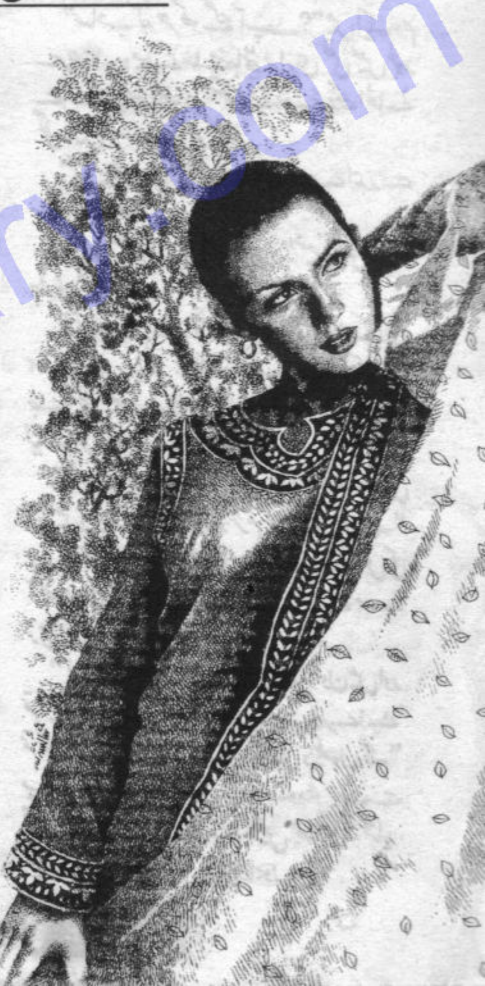
کیونکہ ہر آنکھ کا اپنا منظر ہوتا ہے۔ تماشا ہوتا ہے، اسٹیج ہوتا ہے...... اور میرے سارے منظر، تماشے، اسٹیج تو صرف اور صرف اسی تک آتے ہیں......

مجھے بہت عادت ہے دور تک نکل جانے کی...... باتوں میں، راستوں میں اور...... ہاں رشتوں میں بھی، کبھی کبھی تو میں واپسی تک کے رستے بھی بھول آتی ہوں۔

انار کلی کا لوگوں سے بھرا ہوا بازار...... انسان جیسے دوسرے انسان کے پیر تلے آکر پچک جائے...... یہ آج سارے بازار بند ہو گئے ہیں کیا جو ساری لاہور کی مخلوق انار کلی میں اُمڈ آئی ہے......

اف......اف...... آج تو میرا دن ہے۔

عقیدت منصور علی کا...... مگر یہ تو صرف میں کہتی ہوں، اپنا منظر ہی اپنا، باقی سب تو ادھار کے ہیں...... منظر، راستے اور رشتے (ہائے...... آنکھ بھر آئی)





کنجان انارکلی، بھانت بھانت کے لوگ سوٹڈ بوٹڈ، خوشبوؤں میں بسے، کچھ پان کی پیک والے اور کچھ بچ بچ کر گزرتے نفیس سے ...... آوازیں ہی آوازیں ہیں......!!

سیل...... سیل...... شرٹ، خوشبو، چھولے بھٹورے، گھڑی سے گھڑیال تک، پشواز سے لہنگے تک، غرارے سے ساڑھی تک...... ماروِن سے ڈن ہل تک...... ٹیکے سے پائل تک...... ہر شے......

میں بھی کب سے ماری ماری پھر رہی ہوں۔ آج اس کی چوبیسویں سالگرہ ہے اور میں نے اسے چوبیس تحفے دینے کا سوچا ہے...... تحفے کیا ہوتے ہیں۔ بس یہی دینا دلانا چند لمحوں کی خوشی...... اور پھر فقط ایک مسکراہٹ......

اصل مزا تو دل دے دینے کا ہے بس پھر تو مسکرائے جاؤ...... کائنات کی اوٹ اوٹ سے شرارت جھانکتی ہے اور ہنسی تو پور پور پھوٹ پڑتی ہے۔

مگر...... مسئلہ پتا ہے کیا ہے؟

ہر کوئی مجھے دوست رکھتا ہے مگر محبوب نہیں رکھتا۔ میرے حصے میں محبت نہیں آئی...... دوستیاں ہی آئی ہیں...... اور میں جو گھڑی گھڑی خوش فہم ہو کر لال گلاب کی امید میں رہتی ہوں...... کارنیٹو خوشی کی بائٹ مل جاتی ہے...... دوستی کی بائٹ اور بس......

اب تو یوں لگتا ہے کہ جیسے میرے نصیب میں محبت ہے ہی نہیں...... مگر......!!

مجھے کہیں کہیں، کبھی کبھی لگتا ہے، نہیں سب جھوٹے ہیں۔

میں تو گوندھی ہی محبت سے گئی ہوں...... جس کو محبت سے گوندھا گیا ہو تو پھر وہ تو بلا شرکت غیرے لال گلابوں کی پوری فصل کا مالک ہو سکتا ہے۔

پرانی انگریزوں کے زمانے کی اونچی عمارتیں، جن کی چھتوں پر آوارہ پیپل کی افزائش ہو چکی تھی۔ میں گھومتے پھرتے، بھاگتے دوڑتے اپنی گنتی پوری کر رہی تھی۔

چوبیس سال...... چوبیس تھے......

پھر خیال نے چپت لگائی۔

"اگر وہ تحفے کھولتے کھولتے تھک گیا تو؟"

نہیں...... نہیں...... میں پیکنگ میں سہولت سے کام لوں گی۔"

قد آدم محبت کی میم والی پینٹنگ...... کف لنکس...... پرفیوم، کتابیں، ڈن ہل کے پیکٹ، پاشا کے کرتے، سلور ڈائل والی گھڑی...... اور...... اور بہت کچھ باقی تھا۔ چوبیس کا عدد آج مجھے ساری گنتی میں سب سے اچھا لگ رہا تھا۔

آپ نے کبھی محبت کی ہے؟

اوہ...... نہیں کی ناں...... تو آپ کو کیا پتا ہو سکتا ہے بھلا...... کہاں تھا ناں میں نے کہ میں دور نکل جاتی ہوں...... باتوں میں...... رستوں میں...... رشتوں میں...... بس۔

والٹ میں جھانک کر دیکھا۔

"آٹھ ہزار پچھتر روپے۔"

میری روح فنا ہو گئی تھی...... میں جو سب سے ادھار لے کر آئی تھی۔ میری بچتوں کے ساتھ ساتھ مانگا ہوا ادھار بھی ختم ہونے کو تھا۔

شاید واپسی کا کرایہ تک بھی نہ بچے...... مگر مجھے اس کی پروا نہیں...... زیادہ سے زیادہ کیا ہوگا کہ بس پیدل چلنا پڑے گا اور بس...... کوئی بات نہیں...... اس میں مجھے مہارت ہے...... میں یہ بھی کر لوں گی۔

میں نے بس خود کو اتنا سمجھایا تھا۔

"بس اب اتنی کوشش کرنی ہے کہ ذرا بجٹ کے مطابق چھوٹے چھوٹے تحفے لینے ہیں......"

ورنہ دل کو تو ایسی ہمک لگی تھی کہ ساری انارکلی خرید لینے کو تیار بیٹھا تھا۔ آپ کو پتا ہے دل محبت میں ایسے حساب کتاب نہیں دیکھتا بس منظر دیکھتا ہے...... منظر محبوب ہو اور اسٹیج پر محبت کا کردار ہو تو بس یہی تو ساری بات ہوتی ہے...... محبت کی بات ہی ساری بات ہوتی ہے......!!

شاپر کا ڈھیر تھامے، لوگوں کے درمیان میں

…ہوئی میں ذرا برابر بھی
تھکن کا شکار نہیں ہوئی تھی۔ امی اسی وجہ سے ہمیشہ کہتی ہیں کہ میرے پاؤں لوہے کے جوتے ہیں جو کبھی تھک ہی نہیں سکتے اور آج کے دن تو کبھی بھی نہیں تھک سکتے۔ کبھی بھی نہیں!!!

غزالی آرٹ اینڈ کرافٹ سے میں ایک بادبان خرید چکی تھی۔ آگے جاتے ہوئے لیمن سوڈا پر نظر پڑی تو دل للچا اٹھا۔ ایک دل چاہا ایک گلاس پی لوں پھر دل میں خیال آیا کہ اگر چوبیس کا ہندسہ ادھورا رہ گیا تو......؟؟

ناں...... کبھی بھی نہیں...... میری پیاس ادھوری منظور ہے مجھے مگر محبوب کے چوبیس کو ادھورا نہیں چھوڑنا......!!

محبت میں سودے بازیاں نہیں ہوتیں۔ جہاں ہوتی ہیں، وہ محبتیں بھی تو نہیں ہوتیں......!!

پین ہولڈر سے لے کر دھات کی چین تک آخر میں نے چھوٹے، بڑے چوبیس تحفے مکمل کر لیے تھے۔ مجھے یوں لگا میں نے ساری دنیا خرید لی ہے۔ جس کی مٹھی میں دنیا ہو تو وہ یونہی نازاں ہوا پھرتا ہے۔ جیسے میں تھی پرانی اور نئی انارکلی کی عمارتوں نے سر کو جھکا کر مجھے دیکھا تھا۔ جیسے ہولے سے دھیرے سے مسکائی ہوں۔

"یہ لڑکی دیوانی دکھائی دیتی ہے۔"

کاش...... یہ سارے بازار کے لوگ، عمارتیں انگلیاں اٹھا کر میری طرف دیکھیں اور کہیں "یہ لڑکی محبت دکھائی دیتی ہے۔"

☆☆☆

جب میں رکشے میں شاپروں کا انبار لے کر اور تحائف سے لدی پھندی ماڈل ٹاؤن کے اس گھر کے گیٹ پر پہنچی تھی۔ تو ایک بار...... بس ایک لمحے کو میرے دل کی عمارت ہلی تھی۔ زندگی میں ہمیشہ سے ہی اس گھر کی شاندار عمارت کے سامنے میرا دل سہم سہم جاتا تھا اور مجھے چپ لگ جاتی تھی۔ ایسی چپ جو آپ کو کہیں کا نہیں رہنے دیتی...... خیر...... پھر وہی عادت...... باتوں میں دور نکل جانا......

وہ پرشکوہ عمارت، پام اور سفیدے کے درخت، اونچی دیواروں پر خاردار تاریں سامنے ہی بالکونی جہاں بیٹھ کر وہ سب تاش کھیلا کرتے تھے۔ پچھلے دنوں ہونے والی بارشوں میں وہ عمارت دھل گئی تھی۔ مجھ پر اس عمارت اور اس میں رہنے والوں کا سحر ہمیشہ سے ہی طاری ہے جو کبھی بھی ختم نہیں ہوتا......!

آج بھی سب کچھ ویسے کا ویسا تھا...... نیا...... تازہ...... شگفتہ۔

میں نے گھنٹی بجائی تھی اور چوکھٹے میں ابراہیم کا سر ابھرا تھا۔

"ارے عقیدت بی بی...... آپ؟"

وہ ہمیشہ مجھے عقیدت سے ہی مخاطب کرتا تھا۔ اس وجہ سے نہیں کہ میرا نام عقیدت تھا اس گھر کے ہر فرد کے لیے میں اہم تھی......!

ابراہیم نے پہلے دور جاتے رکشے کو دیکھا تھا اور پھر مجھے لدا پھندا دیکھ کر استفسار کیا تھا۔

"یہ سب؟"

"گیٹ کھولیں گے یا یہیں ساری تفتیش ہوگی؟"

گیٹ کھل گیا تھا۔ سامنے لش گرین گھاس تھی۔ اس سے کچھ فاصلے پر سوئمنگ پول۔ پہاڑی چڑیوں کی آوازیں...... سرمئی بطخوں کی جوڑیاں...... میں دھیرے سے آگے چل کر آئی تھی۔

"آپ کو پتا نہیں چلا؟"

میں ابراہیم کی پیچھے سے آتی آواز پر چونک کر پلٹی تھی۔ میرا شولڈر بیگ میرے کندھے میں درد پیدا کر رہا تھا ساری تھکن جیسے کندھوں میں سمٹ آئی تھی۔

"کیا نہیں پتا؟" یہ دوپہر کے بعد کا وقت تھا ہلکا...... دھیما...... سکون والا۔

"وہ اسپتال میں ہیں"

یوں لگا سورج سر پر اُگ آیا ہو...... اور زمین پاؤں تلے سے کھسک کر مجھے دلدل میں دھنسا گئی ہو۔ میں نے دل پر ہاتھ رکھ لیا تھا دھڑکنیں منتشر ہو گئیں۔

"کک...... کیا ہوا؟"

ان کا شدید ایکسیڈنٹ ہوا ہے پچھلی رات کو۔
تب سے وہ اسپتال میں ہیں...... آج ان کا آپریشن ہے۔"

مجھے یوں لگا آسمان میرے سر پر ٹوٹ پڑا ہو۔ اور میں بغیر چھت کے کھڑی ہوں۔ میں تو دل کی بات کرتی ہوں...... تو میرے دل نے مجھے اس کی تکلیف کا سگنل کیوں نہ دیا؟

"ہائے......" میرا شولڈر بیگ گر پڑا۔ میں سارے وزن کے ساتھ بیٹھتی چلی گئی۔ میں اپنی ہر تکلیف سہہ لیتی ہوں...... بخار، ٹائیفائڈ، لقوہ سب مرض میں ہنس کر سہہ چکی ہوں مگر اس شخص کے سر کا درد بھی مجھے چین نہیں لینے دیتا۔ کبھی بھی نہیں۔ وہ انسان تو عقیدت منصور علی کا دل ہے جہاں اس کی محبت کی فصل اگی ہوئی ہے، آپ نے کبھی بادوباراں میں کسی کسان کی اجڑی ہوئی حالت دیکھی ہے؟

وہ بہک جاتا ہے...... اس کا دماغ سٹک جاتا ہے۔ کسان کا عشق اس کی فصل ہوتی ہے اور میری متاع...... میں سب چھوڑ چھاڑ کر ابراہیم سے اسپتال کا پتا پوچھتی باہر کی طرف بھاگی تھی۔ میرا شولڈر بیگ وہیں رہ گیا تھا۔ جس میں واپسی کا کرایہ بھی نہیں تھا۔

☆☆☆

ڈاکٹر، اسپتال کی ٹھنڈک نے میری روح تک میں رسائی حاصل کرلی تھی۔ مجھے اسپتال کبھی بھی اچھے نہیں لگتے تھے عجیب وحشت اور بے سکونی محسوس ہوتی تھی۔

ریسیپشن سے ہوتے ہوئے پہلی سے دوسری منزل، دوسری سے تیسری...... اور پھر میں نے لاریب سکندر کو اپنے سامنے موجود پایا تھا۔

"عقیدت!"

میرے قدم من من کے ہونے لگے تھے۔ وہ مومی گڑیا جیسے مسلسل رو رہی تھی۔ جیسے میں جہاں زیب کو دکھ میں تکلیف میں نہیں دیکھ سکتی تھی بالکل اسی طرح وہ لاریب کو نہیں دیکھ سکتا تھا۔

جان کیسا ہے اب؟

ہم سب اسے جان کہہ کر بلاتے تھے۔ یہ اس کا نک نیم تھا۔ جو اس نے خود اپنے آپ کو دیا تھا۔ اور اس بات پر ہم سب کتنا ہنسے تھے۔ بہت عجیب لگتا تھا پہلے پہل پھر بعد میں سب کو عادت ہوتی چلی گئی تھی۔

"اس کا ایک بازو کاٹ دیا ہے۔"

وہ سسک سسک کر رو رہی تھی۔ وہ ایسی ہی تھی شروع سے...... تھوڑے دل کی...... بہت روتی تھی بات بات پر......

"اس کا دل تو ٹھیک ہے ناں؟"

لاریب کو بازو کی فکر تھی۔ مجھے دل کی پرواہ تھی۔ ہم دونوں کے اپنے اپنے تقاضے اور چاہ تھی۔ ہر آنکھ اپنی اپنی پسند کا منظر دیکھتی ہے۔ جیسے وہ...... اور جیسے میں......

لاریب نے ٹشو سے آنکھیں صاف کی تھیں۔

"ہاں، دھڑک رہا ہے۔"

"اف...... شکر ہے...... شکر ہے......"

میں نے خود کو ذرا کی ذرا حواسوں میں آتا ہوا محسوس کیا تھا۔

"کیا میں اسے دیکھ سکتی ہوں؟"

لاریب نے سر ہلا کر آپریشن تھیٹر کی طرف اشارہ کیا تھا اور میں اڑتی ہوئی اس شیشے تک آئی تھی جس کے پار وہ سانسیں لے رہا تھا۔ سانس کا زیرو بم...... میرے ہاتھ شیشے پر جمے رہ گئے اور میں دیکھتی رہ گئی تھی۔

وہ آنکھیں بند تھیں جن کی میں دیوانی تھی۔ وہ لمبی انگلیوں اور گلابی پوروں والے ہاتھ بے حرکت تھے۔

ماتھے پر بینڈ یج تھی۔ لمبی پلکیں سوتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ میں نے وہیں کھڑے کھڑے اللہ کا شکر ادا کیا تھا۔ اس لیے نہیں کہ وہ صحیح سلامت تھا بلکہ اس وجہ سے کہ وہ بنایا گیا تھا۔ پیدا کیا گیا تھا۔

"ہوتا ہے ناں کوئی ایسا جو سب کے جیسا نہیں ہوتا۔ سب سے الگ ہوتا ہے۔ خاص ہوتا ہے۔ جیسے

جہاں زیب تھا۔ میں چھ ... اسپتال کی کینٹین
میں لاریب کے ساتھ بیٹھی کافی کے گھونٹ لیتے ہوئے اسے سن رہی تھی۔

''عیب لگ گیا ہے اسے۔''

''عیب کیوں دیکھ رہی ہو؟''

''میں سب دیکھتی ہوں۔ یہی میری فطرت ہے اور یہ بات سب جانتے ہیں۔''

''اس نے خود اپنا بازو کاٹ کر نہیں پھینکا۔''

''میں تو اپنا قصور بھی معاف نہیں کرتی عقیدت۔ میں کیسے اس کا سامنا کروں گی۔ مجھے معلوم ہے سب سے پہلے وہ مجھ سے ملنا چاہے گا...... دیکھنا چاہے گا۔''

''تم خوش قسمت ہو۔'' میں کافی کے سپ لیتے ہوئے اس سونے کے تار جیسے بالوں والی لڑکی کو بغور دیکھ رہی تھی جو جہاں زیب کی محبت تھی۔ وہ لاریب پر جان دیتا تھا۔

''وہ تمہیں دیکھنا چاہے گا۔ تمہاری آنکھیں پڑھنا چاہے گا۔ تمہارے ہاتھ کی چھوٹی انگلی پکڑ کر تمہارا لمس محسوس کرنا چاہے گا...... پھر تم سے کہے گا خاموش رہو۔ وہ گہرے گہرے سانس لے کر تمہارے پرفیوم کی خوشبو کو اپنی نس نس میں اتارے گا اس سب میں وہ سب بھول جائے گا۔ سب کچھ...... جو اس پہ بیتا ہوگا...... سارا کرب، تکلیف، درد...... تم اسے سب بھلا دو گی لاریب......''

لاریب سکندر کی کافی ٹھنڈی ہوتی جا رہی تھی۔ اور مجھے تشویش تھی کہ وہ ٹھنڈی کافی سے چڑتی تھی۔ مگر ابھی اس نے مجھے حیران کر دیا تھا۔ وہ غائب دماغ سی لگ رہی تھی۔ جیسے اپنے آپ میں نہیں تھی۔

''لاریب کیا ہوا ہے؟''

میں نے وہ ٹھنڈا ہاتھ تھپتھپایا تھا...... وہ شہد رنگ آنکھوں، ملائم جلد والی لڑکی...... جو اپنے اصولوں کی بڑی پکی تھی۔ آنکھوں میں ساون بھر کر مجھے دیکھتی رہ گئی تھی۔

''عقیدت...... دل نہیں مان رہا۔''

یہ کہہ کر لاریب نے میری جان لے لی تھی۔
میں نے کہا تھا ناں جہاں زیب امین کا ہر درد مجھے محسوس ہوتا ہے۔ اس شخص کا تو مائیگرین تک بھی میں جھیلتی ہوں یہاں تو؟

لاریب سکندر ایسے کیسے کر سکتی تھی؟

ہر پھٹا ہوا رفو نہیں ہوتا۔

دل بھی ادھڑ جائے تو رفو نہیں ہوتا۔

کینٹین کی دیواروں نے اکٹھا ہونا شروع کر دیا تھا۔

میرا دم گھٹنا شروع ہو چکا تھا۔

مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ میں اچھی رفوگر ہرگز نہیں ہوں۔ کبھی بھی نہیں رہی...... اب بھی نہیں...... تو تب بھی نہیں......!!

زندگی کے اس ایکٹ میں تو مجھے خود ایک رفوگر کی ضرورت تھی۔

☆☆☆

جیسا کہ آپ جانتے ہیں میرا نام عقیدت ولد منصور علی ہے۔ میری امی کا نام رقیہ بیگم ہے جو کہ مجھ سمیت چار بچوں کی اماں ہیں۔ میں، طلعت، صولت اور گلاب......

گلاب ہمارا معذور بھائی ہے جو ہمیں بہت ہی پیارا ہے۔ انسان معذور بھی ہوں تو کوئی بات نہیں۔ بس رشتوں اور تعلقات کو بھی کہیں بھی معذور نہیں ہونا چاہیے۔ یہ چیز زندگی کو بہت مشکل بنا کر رکھ دیتی ہے۔

ہمارا گھر چھوٹا سا ہے مگر بہت اچھا لگتا ہے کیونکہ اس گھر میں ہم سب پورے تو آجاتے ہیں کوئی بھی ایسا نہیں جو لیٹے تو ٹانگیں دروازے کے باہر نظر آئیں۔ ناں۔

پھر کیا واویلا مچانا اور رونا دھونا۔ یہ چیز کم از کم میں نے تو اپنی زندگی میں نہیں سیکھی باقی اپنے بہن بھائی کی گارنٹی میں نہیں دے سکتی کیونکہ ہر انسان کا بیج خمیر مختلف ہوتا ہے۔ جب آنکھ، کان، جدا جدا ہیں تو پھر ضمیر، سوچ اور دل بھی ایک طرف کر لیجیے......

ہے......دن..
تین کمرے...... چھوٹے چھوٹے مگر ہمارے لیے کافی ہیں۔

ایک ٹی وی لاؤنج اس کے آگے گیلری جہاں ہم نے کچھ ان ڈور پلانٹس کے گملے رکھے ہوئے ہیں، یہیں دیوار پر گلاب کے توتے کا پنجرہ بھی ہے۔ توتے مجھے خاص پسند تو نہیں۔ آہاں...... شاید میں نے کچھ غلط کہا...... توتے پسند ہیں بس قید پسند نہیں...... یہ بری چیز ہوتی ہے...... وحشت ناک ...... دردناک......

گیلری سے آگے پھر چھوٹا سا صحن ہے جہاں امرود کا ایک سوکھا چڑ رخ سا پودا ہے۔ جس پر پتے آتے جاتے رہتے ہیں۔ صحن کے دائیں جانب واش روم اور بائیں جانب ہمارا کچن ہے۔ کچن اس گھر کی وہ جگہ ہے جو امی جی کی فیورٹ ہے جہاں وہ اکثر اوقات بس کھانے پکانے کے علاوہ بھی بیٹھی رہتی ہیں، ہوتی ہیں ناں کچھ مخصوص جگہیں جہاں بیٹھ کر انسان اپنے آپ کو اپنا اپنا لگتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے امی یہیں اپنی زندگی کا سب سے زیادہ وقت گزارتی ہیں۔ کچن کی کھڑکی سے کبھی کبھی ٹیک لگا کر باہر ٹکٹکی باندھے گلاب کو دیکھتی رہتی ہیں۔ میں نے کبھی انہیں اس اکلوتے منظر سے بور ہوتے نہیں دیکھا۔

پھر سوچتی ہوں اولاد سے کون بور ہوسکتا ہے؟
یہ میرا سوال ہے۔

''ابا ہوسکتے ہیں...... دادی ہوسکتی ہیں۔ پھوپھو ہوسکتی ہیں......'' یہ زہر زہر لہجہ صولت کا ہوتا تھا۔ شاید اب بھی ہے۔

''صرف ابا کی اولاد ہیں ہم ...... دادی اور پھوپھو کو بیچ میں مت لاؤ۔''

''جب تم نے اپنی بات میں وزن لانا ہو تو پورا محلہ اکٹھا کر لیتی ہو جب میری بات ہو تو دادی، اور پھوپھو کو پرایا کرنے پر تل جاتی ہو۔''

''میں ایسا کچھ بھی نہیں کیا کرتی۔ بس تم اپنی باتوں اور دلیلوں کی سمت درست رکھا کرو۔''

میں نے ہمیشہ یہی کیا ہے عقیدت! اور تم دل ہی دل میں یہ بات مانتی بھی ہو مگر تمہیں عادت ہوگئی ہے بحث کرنے کی، ضد پر اتر آنے کی۔''

''یہ بحث صحن میں پڑے پلنگ پوش پر جاری تھی۔ امی ابھی بھی باورچی خانے کی کھڑکی سے ٹیک لگائے باہر دیکھ رہی تھیں...... غائب دماغ...... کھوئی کھوئی...... جیسے کہیں کچھ رکھ کر بھول گئی ہوں۔ مجھے لگتا ہے ہر بار وہ کوئی برتن بھولتی ہوں گی۔ مگر طلعت کہتی تھی کہ وہ خود کو بھول بیٹھی ہیں۔

مگر میں اپنے دل کو ہمیشہ سیدھی راہ دکھاتی ہوں۔ گنجلک راستوں پر نہیں ڈالتی مگر میرے گھر کے باقی افراد کو یہ عادت ہے ...... خیر...... ہر کسی کا اپنا بیج...... سوچ، خیال، ہم معصوم کس کھیت کی مولی۔ کسی کھاتے میں نہیں آئیں گے......!!

''ابا کی بات بھی کیوں کرتی ہو۔ مت کرو...... تم لوگوں کی بحث میں گندم کے ساتھ ساتھ گھن بھی پس جاتا ہے۔ ابا نے ہماری پیدائش پر کوئی شکوہ نہ کیا...... بات کرنی ہے، تو دادی مرحومہ کی کرو جو چندے آفتاب پوتا چاہتی تھیں۔ مل تو گیا مگر تب جب دادی جان اگلے سفر کو جا چکی تھیں۔ پھر بات آتی ہے پھپھو پر جو ہر بار اماں کو طعنے دے دے کر نہ تھکتی تھیں۔ اب تو وہ بھی ٹنڈو اللہ یار جا بسیں۔ ابا بے چارے تو تین میں نہ تیرا میں ایسے چپ کے پکے ہیں کہ جانے کیسا روگ لگا ہے ان کو...... ضرورت کے وقت بولیں گے اور دھان سوکھے چھوڑ جائیں گے۔''

طلعت کو آئینہ دیکھنے اور دکھانے میں بہت مزہ آتا تھا۔ تب ہی وہ ان دونوں کاموں میں ذرا بھی کنجوسی سے کام نہ لیتی تھی۔ ابا کی لاڈلی تھی بقول اس کے ...... ابا کے سارے کام مانو اس پر فرض قرض تھے...... دوڑ دوڑ کر جاتی تھی۔ اگر جو بھی میں کہتی کہ مجھے پیمانے لکیریں سیدھی کردے تو محترمہ کے پیٹ میں اینٹھن اور مروڑ جاگ اٹھتے ......

میں نے امی جی اور ابا کو بہت کم کھل کر بات کرتے دیکھا سنا تھا۔ جانے کون سا گونگے کا گڑ کھایا

تھا دونوں کے۔ میں بہت باتونی تھی۔ پھر نہ رہی۔ طبیعت میں عجیب ٹھہراؤ آ گیا۔ وقت ایسے ہی کرتا ہے...... خام کو الگ...... خاص کو الگ...... جو باقی بچتا ہے وہی ہماری بچت ہوتی ہے......!!

میں بھی اپنی بچت کے سہارے زندگی گزار رہی تھی۔ آخر میں ہر کوئی ایسا ہی تو کرتا ہے ناں...... اس چھوٹے سے گھر میں کبھی کبھی اتنی خاموشی ہو جاتی تھی کہ شور ڈالنے کو اسٹیل کے پیالے گرانے پڑتے تھے تاکہ پتا تو چلے کہ یہاں انسان بستے ہیں۔ جہاں بھی انسانوں کا بسیرا ٹھکانا ہو تو ان جگہوں کو انسانوں کی رہائش جیسا لگنا ضروری ہے۔ ابا وہی رہے چپ کے چپ...... مطلب کی بات۔

بس اتنا ہوا کہ اماں کو زبان لگ گئی اور ساتھ ہی ہول اٹھنا شروع ہو گئے کہ تین جوان ہوتی ہوئی لڑکیوں کی ماں تھیں۔

سچ تو یہ ہے کہ ہم نے انہیں کبھی تنگ نہ کیا تھا۔ کام بانٹ لیتی تھیں۔ کپڑے تک بانٹ لیتی تھیں۔ جس کو جس چیز کی ضرورت ہو بنا پوچھے استعمال کر سکتا کوئی دنگا فساد نہ ہوتا تھا۔

جب میں نے شاندار نمبروں سے انٹر مکمل کر لیا تو سارا سارا دن مشہور یونیورسٹیوں کے بارے میں جانچ پڑتال شروع کر دی۔ وہ خوابوں کی ایک حسین ترین دنیا تھی۔

جہاں سب کچھ بدل جاتا تھا۔

خوابوں کی اس دنیا میں، میں اپنی بہنوں کو بھی شریک کر لیتی تھی اور رات گئے تک ہم باتیں کرتے رہتے تھے۔

''ہائے...... قائداعظم کیسی رہے گی؟''

کاڑھا پٹی صولت کو اچھو لگا تھا۔

''خواب دیکھو۔ ضرور دیکھو مگر پیر زمین پر ہی رکھو تو زیادہ بہتر رہے گا۔''

''تم خود بھی چھوٹی ہو اور خواب بھی چھوٹے ہی دیکھتی ہو۔''

''قائداعظم یونیورسٹی کا ہی کہا ہے۔ آکسفورڈ کا نام نہیں کیا جو ہمیں چونٹیاں کاٹ رہی ہیں۔''

''میرا کیا ہے کیمبرج پڑھو۔ ہارورڈ چلی جاؤ بہن۔ مگر مجھ میں یہ خوبی مفقود تھی۔''

''اسلام آباد کا موسم...... کھلے کھلے روڈز، پہاڑیاں...... مارگلہ ہلز۔ سکون کی فضا۔''

طلعت کپڑے استری کر کے اب تہہ لگا کر رکھ رہی تھی۔ کمرے میں ٹی وی بھی آہستہ آواز میں چل رہا تھا۔

''اونٹ رے اونٹ تیری کون سی کل سیدھی، لوگ لاہور کے لیے مرے جاتے ہیں اور تم اسلام آباد کے دکھڑے رو رہی ہو بہن...... لاہور کی رونقوں کے مقابلے میں پھسپھسا سا شہر ہے۔ اور جتنی بے چینی اور اضطراب تمہاری فطرت میں ہے تمہیں لاہور کے علاوہ اور کوئی بھی شہر راس نہیں آ سکتا۔''

طلعت جب بھی کوئی منظر نامہ کھینچ دیتی ہے تو ویسا ہی کم و بیش ہو جاتا ہے۔ میں اس کی بات کو سنجیدگی سے لے رہی تھی۔ جب تک جس مٹی سے قدم اکھڑ نہیں جاتے تب تک وہاں کی قدر نہیں ہوتی۔ میرا بھی وہی حال ہوا۔ لاہور ریلوے اسٹیشن سے اسلام آباد داخلے کے فارم جمع کرا آئی مگر وہاں ایسی چپ اور صوفی قسم کی فضا تھی کہ لاہور کا بندہ چند دن تو گزارا کر لے مگر چار سال کا عرصہ رہنا آسان ہرگز نہیں تھا۔ لمبی ناگن سی بل کھاتی سڑکیں۔ سنجیدہ لوگ، پہاڑ اور خنکی، میری روح تک تھرا اٹھی تھی۔ واپس آ کر میں نے طلعت کو خوب خوب کوسا تھا۔

''تمہاری زبان ہی کالی ہے۔''

امی جی نے کڑھائی والے فریم سے سر اٹھا کر سرزنش کے انداز میں مجھے دیکھا تھا۔

''تمہارا مسئلہ یہ ہے کہ ہر فیصلہ تم دل سے کرتی ہو۔ آج کے زمانے میں دماغ بھی اتنا ہی ضروری ہے۔'' صولت سلائی مشین کی پھرکیاں اکٹھی کر کے مکینک بنی بیٹھی تھی۔ گلاب اپنے توتے کو اسپرین گھول کر پلا رہا تھا۔ میں نے دل کے اندر جھانکا تھا۔ طلعت نے ہمیشہ کی طرح مجھے صحیح پڑھا تھا۔ سارے

فیصلے دل کے ہوتے تھے۔ رہی بات دماغ کی تو وہ جانے امی جی کی کون سی جہیز کی پیٹی میں بند تھا۔

☆☆☆

انٹر تک تو ہر کسی کی زندگی میں راوی چین ہی چین لکھتا ہے مگر بعد میں جو ہوتا ہے پھر چین کے علاوہ سب ہوتا ہے مگر یہ چین کہیں غائب ہو جاتا ہے۔

میں امی جی کے آگے پیچھے تھی۔ اور وہ صرف آگے آگے۔ مجھ سے بچ بچاؤ کرتی ہوئی۔ انہیں پتا تھا مجھے اگر اپنی بات منوانا ہو تو منوا کر ہی رہتی ہوں۔ امی جی بھی پچھلے دو ہفتوں سے پیٹیاں، ٹرنک کھولے اپنی بچتوں کا حساب کتاب لگا کر تھک گئی تھیں۔ جمع جتھا نہ ہونے کے برابر تھا۔ تین بانس برابر لڑکیاں...... معذور بچہ...... وہ دونوں میاں بیوی، بیماری...... سو مسئلے مسائل اور اوپر سے میری آگے پڑھنے کی رٹ...... گورنمنٹ یونیورسٹی لاہور میں داخل ہو گیا تھا۔ بے شک اسکالرشپ پر ہوا مگر کچھ فیس بھرنی تھی اور کچھ فیس کا سن کر ہی امی جی کا دمہ بڑھ گیا تھا۔

"عقیدت ...... یہ بہت زیادہ پیسے ہیں۔ کم پیسوں والی پڑھائی کر لے۔ پرائیویٹ پڑھ لے۔ تم تینوں کی شادیاں ہیں...... گلاب کا علاج چل رہا ہے۔ تیرے ابا بھی ریٹائرمنٹ کے قریب ہیں۔"

میرا خواب...... جیسے کسی کنارے لگنے کو تھا۔ وہ شیخ چلی جیسے خواب...... کیا سب ادھورا رہ جائے گا؟ میں نے بھی جیسے تیسے کر کے آنکھوں میں کئی ساون بھر لیے پہلے طلعت کو دبوچا۔

"بہن...... تو ہی مدد کر دے۔ میں اکیلا سپاہی کہاں تک دفاع کروں؛...... قسم سے میں پڑھ لکھ کر تم لوگوں کا خوب نام روشن کروں گی...... تمہارے اچھے بر ڈھونڈوں گی۔ تمہاری سب ذمہ داریاں میرے ذمہ آ گئیں...... میں ساتھ ساتھ کسی اکیڈمی میں پڑھا بھی لوں گی۔"

گیلری میں پودوں کو پانی دیتی طلعت نے سر ہلا کر جیسے میری بات کا متن اپنے ذہن میں جمع تفریق کیا تھا۔

"اگر تم یونیورسٹی جا کر باغی ہو گئیں تو؟"

"دفع دور...... جب گھر کے ہی لوگ دشمن ہوں تو بندہ کیا کرے۔"

وہ ہنس دی تھی۔ قریب آئی کندھے پر ہاتھ رکھ کر مجھے دیکھا۔

"تم فکر مت کرو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ مجھے اور صولت کو تو ویسے ہی پڑھائی سے ہول اٹھتے ہیں۔ جو جماعتیں باقی ہیں گھر بیٹھ کر پڑھ لیں گے۔ ویسے بھی صولت نے آگے پارلر کا کام کرنا ہے۔ اور میں خود آن لائن سلائی کڑھائی کا سوچ رہی ہوں...... چلو...... میں امی سے بات کروں گی۔"

ان دنوں میں نے گلاب کے مٹھو کا بھی خوب خوب خیال رکھا تھا۔ امرود، چوریاں کھلا کھلا کر مٹھو کو ہٹا کٹا کرنے کے ساتھ ساتھ، گلاب کی ہمدردیاں بھی سمیٹ لیں......!!

صولت نے بھی امن کا جھنڈا لہرا کر میری طرف شمولیت اختیار کر لی تھی۔

یوں طلعت، صولت، اور گلاب، تین لوگوں پر مشتمل اس وفد نے میرا مقدمہ سپریم کورٹ میں لڑ کر مجھے فتح سے ہم کنار کیا تھا۔

وہ میری زندگی کا ایک بہترین دن تھا......!!

گورنمنٹ کالج ایک خواب تھا۔ وہ سلجھا ہوا ماحول، سنجیدہ لوگ، جن کے قہقہوں میں بھی عجب نفاست اور تمکنت کا گمان ہوتا۔ پر مغز دلائل سے بھرپور مباحثے۔ وہ نگر جہاں کے باسی اشفاق احمد اور عبداللہ حسین جیسے لوگ تھے۔ وہاں قدم دھرنا عام بات نہیں تھی۔

کم از کم میرے لیے تو ہر گز بھی نہیں......!!

☆☆☆

گورنمنٹ کالج میرے لیے ایک الف لیلوی داستان کی طرف کھلتا ہوا دروازہ تھا۔ جو کھلا تو اسرار کی طرف لے کر ہی گیا اور میں مسحور سی چل پڑی۔ میں چلتے چلتے بہت دور نکل جاتی ہوں۔ میری عادتوں میں سے یہ بھی میری ایک عادت ہے......

میری یہی عادت مجھے لاریب سکندر تک لے آئی تھی۔

آپ کو کبھی ایسے لوگ ملے ہیں؟ یا پھر آپ نے کبھی ایسے لوگ دیکھے ہیں؟ جو مکمل مکمل سے لگتے ہیں؟ پورے پورے سے؟

میں نے دیکھا ہے۔ میں سچ کہتی ہوں۔ وہ ایسی ہی تھی۔ مجھے لگا اس کو خالص شہد سے گوندھا گیا ہو۔ سونے کے تاروں سے بنی ہوئی۔ وہ ہنستی تھی تو لڑکیوں کا دل بھی دھڑک جاتا تھا۔ مدھر ہنسی، جھرنوں جیسی۔ کسی قدیم مندر کی گھنٹیوں جیسی...... لگاتار...... اور مسلسل!!!

(مجھے معلوم ہے کہ آپ میری یہ کہانی پڑھ رہے ہیں مگر میں آپ سے اتنا کہوں گی کہ اس کہانی میں کوئی بھی ولن نہیں ہے۔ فرق بس اتنا ہے کہ ہر کوئی اپنے آگے مجبور ہے۔ کسی کو کسی سے محبت نہیں ہے تو بس نہیں ہے...... اس کھیل میں واویلے نہیں چلتے)

"مجھے دیکھ لیں...... میں نے واویلا کیا؟"

نہیں ناں...... اوہ میں پھر کہیں کی کہیں نکل گئی

ایک بار پھر معذرت...... معذرت میں بہت حسن پرست ہوں۔ لاریب کا حسن مجھے بھی متاثر کر گیا۔ میں حسین نہیں ہوں...... دلکش و خوب صورت بھی نہیں ہوں...... عام سی ہوں...... خالق کی اس تخلیق سے سو فیصد مطمئن ہوں۔ مجھے تخلیق میں کھوٹ نکالنا نہیں آتا۔ کبھی بھی نہیں...... کسی کی بھی نہیں......

سالن اچھا نہ لگے تو یا تو کھالیتی ہوں چپ کر کے۔ ورنہ خاموشی سے دسترخوان چھوڑ دیتی ہوں

جب میں نے لاریب سکندر کو دیکھا تو یونہی ایک خیال آیا تھا۔ "اگر میرے بس میں ہوتا تو لاریب سکندر ہو جاتی۔" میں نے بس اسے دیکھنے کا معمول بنایا تھا۔ کیسے ہنستی ہے؟ بولتی ہے؟ حرکات و سکنات؟ کسی کتاب کی طرح پڑھ لیا۔ سب ٹھیک تھا۔ مگر......؟

لاریب سکندر عیب برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ وہ کھوٹ پسند نہیں تھی۔ مکمل چیز پر اس کا دل آتا تھا۔

وہ سوموار کا ایک بادلوں بھرا دن تھا جب ہم کلاس میں آخری نشستوں پر اکٹھے ہوئے تھے۔

وہ جھک کر میرے ٹفن کو دیکھ کر پوچھ رہی تھی۔

"تمہارے پاس کھانے کو کچھ ہے؟"

میں اس سوال کی توقع نہیں رکھتی تھی۔ حیران ہو گئی۔

میں نے ٹفن اس کے سامنے کھولا تھا۔

"یہ کیا ہے؟ میں کھا سکتی ہوں۔ مجھے بہت بھوک لگ رہی ہے۔"

پکوڑیاں اٹھا کر اجازت لے رہی تھی۔

میں نے مسکرا کر سر ہلا دیا تھا۔

"یہ پکوڑیاں ہیں۔"

"وہ کیا ہوتی ہیں۔"

"پکوڑے کی بہنیں۔"

وہ ہنس دی تھی۔ جلترنگ بج اٹھا۔ وہیں کوئی مندر راگ آیا۔ قدیم گھنٹے بج اٹھے۔ ٹن ٹناٹن......

"یہ میری امی جی بناتی ہیں، چھوٹے پکوڑے۔ میرے بھائی گلاب نے انہیں پکوڑیوں کا نام دیا ہے۔"

"میں دو اور کھا سکتی ہوں؟"

وہ ہماری دوستی کی ابتدا تھی۔ اس کے بعد کھانے اکثر ہم نے ایک ساتھ کھائے تھے۔ وہی وہ وقت تھا جب ہم دونوں کو ایک دوسرے سے مکمل واقفیت ہوئی تھی۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے متاثر تھے۔

میرے پاس کئی وجوہات تھیں۔ جانے اس کے پاس کون سی اکلوتی وجہ ہو گی مجھے دوست رکھنے کی...... میں نے کبھی استفسار نہیں کیا۔ کچھ چیزیں پردے میں اچھی لگتی ہیں۔ پردے چاک ہو جائیں تو بے چین کرتے ہیں......

گورنمنٹ کالج کی سڑک پر ٹہلتے ہوئے برآمدوں اور تھیٹر ہال میں ہم دونوں خوب باتیں کرتی تھیں۔ کوئی ادیب پکڑ لیا...... کوئی برانڈ ڈھونڈ لیا۔

میں دھکے کھاتی پبلک ٹرانسپورٹ سے آتی جاتی تھی اور وہ اپنی گاڑی میں آتی تھی۔ میری اور اس کی

ہم مقناطیس کے مخالف پول تھیں۔ جو کشش کے اصول پر کام کرتے ہیں۔

ان ہی دنوں جب میں لقوے کا شکار ہو گئی تھی تو وہ ہمارے گھر چلی آئی تھی۔ اور مجھے اسے گھر میں بٹھانے کے لیے کوئی تردد نہیں کرنا پڑا تھا۔ طلعت اور صولت سے اس نے دوستی کر لی تھی۔ گلاب بھی اس کی آمد سے خوش تھا کہ وہ وقفے وقفے سے اس کے توتے کے بارے میں بھی سوال و جواب کر رہی تھی۔ امی جی نے پکوڑیوں، دہی بڑے، چائے اور زردے سے تواضع کی تھی۔ میرے گھر میں میرے گھر والوں میں بیٹھی وہ مجھے پھر سے اپنی اپنی لگی تھی۔ مجھے لگا، میں اس سے بالکل واقف نہیں تھی۔ انسان معمہ ہے۔ پہیلی ہے۔ کھوجو، پرکھو، پھر بھی کہیں رہ رہ جاتا ہے......!

طلعت اور صولت ہر بار اس کا ذکر لے کر بیٹھ جاتی تھیں۔

"لاریب کتنی اچھی ہے"

"وہ بہت زیادہ اچھی ہے۔"

"خوب صورت بھی ہے"

"بہت ہے"

"مجھے حیرت ہے، آپ دونوں کی دوستی کیسے ہو گئی؟"

"حیرت کیوں ہے۔"

"وہ اتنی امیر ہے؟"

مجھے پانی پیتے اچھو لگا تھا۔ پھر میں ہنس پڑی تھی۔ جیسے دماغ چل گیا ہو۔

"وہ کسی جھونپڑی سے بھی اٹھ کر آتی ناں تو پھر بھی ہم دوست ہوتیں۔"

"اور اگر تم جھونپڑی میں پلی بڑھی ہوتیں تو؟"

یہ سوال امی جی کی طرف سے آیا تھا۔ میں نے سوچا۔ ایک منٹ، دو منٹ، ایک گھنٹہ، دو گھنٹے اور سب سوال بھول گئے مگر میں جواب ڈھونڈتی رہی۔

شام کو جب دستر خوان سجا تو میں نے سب کو متوجہ کیا تھا۔

"عقیدت منصور علی اگر جھونپڑی میں پلی بڑھی ہوتی تو تب بھی ہم دوست ہوتیں۔ دوستی کو ترازو میں نہیں تولتے...... جو تول دیا جاتا ہے اس کے مول لگ جاتے ہیں۔ یہاں تول نہیں ہے۔ مول بھی نہیں ہے۔ جو بھی ہے...... انمول ہے۔"

وہ میرے ساتھ ساتھ رہتی تھی۔ انار کلی کے پرانی کتابوں کے اسٹالز پر...... اردو بازار کی تنگ گلیوں میں ڈیوڈ روڈ کی چہل قدمیاں...... میٹرو کی سیر، اورنج ٹرین کے مزے۔ وہ کبھی انکار نہیں کرتی تھی۔ میں بس کہتی تھی۔

"لاری...... ڈیوڈ روڈ چلیں؟"

وہ چل پڑتی تھی۔

مجھے بچے کے پائے کھانے تھے۔ لاریب کو پسند نہیں تھے۔ جب میں نے اس سے کہا تھا۔

"بچے کے پائے کھانے چلیں؟"

"تب بھی وہ چل پڑی تھی۔ اسے دوستوں کی خواہشوں کا احترام کرنا آتا تھا...... بے شک اس نے پائے نہیں کھائے تھے مگر مجھے کھاتے ہوئے دیکھ کر وہ خوش ہوتی رہی تھی۔

زندگی کے اس موڑ پر میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ ایک وقت آئے گا جب مجھے لاریب سکندر کی خوشی میں خوش ہونا ہو گا۔ تب میں اسے بہت کچھ کہوں گی۔ وہ سب سن لے گی۔ ہمیشہ کی طرح۔

تب جا کر مجھے احساس ہو گا کہ میں صرف عقیدت منصور علی ہوں۔ کہیں کہیں میں لاریب سکندر بھی ہوتی ہوں۔

کوئی "ایک" دو کیسے ہو سکتا ہے؟

ہونے کو کیا کیا نہیں ہو سکتا؟؟

☆☆☆

"نہیں...... پہلے تم ہی جاؤ گی اس سے ملنے۔"

پچھلے کچھ دنوں سے وہ مسلسل میرے پیچھے تھی اور میں جان چھڑا رہی تھی۔ مگر سب ناممکن۔ لاحاصل، لاریب کے ڈیڈ نے اس کا رشتہ طے کر دیا تھا۔ اور وہ لڑکا گورنمنٹ کالج کے انگلش ڈپارٹمنٹ

تھا۔ معمولات کی خبر رکھتی تھی۔ لاریب چاہتی تھی اس میدان جنگ میں، میں قدم رکھوں۔ مگر مجھے ہول اٹھ رہے تھے۔

"مجھے اور کچھ نہیں سننا۔ بس جاؤ گی تو تم ہی۔"

"مگر میں ایسے کیسے۔"

"اتنا نہیں کر سکتیں میرے لیے؟"

"اس نے کچھ کہہ دیا تو؟"

میں جھجک رہی تھی۔ جانے کون ہو؟ کیسا ہو؟

"کچھ کہہ سننے کے بعد کوئی مر نہیں جاتا۔ تم بھی زندہ ہی رہو گی۔"

میں نے ہامی بھر لی تھی۔ کاش کہ میں نہ بھرتی!!
حسن پرست لوگوں کو لازمی آنکھیں بچا بچا کر گزرنا چاہیے وہ پکڑے جاتے ہیں۔ جکڑے جاتے ہیں۔ مجھے آج بھی یاد ہے۔ وہ جمعرات کا کھلا کھلا روشن سا دن تھا۔ اس دن میرے ٹفن میں سندھی بریانی تھی۔ میرے بیگ میں مکمل ہونے والی کتاب ایلف شفق کی تھی۔ گلاب کا تو تا بیمار تھا۔ امی جی کو آخر ہم نے صولت کے پارلر کے لیے منالیا تھا۔ نہیں بھولا۔ مجھے۔

لاریب سکندر اس دن نہیں آئی تھی اور میں اکیلی انگلش ڈپارٹمنٹ نکل آئی تھی۔ سیڑھیاں چڑھ کر سرخ دیواروں والی گیلریوں سے گزر گزر کر میں اس شخص سے ملنے جارہی تھی۔ فضا میں جیسے موتیا مہک رہا تھا۔ آوازیں تان سین کا راگ ہوئی جاتی تھیں......!!

تب ہی میں نے اس لڑکے کو جالیا تھا جو سب میں نمایاں نظر آرہا تھا۔ کھلنڈرا سا۔ لاپروا۔ مگر خوب صورت......وہ سیاہ گھور آنکھیں۔ کھڑی ناک، کشادہ پیشانی...... میرے پیروں کے تلوے جل گئے تھے جمعرات کے دن کے اس پہر مجھ پر عجیب لمحہ آگیا۔

میں یک دم ایک عجیب اداسی کے لپیٹے میں آگئی۔ ہوتا ہے ناں کبھی کوئی ایسا نظر آتا ہے جو آپ کو گم صم کر دیتا ہے۔ چپ لگا دیتا ہے۔

"سنیں!" میں نے خود کو سہارا دیا تھا۔

"یہاں زیب ایمن کو جانتے ہیں آپ؟"

وہ لاپروا سا شخص بغور مجھے دیکھ رہا تھا۔

"جی جانتا ہوں، مگر آج وہ نہیں آیا۔ آپ کل آئیے گا تو ملوادوں گا۔"

میں پلٹ آئی تھی۔ وہ پلٹنا ٹھہر جانا تھا۔
میری روح کا بیج کسی نے انگلش ڈپارٹمنٹ کی سیڑھیوں کے پاس گاڑ دیا تھا۔ میں لاریب کو بتائے بغیر پھر دوسرے دن گئی تھی، پھر تیسرے دن......

ہر بار مجھے وہی ملا۔ نفی میں سر ہلاتا۔

"آج بھی نہیں آیا۔"

میں صرف اس کا یہی جملہ سننے کو بار بار جاتی رہی تھی۔ میں نے جب بھی ان آنکھوں میں دیکھا، عجیب شرارت دیکھی۔ شریر...... دل ربائی کا جہان تھا۔

کچھ لوگوں کو اندازہ بھی نہیں کہ ان کی شخصیت کتنی جادوئی ہوتی ہے۔ وہ اگلے کو گھائل کر جاتے ہیں اور بس ہوتا۔

"چائے پئیں؟"

میں اس کے ساتھ چل دی تھی۔ وہ آگے آگے اور میں پیچھے پیچھے۔ دھوپ میں اس کا سایہ دیکھتی، مجھے شریر اجنبی پر پیار سا آیا تھا۔

چائے کی پیالی سے سڑک سڑک چائے پیتا بھی وہ مجھے اچھا لگا۔ ہائے میری حسن پرست فطرت۔

"چائے کیسی ہے؟"

"اچھی ہے...... بہت اچھی ہے۔ چائے بری کیسے ہو سکتی ہے بھلا؟"

میرا دل چاہا سب ٹھہر جائے۔ اسٹیچو بن جائے۔ وقت، لوگ، قدم......بس وہ بولتا رہے۔ باقی سب فریز۔

☆☆☆

گھر والوں نے مجھ سے بار بار پوچھنا شروع کر دیا تھا۔

"تم ٹھیک ہو؟"

"کیوں کیا ہوا؟"

"کچھ دنوں سے عجیب سی ہوگئی ہو۔"
"کیسی ہوگئی ہوں؟"
صولت مسکراتے ہوئے آئی اور لائنز چیک کررہی تھی۔
"باسی ہانڈی کے جیسی۔"
اروی گوشت پکا تھا اور میں نے چپ چاپ کھالیا۔ ورنہ اروی گوشت پکے اور میں چپ چاپ کھالوں...... کبھی نہیں۔ میری فیورٹ ڈش تھی۔ کھاتے ہوئے میں تعریف کے پل باندھتی رہتی تھی۔
پارلر کی سیٹنگ میں لائنز کی جگہ میں نے صولت کو لپ گلوس پکڑایا۔ تو اس نے سر پکڑ لیا تھا۔
"تمہارا کچھ نہیں ہوسکتا۔"
امرتا پریتم کی رسیدی ٹکٹ پڑھ کر تو دل میں اور شور اٹھا۔ جس نے ہر ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ گلاب کے پاس گئی جو توتے کے علاج میں لگا ہوا تھا بقول اس کے توتے کو ہیضے کی شکایت تھی۔ مجھے بھی یہی مرض ٹھیک لگا وہ بغیر سوچے سمجھے اسے الم غلم کھلاتا رہتا تھا۔
"گلاب؟"
"ہاں ہاں ں!"
"میں تمہیں کیسی لگتی ہوں؟"
مجھے نہیں پتا تھا کیسا سوال تھا اور کس سے کررہی تھی۔
"اچھی لگتی ہیں۔"
میں پلٹ آئی تھی۔ دل کو ذرا سا سنبھالا تھا۔
اگلے دن گراؤنڈ کی سیڑھیوں پر مجھے لاریب نے بتایا تھا۔
"رات جہاں زیب اپنے فادر کے ساتھ میرے گھر آیا تھا۔"
میں ٹھٹکی، چونکی اور پھر خوش گوار حیرت میں پڑگئی تھی۔
"ارے واہ...... کیسا لگا تمہیں...... کیسا ہے...... دکھتا کیسا ہے...... سب بتاؤ۔" وہ خوب صورت تھی۔ مگر تب خوب صورت ترین نظر آئی۔

"شہد اور میدے سے گوندی گئی...... موم لڑکیا۔
"مجھے وہ بہت بھایا عقی...... بہت ہینڈسم ہے...... اور اتنی مزے کی باتیں کرتا ہے کہ بس، مزہ آجاتا ہے۔ ذرا بھی اجنبیت نہیں ہوئی...... کچھ ہی منٹوں میں ہم ایک دوسرے سے ہنس ہنس کر باتیں کررہے تھے۔ میں نے اسے تمہارے بارے میں بتایا ہے وہ بھی تم سے ملنے کے لیے ایکسائیٹڈ ہے۔ آخر تم ہی تو میری اکلوتی بیسٹ فرینڈ ہو۔"
وہ سارا دن ہمارا موضوع جہاں زیب امین رہا۔ ہم کئی کلاسز بنک کرکے اس کی باتیں کرتے رہے دوسروں کی خوشی کے لیے اپنی خوشی سے دست برداری، لاریب سکندر کی آنکھوں میں جگنو بھر گئے تھے۔ وہ خوش تھی تو میں بہت زیادہ خوش تھی!
میں نے زندگی میں دوست کی خوشی میں خوش ہونا سیکھا ہے۔ دوسروں کی خوشی کے لیے اپنی خوشی سے دست برداری بھی فطرت ہے میری...... مجھے تکلیف سے وحشت ہے...... میں چاہتی ہوں ہر کوئی خوش باش رہے۔ ہنستا مسکراتا...... کبھی کبھی طلعت کہتی تھی۔
"عقیدت تمہارے وجود کا عنصر محبت اور قربانی ہے۔"
میں بس ہنس دیتی تھی۔
یونہی دن گزرتے رہے۔ دل انگلی پکڑ کر انگلش ڈپارٹمنٹ کی راہ دکھاتا تھا مگر میں نے دل کو سمجھایا تھا۔ آسان نہیں تھا۔ مشکل تھا۔ ناممکن بھی۔ مگر ہوگیا۔
پتا چلا جہاں زیب امین کسی تقریری مقابلے میں حصہ لے رہا تھا۔ ہم دونوں بھی مدعو تھیں۔ ادب، غزل، تقریر کا ہفتہ چل رہا تھا۔ جب ہم دونوں ہال میں پہنچیں تو تب ہی اس کا نام پکارا گیا تھا۔
"اب تشریف لاتے ہیں جہاں زیب امین جن کا موضوع ہے۔ 'خیانت، زندگی تباہ کرتی ہے۔'"
دروازہ اونچائی پر تھا۔ کرسیوں کی ترتیب ایسی تھی کہ اونچائی سے جھکائی کی طرف جاتی تھی۔ میں اونچائی پر وسط میں کھڑی تھی۔ اور سمجھیں وہیں سے

کسی نے مجھے دھکا دیا تھا۔

روسٹرم کی طرف جاتا وہ شخص جہاں زیب امین تھا۔ کوٹ کی شکنیں درست کرتا، روسٹرم کا مائیک ٹھیک کرتا وہ نٹ کھٹ شخص، شرارتی دیوتا......! سارا ہال کھچا کھچ لوگوں کے ہجوم سے بھرا ہوا تھا۔

مگر میں اندھی ہو چکی تھی۔ مجھے کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ آنکھ مجھ پر اٹھی تھی......شناسائی کا رنگ تھا۔

مجھے یوں لگا ہال کی چھت پھٹ پڑی ہو اور کسی نے بارش کی بوچھاڑ کردی ہو......لاریب دور کھڑی مجھے ہاتھ کے اشارے سے بلا رہی تھی۔

میں اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

کشادہ پیشانی...... کھڑی ناک...... سیاہ آنکھیں۔

قدم من من بھر کے ہو گئے۔ تو وہ جہاں زیب تھا۔

اس نے کیوں کیا ایسا؟

جھوٹ کیوں بولا؟

آج تک میں نے زندگی میں کسی سے جھوٹ نہیں بولا کیونکہ مجھے لگتا تھا اس کی تکلیف سب تکلیفوں سے بڑی ہوتی ہے......یقین آگیا......میری باتیں ٹھیک ہوتی ہیں......مجھے امرتا پریتم یاد آگئی تھی۔

”زندگی آپ کے اسی وصف کا امتحان لیتی ہے جو آپ کے اندر ہو۔ میرے اندر محبت تھی۔“

☆☆☆

وہ مجھے ڈھونڈتی رہی تھی۔

”تم کہاں چلی گئی تھیں۔ میں تمہیں ڈھونڈتی رہی۔“

”مجھے کہاں جانا تھا۔ لاریب۔“

”طبیعت تو ٹھیک ہے؟“

”نہیں۔“

وہ مجھے گھر چھوڑ گئی تھی گاڑی پر۔ سارا گھر پریشان ہو گیا تھا۔ بار بار تاپ چڑھتا رہا۔ جسم جلتا رہا۔ ٹھنڈی پٹیاں تک کام نہ آئی تھیں۔ یہاں دل جلا ہوا تھا۔ ہوتے ہوتے بخار ٹائیفائیڈ میں بدل گیا۔

ٹھیک ہونے میں دو ہفتے لگ گئے تھے۔ اور ہر دوسرے دن بعد لاریب آجاتی تھی۔ میرے سرہانے بیٹھ جاتی تھی۔ ٹھنڈی پٹیاں رکھے جاتی۔ اور دنیا جہان کی باتیں۔ دنیا سے ہوتی ہوتی باتیں جب جہاں زیب امین تک پہنچتی تھیں تو میں آنکھیں بند کرکے سوتی بن جاتی تھی۔

جب آنکھ کھلتی وہ جا چکی ہوتی تھی۔ کسی کا قصور کسی اور کے سر نہیں ڈالا کرتے۔ میں بھی یہ نہیں کرسکتی تھی۔ کبھی بھی نہیں...... ہرگز نہیں......!!

☆☆☆

ایک بات میں اچھی سے جانتی ہوں کہ اب میرے ڈپارٹمنٹ میں ایک شخص آتا جاتا ہوگا۔ میرا اتا پتا پوچھتا پھرتا ہوگا۔ جسے میرا نام تک نہ آتا ہوگا۔ گر جو وہ میرے بارے میں لاریب سکندر سے پوچھ بیٹھے تو!!

کئی مہینوں بعد بارشوں نے لاہور کو دھو ڈالا تھا۔ سب دھل گیا تھا۔ راستے مشکل ہو گئے۔ مجھے لگا آج مجھے جانا ہوگا۔ میں تاپ چڑھے وجود کے ساتھ بسیں بدل بدل کر پہنچ گئی تھی۔

بادلوں کی گھٹا میں تاریکی سی تھی۔ ہواؤں میں پھر موتیے کی مہکار تھی۔ ہر جگہ پانی تھا۔ چھپاک...... چھپاک......میں بچتی بچاتی ڈپارٹمنٹ پہنچ گئی تھی۔

اب کی بار فلاسفی ڈپارٹمنٹ کی سیڑھیاں تھیں جہاں وہ کھڑا ہوا تھا۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھ لیا تھا میں چلتی ہوئی اس تک آگئی تھی۔

”اپنا نام تو بتایا ہوتا۔“

”ڈینم کی جینز کالے ڈائل والی گھڑی، سفید شرٹ میں ملبوس، گھور سیاہ آنکھیں مجھ پر گاڑے کھڑا وہ پوچھ رہا تھا۔

”عقیدت“

وہ ٹھٹکا تھا۔ بغور مجھے دیکھا۔ پھر ہنس دیا۔

”دوست...... میں روز تمہارے لیے آتا رہا۔ جس کو بھی تمہارے بارے میں بتایا سب مجھے پاگل کہتے تھے۔ ہر کسی کو نام چاہیے ہوتا ہے۔ ڈھونڈے

بات ...... میں کیا کیا تمہارے بارے میں یاد
کر کے تمہارا پوچھتا رہا پہلے پہل جب ہم ملے مجھے لگا
تمہارا نام لاریب ہوگا۔ تب ہی میں نے شرارت کی
ڈیڈ نے کہا تھا جس لڑکی سے رشتہ ہو رہا ہے تمہاری
یونی ورسٹی کی ہے۔ تم سے ملنے آئے گی۔ مجھے لگا تم
لاریب ہو۔ مگر شکر ہے تم لاریب نہیں تھیں۔"

آسمان رو پڑا تھا...... بارش کی بوچھاڑ نے ہمیں
گیلا کر دیا تھا۔ پہلے ہی میرے دوپٹے سے ٹپ ٹپ
پانی ٹپک رہا تھا

"وہ کیوں؟"

"کیونکہ میں ایک دوست کو نہیں کھونا چاہتا تھا۔
ایک تیر سے دو شکار...... مجھے لاریب کے ساتھ ساتھ
ایک دوست بھی مل گئی۔"

دوست...... دوست...... وہ لفظ سارے جہان
کی پکار بن گیا تھا۔ کیا مجھ سے محبت نہیں کی جا سکتی
تھی؟"

"میں نے ہمیشہ ہی اپنی شرارتوں کی وجہ سے
اچھے دوست بنائے ہیں۔ مجھے تم سے دوستی کر کے
اچھا لگے گا۔ ہم تینوں کی مثلث اچھی رہے گی۔ جب
لاریب کو علم ہوگا کہ ہم دونوں پہلے سے ایک دوسرے
سے واقف ہیں تو وہ کتنا حیران ہوگی ناں۔"

ہم باتیں کرتے ہوئے پھر وہیں کیفے آ گئے۔
زرد لٹکتے ہوئے بلبوں کے نیچے چائے پیتے ہوئے
میں نے اپنے دل کو وہیں بیٹھے بیٹھے تھپکا تھا۔

"نہیں...... امانتوں میں خیانتیں نہیں کی
جاتیں۔ دوستی محبت سے بڑھ کر ہوتی ہے۔ ہم دوست
ہیں۔"

پھر ہم دوست ہو گئے۔ دوست ہونا بھی تو اچھا
ہوتا ہے۔

ہم تین...... ہم مثلث......
عقیدت منصور علی......
لاریب سکندر......
جہاں زیب امین عرف جان۔

مجھے اپنی سب سے زیادہ اچھی عادت یہ لگتی ہے
کہ ہر بار اپنے سے منسلک رشتوں کو فیور دیا ہے۔ جو
جو چاہتا ہے کرے...... بے شک مجھ سے پوچھے تک
نہیں۔ جہاں بات دل کی ہو تو وہاں میں کھلی چھوٹ
دے دیتی ہوں۔ (آنکھ بھر آئی جانے کیوں)

لاریب سکندر کو جہاں زیب امین پسند تھا۔
جہاں زیب امین کو اپنی پسند اور مزاج کی لائف پارٹنر
مل گئی تھی۔ اصل مسئلہ تو صرف اور صرف میرا تھا
ناں......

میرے لیے دونوں ضروری تھے۔ میں نے
سب چھپا لیا۔ دل کو آخری ڈانٹ پلا کر اس راستے
سے واپس پلا لیا جہاں پہ اگر میں چل پڑتی تو کبھی
واپسی نہ ہوتی۔ سب ٹوٹ پھوٹ جاتا۔ یہ تکون بھی۔
مثلث بھی...... میں نے ہنس کر دکھایا اور ہر کوئی یقین
کرتا گیا۔

مگر طلعت کو چوریاں پکڑنا آتا ہے۔ ہمیشہ
سے۔

"تمہیں کیا ہوا ہے؟"
"کچھ نہیں۔"
"تمہاری آنکھیں کچھ اور کہتی ہیں۔"
"تم نجومی ہو گیا جو تمہیں سب پتا ہوتا ہے۔"
"مجھے تمہارے بارے میں سب پتا ہوتا ہے۔"

گیلری کے پلنگ پوش پر پیر اٹھا کر بیٹھے رات
کے اس پہر میرے ضبط کے بندھن ڈھیر ہو گئے تھے۔
ہر کسی کو کوئی نہ کوئی کندھا چاہیے ہوتا ہے۔ رو لیا
جائے۔ سب بہا دیا جائے۔

"طلعت...... قسم لے لو...... میں نے دل کو بڑا
سمجھایا...... بار بار...... مگر دل وہ کھلونا چاہتا ہے جو
دسترس سے باہر ہے۔ میں حاسد نہیں ہوں۔ میں
غاصب بھی نہیں ہوں۔ بس میں دل کو صحیح سے سمجھا
نہیں پا رہی تھی۔"

طلعت سب سمجھتی تھی۔ اسے پوری کہانی نہیں
بتانا پڑی تھی۔

"عقیدت مٹی ڈال...... بھول جاؤ، دوستی کو اتنا
اونچا کر لو کہ سب دب شب جائے۔ تم ہمیشہ دل کی

کرتی ہو، اب کی بار دماغ کو ساتھ ملا کر دل کو بدگمان کردو۔ غلط فہمی میں ڈال دو۔ تم تینوں دوست ہو اور بس۔"

پھر میں نے یہی کیا...... دوستی کی مثلث کو اونچا کرلیا۔ گورنمنٹ کالج کے ٹاور سے بھی اونچا۔

"کبھی مرید دیکھے ہیں۔"

میں نے خود کو مرید کرلیا...... فخر سے......

وہ ایسے تھے کہ ان سے محبت کی جاتی اور میں ایسی تھی کہ مجھے دوست رکھا جاتا۔ گورنمنٹ کالج میں ہم بہت مشہور ہوگئے تھے۔

یک جان تین قالب...... ہم تین۔

ان کی ہر خوشی میری خوشی تھی۔ جہاں زیب امین کا سر بھی درد کرتا تو میری جان پر بن جاتی تھی۔ میں جلے پیر کی بلی کی طرح اس کے ڈپارٹمنٹ کے چکر لگاتی ہوئی پائی جاتی تھی۔

لاریب سکندر کا ہر مسئلہ میرا مسئلہ تھا۔

اگر کبھی میچنگ دوپٹہ بھی اسے نہ ملتا تھا تو میں سارا دن اکیلی پورا انارکلی چھان مارتی تھی۔ وہ مجھے عزیز تھے اور جو عزیز ہوتے ہیں ان کے واسطے خود کو بھی بھلا دیا جائے تو کوئی بات نہیں۔

وہ مجھے بھیجے کے پائے کھلانے لے جاتے۔ وقاص بریانی کا لطف لیا جاتا۔ الحمرا میں ہم نے کتھک کی چند کلاسز تک لے لیں۔ سنیما جا کر پنجاب نہیں جاؤں گی دیکھ آئے۔

لاہور کے سب روڈ، سڑکیں چھان ماریں......

باغ جناح کی ایک ایک اینٹ ناپ لی۔ قائداعظم لائبریری میں نشستیں رکھی گئیں۔ جب ان دونوں کی منگنی ہوئی اور پھر باغ جناح میں ہی فوٹو سیشن تھا تو میں ساتھ ساتھ رہی۔ ہر بات میں ہر چیز میں......

دل مچلتا تھا۔ کرلاتا تھا۔ سسکتا تھا۔ میں تھکتی تھی۔

"نہیں دل...... اے میرے دل...... محبت کی رسوائی نہیں منظور۔" وہ دونوں اتنے حسین اور خوب صورت لگتے تھے کہ میں رو دی تھی۔ اگر دونوں کھلونے ہوتے تو میں خرید کر اپنے پاس رکھ لیتی تمام عمر کے لیے۔ مگر انسان کھلونے نہیں ہوتے۔

فوٹو گرافر کے لیے پوز بناتے ہوئے میں لاریب کا لہنگا درست کررہی تھی۔ جان نے مجھے شرارتاً دیکھا تھا۔

"کیسا لگ رہا ہوں؟"

دل پر قابو نہ رہا۔ ایک لمحے کو...... میں نے آنکھ میں ماتم بھر کر اسے دیکھا۔ آنکھیں چار ہوگئیں...... اس سے پہلے کہ بھید کھلتا۔ میں لاریب کے بنارسی دوپٹے میں چھپ گئی تھی۔ ضروری تھا۔ پھر ہم باغ جناح کے بوڑھے درختوں تلے چہل قدمی کرتے رہے۔ باتیں، ہنسی، گپ شپ...... کوک پیتے......

"ہماری شادی پہ تمہیں ایک ماہ پہلے آنا ہوگا۔"

میں ہنس دی تھی۔

"کیا پتا میری پہلے ہوجائے۔"

وہ رک گئے۔ فضا میں پھر کمبخت موتیے کی خوشبو دوڑی چلی آئی تھی۔

"کیا...... کون ہے وہ...... ہم سے کیوں چھپایا؟" وہ سنجیدہ لے گئے تھے۔

مذاق مذاق کہتی میں آگے بھاگتی گئی اور وہ میرے پیچھے پیچھے تھے۔ وہ سجا سنورا کپل...... میں ان کی لاڈلی تھی۔ ہر آنکھ ہم پر تھی...... وہی بات...... ہم تین...... یک جان تین قالب......! طلعت نے سچ کہا تھا...... دماغ کو ساتھ ملا لو اور میں نے یہی کیا تھا۔ دن گزر جاتے تھے۔ راتیں شام غریباں تھیں۔

☆☆☆

ابا جی ریٹائرڈ ہوگئے۔ صولت کا پارلر چل پڑا۔ گلاب کا آپریشن ہوگیا۔ امی جی اور ابا جی دونوں کو ساتھ ملا تو باتیں بھی کرنے لگے۔ گھر ذرا رونق والا ہوگیا۔

میری سالگرہ کے دن وہ دونوں گاڑی میں لدے پھندے آگئے۔ میری اکیسویں سالگرہ کے موقع پر میرے لیے وہ اکیس تحفے لے آئے تھے۔ وہ حیران کن لمحہ تھا۔ بے تحاشا۔

... زندگی میں اتنی ضروری تھی۔ جہاں آپ ضروری ہوتے ہیں۔ وہیں آپ کی اہمیت ہوتی ہے، وہ رات شاندار تھی۔ ہم سب اکٹھے تھے۔ سارا گھر اور وہ دو...... کھانا پینا چلتا رہا...... پکوڑیاں، چائے، کیک، سبزی پلاؤ۔ وہ میری زندگی کا حسین ترین دن تھا۔ میں نے خود کو خوش قسمت ترین سمجھا تھا۔ مجھے لگتا ہے جب بھی میں زندگی کے سودوزیاں کا حساب لگانے بیٹھوں گی تو میرا حاصل مجھے مایوس نہیں ہونے دے گا۔

وہ رات میری تحفے کھولتے گزر گئی۔

وہ جیسے میرے لیے سارا ایمپوریم مال خرید لائے تھے۔

ڈیزائنر ڈریس، پرفیوم، جوتے، ہینڈ بیگ، نیا فون، کتابیں، رسٹ واچ، میں آنکھیں میں آنسو لیے بیٹھی رہ گئی تھی۔

''طلعت...... میرا دل بیٹھ جائے گا کسی روز۔''

''ایسی محبتوں پر دل بوجھل نہیں کرتے۔ اعزاز سمجھ کر وصول کرتے ہیں۔''

میں نے پھر یہی کیا۔ جب بھی ان دونوں کی سالگرہ آتی میں نے بھی سالوں کے حساب سے تحائف دیے۔ تب میں سب گھر والوں کی مقروض ہوتی تھی۔ اور تب میں لاہور کا کونا کانا چھان مارتی تھی۔

انارکلی، اچھرہ، کریم بلاک، شاہ عالمی...... میں نے کبھی پیروں کو تھکنے نہ دیا۔

ان کی سالگرہ پر ہی مجھے ان کے گھروں میں جانے کا اتفاق ہوا تھا۔ میں رکشے پر ان کے گھروں کے باہر کھڑی پسینے پسینے ہو جاتی تھی۔ وہ لائف اسٹائل، رہن سہن میرے طرز زندگی سے کتنا مختلف تھا ناں۔

وہ میرے لیے عام ہو جاتے تھے۔ فرش پر دستر خوان پر بیٹھ جاتے تھے۔ طلعت ٹھیک کہتی تھی۔ ''کچھ رشتے، لوگ ہماری زندگی میں اعزاز کی طرح شامل ہو جاتے ہیں۔''

میری زندگی کا زیادہ وقت انہی دو گھروں میں گزرا۔

کمبائن اسٹڈی ہم کر لیتے تھے...... بے شک جہاں زیب کا ڈپارٹمنٹ الگ تھا مگر وہ ساتھ ہوتا تھا۔ کوئی بھی شرارت کرنے کا موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا تھا۔

میں اور لاریب تنگ آجاتے تھے۔ چمٹے سے چھپکلیاں پکڑ کر ہمارے سامنے رکھ کر غائب ہو جاتا تھا۔ لڑکیوں کی چھپکلی نامی مخلوق سے ویسے ہی جان جاتی ہے اور وہ اسی بات کا فائدہ اٹھاتا تھا!! میں اب ان کے گھر کے فرد کی سی حیثیت حاصل کر گئی تھی۔ گارڈ، مالی تک مجھے عزت دیتے تھے، دماغ مجھے خوش ہو کر کہتا تھا۔

''دیکھا، کتنی عزت ہے اس دوستی کے رشتے میں۔'' اور دل کرلاتا تھا۔

''عقیدت...... محبت...... محبت......''

☆☆☆

موتیے کی خوشبو سے لبریز دوپہر آسمان پر بھاگتے دوڑتے بادل...... بارش کئی روز سے جاری تھی۔ جس وقت میں جہاں زیب کے گھر پہنچی پتا چلا کہ لاریب آج نہیں آسکتی۔ اسے گھر میں کچھ کام تھا۔ میں واپسی کا ارادہ کر رہی تھی۔

''رک جاؤ۔ میں تمہیں چھوڑ دوں گا۔''

''نہیں مجھے جانا ہوگا۔''

ہم پورچ میں کھڑے تھے۔ باہر جل تھل بارش شروع تھی۔ پام کے درخت لہرا رہے تھے۔

''رکو۔ تم کبھی ہوا کے گھوڑے پر سوار رہتی ہو۔ اچھی سی چائے پلواتا ہوں تمہیں پھر چلی جانا۔''

وہ میرا ہاتھ پکڑ کر کچن میں لے آیا اور میں کھنچتی چلی گئی۔ وہ مقناطیس تھا۔ اور میں لوہ چون۔

مجھے اسٹول پر بٹھا کر وہ چائے بنانے لگا تھا۔ ساتھ ساتھ باتیں بھی جاری تھیں۔

''گھر میں سب کیسے ہیں؟''

''سب ٹھیک ہیں۔''

"اور تم کیسی ہو؟"

کچن کی کھڑکی سے ٹھنڈی ہوا کی ایک لہر سی آئی تھی۔ خنکی سی بھر گئی تھی۔ وہ پیٹھ موڑے کھڑا تھا اور میں اس کی پشت دیکھتی سوچ رہی تھی کہ میں اس شخص کو ایسے ہی دیکھتے دیکھتے صدیاں گزار سکتی تھی۔ بغیر پلک جھپکے......

"میں ٹھیک ہوں۔"

"کبھی کبھی مجھے پتا ہے کیا لگتا ہے؟"

"کیا لگتا ہے؟"

"مجھے لگتا ہے جیسے تم ابھی تک ناراض ہو مجھ سے۔"

چائے بن گئی تھی۔ ایک کپ بھاپ اڑاتا مجھے پکڑا کر دوسرا اس نے خود تھام لیا تھا۔

"کیوں؟"

"وہی جو میں نے تم سے جھوٹ بولا تھا۔"

چائے کے کپ کی حرارت نے میرے سارے وجود کو عجب سکون بخشا تھا۔

"میں تم سے کبھی ناراض نہیں ہو سکتی۔"

"کیوں؟"

سپ لیتا ہوا وہ پوچھ رہا تھا۔

"بس یونہی۔"

ادھر ادھر کی باتوں کے بعد وہ لاریب کے موضوع پر آ گیا تھا۔ میرا دل دھڑک رہا تھا۔ میں نے دماغ کو لاکھ پکارا مگر وہ میری ایک سننے والا نہیں تھا۔ آنکھ بار بار اٹھتی تھی۔ اور جھک جاتی تھی۔ عام سے گھریلو حلیے میں بھی وہ انسان کتنا دلکش تھا...... کوئی مجھ سے پوچھتا...... میں دیوان لکھ بیٹھتی...... زندگی میں کچھ لمحوں کو ایسے ہی تو چور لمحے آ جاتے ہیں جن کے بھگتان انسان ساری زندگی بھگتتا رہتا ہے۔ جیسے میں بھگت رہی تھی۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا۔ کبھی کبھی لاریب بہت عجیب ہو جاتی ہے۔ وہ عجیب طرح ری ایکٹ کرتی ہے اور میں بعد میں پریشان ہو کر سوچتا رہ جاتا ہوں، باتیں چھوٹی چھوٹی ہوتی ہیں مگر وہ ایشو بنا لیتی ہے۔ بہت عجیب ہو جاتی ہے سمجھ سے باہر۔" وہ بولتا رہا۔ میں سنتی رہی۔

طلعت کہتی تھی عقیدت تم اچھی سامع نہیں ہو۔ گفتگو میں بار بار ٹوکتی ہو۔ کاش اب طلعت دیکھتی میں کیسے بت بنی اسے سن رہی تھی۔ مجھے آواز چاہیے۔ موضوع جو بھی ہو۔ بس وہ بولتا رہے......

"تم جان اسے سمجھ نہیں پائے۔ وہ بہت یونیک فطرت والی ہے۔ تمہیں ابھی وقت لگے گا۔ تم مرد سمجھتے ہو، عورت جلد کھل جاتی ہے۔ نہیں، جب تم سمجھتے ہو تم نے عورت کو مکمل جان لیا ہے تب ہی تو اس کی پہلی پرت اتر رہی ہوتی ہے۔ رہی بات لاریب کی تو وہ مکمل کی دیوانی ہے۔ وہ ہر چیز عیب سے پاک چاہتی ہے۔ وہ دوستی میں کمپرومائز کر سکتی ہے۔ کر جاتی ہے۔ مگر محبت میں نہیں۔ تب ہی وہ ہر چھوٹی چھوٹی بات پر تم سے بحث کرتی ہو گی۔ وہ دنیا کی سب لڑکیوں میں سے سب سے اچھی لڑکی ہے۔ تم خوش قسمت ہو۔"

کپ تھامے سیڑھیاں چڑھ کر ہم ٹیرس پر آ گئے تھے۔ ہوا چل رہی تھی۔ آسمان بادلوں کے گھیرے میں آ گیا تھا۔

"شاید تم ٹھیک کہتی ہو۔ مجھے وقت لگے گا۔ تم لڑکیوں کو سمجھنا اتنا آسان نہیں ہے۔"

میں ہنس دی تھی۔

"تم مجھے کتنا سمجھتے ہو؟ کتنا جانتے ہو؟"

اس سوال کا جواب میری زندگی کا حاصل تھا۔ میری وجود کی پور پور کان بن گئی تھی۔

"آہاں...... مجھے لگتا ہے کم از کم میں تمہیں تو جانتا ہی ہوں۔ تم اچھی دوست ہو، نرم دل، اور ہم خوش قسمت ہیں ہمیں تم جیسی دوست ملی ہے۔"

"نہیں...... خوش قسمت تو میں ہوں۔ جیسے تم ملے۔"

چائے کے کپ خالی ہو گئے۔ وہ جگنوؤں جیسا شخص ریلنگ تھامے کھڑا تھا۔ میں نے چور نظروں سے اس کے سارے سراپے کا جائزہ لیا تھا۔

مجھے پتا تھا یہ خیانت ہوتی ہے۔ پرائی چیز پر ایسے نظر کرنا۔ مگر یہ بات صرف محبت کرنے والے سمجھ سکتے ہیں کہ کتنا مشکل ہوتا ہے؟

یوں اداکاری کرتے رہنا۔ مسلسل...... صبح شام......!!

وہ تکلیف میں تھا۔ انسان کو جب ایسی جگہ سے ٹھوکر لگے۔ جہاں سے وہ سوچ بھی نہ سکتا ہو تو تکلیف تو لازمی بات ہے ناں...... وہ تکلیف میں ہو اور مجھے چین آجائے ایسا ناممکن تھا۔

میں اب بھی ایک بات کہوں گی ہماری اس کہانی میں کوئی ولن نہیں ہے۔ ہرگز...... ہرگز نہیں، لاریب سکندر بھی نہیں...... ہر انسان اپنی فطرت پر چلتا ہے ار انسان کو کم از کم ہمیں فطرت کا مارجن تو لازمی اور ہر صورت دینا چاہیے۔ یہ ضروری ہوتا ہے۔

لاریب نے رو رو کر اپنی کم ہمتی اور مجبوری ہمارے سامنے رکھی تھی۔ مجبور انسان کے پاس اور کوئی آپشن نہیں ہوتا۔ وہ تین قالب کی مثلیث پر بھروسا کر کے ہمارے سامنے بیٹھی تھی۔ وہ جانتی تھی ہم اسے سن لیں گے۔ سمجھنے کی کوشش بھی کریں گے جذباتیت میں نقصان کے علاوہ کچھ ہاتھ نہیں آیا کرتا۔

ہماری ملاقات باغ جناح میں ہوئی تھی۔ جہاں زیب امین کا بازو کٹ جانے کے بعد ان دونوں کی منگنی ٹوٹنے کے بعد...... وہ عذاب کا لمحہ تھا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ کبھی ایسا ہوگا۔ مگر ہو گیا تھا۔ راتوں نے میری زندگی میں خوف سے بھر دیے تھے کہ کہیں میری نظر تو نہیں لگی؟

ایسے کیسے سب ختم ہو سکتا ہے؟

لاریب سکندر نے منگنی توڑ دی تھی۔ یہ عام بات نہیں تھی۔

ہم تینوں ایک دوسرے کو سمجھتے تھے۔ جہاں سب ایک دوسرے کو سننے والے ہوں۔ وہاں مزید مسائل کھڑے نہیں ہوتے۔

یہی وجہ تھی کہ ہم اس حادثے کے کئی ماہ بعد باغ جناح میں اکٹھے ہوئے۔ جب ہماری تعلیم مکمل ہو گئی تھی۔ سب مکمل تھا۔ کافی کچھ ادھورا تھا۔

مال روڈ ویران تھا۔ وقاص بریانی کی لمبی لمبی لائنوں میں لگنے والا کوئی نہیں بچا تھا۔ اردو بازار کے پرانے بک اسٹال پر کتابیں چھاننے والا کوئی نہیں تھا۔

سناٹوں نے ہماری رونقوں کو چاٹ کھایا تھا۔

میں گھر میں بولائی بولائی سی پھرا کرتی تھی۔ گلاب کو ٹیوٹر پڑھانے گھر آنے لگا تھا۔ صولت کے دن رات مصروف گزرنے لگے تھے۔ گھر میں پارلر کا رش ہونے لگا تھا۔

میں پلنگ پر بیٹھی ان دونوں کے بارے میں سوچتی رہتی تھی۔ وہ بیتے دن...... وہ گپ شپ...... شرارتیں۔ ہمارے کاسے میں وقت نے بہت کچھ ڈالا تھا۔

قیامت مجھ پر ٹوٹی تھی۔ اپنی محبت کا دکھ...... پھر محبوب کی محبت کا دکھ۔ سارے کرب میرے حصے میں آئے تھے۔ مجھے سہنے تھے...... میں سہہ بھی رہی تھی۔

باغ جناح میں ہم پورا ایک گھنٹہ خاموش بیٹھے رہے۔ ہماری آئس کریم پگھل گئی۔ آواز کھوگئی۔

آج لاریب سکندر کی عدالت لگی تھی۔ میں صرف اور صرف منصف تھی۔ باغ جناح کے بوڑھے درخت تلے ہماری محفل سجی تھی۔ میں نے سر اٹھا کر پہلے لاریب کو دیکھا تھا وہ ایسی تو نہیں تھی۔ اتنی پیلی زرد، جیسے یرقان ہو گیا ہو۔ وہ کملا گئی تھی۔

میں اندازہ کر سکتی تھی کہ وہ فیصلہ ہرگز بھی آسان نہیں ہوگا۔ وہ جنگ تھی جو اس نے لڑی تھی۔ میں نے دوسری نظر جہاں زیب کو دیکھا تھا۔ وہ جو راج ہنسوں کی جوڑی تھی۔ کیسے بچھڑی تھی، وہ سر جھکائے بیٹھا تھا۔ منتظر ڈھیلا انداز، میرا دل اب بھی اسے دیکھ کر دھڑکنا بھول سا گیا تھا۔

وہ خاموشی لاریب نے توڑی تھی۔ دور آسمان کو نگاہ میں رکھ کر۔ آسمان کی وسعتوں میں، کچھ کھوجتی ہوئی۔

''میرا بچپن عام لوگوں جیسا نہیں گزرا۔ میں نے زندگی کا کافی وقت تنہا ہی گزارا ہے۔ میرے والدین کی طلاق کے وقت میں نے ہوش سنبھالا تھا۔ کچھ عرصہ کورٹ میں یہ جھگڑا رہا کہ مجھے کون اپنے پاس رکھے گا۔ اللہ کی اتنی بڑی دنیا میں بھی جب آپ کو جگہ نہ ملے۔ آپ کی زندگی کو لے کر ٹاس کھیلا جا رہا ہو۔ ہر تیس، چالیس، دن بعد آپ عدالتوں کے چکر

لگا رہے ہوں۔ ہر آنکھ آپ کو ترحم سے دیکھتی ہو۔ تم لوگوں کو کبھی ترحم سے دیکھا گیا ہے؟ مجھے دیکھا گیا ہے۔ بار بار...... وقت بہت ظالم ہے۔

میرا بچپن میرے اپنے ساتھ گزرا ہے، کھانے کی میز پر اکیلے میں نے اپنے آپ کو کھانا کھاتے دیکھا ہے۔ اسکول کے لیے بیگ تیار کرتے دیکھا ہے۔ گر کر سنبھلتے دیکھا ہے۔ کئی بار اندھیرے میں ڈر کر سیڑھیوں سے گر جایا کرتی تھی۔ خود کو مرہم لگاتے دیکھا ہے۔ ہر جگہ اپنے ساتھ میں نے خود کو ہی دیکھا ہے۔

لاریب سکندر کے پاس صرف لاریب سکندر ہی تھی۔ اپنے پاس صرف اپنا آپ ہونا بھی آزار ہے۔ اسے آزادی کی کسی قسم کا نام دے کر سیلف فریڈم کے کھاتے میں مت ڈالنا۔ کھانے پینے کے آداب سے لے کر دوست بنانے تک، اسکولنگ کے فیصلوں سے دوپہر کے لنچ اور ڈنر میں کھانے میں پکنے والی ڈش کے ہر ہر فیصلے پر میں اکیلی تھی۔ میں نے کبھی روڈ پر کسی ٹھیلے سے گول گپے یا کسی ہوٹل سے کھانا نہیں کھایا۔

اکیلا انسان کیا کر سکتا ہے؟ ماں پاس نہیں۔ اور باپ کا صرف نام تھا۔ تم دونوں کو لگتا ہوگا، میں جو تم دونوں کے ساتھ مال روڈ کی بے فکری سے سیریں کرتی ہوں۔ انار کلی اور اردو بازار کے اسٹالز گھومتی ہوں۔ وقاص بریانی کے رش میں لائن میں کھڑی ہو کر بریانی خریدتی ہوں یوسف کے فالودے کے پیالے کھاتی ہوں۔ کیا میں شروع سے ایسی ہی ہوں؟ ہرگز نہیں۔ میں ایسی نہیں ہوں۔ ایک فیصد بھی نہیں۔ مجھے ہنسی آتی ہے ان لوگوں پر جو اگلے انسان کو جاننے کا دعویٰ لمحوں میں کر کے چلتے بنتے ہیں۔ جان پہچان کا سفر تو بہت لمبا ہوتا ہے۔ تھکا دینے والا ہوتا ہے۔ عرق ریزی والا۔

لڑکپن میں مجھے اپنا آپ ملا۔ بن ماں باپ کی بچی۔ سوسیڈ، لاوارث کی طرح ہر کوئی کان میں یہی بات ڈالتا تھا کہ لاوارث ہے۔ کیسے پلے گی۔ میں پل گئی۔ بچپن سے لڑکپن اور تب میں نے سوچا میں اپنے آپ کی تربیت خود کروں گی۔ یہ آسان نہیں ہوتا۔ دنیا کی کسوٹی بہت مشکل ہے۔ کہو تو پل صراط اب گرے کہ تب گرے...... میں نے خود کو گرنے نہیں دیا۔ جو دنیا کے تربیت کے معیار تھے اپنے آپ کو ان میں ڈھالتی گئی۔ پرفیکشن صرف اور صرف اللہ کی ذات کو ہے۔ مگر انسان کو خود پر محنت کرنی ہوتی ہے۔ ہر کوئی کرتا ہے مگر ہر کسی کے پاس کوئی نہ کوئی ضرور ہوتا ہے۔ میرے پاس کوئی نہیں تھا۔ کبھی بھی...... صرف دیواریں تھیں اور آئینے......

بس...... دیواروں میں دم گھٹتا تھا اور شیشوں کو میں توڑ دیتی تھی۔ پھر میں نے خود اپنے وجود کی عمارت کو اٹھایا...... ایک معیار بنایا۔ کیا کرنا ہے؟ کیا نہیں کرنا؟ دنیا، لوگوں، معاشرے نے مجھے کسی بھی مقام پر فیور نہیں دیا۔ ہر جگہ لاوارثی کا ٹیگ...... یار انسان تھک بھی تو جاتا ہے۔ جیسے میں تھک گئی۔ مشکل تھا۔ بہت مشکل تھا۔ اب جو تم لوگوں کے سامنے لاریب سکندر ہے ناں ہر کوئی اس کی ذات کو سنوارنے کا کریڈیٹ لینا چاہتا ہے۔ ساری دنیا...... صرف تم دونوں کے سوا۔ تم دونوں میرا حاصل ہو...... میں زندگی میں سب کھودینے کے بعد بھی نہیں پچھتاؤں گی۔ مگر تم دونوں کو میں نے کھودیا تو سمجھو میں نے خود کو کھودیا ہے۔ انسان جب خود کو خود گھڑنے والا ہو تو وہ خود کو اچھی طرح جان جاتا ہے...... کہ اس نے اپنا آپ کس طرح سینچا ہے۔ کہاں کمی ہے اور کہاں زیادتی ہے۔ میری ذات میں کمی نہیں ہے...... زیادتی ہے...... ہر چیز کی۔ مجھے افسوس ہے کہ اپنی عمارت تعمیر کرتے وقت میں توازن رکھنا بھول گئی۔ میں بھول گئی۔

وہ سناٹے کی فضا تھی۔ موتیا کی خوشبو نہیں مرگئی تھی۔ وہ بلک بلک کر رو رہی تھی۔ ہمارا دل جیسے پھٹنے لگا تھا۔ وہ شہد سے بنی موم سی لڑکی۔ اسے اپنے آپ کا غم تھا۔ جہاں زیب امین کے چہرے کے تاثرات پہلے جیسے نہیں رہے تھے۔ وہاں ہم تینوں میں سے ہر کوئی پہلے جیسا نہیں رہا تھا......!

آسمان کی وسعتوں میں دیکھتی وہ نگاہ کا مرکز بدل کر جہاں زیب امین پر آن رکی تھی۔

"میں نے اپنی ذات میں کھوٹ کے رنگ بھرے ہیں۔ تمہاری ذات میں نہیں بھر سکتی۔ میں عیب برداشت

کسی چیز میں بھی نہیں۔ مجھے لگا تھا۔ شاید یہ رشتہ تعلق چلے گا۔ مگر اس حادثے کے بعد مجھے لگتا ہے نہیں۔ میں یہ سب برداشت نہیں کر پاؤں گی۔ میں خود سے واقف ہوں جو اپنے آپ کو مکمل جانتا ہو اسے رسک نہیں لینے چاہئیں۔ میں پھر دیواروں میں گھٹ گھٹ کر نہیں رہنا چاہتی۔ آئینوں کے ٹوٹنے سے مجھے خوف آتا ہے۔ اب دنیا کے سوال ختم ہوئے تھے۔ میں دوبارہ سے سوالوں کو جنم نہیں دینا چاہتی۔ کبھی بھی نہیں۔ تم مجھے اچھے لگے۔ اب بھی لگتے ہو۔ مگر مجھے لگتا ہے، مجھے تم سے محبت نہیں جہاں...... اگر مجھے محبت ہوتی تم سے تو میرے لیے صرف اور صرف تمہاری سانسیں کافی تھیں۔ بجائے اس کے میں تمہارے وجود کے کسی حصے کے کٹ جانے کے بعد تم سے تعلق ختم کرلوں...... جو محبت کرتے ہیں۔ وہ یہ سب نہیں دیکھتے۔ بازو کٹا ہے؟ ٹانگ کٹی ہے یا چہرہ بھر گیا ہے؟ وہ صرف سانس دیکھتے ہیں۔ دل دیکھتے ہیں۔ چل رہی ہے؟ دھڑک رہا ہے۔ اور بس......

تم محبت ڈیزرو کرتے ہو۔ سمجھوتا نہیں۔ اور شاید تمہیں پتا نہ ہو، کسی کو تمہارے دل کی دھڑکن صاف صاف سنائی دیتی ہے۔ مجھ جیسے لوگوں کو کہاں دل کی زبان سمجھ میں آتی ہے؟ اب بھی اگر میں غلط ہوں تو جو سزا دو گے، مجھے قبول ہوگی۔ بس اتنا کرنا کہ صحیح فیصلہ کرنا، دوست سمجھ کر دیا جانے والا کوئی بھی فیور میں قبول نہیں کروں گی۔ میں اب چلتی ہوں۔ مجھے دور جانا ہے۔ بہت دور جانا ہے۔"

وہ آہستہ سے اٹھ گئی تھی۔ ہم دونوں ڈبڈبائی آنکھوں سے اسے دور...... بہت دور جاتا ہوا دیکھتے رہے......

وہ عیب پسند نہیں تھی۔ کھوٹ پسند نہیں تھی۔

مجھے یوں لگا، وہ سب جانتی تھی۔ وہ موم کی گڑیا شاید مجھے فیور دے گئی تھی۔ باغ جناح کے دھانی گیسوؤں کی طرف لٹے لٹے قدم بڑھاتے ہوئے میں نے اسے، ہم دونوں سے دور جاتے دیکھا تھا......!!

کبھی دور جاتے قدم بہت قریب آتے ہوئے ... قریب، بہت قریب آتی جا رہی تھی......!!

☆☆☆

آپ کو کیا لگتا ہے کہ کیا اس کے بعد سب ٹھیک ہو گیا؟ کیا سب کچھ ایسے ہی ٹھیک ہو جایا کرتا ہے؟

وقت لگتا ہے ہر زخم کو مندمل ہونے میں۔

لاریب نے لندن شفٹ ہونے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ اس کے لندن جانے سے ایک دن پہلے ہم پھر ملے تھے۔

ہم نے ماضی کو کہیں پس پردہ رکھ دیا تھا۔ وہ دن ہم تینوں کا دن تھا۔ ہمیں پھر سے اپنے محسوسات کو واپس لانا تھا۔ وہیں...... اسی جگہ......!!

پھر سے لاہور کے چپے چپے کی خاک چھانی گئی۔ آئس کریم کی ان گنت کونز کھائی گئیں۔ بے معنی گفتگو کے سلسلے شروع ہوئے۔ جیسے سب پہلے جیسا ہو جائے گا۔ بہت دقت ہوئی۔

ہم نے لاریب سکندر کو الوداع کہہ دیا۔ یا پھر ہم تینوں ہی اپنے اپنے محور میں کھو گئے۔ مجھے بعد میں خبر ہوئی کہ جہاں زیب امین ڈپریشن کے اندھے کنویں میں جا گرا تھا۔

میں کیسے اس سے کہتی؟ روکتی کہ تم میرے لیے بہت قیمتی ہو۔ تم یہ مت کرو مجھے تکلیف ہوتی ہے۔ یہ جذبوں کی زبان اتنی خاموش کیوں ہوتی ہے کہ اگلے کو محسوس ہی نہ ہو۔

میں نے خود کو گھر کی روٹین میں گھل مل جانے دیا۔ سر کتابوں کے انبار میں گھسایا۔ کبھی کچن میں کوکنگ شروع کردی۔ گلاب کو فیثا غورث سمجھاتے سمجھاتے ارشمیدس پر پہنچ جاتی تھی۔

"آپو! آج کل آپ کو کیا ہو گیا ہے؟"

میں کسی کو کیا بتاتی کہ مجھے کیا ہوا تھا۔

بریانی بناتے وقت میں چینی کا ڈبہ ڈھونڈ رہی تھی۔ طلعت نے مجھے جالیا تھا۔

"کیا پاگل پن ہے یہ...... حواسوں میں تو ہو۔ قدم رکھتی کہیں ہو اور پڑتا کہیں ہے۔"

یں تھک گئی ہوں عقیدت۔

"تھکی ہو...... مری نہیں ہو...... زندہ ہو تو زندہ لوگوں جیسی تو دکھو......"

"مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔"

"سب کچھ وہی ہے...... ویسا ہے...... کچھ نہیں بدلا...... جب تم لوگ لاریب کو فیور دے چکے ہو تو یہ بار بار کا رونا کیا معنی رکھتا ہے؟

جان تکلیف میں ہے اسے تمہاری ضرورت ہے۔ ایک دوست کی۔ یاد رکھنا میں دوستی کی بات کررہی ہوں۔ ایک بار پھر سے تمہیں دماغ سے جڑنے کا مشورہ دے رہی ہوں۔ دوست بن کر اس کے کام آؤ گی تو سب اچھا ہوگا۔ دل کو امی جی کے جہیز کی پیٹی میں بند کردو تو بہتر ہوگا۔"

میں نے یہی کیا۔ دل کو بند کردیا اور اچھی دوست بن گئی۔ اسے رات ایک بجے کے قریب میسج کیا۔

"کیا ہم مل سکتے ہیں۔"

"نہیں۔"

آگے سے جواب آیا تھا۔ میں گہری سانس لے کر رہ گئی تھی۔ پورے تین ہفتے میں روزانہ یہی سوال دہراتی رہی تھی۔

"کیا ہم کل مل سکتے ہیں؟"

اور جواب آتا تھا۔

"نہیں۔"

پھر جب میں نے ساری امیدیں کھودیں۔

اس شام ٹیکسٹ آیا تھا۔

"کیا ہم مل سکتے ہیں عقیدت؟"

میں نے کچھ سوچا تھا اور ٹائپ کیا تھا۔

"نہیں۔"

پھر چپ چھا گئی تھی۔ وہ سمجھ گیا تھا۔

اگلے دن میں نے اس کے گھر کا دورہ کرلیا۔ وہ پہچاننے میں نہیں آرہا تھا۔ رف حلیہ...... الجھے بال...... بڑھی ہوئی شیو...... وہ نک سک سے تیار شخص عجیب حال کو پہنچا ہوا تھا۔ میرے دل کو دھچکا سا لگا تھا۔ مال روڈ پر نکل آئے...... بے مقصد چپ چاپ

کھوئے رہتے۔ آوارہ گردی کرتے رہتے۔

کچھ کہنا کچھ سننا ضروری نہیں ہوتا۔ بس ساتھ ضروری ہوتا ہے۔ کبھی کبھار سکوت کے معنی پورے ہوجاتے ہیں۔

قائداعظم لائبریری...... جناح باغ...... ڈیوس روڈ، ہم چلتے رہے۔ ذرا بھی نہیں تھکے۔ ایک ڈھابے پر چائے پیتے ہوئے بھی ہم نے ایک لفظ تک کا تبادلہ نہیں کیا تھا۔

چائے کا بل بھی میں نے دیا...... وہ بس آگے بڑھ گیا۔

کسی دوسرے کا درد، تکلیف آپ کے اندر سانس لے رہی ہو تو بندہ دار پر آجاتا ہے۔ جیسے میں آگئی تھی۔ آنے والے کچھ ماہ میں مجھے ایک کالج میں ٹیچنگ کی جاب مل گئی۔ وہ بھی اپنے کاروبار میں مصروف ہوگیا۔ مگر ہر ویک اینڈ پر ہم ملنے کا بہانا ڈھونڈ لیتے تھے۔ آہستہ آہستہ مجھے یوں لگا جیسے ہمیں ایک دوسرے کی عادت ہوتی جارہی ہو۔ غیر محسوس طریقہ سے دھیرے دھیرے۔

لندن سے لاریب کی کانفرنس کال آجاتی تھی۔

"تم لوگ کیسے ہو۔"

"ہم ٹھیک ہیں۔ تم کیسی ہو؟"

"میں بھی ٹھیک ہوں، یہاں کی یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا ہے۔"

"اور کتنا پڑھو گی تم...... بوڑھی ہوجاؤ گی۔"

وہ ہنس دیتی تھی۔

"میں تعلیم حاصل کرنے کے سفر میں کبھی بوڑھی نہیں ہونے والی۔ یہ میرا شوق ہے۔"

وہ مطمئن ہوگئی تھی۔ ہر کوئی ہوجاتا ہے۔ شاید میں بھی۔ اور جان بھی۔

لاہور میں تین روزہ جشن بہاراں تہوار شروع ہوا تو میں نے اور جہاں زیب نے پلاننگ کی...... ہم روٹین سے گھبرائے ہوئے تھے۔ فرار ضروری تھا۔ اشد ضروری......!!!

وہ ہماری زندگی کے دلکش دن تھے۔ ہم نے یادیں اکٹھی کی تھیں۔ ثقافت میلے، رنگوں کی بہاریں۔ بھانت

بھانت کے لوگ کھانے پینے ......! دروازے کھڑکیاں بند کر کے گھروں میں بیٹھنے والے لوگوں کے لیے باہر کی زندگی کتنی دلچسپ تھی۔ ہم نے لوگوں کو دیکھا۔ ہنستے گاتے ...... جیسے راوی نے چین ہی چین لکھ دیا ہو۔ کتنے خوش باش چہرے تھے۔ ہم بھٹے کھاتے ہوئے ریس کورس کے ٹریک پر ٹہل رہے تھے۔ وہ نپے تلے قدم اٹھاتا اپنے ازلی وقار سے میرے ہم قدم تھا۔

"تم آج اچھی لگ رہی ہو۔"

وہ شاید تعریف تھی۔ میں ہنسی تھی۔

"صرف آج؟"

"ہاں ...... ویسے بھی ...... تم آج زیادہ اچھی لگ رہی ہو ...... یہ رنگ تم پر سوٹ کر رہا ہے۔"

"فلرٹ کر رہے ہو؟"

وہ ہنسا تھا۔ جیسے کچھ یاد آ گیا ہو۔ وہ انگلش ڈپارٹمنٹ والی ملاقاتیں۔

"نہیں ...... نہیں۔"

اس کے وجود کا ایک حصہ، بازو کٹ جانے کے بعد بھی میرے دل میں اس کی پسندیدگی میں فرق نہیں پڑا تھا۔ میں ایسی ہی تھی۔ دل پسند لڑکی۔ دل ہے ناں۔ جہاں اٹک جائے ...... جوڑ توڑ کہاں دیکھتا ہے۔

"مجھے کبھی کبھی لگتا ہے لاریب نے ٹھیک کیا۔"

"بس کبھی کبھی لگتا ہے؟"

"شاید واقعی میں اس نے ٹھیک کیا۔"

میں نے پتھر کو ٹھوکر سے اڑایا تھا۔ گھنے درختوں کی چھایا تلے ہم دونوں گزر رہے تھے۔

"وہ بہادر لڑکی ہے۔ ہم تینوں میں سے وہ اچھی رہی۔ مروت میں سمجھوتے ہوتے ہیں۔ محبت نہیں ہوتی۔ مرد محبت چاہتا ہے۔ دیوتا سمان، دیوی چاہتا ہے۔ وہ ایسی نہیں تھی۔ وہ فخر سے سر اٹھا کر کہہ سکتی ہے کہ اس کے دوست اسے سمجھتے ہیں ......"

وہ جانے کس سوچ کے چکر میں تھا۔ سر ہلاتا رہا۔

"اور بھٹے لینے واپس چلیں؟"

پھر ہم واپس ہو لیے تھے۔ دوپہر سہ پہر کے روپ میں رنگ بدل رہی تھی۔ وہ آگے نکل گیا تھا۔ میں پیچھے پیچھے تھی۔ میں نہیں جانتی تھی کہ یہ کب تک اس طرح چلنے والا تھا۔

زندگی میں کچھ سکون آ گیا تھا۔ ٹھہراؤ۔

ہر بار حالات ایک جیسے تو نہیں رہ سکتے تھے۔

☆☆☆

میں جب چائے پینے کے بعد معمول کے مطابق صحن میں ٹہل رہی تھی۔ آسمان پر اکا دکا تارے تھے۔ کچھ جگنو املی کے پودے کے گرد چکرا رہے تھے۔ ابا جی خبریں لگائے بیٹھے تھے۔ صولت اور طلعت پارلر میں دلہن تیار کر رہی تھیں۔ گلاب فیثا غوث کے مسئلوں میں الجھا پڑا تھا۔ امی جی میرے پاس آ گئی تھیں۔ وہ سیدھی سادی تھیں۔ کبھی تمہیدیں باندھ کر انہیں بات کرنا نہ آیا تھا۔

"تم کل فری ہوناں ...... کوئی کام تو نہیں؟"

کل ویک اینڈ تھا اور میرے ذہن کی سلیٹ پر وہ شخص لہرایا تھا۔ جس کے ساتھ میں نے ایکسپو سینٹر میں ہونے والے کتاب میلے میں شرکت کرنا تھی۔

"جی امی ...... خیریت ہے؟"

"ہاں ...... کل گھر میں ہی رہنا۔ تمہارے رشتے والے آ رہے ہیں۔"

آسمان کے تارے بجھ گئے۔ املی پر منڈلاتے جگنوؤں کے پر جل گئے۔ امی جی کی جہیز کی پیٹی میں بند پڑا میرا دل آخری سانسیں لے رہا تھا۔

☆☆☆

وہ رات بوجھ تھی میرے دل پر۔ یوں لگا تھا آسمان الٹ گیا تھا۔ رات بارہ بجے مجھے اس کا میسج ملا۔

"کل پھر کتنے بجے مل رہے ہیں؟"

"نہیں مل رہے۔"

"کیوں؟"

"میں کل مصروف ہوں۔"

"کیا مصروفیت ہے؟"

"میرے رشتے کے لیے کچھ لوگ آ رہے ہیں۔"

یہ کہہ کر میں نے موبائل سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر پرے پھینک دیا۔ تکیے پر سر رکھ کر میں نے آنسوؤں کو بہہ

جانے دیا تھا۔ شاید میری زندگی میں اب ہر رشتے سے دست برداری لکھی جانے والی تھی۔ میں ہمیشہ رشتہ، شادی، سسرال کے ذکر کو ہنس کر ٹال دیا کرتی تھی۔ مگر اب یہ ذکر میرے پیروں تلے سے زمین کھینچ کر لے گیا تھا۔

اگلے دن میں نے دیکھا تھا۔ پانچ سو مسڈ کالز، جیسے وہ ساری رات یہی کام کرتا رہا تھا۔ میں پتھر ہو کر رہ گئی تھی۔ یہ سب کیا تھا؟"

وہ کیا ثابت کرنا چاہ رہا تھا؟

اس کی طرف سے ظاہر ہوتی یہ بے چینی اور اضطراب کیا معنی رکھتا تھا؟"

پھر وہ ایک ٹیکسٹ میرے دماغ کا فیوز اڑا لے گیا تھا۔

"عقیدت...... مجھ سے شادی کرو گی؟"

☆☆☆

صبح کے سات بج رہے ہیں۔ میں کھڑکی سے باہر دیکھ سکتی ہوں کہ موسم نرم گرم سا ہے۔ میرا شوہر سامنے سوئمنگ پول کے پاس جاگنگ کے بعد تولیے سے اپنا پسینہ صاف کر رہا ہے۔ بطخوں کی جوڑی اس کے قریب سے گزر گئی ہے۔ وہ انہیں دیکھ کر مسکرایا ہے۔ وہ ہمیشہ سے یہی کرتا آرہا ہے۔ میں عادی ہو چکی ہوں۔

کبھی سوچتی ہوں ہم انسانوں میں پتا نہیں کون سا مادہ، کیمیکل ہوتا ہے کہ ہم ہر حالت میں سروائیو کر جاتے ہیں۔

خیر...... میں پھر دور نکل گئی...... شیشے کے پار وہ اب اندر کی طرف آرہا ہے...... نپے تلے قدم اٹھاتا...... وہ مجھے متاثر کرنے کے ایک ایک گر سے واقف ہے۔ کچھ لوگوں کو یہ فن بھی آتا ہے۔ جیسے میرے شوہر کو آتا ہے...... بہت اچھے سے......

ہماری شادی کو دو سال ہو گئے ہیں ان دنوں میں، میں نے اپنے لیے اس کی آنکھوں میں صرف ایک چیز دیکھی ہے...... محبت...... محبت۔

میں حیران ہوتی ہوں، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟

دنیا تو کچھ اور کہتی ہے کہ محبت ایک بار ہوتی ہے اس کے بعد تو انسان مجنوں بھیس میں گھومتے ہیں۔ سب تلپٹ...... مگر ہر نیا دن اسی وجہ سے ہماری زندگی میں آتا ہے کہ اس کا پچھلے دن سے کوئی لینا دینا نہیں ہوتا۔ پھر بھی ماضی کی دلدل سے نکلنا آسان تو نہیں ہوتا......

وہ اندر آگیا ہے۔ میز پر ناشتا اور اخبار اس کا منتظر ہے۔

وہ ناشتا کرتے ہوئے مجھ سے باتیں بھی کرتا جائے گا اور ساتھ ساتھ اخبار پر بھی نظریں دوڑاتا جائے گا۔

میں بس چائے کا کپ تھامے، آہستہ آہستہ سپ لیتے ہوئے اسے دیکھتی جاؤں گی۔ میں یہ کر سکتی ہوں پچھلے دو سالوں سے کر رہی ہوں وہ معنی خیز ہنسی ہنستا ہے۔

"عقیدت...... تھک جاؤ گی۔"

"تمہیں دیکھ کر میں نہیں تھکتی۔"

"یار تم بیوی نہیں لگتی ہو۔"

"تو پھر کیا لگتی ہوں۔"

"محبوبہ لگتی ہو۔"

"محبوبہ، بیوی نہیں ہو سکتی کیا؟"

"کبھی سننے میں تو نہیں آیا۔"

"سنی سنائی پر یقین کرتے ہو؟"

وہ ہار جاتا تھا ہمیشہ...... اخبار سائیڈ پر رکھ دیا جاتا ہے۔

"نہیں...... تم پر کرتا ہوں۔"

میں سر ہلا کر چائے پر بنتی جھلی دیکھ رہی ہوں۔

"سنو۔"

"ہوں...... ں۔"

"آج میں جب آفس سے واپس آؤں گا تو تم کون سے رنگ کے کپڑے پہن کر میرا استقبال کرو گی؟"

وہ سوال اس کا پسندیدہ ترین ہے۔ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ ہر گھر میں یہ سوال نہیں کیا جاتا ہوگا۔ کچھ نیکیاں جو آپ لاعلمی میں کر جاتے ہوں گے۔ ان کے انعام بہت خوب، خوب صورت ہوتے ہوں گے۔ جیسے میرے سامنے بیٹھا وہ شخص...... جس کی صبح مجھے ایک نظر دیکھنے سے ہوتی ہے اور دفتر سے واپسی پر وہ سب سے پہلے مجھے دیکھنا چاہتا ہے۔

کوئی مریض لاعلاج ہوچکا ہو اور جبر ہو، علاج دریافت ہوگیا ہوتو کیا حال ہوگا؟ وہی میرا حال تھا۔

"طلعت...... دماغ کو ساتھ رکھوں یا دل کو امی جی کی پیٹی سے نکال کرلاؤں؟"

طلعت نے مجھے خود سے لپٹالیا تھا۔ وہ سہارا مجھے اندر سے سکون میں مبتلا کر گیا۔

"دل کی سنو عقیدت"

میں نے صحن میں ٹہلتے ہوئے لندن میں لاریب کو کال کی تھی۔ ہماری ہفتے میں پانچ دن لازمی بات ہوتی تھی۔ آج چھٹی بار بات ہورہی تھی۔

"لاریب ایک پروپوزل ہے۔"

وہ خوش ہوگئی تھی۔ وہ میری خوشیوں کے بارے ہمیشہ سے ہی ایکسائیٹڈ رہی تھی۔

"کون ہے؟ کیسا ہے؟ کیا کرتا ہے؟"

میں نے دنیا جہان کی ہمت اپنے اندر جمع کی تھی۔ سر اٹھا کر آسمان کو دیکھا تھا کچھ کونجیں سفر میں تھیں۔ پھر سے فضا میں موتیے کی خوشبو خود پڑی تھی......!

"جہاں زیب امین نام ہے اس کا...... کیسا ہے تو یہ بات تم اچھے سے جانتی ہو۔ کیا کرتا ہے تو بزنس ہے اپنا۔ اچھا کماتا ہے۔ کہتا ہے مجھے خوش رکھے گا۔"

دوسری طرف خاموشی...... طویل...... میں ننگے پاؤں انگاروں پر تھی...... لاریب کی چپ مجھے اندر ہی اندر کھائے جارہی تھی۔

پھر وہ بھیگی ہوئی آواز...... جس میں خوشی کی کپکپاہٹ تھی۔

"ارے...... عقیدت...... یہ جہاں زیب...... اپنا جہاں...... اپناوالا جہاں......"

وہ لہجہ خوشی کا تھا۔ کسی گلٹ سے آزاد ہونے کا تھا۔ لاریب سکندر کو جیسے اپنی تپسیا کا پھل مل گیا تھا۔

میں نے کہا تھا ناں، میری کہانی میں کوئی ولن نہیں ہے۔ ہر کہانی میں ولن نہیں ہوتا۔ کہیں کچھ دوست بھی ہوتے ہیں۔ جو مروت میں آکر ایک دوسرے کی زندگیاں برباد نہیں کرتے...... جیسے ہم...... تین قالب......

عقیدت منصور علی......

لاریب سکندر......

اور جہاں زیب امین عرف جان......

☆☆☆

آج میں خوش ہوں۔ مطمئن ہوں۔ ہم تینوں ہیں۔ زندگی میں کسی بھی موڑ، موقع پر اپنی خوشی دیکھنا ضروری ہے۔ چھوٹی سی زندگی میں ہم سمجھوتوں کے بار کب تک اٹھا سکتے ہیں؟

کبھی نہیں...... ضروری تو نہیں......

رات کے پچھلے پہر جب ہر طرف سکوت اور سکون ہے...... میں نے اپنے شوہر جہاں زیب امین کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے اسے پھر سے وہی کہانی سنائی تھی۔ جو وہ ہر رات سن کر نیند میں کھوجاتا تھا۔ وہ کہانی نہیں تھی۔ لوری تھی۔ محبت کی لوری سے بڑھ کر بھی کوئی لوری ہوسکتی ہے کیا؟

"تمہیں پتا ہے ناں میں کتنی حسن پرست ہوں۔ تمہاری آنکھیں اپالو سے زیادہ خوب صورت ہیں۔ تمہاری یہ کھڑی ناک مجھے اپنی طرف عجیب انداز سے کھینچتی ہے۔ میں نے زندگی میں کبھی نہیں سوچا تھا کہ پہلی نظر کی محبت کا شکار ہوجاؤں گی...... مگر محبت کہاں دیکھتی ہے؟ کیوپڈ کا تیر چل گیا۔ میں نے ہر فارغ وقت میں گورنمنٹ کالج کے انگلش ڈپارٹمنٹ کے چپے چپے کو چھانا ہے۔ کہ جانے کہاں تم نے قدم رکھا ہوگا۔ کس راہداری سے گزرے ہوگے۔ ضروری نہیں ہے سب عیاں کردیا جائے۔ کچھ بھرم سلامت رکھنے لازمی ہوتے ہیں۔ خاموشی عبادت ہوتی ہے اور عبادتوں کے صلے ضرور ملتے ہیں۔ تم میری خاموشی کا صلہ ہو۔ میں نے یہی سوچا تھا میں نے غاصب نہیں بننا۔ اگر اوپروالا میرے دل میں کسی کی محبت ڈال رہا ہے تو کوئی حکمت ضرور ہوگی۔ آج دیکھو تم میرے سامنے ہو...... میں دنیا کی خوش قسمت ترین لڑکی ہوں...... جو چاہا وہی پالیا...... زندگی بہت اچھی چیز ہوتی ہے۔ خوب صورت...... رنگین...... اور دلکش......"

☆

عفت سحر طاہر

رنگ سچے تیرے

ہائی وے پر ٹرالر اور کار کا شدید ایکسیڈنٹ ہوتا ہے ٹرالر کا ڈرائیور بھاگ جاتا ہے، کار بری طرح پچک جاتی ہے۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا مرد اور اگلی نشست پر ہی بیٹھی عورت خون میں لت پت ہیں۔ ریسکیو عملے کا انتظار ہے کہ وہ آئے تو گاڑی کی باڈی کاٹ کر لاشیں نکالی جائیں اسی وقت گاڑی سے ایک بچے کے رونے کی آواز آتی ہے۔

ہاسپٹل میں چار لوگ آئی سی یو کے باہر بیٹھے ہیں نرس باہر آ کر کہتی ہے آپ کے پیشنٹ کو ہوش آ گیا ہے۔ وہ آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔

سرخ پھولوں سے سجی گاڑی پوش ایریا کے ایک بنگلے کے آگے رکتی ہے تو۔ دولہا کی ماں ملازمہ سے کہتی ہے کہ دلہن کو لے کر اندر آؤ۔ ملازمہ دلہن کو بیڈ روم میں بٹھا کر جانے لگتی ہے تو دلہن اس سے سر درد کی گولی مانگتی ہے۔ ملازمہ کہتی ہے کہ چائے بھی لے آؤں۔

دولہا کمرے میں آتا ہے۔ تو وہ اس کی شکل دیکھ کر حیران رہ جاتی ہے۔ وہ ایک بچی کو لے کر آتا ہے کہ اس کے لیے میں نے تم سے شادی کی ہے۔

زمین کو ہواؤں میں اڑنے اور اونچے خواب دیکھنے کا شوق ہے حریم اس کی چھوٹی بہن اسے سمجھاتی ہے۔

زمین کی سہیلی بجل کہتی ہے کہ تمہیں عباد وسیم پوچھ رہا تھا۔

زمین اپنی دوست صوما کی سالگرہ میں جانے کی ضد کرتی ہے لیکن اس کی اماں کو اعتراض ہوتا ہے کہ جوان جہان لڑکی آدھی رات کو سالگرہ میں سے واپس آئے گی تو محلے والے کیا کہیں گے۔ اس کے اصرار پر ابا سے جانے کی اجازت





دے دیتے ہیں لیکن اس کی اماں ناراض ہی رہتی ہیں۔
زمین صوما کی سالگرہ کی تقریب میں (جو کہ تھیم پر تھی) گھر سے تیار ہو کے نہیں جاتی بلکہ تجل کے گھر سے تیار ہو کر جاتی ہے۔ راستے میں تجل رانا سعید سے عباد وسیم کے متعلق بات کرتی ہے کہ رانا سعید عباد کا دوست ہے وہ عباد سے زمین کی دوستی کرادے۔ وہ کہتا ہے کہ اپنی دوست کو بربادی کے راستے پر مت ڈالو۔ پارٹی میں زمین کی عباد سے ملاقات ہوتی ہے لیکن وہ یمنیٰ الطاف کے ساتھ ہوتا ہے۔ اگلی ملاقات میں تجل بتاتی ہے کہ عباد وسیم، رانا سعید سے تمہارا پوچھ رہا تھا۔ زمین بے یقین ہوتی ہے۔
وہ اپنے حواس میں نہیں تھی فیملی ڈاکٹر فریحہ کی ویسے کی صبح اس کا چیک کرنے آیا تو اس نے کہا کہ شاکڈ اور ڈپریسڈ ہیں۔ میڈیسن دیں آرام کرائیں شام تک بہتر ہو جائیں گی۔
تجل زمین کو آفس کے بعد لے کر کلب آجاتی ہے زمین کا موڈ آف ہے۔ وہاں ان کی ملاقات عباد وسیم سے ہوتی ہے۔ دونوں کے درمیان رکھائی سے بات چیت ہوتی ہے۔ عباد وسیم ان کے جوس کا بل ادا کر دیتا ہے۔ زمین کو برا لگتا ہے۔
نصرت زلفی کو کہتی ہیں کہ اٹھ کر دکان پر چلا جا لیکن وہ نہیں سنتا۔ وہ زمین کی ہم راہی کا خواب دیکھتا ہے نصرت کہتی ہیں کہ وہ پڑھی لکھی لڑکی تجھ سے شادی سے انکار کر دے گی۔ زلفی کہتا ہے کہ وہ میرے بچپن کی منگ ہے۔
زمین کے پاس چھٹی والے دن عباد کا فون آتا ہے کہ وہ اس کے ساتھ دن گزارنا چاہتا ہے۔ زمین، تجل کے گھر کا بہانہ کر کے اس کے بتائے ہوئے ریسٹورنٹ میں اس کا انتظار کرتی ہے۔
عباد وسیم کے ساتھ ایک بھرپور دن گزار کر زمین خوشی خوشی گھر لوٹ آتی ہے۔ زمین کو اس کی کھوجتی چمکتی آنکھوں کی گہرائی کا اندازہ نہیں ہوتا۔
زمین کی غیر موجودگی میں اماں کے پیٹ میں درد ہوتا ہے۔ حریم ابا کے گھر میں نہ ہونے کی وجہ سے زمین کو فون کرتی ہے، فون بند ہونے کی صورت میں وہ تھک ہار کر تجل کے نمبر پہ کال کرتی ہے، اسے مبارک باد دیتی ہے تو وہ حیران رہ جاتی ہے کہ کس چیز کی مبارک باد اور اپنے گھر میں صبح سے کپڑے دھونے کی مظلومیت کا رونا روتی ہے۔ حریم پریشان ہو جاتی ہے۔ ابا آجاتے ہیں وہ اماں کو ڈاکٹر کے پاس لے جاتے ہیں۔
زمین کے آنے پر حریم اس سے پوچھتی ہے کہ وہ کہاں تھی، زمین سچ اسے بتا دیتی ہے۔
عباد وسیم، رانا سے ملتا ہے تو زمین کی بات ہوتی ہے، رانا کہتا ہے کہ وہ شریف گھرانے کی ہے اس کو بخش دے۔ عباد ہنسنے لگتا ہے۔
مائرہ صبح صبح پھپھو کے گھر پہنچتی ہے جہاں عباد وسیم اور نزہت ناشتہ کر رہے ہیں۔ مائرہ اور نزہت کی معنی خیز باتوں سے انجان بنتا عباد وہاں سے اٹھ کر چلا جاتا ہے۔
حریم بے ساختہ میرب کو پیار کرتی ہے، وہ گھبرا جاتی ہے۔
نزہت گھر واپسی پر حریم کو کہتی ہیں کہ وہ میرب کے سلسلے میں کوئی کوتاہی برداشت نہیں کریں گی۔
حریم عباد سیکھی کے بارے میں معلومات حاصل کرنے اس کے شوروم تک آجاتی ہے عباد اسے دھمکاتا ہے وہ اس سے کہتی ہے کہ تم خراب کیریکٹر کے ہو۔ میری بہن کا پیچھا چھوڑ دو۔ زمین پتا چلنے پر ناراض ہوتی ہے اور عباد سے معذرت کرتی ہے وہ معذرت قبول کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔
مارک ڈینیئل کو بتاتا ہے کہ اس کی مسلمان لڑکے سے دوستی ہے۔ نصرت پھپھو تاریخ طے کرنے کے لیے مٹھائی اور شادی شدہ بیٹی کو لے کر آتی ہیں۔ زمین گھر میں نہیں ہوتی۔
حریم کو وہ اس کے گھر لے کر آتا ہے اماں اور طوبیٰ بہت خوش ہوتی ہیں لیکن ابا کے آنے سے پہلے اسے جانے کا کہتی ہیں۔
عباد کی برتھ ڈے کے موقع پر عباد زمین کو اپنے فلیٹ پر تنہا بلاتا ہے، وہاں جانے کے بعد زمین کو باپ کی بات یاد آتی ہے کہ دو نامحرموں کے بیچ تیسرا ہمیشہ شیطان ہوتا ہے۔
عباد زمین کو اپنے فلیٹ پر بلاتا ہے۔ اس کے قریب آنے پر وہ وہاں سے واپس آجاتی ہے۔ عبد کی پرکھ کہ وہ پورا اترتی ہے۔ ادھر نصرت پھپھو تاریخ لینے آجاتی ہیں۔ اماں اور حریم کے پوچھنے پر زمین شادی کی ہامی بھر لیتی ہے۔ نصرت پھپھو اور زلفی خوش ہو جاتے ہیں۔ تجل فون کر کے زمین کو لاتی ہے۔ وہاں عباد وسیم موجود ہوتا ہے اور اسے پروپوز کرتا ہے۔

نرمین خوشی خوشی گھر آتی ہے۔
رات میں حریم نرمین سے کہتی ہے کہ شادی کا کارڈ پسند کرلو۔ وہ کہتی ہے پہلے لڑکا تو پسند کرلوں۔ پھر اسے بتاتی ہے کہ عبادوسیم نے اسے پرپوز کیا ہے۔ دروازے میں کھڑی اماں یہ سن کر بے سدھ ہوکر گر پڑتی ہیں۔
نجل کے سمجھانے پر حریم کو احساس ہوتا ہے کہ وہ غلطی پر ہے، اس نے اپنی زندگی کو تباہ کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ حالات کو انتہا پر آتے دیکھ کر حریم شوہر سے کہتی ہے کہ وہ میرب سے دور نہیں رہ سکتی۔ وہ کہتا ہے کہ وہ اسے آخری چانس دے رہا ہے، اس کے بعد اسے یہاں سے جانا پڑے گا۔
وہ میرب کے لیے شاپنگ کا کہتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ آؤٹ لیٹ پر آجاتا۔ زیاد واپس پہنچتا ہے تو کیتھی کی ساتھی ویٹرس اسے بتاتی ہے کہ اس کا اسپیشل کسٹمر آیا ہے۔
زیاد کیتھی کو بتاتا ہے کہ اس کے بھائی نے پسند کی شادی کرلی ہے اور ماں باپ نے اسے گھر سے نکال دیا ہے اور بھائی کی منگیتر اس کے سر منڈھنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ بڑی مشکل سے جان بچا کر آیا ہوں۔
پال کیتھی سے کہتا ہے کہ اسے اب مارک کے مستقبل کی پلاننگ کرنی چاہیے۔ وہ اکتا کر وہاں سے ہٹ جاتی ہے۔
مارک اس سے راستے میں معافی مانگتا ہے، کیتھی کے انکار پر ثبوت ملنے کا کہتا ہے۔
کیتھی زیاد سے کہتی ہے کہ وہ مسلمان ہونا چاہتی ہے۔ عباد ماں باپ سے معافی مانگ کر گھر واپس آنے کا کہتا ہے۔
مائرہ، حریم کو آؤٹ لیٹ پر دیکھ کر برہم ہوجاتی ہے۔ نزہت بھی اس پر ناراض ہوتی ہے۔ حریم میرب کو لے کر اپنے والدین کے گھر آتی ہے۔
حریم میرب کو لے کر اپنے والدین کے گھر جاتی ہے۔ اماں کو یہ سن کر بہت صدمہ ہوتا ہے کہ حریم کا شوہر پہلے سے شادی شدہ ہے۔ وہ بچی کو پیار کرتی ہیں کہ اس میں نرمین کی شباہت ہوتی ہے۔
مائرہ کو دیکھنے کچھ لوگ آنے والے ہیں۔ وہ ماں پر ناراض ہوتی ہے لیکن وہ کہتی ہیں کہ اپنی پھپھو کے سراب سے باہر نکل آؤ۔
نزہت بیٹے پر ناراض ہوتی ہیں کہ اسے حریم کے میکے کیوں بھیجا۔ مائرہ اسے اپنے آنے والے رشتے کے بارے میں بتاتی ہے۔ وہ اسے سمجھاتا ہے کہ اسے اب زندگی میں آگے بڑھ جانا چاہیے۔ مائرہ باہر جانے کا پروگرام بناتی ہے لیکن وہ منع کردیتا ہے کہ اسے حریم اور میرب کو لینے جانا ہے۔ مائرہ شدید غصے میں گھر آتی ہے جہاں اس کے رشتے کے لیے کچھ لوگ آئے ہوتے ہیں، وہ ان سے بدتمیزی کرتی ہے۔ فوزیہ بیٹی کو ڈانٹتی ہیں، وہ بے ہوش ہوجاتی ہے۔
کیتھی کے گھر والوں کو پتا چل جاتا ہے کہ وہ اسلام قبول کرچکی ہے۔ وہ اسے لے کر غائب ہوجاتے ہیں۔ زیاد ہر جگہ اسے تلاش کرتا ہے لیکن اس کا کچھ پتا نہیں چلتا، مائرہ خودکشی کرلیتی ہے۔

سولہویں قسط

''مما! پلیز..... خود کو سنبھالیں۔'' وہ مائرہ کی خودکشی کی خبر سن کر غم سے نڈھال نزہت کو قریبی صوفے پہ بٹھاتے ہوئے گھبرا کر ان کی ہتھیلیاں اپنے ہاتھوں سے رگڑنے لگا تو وہ اونچی آواز میں رونے لگیں۔ حریم تقریباً دوڑتی ہوئی آئی تھی لاؤنج کا منظر دیکھ کر اس کا دل پریشان ہوا تھا۔
''اللہ خیر کرے..... کیا ہوا ہے؟''
''یہ..... یہ قصوروار ہے سارے قصے میں۔'' نڈھال پڑی نزہت ایک دم زخمی شیرنی کی طرح حریم پہ جھپٹ پڑیں اور یہ اتنا اچانک ہوا کہ وہ دم بخود رہ گیا، دہشت زدہ ہوکر پیچھے ہٹتے ہوئے بھی ان کا تھپڑ حریم کے شانے کو چھو گیا۔ نزہت کا دماغ گھوما ہوا تھا۔ وہ شاید اتنے پہ بس نہ کرتیں مگر وہ یک لخت اٹھ کر ان دونوں کے بیچ آگیا اور ماں کے ہاتھ تھام لیے۔
''یہ کیا کررہی ہیں مما؟ حریم کا کیا قصور ہے اس سارے معاملے میں؟''

''پیچھے ہٹ جاؤ...... جان سے ماردوں گی میں اسے...... کھا گئی میری بچی کو...... ان ٹٹ پونجیوں نے تو قسم ہی کھالی ہے ہماری نسل ختم کرنے کی۔ اس سے کہو دفع ہو جائے...... مجھے دکھائی نہ دے بس۔'' نزہت پھوٹ پھوٹ کر رو دیں۔

اس نے مڑ کر حریم کو جانے کا اشارہ کیا تو وہ اہانت سے سرخ پڑتا چہرہ لیے واپس چلی گئی۔ وسیم صاحب افتاں وخیزاں کمرے سے نکلے۔

''مجھے مائرہ کے پاس لے جاؤ...... ہائے...... میرے بھائی کی ایک ہی اولاد۔ اس کا بھی کوئی سکھ نہیں دیکھ پایا۔'' نزہت تڑپ رہی تھیں۔

''اچھا، ٹھیک ہے۔ فوراً چلتے ہیں۔ بس آپ خود کو سنبھالیں میں گاڑی کی چابی لے کر آتا ہوں۔'' اس نے باپ کو مختصراً مائرہ کے بارے میں بتایا تو وہ بھی پریشان ہو گئے، نزہت کو ان کے حوالے کرتا لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے وہ سیڑھیاں چڑھ گیا۔

حریم بیڈ کے کنارے ٹکی گود میں ہاتھ رکھے ساکت بیٹھی تھی۔ اسے ایک نظر دیکھ کر وہ اپنا والٹ موبائل اور گاڑی کی چابی اٹھا کر لمحہ بھر کو رکا۔

''مائرہ نے خودکشی کی کوشش کی ہے۔ دعا کرنا اللہ تعالیٰ خیریت رکھے۔'' وہ گہری سانس بھرتا کمرے سے نکل گیا تھا حریم کا ہاتھ بے اختیار اپنے دل پہ آٹھہرا۔

ایک اور جرم اس کے سر۔ وہ اب نزہت کے غصے کی وجہ سمجھی تھی۔ اور اگر خدانخواستہ مائرہ کو کچھ ہو گیا تب میرا کیا بنے گا؟ حریم کو سوچ کر ہی جھرجھری آ گئی، وہ خالی الذہن کیفیت میں سوئی ہوئی میرب کو دیکھنے لگی۔ اب جبکہ وہ زندگی کو سیدھی سڑک بنانا چاہ رہی تھی تو اچانک ہی اونچے نیچے ٹیڑھے میڑھے راستے سامنے آنے لگے تھے۔

☆☆☆

''اللہ کا واسطہ ہے نزہت! اب میری بیٹی کا پیچھا چھوڑ دو۔ جی لینے دو اسے اپنی زندگی۔'' وہ ہاسپٹل پہنچیں تو فوزیہ انہیں دیکھتے ہی کرلا اٹھیں۔ نزہت اہانت کا شکار ہوئیں لیکن موقع ایسا تھا کہ کچھ کہہ بھی نہیں سکتی تھیں۔

''مائرہ کیسی ہے بھائی صاحب!'' وہ چور سی ہو کر بھائی کے پاس آ کھڑی ہوئیں۔

''ابھی انتہائی نگہداشت میں ہے۔ سرجری ہوئی ہے کلائی کی۔''

''گاڈ۔'' فوزیہ سے سلام دعا کر کے ماموں جان کی طرف متوجہ ہوتا وہ ششدر رہ گیا۔

''کل میرے ساتھ لنچ کیا تھا اس نے۔ میں خود گھر ڈراپ کر کے آیا تھا۔''

''وہ جب آئی، تبھی اس کا موڈ خراب تھا۔'' فوزیہ تڑپیں۔

''ہائے گاڈ! ممانی جان! ہمارے بیچ کوئی ایسا ایشو ڈسکس نہیں ہوا۔ اور نہ ہی مائرہ کے کسی انداز سے لگا کہ وہ کچھ انتہائی سوچ رہی ہے۔'' وہ انہیں یقین دلاتے ہوئے بولا۔

''اچھا بس...... یہ فضول باتیں چھوڑو، اور بیٹی کے لیے دعا کرو۔'' ماموں جان نے بیوی کو تادیبی لہجے میں کہا تو وہ دوپٹے سے آنکھیں پونچھتی خفگی کے ساتھ بینچ پہ جا بیٹھیں۔

''ڈاکٹر نے کہا ہے اب خطرے کی کوئی بات نہیں۔ کلائی کی نس کاٹ لی تھی اس نے۔ بروقت ہاسپٹل پہنچ گئے۔ فوری سرجری ہو گئی تو اللہ نے دوبارہ زندگی دے دی اسے بھی اور ہمیں بھی۔'' وہ تھکے ہوئے انداز میں بتا رہے تھے۔

نزہت کی شکایتی نظریں بیٹے کی طرف اٹھیں تو وہ ان سے نگاہ چرا کر رہ گیا، نزہت دوپٹہ سر پہ لپیٹے دکھی دل کے ساتھ دعاؤں میں مشغول ہوگئیں۔ ان کے بس میں نہیں تھا ورنہ شام سے پہلے جادو کی چھڑی گھما کر سارے حالات ٹھیک کردیتیں۔

شام کو مائرہ کو ہوش آیا تو اسے کمرے میں شفٹ کردیا گیا۔ زرد رنگت اور زندگی کی رمق سے عاری چہرہ لیے وہ پرانی شوخ و زندہ دل مائرہ لگ ہی نہیں رہی تھی۔ نزہت نے اس کی پیشانی چومی تو ان کا کلیجہ پھٹ رہا تھا۔

"میری بچی! پھپھو قربان۔"

مائرہ کی آنکھوں کے کونے نم ہونے لگے۔

"مما پلیز! آپ نے مل لیا۔ اب ذرا مجھے مل لینے دیں محترمہ سے۔" اس نے دونوں کو جذباتی دیکھ کر فوراً ہی ہلکے پھلکے انداز میں کہتے ہوئے نزہت کو پیچھے کیا اور خود اس کے پاس آکر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔

"کیسی ہو؟"

"زندہ ہوں۔" اس کی آنکھوں سے آنسو ابل پڑے۔

"بری بات۔ ماؤ! تم اتنی بزدل تو کبھی بھی نہیں تھیں۔ یہ تو مشکلوں سے لڑنے والوں کے بجائے راہ فرار اختیار کرنے والوں کا طریقہ ہے۔" وہ نرمی اور تفکر سے کہہ رہا تھا۔ مائرہ نے آنکھیں موند کر چہرہ دوسری طرف پھیر لیا۔ جیسے مزید کوئی بات کرنے کے موڈ میں نہ ہو، وہ گہری سانس بھرتے ہوئے ماموں جان کی طرف پلٹ گیا۔

☆☆☆

حریم کو کسی پل چین نہیں تھا۔ وہ لوگ ہاسپٹل سے رات گئے گھر واپس آئے تو وہ جلے پاؤں کی بلی کی طرح کمرے میں پھر رہی تھی۔ خیال یہی تھا کہ وہ آئے تو اس سے مائرہ کا حال پوچھے گی۔ لیکن وہ رات ساڑھے دس بجے گھر آکر بھی نجانے ماں کے ساتھ کون سے راز و نیاز کی باتیں کررہا تھا کہ سوا بارہ بجے کمرے میں داخل ہوا۔

حریم اسے دیکھ کر بے اختیار اٹھ کھڑی ہوئی تو وہ سلام کرتا کاؤچ پہ بیٹھ کر جوتے اتار کر چپل پہننے لگا پھر اٹھ کر وارڈروب سے اپنا نائٹ سوٹ نکالا۔ تھکے ہوئے اعصاب اس وقت ایک طویل شاور اور پرسکون نیند کے متقاضی تھے۔

"مائرہ کیسی ہے؟" اسے واش روم کی طرف بڑھتے دیکھ کر حریم رہ نہیں پائی۔

"بڑی جلدی خیال آگیا۔" وہ رک کر خفیف سے طنز سے بولا تو حریم چکرائی۔

"کیا مطلب......؟"

"مطلب یہ کہ سارے دن میں ایک بار بھی تم نے زحمت نہیں کی کہ ایک کال کرکے مجھ سے یا ممانی جان ہی سے مائرہ کا حال پوچھ لیتیں۔ موت کو چھو کر واپس لوٹی ہے وہ۔" وہ تلخی سے کہتا یقیناً نزہت کی زبان بول رہا تھا۔ حریم کو الفاظ ختم ہوتے محسوس ہوئے۔

"آنٹی کا رویہ تم اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہو۔" حریم نے صفائی پیش کی۔

"ہر کسی کا عمل اس کے ساتھ ہوتا ہے تمہارا فرض تھا کہ تم میرے سیل فون پہ کال کرکے کم از کم ممانی جان سے ہی احوال پوچھ لیتیں۔" وہ درشتی سے کہہ کر کپڑے لیے واش روم میں چلا گیا۔ حریم دھک سی بیٹھی اس کے انداز پہ ہی غور کرتی رہ گئی۔

"میں صبح کال کرلوں گی آپ کی ممانی جان کو۔" وہ شاور لے کر فریش ہو کر نکلا تو حریم کی سوئی ابھی تک وہیں اٹکی ہوئی تھی۔ وہ ٹھٹکا۔

"زندگی بہت مشکل چیز ہے حریم! آسان کرنے کا ایک بھی موقع ملے تو اسے ضائع مت کرو، اور ہاں۔ مما کی طرف سے میں معذرت کرتا ہوں تم سے۔ وہ حواس کھو بیٹھی تھیں مائرہ کی خودکشی کا سن کر۔" وہ سنجیدگی سے کہہ کر آئینے کے سامنے اپنے گیلے بالوں میں برش کرنے لگا۔

(ہونہہ...... مجھ سے زیادہ زندگی کی مشکلات سے اور کون واقف ہوگا) وہ خود اذیتی سے سوچ کر پھیکا سا مسکرائی۔

"اب کیسی طبیعت ہے مائرہ کی؟"

"ہمم...... بروقت میڈیکل ٹریٹمنٹ مل گیا تو خون ضائع ہونے سے بچ گیا۔ آپریٹ کیا ہے ڈاکٹرز نے کلائی کو...... اب ہوش میں ہے...... کمرے میں منتقل کردیا گیا ہے اسے۔"

"اتنا انتہائی قدم کیوں اٹھالیا اس نے؟" حریم نے جھجک کر پوچھا۔

"اس کا پروپوزل آیا ہوا تھا اسی کو لے کر شاید اپ سیٹ ہوگئی تھی۔" وہ تکیہ اٹھا کر اپنی جگہ جھاڑتے ہوئے بولا تو حریم کی دھڑکن سست پڑی۔

"وہ...آپ سے شادی کرنا چاہتی ہے۔" حریم نے شاید پوچھا نہیں بتایا تھا مگر اس نے ان سنی کر کے لائٹ آف کی اور لیٹ گیا۔ حریم اندھیرے میں اس کی جگہ کو گھورتی رہی۔

"سو جاؤ۔ یہ سوالنامہ صبح بھی حل ہوسکتا ہے۔ ہاسپٹل بھی جانا ہے مجھے۔" چند لمحوں بعد اندھیرے میں اس کی نیند سے بوجھل آواز گونجی تو وہ گہری سانس بھرتی میرب کے ساتھ دراز ہوگئی۔

☆☆☆

اس کے اگلے روز مائرہ ہاسپٹل سے گھر آئی تو وہ مانو وہیں کا ہوگیا۔ کبھی نزہت کو لے کر جارہا ہے تو کبھی خود آفس سے سیدھا وہیں اور رات گئے کھانا کھا کر گھر واپسی۔ حریم کا دل مستقل اوہام نے جکڑا ہوا تھا۔ ایسے کوئی قربتوں کے رشتے نہ تھے کہ مان سے اس کو کٹہرے میں کھینچ لیتی۔

دو دن سے تقریباً وہ آدھی رات کو گھر آرہا تھا اور صبح افراتفری میں میرب کے سوتے میں ہی ناشتا کر کے آفس کے لیے نکل جاتا لیکن آج سرشام ہی میرب کے پاپا کے نام کی مسلسل ضد لگانے پر حریم نے مجبور ہو کر اس کا نمبر اپنے موبائل سے ملایا جو پہلی بار تو اٹینڈ نہ ہوا لیکن دوسری بار کال کرنے پر متعدد رنگز ہونے کے بعد اس نے اٹینڈ کر ہی لیا۔

"السلام علیکم۔" کھنکار کر بات شروع کی۔

"ہمم...... وعلیکم السلام۔ خیریت؟" دوسری طرف سے جوابی سلامتی کے ساتھ فوری سوال آیا جیسے وہ بہت جلدی میں ہو۔ حریم گڑبڑائی۔

"وہ...... یہ میرو تنگ کررہی تھی تمہیں یاد کر کے تو میں نے سوچا۔" حریم نے ہلکے پھلکے انداز میں کال کرنے کی وجہ بتانا شروع کی تو وہ اس کی بات کاٹ کر بہ عجلت بولا۔

"آکر دیکھ لوں گا اسے۔ ابھی تم مینیج کرلو۔ میں مائرہ کو چیک اپ کے لیے ہاسپٹل لے کر جارہا ہوں۔"

حریم اندر تک سلگ اٹھی۔

"مائرہ کو ہاسپٹل لے جانے والے کئی ہوں گے۔ لیکن میرو کی ضد پوری کرنے کے لیے صرف تم ہو۔" وہ بے اختیار ہی تیز لہجے میں کہہ گئی تو دوسری طرف خاموشی چھا گئی حریم کو فی الفور اپنی فاش غلطی کا احساس ہوا۔

"آئم سوری"
"آ کے بات کرتا ہوں۔ تم میرو کو بہلالو ذرا۔"
"کھانا اس کے ساتھ ہی کھانا آ کر۔" حریم دھیمی پڑی۔ دوسری طرف سے گہری سانس کی آواز آئی۔
"او کے۔ آٹھ بجے تک کھانا لگا دینا۔"
کال بند ہو گئی تھی حریم نے موبائل آف کر کے بے دلی سے ایک طرف ڈال دیا۔
"پاپا پاپا آئے۔" میرب کی رٹ پھر سے شروع ہوئی۔ جو تحمل سے کال ختم ہونے کا انتظار کر رہی تھی کیونکہ ماما نے کہا تھا وہ ابھی کال کر کے پاپا کو بلائیں گی۔
"جی جان!" حریم نے ساری سوچیں جھٹکتے ہوئے جھک کر میرب کو گود میں لیا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔
"ہم ابھی چل کے کھانا لگاتے ہیں۔ پاپا آئیں گے تو انہیں سرپرائز ملے گا۔ پھر پاپا اور میرو مل کر کھانا کھائیں گے۔"
میرب کو جتنی بھی بات سمجھ میں آئی ہو۔ وہ حریم کو مسکراتے پر جوش لہجے میں بولتے دیکھ کر ہمیشہ ہی پر جوش ہو جایا کرتی تھی۔
"او کے۔" حسب عادت میرب نے نعرہ لگایا تو وہ ہنستی ہوئی اسے باہر لے آئی۔
آٹھ بجے تک اس نے ثریا کے ساتھ مل کر کھانا لگا دیا تھا۔ آج بہت دنوں کے بعد حریم نے اس کی من پسند بریانی کے ساتھ مٹن چانپ روسٹ کی تھی۔ نزہت ٹھٹکیں۔
"اتنا اہتمام کس خوشی میں ہوا ہے؟" انہوں نے تیوریاں چڑھا کر ثریا کو مخاطب کیا تو رائتے کا ڈونگا اٹھانے کچن میں گئی حریم وہیں رک گئی۔
"بی بی بتا رہی تھیں آج چھوٹے صاحب کھانا گھر پہ کھائیں گے۔" ثریا کی آواز آئی تو حریم کا دل دھک دھک کرنے لگا۔
"اسے بڑا پتا ہے چھوٹے صاحب کی ٹائمنگ کا۔" نزہت کی پرنخوت آواز نے حریم کی طاقت چھینی۔
"میرو بے بی بھی شام سے ہی تنگ کر رہی ہیں۔ اپنے پاپا کو یاد کر کے۔"
"سب سمجھتی ہوں میں۔ جاؤ تم...... کام کرو اپنا۔"
ذرا دیر میں وسیم صاحب بھی کھانے کی میز پہ پہنچ گئے۔ حریم بھی میرب کو کرسی پر بٹھا کر اس کی فراک پہ نیپکن لگانے لگی پھر اس کے لیے تھوڑے سے چاول پلیٹ میں نکالے۔
"صاحب بہادر کہاں رہ گئے ہیں کیا آج بھی نہیں آنا اس نے؟" وسیم صاحب نے کلاک پہ نظر ڈالتے ہوئے پوچھا تو حریم کارواں رواں متوجہ ہو گیا۔
"ابھی کال کر کے پوچھتی ہوں۔ مائرہ کو چیک اپ کے لیے لے جانا تھا اس نے۔" نزہت اپنا موبائل اٹھا کر کال ملانے لگیں۔
"کیسی طبیعت ہے مائرہ کی؟" وہ پوچھ رہی تھیں۔
"چلو...... اللہ کا شکر ہے۔" وہ خوش ہوئیں دوسری طرف سے یقیناً صحت یابی کی خوش خبری سنائی گئی تھی۔
"دیکھا...... تم ساتھ ہوتے ہو تو مائرہ کو جیسے کوئی تکلیف ہوتی ہی نہیں۔"
نزہت چہکیں۔ "ہاں...... میرو یہیں ہے، کھانا کھا رہی ہے۔ تم ذرا دھیان کرنا مائرہ کا۔ کھانا اپنی نگرانی میں کھلانا فوزیہ بھابی کا تو وہ بالکل بھی کہنا نہیں مانتی۔"
"چلو ٹھیک ہے۔ کوئی بات نہیں۔ وہ بھی اپنا ہی گھر ہے تمہارا۔" مسکراتے ہوئے کہہ کر انہوں نے بات

سمیٹی تھی۔
"کب تک آرہا ہے؟" وسیم صاحب کے استفسار پہ وہ پلیٹ اٹھاتے ہوئے اس میں بریانی ڈالتے ہوئے اطمینان سے بولیں۔
"وہ کھانا کھا کر ہی آئے گا۔فوزیہ نے کافی اہتمام کیا ہوا ہے آج کھانے پر۔"
"مائرہ کیسی ہے اب؟" انہوں نے استفسار کیا۔
"اللہ کا شکر ہے۔ بہت بہتر ہے۔اسی لیے میں نے کہا کہ آرام سے آئے۔اس کی موجودگی میں مائرہ خوش رہتی ہے۔بچپن کا ساتھ جو ہوا۔" انہوں نے بریانی کی پلیٹ وسیم صاحب کے سامنے رکھی اور دوسری پلیٹ میں روسٹڈ چانپ کا پیس اور گرین سیلڈ ڈال کر انہیں سرو کیا۔ پھر خفت سے لب کاٹتی حریم پہ نگاہ غلط ڈالتے ہوئے اپنے لیے کھانا نکالنے لگیں۔اتنے شوق سے بنائے گئے کھانے کے چند لقمے حریم نے گویا زہر مار کیے اس کی بھوک یکلخت ہی ختم ہوگئی تھی۔

☆☆☆

تھوڑا سا کھانا کھا کر اس نے ہاتھ کھینچ لیا تھا۔
"ارے......بس۔ابھی یہ چاؤمن تو لیا ہی نہیں تم نے۔" فوزیہ کا رویہ مائرہ کی سنبھلتی حالت دیکھ کر اس سے بدل گیا تھا اسے فوراً ٹوک کر کہا تو وہ مسکرا دیا۔
"بس ممانی جان! اتنا بہت ہے۔ میرب کھانے پہ انتظار کررہی ہوگی۔"
"میرب......یا اس کی نام نہاد ماں؟" مائرہ نے اس کی بات اچکی تو اس کی مسکراہٹ غائب ہوئی۔
"مائرہ۔" فوزیہ نے تنبیہی انداز میں اسے پکارا۔
مائرہ نے سوپ کا پیالہ پیچھے کیا اور کرسی دھکیل کر اٹھ کھڑی ہوئی۔
"ہر جگہ میں ہی غلط ہوں۔ اکیلی ہوں اور برباد بھی میں ہی ہوں۔" وہ اب بات بے بات ایسے ہی جذباتی ہوجاتی تھی۔
"کم آن ماؤ......کیا بچپنا ہے یہ۔تمہاری خاطر ہی تو یہاں بیٹھا ہوا ہوں۔ورنہ جب میرو کی کال آئی تھی اسی وقت نکل جاتا۔" اس نے تحمل سے سمجھایا تو ماں کی آنکھ کے اشارے پہ وہ منہ پھلائے بیٹھ گئی۔اس نے زبردستی سوپ پلایا اور ابھی اٹھنے کا قصد کررہا تھا کہ ماموں جان دوستوں کی دعوت سے واپس تشریف لے آئے۔
اسے ایک گھنٹہ مزید بیٹھ کر ملکی سیاست پہ سیر حاصل گفتگو کرنی پڑی مائرہ تھک کر سوگئی تب کہیں جا کر وہ گھر واپس آیا تو سوائے لاؤنج کے ساری ہی لائٹس آف تھیں۔وہ دل ہی دل میں میرب سے شرمندہ تھا کمرے میں آیا تو حسب توقع لائٹ آف تھی۔اس نے سوئچ بورڈ پہ ہاتھ مار کر ہلکی لائٹ آن کی۔تو حریم نے آنکھوں پہ رکھا بازو ہٹا کر اسے دیکھا۔
"سوری فار ڈسٹربنگ۔" وہ دھیمی آواز میں کہتا والٹ، کی چین اور موبائل سائیڈ ٹیبل پہ رکھ کر شرٹ کے بٹن کھولنے لگا جوتے تبدیل کیے اور حسب عادت نائٹ سوٹ لے کر فریش ہونے چلا گیا، حریم اٹھ بیٹھی۔وہ میرب کے ساتھ ہی سونے کے لیے لیٹ گئی تھی لیکن نیند تھی کہ آکر نہیں دی۔
تھوڑی دیر بعد وہ واش روم سے نکلا تو حریم کو بیٹھے دیکھ کر حیران ہوا۔
"کیا بات ہے؟ کوئی مسئلہ ہے کیا؟"
"ہاں......ہے مسئلہ۔" وہ اٹھ کر چلتی اس کے سامنے آکھڑی ہوئی۔
"کیا مسئلہ ہے؟ بتاؤ۔" وہ نیم تاریکی میں اس کے تاثرات کا اندازہ لگانے سے قاصر رہا تو نرمی سے بولا۔

"اس مسئلے کا نام ہے مائرہ۔" سینے پہ بازو لپیٹے ہوئے [illegible] آنکھوں کے ساتھ وہ بے [illegible]
دھکا سا لگا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"مطلب یہ ہے کہ تم مجھے شادی کر کے اس گھر میں لائے ہو۔ شاید تمہیں یاد نہیں۔" حریم تلخی سے بولی۔

"ہنہہ ...... ایک یہی حقیقت تو یاد ہے۔" وہ بڑبڑایا حریم سن نہیں پائی۔

"خائن ہو تم ...... اپنی فیملی کا وقت دوسروں پہ لٹانے والے خائن ہی ہوا کرتے ہیں۔" حریم سلگی تو اس نے بے اختیار خود پہ قابو کھو کر حریم کا بازو تھام کر ہلکا سا جھٹکا دیا۔

"اپنا انداز درست کرو۔"

"یہاں ہر کسی کا ہی انداز غلط ہے پھر درستی کا آرڈر صرف میرے لیے ہی کیوں؟" حریم نے غصے سے اپنا بازو چھڑایا۔

"تم اچھی طرح جانتی ہو کہ مائرہ کس کنڈیشن میں ہے۔ اسے توجہ کی ضرورت ہے۔" اس نے اپنے غصے کو دباتے ہوئے تحمل سے حریم کو سمجھانا چاہا۔

"اچھا...... یعنی خودکشی کی ایک کوشش مجھے بھی کرنا پڑے گی؟" حریم کی آنکھیں غم و غصے سے سلگنے لگیں۔ حد ہی تو ہوگئی تھی۔ زبردستی کی شادی۔ گھر لا کر لاتعلقی اور اب ناک تلے پھر سے پرانے معاشقے جاری و ساری تھے۔ وہ کہاں تک برداشت کرتی۔

"تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہوگیا؟" وہ متحیر تھا۔

"ایسا کیا ہوگیا ہے جو اتنی فضول باتیں کر رہی ہو تم؟"

"واہ......" حریم نے بے آواز تالی بجائی۔ "ابھی کچھ ہوا ہی نہیں ...... براوو۔" طنز سے بھرپور پرتپش لہجے میں کہا تو وہ اسے کہنی سے تھام کر زبردستی ڈریسنگ روم میں لے آیا۔ لائٹ آن کی تو اس کی آنکھیں لمحہ بھر کو چندھیا گئیں۔

"روشنی میں بات کرو۔ اندھیرے میں بہادری دکھانے والے عموماً بزدل ہوا کرتے ہیں۔" وہ ٹھنڈے لہجے میں بولا۔ سیاہ زیرک نگاہیں یقیناً روشنی میں حریم کے تاثرات جانچنے کی چاہ میں اس کے چہرے پہ جمی تھیں۔

"میں بزدل نہیں ہوں۔" حریم نے پھنکارتے ہوئے اپنی کہنی جھٹکے سے چھڑائی۔ "میں صرف مجبور اور بے بس ہوں۔" غم و غصے سے اس کی رنگت سرخ اور تنفس بے ترتیب تھا۔ آنکھوں کی سفیدی میں ضبط کا گلابی پن جھلک رہا تھا۔

"کیا کرنے میں بے بس ہو؟ مجھے اور میرب کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر جانے میں؟" وہ سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔

"تم......" حریم نے نم آنکھوں سے اسے دیکھ کر دانتوں پر دانت جمائے پھر چیخ کر بولی۔

"تم تو میری زندگی میں ہو ہی نہیں۔ صرف کاغذوں میں ہی لکھے ہوئے ہو کہیں۔ بے بس اور مجبور تو میں صرف میرب کے لیے ہوں۔"

"مجھے تمہارا انداز گفتگو بالکل بھی سمجھ میں نہیں آرہا۔" چند لمحے توقف کے بعد وہ رسان سے بولا۔ "دیکھو! اگر تم چاہتی ہو کہ ہم اپنی میریڈ لائف شروع کردیں تو مجھے کوئی اعتراض۔" وہ اس کی جذباتی کیفیت کا اپنی سمجھ کے مطابق حل نکالتے ہوئے کہنے لگا تھا کہ شرم و اہانت کے احساس کے ساتھ کانپ کر وہ بلا ارادہ و بے اختیار غرا اٹھی۔ "شٹ اپ......"

غیر سے...... ہاں۔ وہ بھی بھڑ کا۔
"حد ہوگئی ہے۔ یہ بھی نہیں وہ بھی نہیں...... تو پھر کیا؟ اصل مسئلہ کیا ہے تمہارا؟" اسے شانوں سے تھام کر پیچھے دھکیلا تو وہ دیوار کے ساتھ جا لگی۔ وہ آج تک اس پہ کبھی یوں نہیں بھڑ کا تھا جیسے حریم کی لایعنی باتوں اور الزامات نے اسے بھڑکا دیا تھا اور یہ پہلی بار تھا کہ حریم اس کے غصے سے خائف ہوئی۔
"تم...... مجھے چھوڑ دو۔ میں میرب کو یہاں سے لے کر چلی جاؤں گی۔ تم مائرہ سے شادی کر لینا۔" سسک کر کہا۔
"تم نا۔" دانتوں پہ دانت جما کے اس نے جبڑے بھینچے تھے۔ پھر اس کے چہرے کے بالکل پاس دیوار پہ مکا مارا تو حریم کی چیخ نکل گئی۔
"امتحان بن گئی ہو میری زندگی کا سب سے بڑا۔ مائرہ سے شادی کر کے گھر لانا ہوتا تو میں اسی کو لاتا۔ کوئی نہیں روک سکتا تھا مجھے ڈیم اٹ...... تمہارے عشق میں پاگل نہیں ہو رہا تھا جو تمہیں سر پہ لا دلیا۔ اتنی سی بات تمہاری سمجھ میں کیوں نہیں آتی۔"
تلخی سے کہتے ہوئے وہ ڈریسنگ روم سے باہر نکل گیا تو حریم کتنی ہی دیر دیوار کے ساتھ بے حس وحرکت کھڑی اپنے حواس سنبھالتی رہی۔

زندگی!
مجھ کو تیرا پتا چاہیے
روشنی کے لیے دیا چاہیے
روٹھے رب سے دعا
ٹوٹے دل کی صدا
گم شدہ راستوں میں پناہ چاہیے
زندگی! مجھ کو تیرا پتا چاہیے

☆☆☆

"مجھے بھی جانا ہے مائرہ کا احوال پوچھنے۔" صبح ناشتے کی میز پہ دل کڑا کر کے اس نے کسی کو بھی بطور خاص مخاطب کیے بنا کہا تو ایک دم خاموشی پھیل گئی، میرب کو ناشتا کرواتی حریم کو اپنی دھڑکن کانوں میں سنائی دینے لگی۔
"کیوں۔ کس ناتے سے؟" نزہت پہلے ہوش میں آئیں۔ وسیم صاحب نے بس ایک سرسری نظر حریم پہ ڈال کر چائے ختم کی اور آفس کی تیاری کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے وہ گھر کے معاملات میں بس اتنا ہی پڑتے تھے جتنا نزہت انہیں کھینچ کر معاملے میں لاتی تھیں۔
"آپ کی بہو ہونے کے ناتے سے۔" اس نے مضبوطی سے کہا۔ "ماموں اور ممانی جان کو گلہ ہوگا مجھ سے۔"
"دیکھ رہے ہو اپنی بیوی کی زبان درازی۔ کیا فضول فرمائشیں کر رہی ہے۔" بیٹے کو آتا دیکھ کر نزہت نے جلبلا کر شکایت لگائی۔ وہ اپنی نشست سنبھالتے ہوئے استفہامیہ نظروں سے ماں کو دیکھنے لگا۔
"مائرہ کا پتا لینے جانا ہے بی بی کو...... مطلب...... جو مرا نہیں۔ اسے خدانخواستہ گھر جا کے مارے گی یہ۔" نزہت تلملا اٹھی تھیں اس کی فرمائش پہ اس نے ایک اچٹتی نظر حریم پہ ڈالی اور سنجیدگی سے بولا۔
"میں کال پہ ممانی جان سے بات کروا دوں گا تمہاری۔"

تب وہاں جارہے ہیں تو میں کیوں نہیں جا سکتی؟ میری ایسی کوئی ڈیل نہیں مائرہ کے ساتھ۔" حریم نے احتجاج کیا۔

"اس کی جگہ اس گھر میں آئی ہو۔ پہلے تمہاری بہن اور اب تم...... ابھی بھی اپنا قصور پتا نہیں ہے تمہیں۔" نزہت کہتے ہوئے بھول گئیں کہ حریم کا رشتہ لے کر وہ خود گئی تھیں۔

"آپ نے رشتہ مانگتے ہوئے کہا تھا کہ آپ کا بیٹا مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ میں زبردستی اس گھر میں نہیں آئی آنٹی! آپ خود میرے والدین سے مجھے مانگنے گئی تھیں۔" وہ خوف کو اندر دباتے ہوئے بولی۔

"دیکھ رہے ہو اسے۔ کیا بکواس کیے جارہی ہے۔" نزہت نے تلملا کر بیٹے کو دیکھا جو جانچتی نظروں سے حریم کو دیکھتے ہوئے اندازہ لگانے کی کوشش کررہا تھا کہ آخر وہ چاہتی کیا ہے۔ پھر آرام سے بولا۔

"حریم! اس ٹاپک کو چھوڑ دو۔ صاف بات ہے مائرہ تم سے ملنا نہیں چاہے گی۔ اس لیے ایسی حرکت کا کوئی فائدہ نہیں جو عزّت نہ دے پائے۔"

حریم اس کی بات سن کر ہوا نکلے غبارے کی طرح ہوگئی۔ وہ مطمئن ہو کر ناشتا کرنے لگا جبکہ نزہت فاتحانہ نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے اٹھ گئیں۔

"آفس جانے سے پہلے مائرہ کی طرف جاؤ گے تم؟" بیٹے کو مخاطب کیا تو جواب دینے سے پہلے اس کی نگاہ سامنے بیٹھی حریم کی تنی ہوئی شکل پہ پڑ گئی۔

"جی ہاں۔ روز ہی جاتا ہوں پانچ دس منٹ کے لیے۔" توس پہ مکھن لگاتے ہوئے بے نیازی سے بولا۔

"میں بس دو منٹ میں تیار ہو کر آتی ہوں۔ مجھے مائرہ کے پاس چھوڑ دینا۔" نزہت سرشاری ہوگئیں۔ وہ سر اثبات میں ہلا کر ناشتا کرنے لگا۔ ثریا اس کے لیے تازہ اورنج جوس کا گلاس رکھ گئی تھی۔

"تم ابھی بھی آفس جانے سے پہلے مائرہ کی طرف جاتے ہو؟" حریم نے بے یقینی سے پوچھا۔

"ابھی اس کی طبیعت سنبھلی نہیں۔ اسے اس سارے فیز سے نکلنے کے لیے من پسند باتوں، ماحول اور کمپنی کی ضرورت ہے۔"

"جو کہ بس تم ہی ہو۔" وہ تڑخی۔

"خوش قسمتی سے۔" وہ سر ہلا کر جوس کا گلاس لبوں سے لگا گیا۔ حریم کا جی چاہا وہی گلاس لے کر اس کے سر میں دے مارے۔

☆☆☆

"عباد۔"

"ہمم......"

"ہم تمہارے گھر کب جائیں گے؟" زمین ابھی میرب کو سلا کر آئی تھی۔ کینڈی کرش کا کوئی مشکل سا لیول پار کرتے عباد نے بے توجہی سے اس کی بات سنی۔

"ہمم......" زمین کو اس کی بے جا مصروفیت پہ غصہ آیا۔

"یہ کیا فضول حرکت ہے بھئی۔" اس نے عباد کے ہاتھ سے موبائل اچک لیا تھا۔

"ارے...... لیول تو کمپلیٹ کرنے دو۔" عباد نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے احتجاج کیا۔

"اور جو میرا بی پی لیول بڑھا رہے ہو تم۔" زمین نے منہ پھلایا۔

"اب کیا ہو گیا ہے بھئی؟" عباد کی ساری توجہ اپنے موبائل کی طرف تھی جسے زمین نے آف کر کے ایک طرف ڈال دیا تھا، وہ ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے اس کی طرف متوجہ ہوا۔

"اب یہ ہوا ہے کہ شادی کے محض پونے دو سال بعد ہی تم مجھ سے اتنے اکتا گئے ہو کہ دھیان سے میری بات بھی نہیں سنتے۔" زمین نے منہ پھلایا تو اس کے تاثرات فوراً بدلے۔ نظر میں استحقاق کی چمک اتری تو وجیہہ چہرے کو اس کی مخصوص مسکراہٹ نے کھلا دیا۔

"میں پوچھ رہی تھی ہم تمہارے گھر کب جائیں گے؟"

"میرا گھر؟" عباد نے دہرایا پھر مسکرا دیا۔

"ہمارا گھر تو یہی ہے جانم! وہ تو مما ڈیڈ کا گھر ہے جہاں انٹری کی فی الحال اجازت نہیں ہمیں۔"

"تم زیاد سے کیوں نہیں بات کرتے۔ وہ منا سکتا ہے مما اور ڈیڈ کو۔" زمین نے اسے راہ بجھائی تو وہ ہنسنے لگا پھر گویا ایک راز فاش کیا۔

"مما نے کہا ہے کہ اگر میں زیاد کی شادی مائرہ سے کروا دوں تو راضی نامہ ہو سکتا ہے۔"

"لوووجی...... تو اس سے اچھی کیا بات ہے پھر؟" زمین پھڑکی۔

"اس سے اچھی بات یہ ہے کہ زیاد کو بھی اپنی پسند کی زندگی گزارنے کا حق ہے۔ اور مجھے کوئی حق نہیں کہ میں اپنی خود غرضی کے لیے اس کے جذبات کا استعمال کروں۔"

عباد نے اس کے گرد بانہوں کا گھیرا تنگ کرتے ہوئے مسکرا کر کہا تو وہ خفا ہوئی۔

"لو بھلا۔ اچھی خاصی پیاری لڑکی تو ہے وہ۔ زیاد کو بھلا کیا اعتراض ہو گا۔"

"اچھا......" وہ اس کی بات سن کر محظوظ ہو کر ہنسا پھر اسے چھیڑنے لگا۔

"مجھے تو تم نے نہیں کہا تھا یہ سب۔ نہ اس پیاری لڑکی کے لیے مجھے راضی کیا تھا۔"

"تم تو......" زمین نے اس کی شرارت سمجھ کر دانت پیسے پھر خفا ہونے لگی۔

"فضول باتیں کروا لو بس تم سے۔ سوال گندم جواب چنا۔"

"وہ کسی اور کو پسند کرتا ہے میری بھولی سرکار۔" عباد نے اس کی آخری امید کے غبارے کی ہوا بھی نکال دی تھی۔ زمین کا منہ لٹک گیا۔

"حد ہے بھئی۔ ہر کوئی اپنی اپنی نبیڑ رہا ہے۔"

وہ جھنجھلا کر پیر پٹختی وہاں سے چلی ہی گئی۔ عباد کا زوردار قہقہہ اس کے پیچھے تک آیا تو زمین مزید چڑی۔ لیکن اس نے طے کر لیا تھا کہ کوئی نہ کوئی پلان بنا کر سیٹھی ہاؤس جانا ہی ہے۔ وہ اونچے خاندان کی حسین بہو بننے کا ذائقہ چکھنے کو بے چین و بے تاب تھی۔ مگر اب یہ بات کھل کر عباد کو کون سمجھاتا یقیناً اسے خود ہی کوئی لائحہ عمل طے کرنا تھا۔

☆☆☆

یہ چبھن اکیلے پن کی یہ لگن اداس شب سے
میں ہوا سے لڑ رہا ہوں تجھے کیا بتاؤں کب سے
تیرے نام سے شفا ہو، کوئی زخم وہ عطا کر
میرا نامہ بر ملے تو اسے کہنا یہ ادب سے
وہ جواں رتوں کی شامیں کہاں کھو گئی ہیں محسن
میں تو بجھ کے رہ گیا ہوں وہ بچھڑ گیا ہے جب سے

(محسن نقوی)

اس نے زمین و آسمان ایک کرڈالا لیکن کیتھی اور اس کی فیملی کو جیسے زمین نگل گئی تھی یا آسمان۔ کہیں کوئی تل برابر نشان بھی نہ چھوڑا تھا ان لوگوں نے۔ زیاد رات کو تڑپ تڑپ اٹھتا۔ نیند، کھانا پینا، سونا سب متاثر ہونے لگا۔

''کیا ہوا ہے یار! ٹھیک تو ہے تو......؟'' عباد اسے ویڈیو کال پہ دیکھ کر پریشان ہوا تھا۔

''کیتھی کہیں نہیں ہے۔ کہیں بھی نہیں۔'' دوستوں جیسے ہمدرد بھائی کو سامنے پا کر زیاد ہمت چھوڑ بیٹھا۔

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ میں ایک ہفتے کے لیے دوستوں کے ساتھ آؤٹنگ پہ تھا۔ واپس آیا ہوں تو وہ بنا رابطے کے غائب ہے۔''

''یہیں کہیں ہوگی۔ اس کے دوستوں سے پوچھو۔'' عباد نے اسے تسلی دی۔

''کسی کو کچھ بھی پتا نہیں۔ راتوں رات وہ لوگ اپنا فلیٹ بیچ کر خدا جانے کہاں روپوش ہو گئے ہیں۔'' وہ سر تھامے بیٹھا تھا۔

''پولیس سے رابطہ کیا تم نے؟''

''جو کھو گیا ہو اس کے بارے میں تو رپورٹ کروادیتا لیکن جو اپنی مرضی سے پلان کر کے چھپے ہوں اُن کے لیے کیا رپورٹ درج کرواؤں۔'' وہ ہارا ہوا تھا۔ عباد دم بخود تھا۔

''یہ کیا ہو گیا یار؟''

''میرے خیال میں تو کیتھ کے گھر والوں کو اس کے اسلام قبول کرنے کا پتا چل گیا ہوگا اور کوئی وجہ نہیں ہو سکتی اس کیموفلاج (چھپنے) کی۔'' زیاد نا امید تھا۔

''بہادر بنو یار۔'' عباد کو اس کی حالت تکلیف دے رہی تھی۔

''بہادر ہی تو بنا ہوا تھا پورے ایک ماہ سے......زمین آسمان ایک کر دیا۔ چھوٹے سے چھوٹے نشان کے پیچھے گیا ہوں اسے ڈھونڈنے، لیکن اب تو ہر آس امید ختم ہو گئی ہے۔'' زیاد کا لب و لہجہ ہارا ہوا تھا عباد بے چین ہو اٹھا۔

''مل جائے گی۔ ہوسکتا ہے وہ لوگ خود اپنی کمیونٹی کے خوف سے چھپے ہوں۔ تم نے بتایا تھا کہ وہ مذہب تبدیل کرنے والی تھی۔''

اور جب وہ سب امیدیں کھو بیٹھا تھا تو ایک ریسٹورنٹس میں اسے مارک دکھائی دے گیا وہ اپنی ایک دوست

کواوپن ریسٹورنٹ میں کھانا کھلانے کے بعد رخصت کررہا تھا۔اس کے جانے کے بعد وہ اپنی کافی ختم کرتے ہوئے موبائل پہ کچھ سرچ کررہا تھا جب زیاد کرسی گھسیٹ کراس کے سامنے آبیٹھا۔

''ہیلو۔'' مارک نے بے اختیار نظریں گھمائیں تو زیاد کو سامنے دیکھ کر گھبرانے کے بجائے محظوظ ہوتے ہوئے مسکرادیا۔

''او...... ہائے...... محبت میں ناکام ـــــ انسان۔'' اس کے جوابی تخاطب پہ زیاد کی کنپٹیاں تپ اٹھیں۔ یعنی یہ سب ایک سوچا سمجھا منصوبہ تھا۔وہ سب جانتے تھے کہ زیاد ابھی تک کیتھی کو ڈھونڈ رہا ہے۔

''کیتھ کہاں ہے؟''

''تمہیں پتا ہوگا۔تمہاری گرل فرینڈ تھی۔ مجھ سے تو منگنی بھی توڑ دی تھی اس نے۔'' وہ شانے اچکا کر بولا۔

''میرے صبر کا امتحان مت لو مارک! میں اپنے گزشتہ رویے کی معافی مانگتا ہوں تم سے۔ مجھے کیتھی کا پتا بتا دو۔'' وہ اپنا سارا مان سمان بھولے ہوئے منّت کرنے پہ اتر آیا۔مارک محظوظ ہوا۔زیاد کے شکست خوردہ انداز نے اس کی زخمی انا کو بہت تسکین پہنچائی تھی۔

''میں تمہیں بتارہا ہوں نا۔ وہ لوگ میرے بھی رابطے میں نہیں۔ہم نے تو منگنی ختم ہونے کے بعد ملنا جلنا ہی چھوڑ دیا تھا ان لوگوں سے۔'' وہ رکھائی سے بولا تو زیاد کو اس کے لب و لہجے کی سختی سے اندازہ ہو گیا کہ وہ اس سے زیادہ ایک لفظ بھی نہیں بتائے گا۔

☆☆☆

آج مائرہ اس حادثے کے تقریباً ڈیڑھ ماہ بعد گھر آئی تھی۔لاؤنج میں دونوں فیملیز کی باتیں ہنسی قہقہے سب کچھ تھا۔صرف ایک حریم ہی تھی جو چائے کی ٹرالی سیٹ کرکے ثریا کے ہاتھ بھجوا کر اب مجرموں کی طرح کچن میں چھپی کھڑی تھی۔ ہمت ہی نہ ہوتی تھی کہ باہر جاکر ان کے بیچ بیٹھ جاتی۔نزہت نے بطور خاص اسے چائے بھجوا کر اپنے کمرے میں چلے جانے کا آرڈر پہلے ہی سے دے دیا تھا۔

دل مضبوط کرتے ہوئے وہ لاؤنج میں چلی آئی تو اسے دیکھ کر سب خاموش ہوگئے، حریم کا اعتماد متزلزل ہوا۔نزہت نے بے حد خفگی سے بیٹے کو دیکھا لیکن وہ ان کی طرف متوجہ نہیں تھا۔

''وہ...... میرب کے سونے کا وقت ہو رہا ہے۔ میں اسے لینے آئی تھی۔''

''ایک تو لوگوں کا ''آیا پن'' جاگ اٹھتا ہے بے وقت۔'' مائرہ کی بڑبڑاہٹ سبھی نے سنی تھی وہ مزید نروس ہوئی تو اس نے اپنی گود میں بیٹھی میرب کو اٹھ کر حریم کے حوالے کرتے ہوئے اس کی مشکل آسان کی۔

''یہ لو...... اور کھانا کھلا دینا سلانے سے پہلے۔اس نے چند نوالے ہی لیے تھے۔'' حریم نے خفگی و بے بسی سے پرنگاہ اپنے شوہر پہ ڈالی اور میرب کو لے کر لاؤنج سے نکل کر سیڑھیاں چڑھنے لگی۔

''اس کا شکل دکھانا ضروری ہوتا ہے۔سارا موڈ خراب کردیتی ہے تمہاری بیوی۔'' مائرہ اونچی آواز میں کس سے مخاطب تھی یہ حریم اچھی طرح جانتی تھی۔وہ تیزی سے سیڑھیاں طے کر گئی اس کا دل بہت دکھا ہوا تھا۔آنکھیں ضبط کے باوجود بھری جارہی تھیں۔

اس کا شدت سے دل چاہ رہا تھا اس گھر اور اس ماحول سے کہیں دور چلی جائے۔

☆☆☆

''بے وقوف مت بنو حریم! ایسے بھی کوئی اپنی جگہ کسی کے لیے خالی کرتا ہے؟'' سجل بہت دنوں بعد اس سے ملی تو حریم کی باتیں سن کر سر تھام لیا۔

"دیکھو...... اس کے لیے بھی یہ سب اچانک اور غیر متوقع صورت حال ہے۔ وہ بھی ابھی تک حالات سدھارنے کے لیے ہاتھ پیر مار رہا ہے۔ یوں اسے بار بار خود سے مائرہ کی طرف دھکیلو گی تو وہ تم سے بدظن ہو جائے گا۔" سجل نے اسے سمجھایا۔

"پہلے کون سے محبت کے گیت سناتا رہتا ہے وہ۔" حریم کو اس کی آفر یاد آئی تو کان تپ سے گئے اس نے جب جب اس بات کو یاد کیا اسے غصہ ہی آیا تھا۔ کیا سمجھتا ہے یہ مجھے۔ جذبات کے ہاتھوں مجبور ہو کر پکے پھل کی طرح گود میں گرنے والی۔ اُفف...... اسے ہر بار تپ چڑھتی تھی۔

"اپنی سلطنت اپنے ہاتھوں کسی کو سونپ دینے والے ذلت آمیز شکست یافتہ قرار پاتے ہیں حریم! زندگی کا ڈٹ کر مقابلہ کرو۔ اپنا حق وصول کرو۔ دیکھو، جہاں رشتہ نبھانا ہو جوڑے رکھنے کی تگ و دو ہو وہاں انا اور خودداری کا کیا کام؟"

"اب کیا کروں۔ بھیک مانگوں اس کی توجہ کی؟" حریم کے سر میں درد شروع ہو گیا تھا۔

"بھیک مت مانگو۔ لیکن یوں بھیک میں کسی اور کو دان بھی مت کرو اپنا شوہر۔" سجل زچ ہوئی۔

"جو میرا ہے ہی نہیں اسے کسی اور کا ہونے کے لیے میری اجازت کی بھلا کیا ضرورت ہے۔" حریم سلگی تو سجل نے سر تھام لیا۔

"میں اس زندگی کے ہاتھوں تنگ آ چلی ہوں سجل! کیا تھا جو اللہ مجھے سادہ سی نارمل سی زندگی اور خوشیاں دے دیتا۔ میں تو ان آزمائشوں کے قابل ہی نہیں۔" وہ مایوس تھی۔

"اللہ کسی پہ اس کی استطاعت سے بڑھ کے بوجھ نہیں ڈالتا۔ تم یقین رکھو جس نے تم پہ آزمائش ڈالی ہے وہ اس کا صلہ بھی بہترین دے گا تمہیں۔" سجل نے اسے تسلی دی۔

"مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ وہ مائرہ سے محبت کرتا ہے۔"

"اگر وہ مائرہ سے محبت کرتا تو شادی تم سے کیوں کرتا؟"

"کیونکہ مائرہ کو میرب پسند نہیں۔ وہ اسے پالنا نہیں چاہتی تھی۔" حریم نے ترنت کہا۔

"اس سے یہ کیسے ثابت ہوا کہ وہ مائرہ سے محبت بھی کرتا ہے؟" سجل نے پوچھا۔

"اس کی آنکھیں کہتی ہیں۔ وہ محبت میں ہارا ہوا شخص ہے سجل! میرے پاس آتا ہے تو اس کے انداز سے وہ بے ساختگی مفقود ہوتی ہے جو اس رشتے کی جان ہوا کرتی ہے۔" حریم نے آج ساری داستان کھول دی تھی۔

"اور جب سے مائرہ نے خودکشی کی کوشش کی ہے وہ اس کے گھر کے چکر نہیں چھوڑ رہا۔"

"اگر ایسا ہے بھی تو تمہاری حیثیت بہت مضبوط ہے حریم!" کچھ حساب لگا کر سجل پر جوش سی آگے کو جھکی۔

"اس گھر میں وہی دلہن بن کے آ سکتی تھی جو میرب کی ماں بنتی...... اور وہ تم ہو...... یعنی کم از کم تمہیں سیٹھی ہاؤس سے نکال کوئی نہیں سکتا۔"

"تم ابھی میری ساس کو نہیں جانتیں۔" حریم نے چائے کے کپ میں چمچ گھماتے ہوئے بیزاری سے کہا تھا۔

"تو اچھی ساسیں بھی کون سا سارے زمانے کی ہوتی ہیں۔ ایک تمہیں بری مل گئی تو کیا؟" سجل نے حقیقت کا آئینہ دکھایا۔

"اصل بات ہوتی ہے شوہر کی۔ اس پہ غور کرو۔ اسے باندھو خود سے۔ ایسے کہ گزارہ نہ کر پائے تمہارے بغیر۔"

''اور اگر شوہر بھی وہ ملے جو پہلے ہی کسی اور سے بندھا ہو، تب کیا کرنا چاہیے؟'' وہ سجل کی باتوں پہ اندر ہی اندر جز بز ہوتی خود سے ہی خفا ہوتی جا رہی تھی۔

''فضول کے قیافے مت لگاؤ۔ اس کا نقصان بھی تو دیکھو کتنا بڑا ہوا ہے۔ میرب کے لیے اسے اپنے جذبات بدلنے پڑے ہیں اور یہ آسان کام نہیں ہوتا اب یہ تم پر ڈیپینڈ کرتا ہے کہ کس طرح اس کے دل میں اپنی جگہ بنائی ہو۔''

''خدا کے لیے سجل!'' حریم کا چہرہ خفت سے گلابی ہوا۔ ''میں نے اس کے ساتھ لو میرج نہیں کی بائے داوے۔''

''ہر میرج لو میرج نہیں ہوتی۔ اس میں لو خود ایڈ کرنا پڑتا ہے میری جان۔'' سجل ہنسی تو وہ خفا خفا سی اپنی چائے ختم کرنے لگی۔

☆☆☆

''کیوں اپنی زندگی برباد کر رہی ہو کیتھی!''

ڈینیئل نے دکھ سے کیتھی کو دیکھا۔ اس سال خوردہ کمرے میں ایک زنجیر سے بندھی وہ چپ چاپ اپنے بستر پہ بیٹھی ہوئی تھی۔ زرد رنگت۔ لیکن بے خوف چہرہ۔ آنکھوں کی چمک حد سے سوا۔ اس کے پیر سے بندھی لوہے کی موٹی چین بس اتنی ہی لمبی تھی کہ وہ اپنے بستر کے ساتھ موجود اٹیچ باتھ تک ہی جا سکتی تھی۔ کمرے کے دروازے تک بھی اس کا ہاتھ نہیں پہنچتا تھا۔

''اللہ کا شکر ہے۔ اب ہی تو زندگی آباد ہوئی ہے میری۔ تمہیں کیا پتا اللہ پہ ایمان لانا کیا ہے ڈینی! یوں لگتا ہے جیسے اپنا کھویا ہوا باقی آدھا حصہ مل گیا ہو۔'' اس کے چہرے کی چمک نے ڈینیئل کو متحیر کیا۔

پچھلے سوا مہینے سے وہ یہاں چھوٹے سے کمرے میں قید تھی آسمان اور سورج کی روشنی گویا اس کی نظروں کے لیے حرام کر دی گئی تھی۔ اس کا قرآن، حجاب اس سے چھین لیا گیا تھا کہ ابھی نئی نئی مسلمان ہوئی ہے۔ چند دنوں میں سب بھول جائے گی لیکن وہ نہیں جانتے تھے کہ نماز کے لیے اسے ظاہری حجاب کی نہیں کامل نیت کی ضرورت تھی جو وہ لوگ اس سے چھین نہیں سکتے تھے۔ وہ واش روم میں وضو کر کے بستر پر بیٹھ کر ننگے سر ہی نماز ادا کرتی اور اللہ کے سامنے کھل کر روتی۔

''اے اللہ!! تو بہت رحیم اور رحمٰن ہے۔ فضل فرمانے والا ہے۔ میری اس بے پردہ عبادت کو اپنی بارگاہ میں قبول فرمانا۔ تو جانتا ہے یہ بے پردگی تیرا نام لینے پر میرا نصیب کر دی گئی ہے۔''

ڈینیئل اس روز تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ اس کے پاس رکا۔ پیار محبت، غصہ، چیخ و پکار سب کر کے اسے سمجھا لیا لیکن کیتھی نے ایک وقت پہ آ کر گونگوں بہروں کی مانند چپ سادھ لی۔ ڈینیئل اس روز بک جھک کر روتے ہوئے وہاں سے گیا تھا۔ کیتھی نے یہ آخری موقع بھی کھو دیا۔

اس روز کے بعد کیتھی کو کسی نے بھی کھلے آسمان تلے نہیں دیکھا تھا کہ وہ زندہ ہے یا مار دی گئی۔

☆☆☆

''میرا بالکل بھی دل نہیں کر رہا تمہیں گھر لے جانے کو..... حالانکہ مما کو بتا چکا ہوں کہ تمہیں اور میرو کو لے کر آ رہا ہوں۔'' عباد الجھا الجھا سا تھا۔ میرب کو تیار کرتی نرمین پر جوش تھی اس کی مسلسل ضد اور خواہش آج رنگ لے ہی آئی تھی۔

''کم آن عباد! کیا بہویں اپنے سسرال میں خوش نہیں رہتیں؟'' وہ اب خود تیار ہونے جا رہی تھی۔

نہیں لگتا کہ تم یہاں آکے ہیں زیادہ خوش ہو گئی ہو۔

"لو...... یوں ایک کونے میں گھس کر سب سے کٹ کر زندگی گزارنے کا کیا مزا (جب تک شریکوں کو جلایا نہ جائے)۔" اس نے چمکتی آنکھوں کے ساتھ آدھی بات دل میں کہتے ہوئے عباد کے بالوں میں انگلیاں پھنسائیں۔

"مجھے اچھا نہیں لگے گا اگر مما نے تمہیں کچھ الٹا سیدھا کہا۔" عباد نے سچائی سے کہا۔

"خوابوں کی تعبیر پانے کے لیے تھوڑی سی تکلیف برداشت کرنے میں کیا حرج ہے عباد!" اس نے منہ بناتے ہوئے کہا تو وہ بے اختیار مسکرا دیا۔

"تم عورتوں کو کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ کچھ ساس کے ساتھ رہ کے چین نہیں پاتیں تمہیں ساس سے دور چین نہیں پڑ رہا۔" وہ نرمین کو چھیڑ رہا تھا وہ بے ساختہ کھلکھلا دی۔

☆☆☆

ایکسیڈنٹ اس قدر شدید تھا کہ کار کا اگلا حصہ بہت بری طرح پچک گیا تھا۔ ٹرالر کا بھی خاصا نقصان ہوا مگر ڈرائیور کی اپنی بچت ہو گئی تھی وہ بنا رکے وہاں سے فرار ہو گیا۔ ہائی وے پولیس کی پاس ہی گشت کرتی گاڑی سب سے پہلے موقع پر پہنچی۔

"مجھے نہیں لگتا کہ ان دونوں میں سے کوئی بھی بچا ہوگا۔" ریسکیو ٹیم کو کال کرنے کے بعد ایک پولیس اہلکار نے گاڑی کا جائزہ لیتے ہوئے تاسف سے کہا۔ گاڑی کی اگلی نشستوں پر ڈرائیونگ سیٹ پر ایک مرد اور پسنجر سیٹ پر عورت موجود تھی جو گاڑی کے دروازے اور فرنٹ بری طرح پچک جانے کی وجہ سے اندر دب گئے تھے اور بے حس و حرکت خون میں لت پت دکھائی دے رہے تھے۔ ایکسیڈنٹ کی وجہ سے ٹریفک کی روانی متاثر ہوئی تھی اور لوگوں کا اژدہام وہاں جمع ہونے لگا تھا۔ جنہیں اس تکلیف دہ صورت حال میں بھی جائے حادثہ کی سب سے پہلے "موبائل کوریج" کی فکر لگی ہوئی تھی۔

ہک ہاہ...... آج کے معاشرے کا المیہ...... حادثات کی صورت میں بھی انسان کسی کی مدد کرنے سے پہلے جائے وقوعہ کی تصویریں لیتا ہے وڈیوز بناتا ہے۔ سبھی کو لوگوں کا دکھ تفریح اور اپنا دکھ ہی بس "دکھ" لگتا ہے، یہاں بھی یہی صورت حال تھی۔ اس حادثے کا شکار لوگوں کے زندہ بچنے کی کوئی امید نظر نہیں آتی تھی۔ پولیس کو ریسکیو کے عملے کا انتظار تھا گاڑی کی باڈی کاٹ کر ہی دونوں لاشوں کو نکالا جا سکتا تھا اور جب سب ناامید کھڑے تھے۔ اسی وقت کسی بچے کے رونے کی گھٹی گھٹی سی آواز آئی تو دو پولیس اہلکار بے اختیار گاڑی کے پچھلے دروازے کی طرف لپکے جو بری طرح جام ہو چکے تھے۔ ایک پولیس والے نے اپنی ناک گاڑی کے ڈارک براؤن شیشے کے ساتھ چپکا کر اندر جھانکنے کی سعی کی، پچکی ہوئی سیٹوں کے درمیان ایک چھوٹا بچہ اوندھے منہ گرا ہوا تھا اور اب یقیناً حواس میں لوٹا تو دبی آواز میں رونے کی کوشش کر رہا تھا وہ لوگ پُرجوش ہو کر گاڑی کا دروازہ کھولنے اور کھڑکی کا شیشہ توڑنے کی کوشش کرنے لگے۔

زندگی ابھی سانس لیتی تھی۔ پوری طرح مری نہ تھی اور نیٹ پر وڈیوز اپ لوڈ کرنے کی شوقین عوام نئی وڈیو بنانے کے لیے پُرجوش اور بے تاب ہونے لگی کوئی نہیں جانتا تھا کس کا گھر لٹا کس کا چمن اُجڑ گیا ہے۔

☆☆☆

عباد اور نرمین کے ایکسیڈنٹ کی خبر سیٹھی ہاؤس کے مکینوں پر قیامت صغریٰ بن کر ٹوٹی تھی۔ نزہت اپنی تمام ضد اور انا بھلا کر دھاڑیں مار کر رو دیں۔ زیاد سیٹھی کی گمشدگی کا غم بھلا کر پہلی میسر فلائٹ سے پاکستان لوٹ آیا۔ زندگی سے بھرپور جوان بھائی کو مشینوں کے سہارے سانس لیتے دیکھ کر وہ نڈھال والدین کے گلے لگ کر سسک

ہاسپٹل کا سرد کوریڈور اس شام مزید سرد اور بے رحم لگ رہا تھا۔ بنچوں پر نڈھال سے بیٹھے نفوس ساکت سی کیفیت میں تھے۔ یقین ہی نہ آتا تھا کہ یہ حادثہ ان کے ساتھ پیش آچکا بلکہ ایک قیامت ان پر آکر گزر چکی ہے۔
دفعتاً آئی سی یو کا دروازہ کھلا اور ایک نرس تیزی سے باہر آئی۔
"سر! آپ کے پیشنٹ کو ہوش آگیا ہے۔ وہ آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں' جلدی کیجیے۔" وہ بعجلت بولی تو وہ سب یوں آئی سی یو کی جانب لپکے جیسے دوبارہ سے زندگی کی نوید مل گئی ہو۔
مگر زندگی جیسی قیمتی چیز یونہی نہیں مل جایا کرتی۔
"مسٹر زیاد؟" نرس نے آئی سی یو کے دروازے پر رک کر ان سب کو باہر ہی روکتے ہوئے استفہامیہ نظروں سے دیکھا تو زیاد نے —— انگشت شہادت اٹھائی۔
"ابھی صرف آپ آئیے۔ پیشنٹ نے آپ کا ہی نام لیا ہے ابھی ان کی کنڈیشن ایسی نہیں کہ ان کے پاس رش لگایا جائے۔" نرس کے الفاظ نے سب کو آب دیدہ کردیا۔ زیاد کی رگوں میں خون سُرعت سے دوڑا تھا وہ تیزی سے آئی سی یو کا دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہوگیا' موت جیسی یخ بستگی لیے سرد ماحول نے اس کے مضبوط اعصاب کو ٹھٹھرا دیا تھا۔

☆☆☆

حریم تیار ہو کر باہر نکلی تو وہ اسے دیکھ کر ٹھٹکا۔
"کہیں جا رہی ہو؟"
"ہاں۔ تمہارے پاس وقت نہیں ہے اس لیے میرو کو کسی پارک میں لے کر جانے کا ارادہ ہے۔" حریم نے طنز کرتے ہوئے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر بالوں میں برش پھیرا اور پھر چٹیا بنانے لگی۔ وہ بے دھیانی میں اسے لمبے سیاہ بالوں کی چٹیا کرتے دیکھ رہا تھا۔ اس نے باقی بچے بالوں پر ربڑ بینڈ چڑھا کر چٹیا کو کمر پہ پھینکا تو جیسے کوئی طلسم سا ٹوٹا وہ چونکا تھا۔
"میں لے چلتا ہوں۔ سنڈے ہے آج تو گھر پر ہی ہوں۔" جانے کس رو میں کہتا وہ مائرہ کے ساتھ کیا وعدہ بھول رہا تھا۔
حریم نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔
"تمہیں یقین ہے اس پر جو تم کہہ رہے ہو؟" معصومیت سے پوچھا تو وہ ہلکا سا قہقہہ لگا کر اندر آتی پنک فراک میں ملبوس میرب کو اٹھا کر ہوا میں اچھالنے لگا۔ کمرے میں میرب کی قلقاریاں گونج اٹھی تھیں۔
"بس پپا...... بس......" وہ انجوائے بھی کر رہی تھی اور ڈر بھی رہی تھی۔ خود حریم کو اسے دیکھ کر خوف آنے لگا۔
"یہ کیا کر رہے ہو۔ وہ گر جائے گی۔"
"نہیں گرتی۔ ہم کھیل رہے ہیں۔"
"کھیل رہے ہو یا ہوا میں اڑا رہے ہو؟" حریم کی بات نے اسے نجانے کیا یاد دلایا کہ وہ بے اختیار ہنستا چلا گیا۔
حریم کی نگاہ اس کے ہنستے ہوئے وجیہہ چہرے پہ کچھ پل کے لیے تھم سی گئی۔
اسے زلفی یاد آیا۔ پھر اسے اللہ کی خود پہ کی گئی مہربانی کا شدت سے احساس ہوا۔
"چلیں۔" وہ اس کی آنکھوں کے سامنے چٹکی بجاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ حریم حواس میں لوٹتے ہوئے اسے

"ہاں۔ چلتے ہیں۔" اس کا چہرہ تپا۔ جلدی سے پلٹ کر وہ اپنا موبائل شولڈر بیگ میں ڈالنے لگی۔ دھڑکنوں کا شور اسے اپنے کانوں میں گونجتا محسوس ہو رہا تھا۔

پارک جا کر میرب ادھر اُدھر اڑتی پھری، اس کے ہم عمر کئی بچے اسے ساتھ کھیلنے کے لیے مل گئے تو وہ دونوں سامنے بینچ پر بیٹھ کر اسے کھیلتا دیکھنے لگے۔

"تم نے کہا تھا کہ میں اپنا سوال نامہ بعد میں پیش کر سکتی ہوں...... تو کیا میں تم سے کچھ پوچھ لوں؟" حریم زندگی کی ڈولتی ناؤ کو کسی کنارے لگانا چاہتی تھی۔ سو کچھ سوچ کر سامنے کھیلتی میرب پہ نظریں جمائے ہوئے پوچھا۔

"کچھ باتوں کو کریدنے سے تکلیف ہی ہوا کرتی ہے حریم! کیا بہتر نہیں کہ ہم ماضی کو چھوڑ کر حال میں جئیں۔" جواب کچھ لمحوں کے بعد آیا تھا۔

"حال ہی تو مشکوک ہے میرا۔" وہ تنکی۔ اور یہ چڑچڑا پن کبھی بھی حریم کی زندگی کا حصہ نہیں رہا تھا یہ ان حالات کی دین تھا جو شادی کے بعد اسے پیش آ رہے تھے۔

"کیا ہوا ہے تمہارے حال کو؟" وہ چہرہ موڑ کر حریم کو دیکھنے لگا پھر ہلکی سی شرارت سے بولا۔ "خوب صورت بچی...... بڑا سا گھر...... ہینڈسم شوہر......" حریم نے تپ کر اس کی بات کاٹی۔

"اور اس کی سابقہ منگیتر۔" حریم کی کاٹ دار بات پر اس کے مسکراتے لب سکڑے تھے۔

"کبھی کبھی تم بہت زیادتی کر جاتی ہو حریم!" وہ سنجیدگی سے بولا تو حریم خفیف سی ہوگئی۔ مگر وہ کیا کرتی۔ نزہت اور مائرہ نے ماحول ہی کچھ ایسا بنا دیا تھا کہ نہ چاہتے ہوئے بھی ہر بات کا غلط رخ اس کے ذہن کو الٹا جاتا تھا۔

ایک اچھے سے لنچ کے بعد لمبی سی ڈرائیو نے میرب کو تھکا دیا وہیں ان دونوں کے درمیان خاموشی کی ایک محسوس کن دیوار اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ وہ گھر آئے تو نزہت کے ساتھ مائرہ بھی موجود تھی۔ حریم کا منہ کڑوا ہونے لگا۔

"واٹ اے سرپرائز...... پارٹنر......" وہ مائرہ کو دیکھ کر چہکا تھا۔

ان تینوں کو اکٹھے اندر آتے دیکھ کر مائرہ کے تاثرات بدلے۔

"آج سنڈے تھا۔ تمہاری کمٹمنٹ تھی میرے ساتھ...... کہاں غائب تھے تم...... میں سارا دن تمہارا انتظار کرتی رہی۔" مائرہ اس کے انداز کے برعکس چبا کر بولی۔

"سوری یار۔" اس نے فوراً معذرتانہ انداز میں ہاتھ اٹھا دیے۔

"بالکل بھی یاد نہیں رہا۔ دراصل حریم نے میرو کو پارک لے جانے کا پروگرام بنا لیا تھا۔" وہ صوفے پہ گرنے والے انداز میں بیٹھا اور ہانک لگائی۔

"حریم! ٹھنڈا پانی بھجواؤ یار۔"

"حریم بچی تو نہیں۔ خود بھی لے جا سکتی تھی میرب کو۔ ویسے بھی تو ڈرائیور کے ساتھ نکل جاتی ہے، کبھی میکے تو کبھی بازار۔" نزہت نے سردمہری سے کہا تو کچن کی طرف جاتی حریم ان کے الفاظ کے چناؤ پہ متاسف سے ہوئی ثریا کو ٹھنڈے پانی کی بوتل اور گلاس دے کر وہ سوئی ہوئی میرب کو شانے سے لگائے سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔

"چھوڑیں بھی مما! میں نے خود کہا تھا ساتھ چلنے کو... وہ تو لے کر جا ہی رہی تھی میرب کو۔"

''تم سناؤ۔ طبیعت کیسی ہے اور آفس کب سے جوائن کر رہی ہو؟'' وہ دانستہ طور پر مائرہ کی طرف متوجہ ہوگیا لیکن وہ ابھی بھی اندر ہی اندر تلملا رہی تھی۔

''بس...... میرا دل تنگ پڑ گیا ہے آفس ورک سے...... میں کچھ بھی نہیں کرنا چاہتی۔'' اکتا کر کہا تو وہ ناصحانہ انداز میں بولا۔

''کام کرنا مصروف رہنا ذہن کو ریلیکس رکھتا ہے فالتو کی سوچیں نہیں آتیں۔ چند دن مزید آرام کرلو، پھر جوائن کر لینا۔''

مائرہ بے زارکن انداز میں سر ہلا کر رہ گئی۔

☆☆☆

وہ کمرے میں آیا تو حریم وارڈروب سے کپڑے نکال نکال کر بیڈ پر پھینک رہی تھی۔

''ارے...... یہ کیا کر رہی ہو؟'' وہ ہڑبڑا کر سامنے آیا اور اپنی شرٹ کھینچ لی۔

''وہ کر رہی ہوں جو میں اپنا غصہ اتارنے کے لیے کر سکتی ہوں۔'' حریم تھک کر بے بسی سے کاؤچ پر گر گئی۔

''مگر کس بات کا غصہ؟'' وہ انجان بنتے ہوئے شرٹ بیڈ پہ پھینکتا اس کے پاس آیا۔

''وہ کون ہوتی ہے مجھ پہ طنز کرنے والی۔ تم پہ میرے سامنے اس قدر حق جما کر بات کرنے والی، جبکہ کاغذات میں ہی سہی...... تم میرے شوہر ہو۔''

''ہاں تو پھر...... جب یہ بات جانتی ہو کہ میں ''تمہارا'' شوہر ہوں تو دوسروں کی کیوں سنتی ہو۔'' وہ سہولت سے اس کے ساتھ کاؤچ پہ آ کر بیٹھا تو حریم بے اختیار ذرا سا پرے کھسک گئی۔ ''پہلے خود کو تو سمجھالو۔'' اس نے حریم کی حرکت پہ طنز کیا تو وہ اس کی بات سمجھ کر خجالت کا شکار ہوئی۔

''آنٹی کی مجھ سے پرخاش کی وجہ کیا ہے...... مجھے تو ابھی تک سمجھ میں نہیں آئی اس بات کی۔'' حریم نے بات بدلی۔

''وجہ صاف ہے، مما کی اپنی بھتیجی سے بے پناہ محبت...... انہوں نے ہمیشہ اپنی بہو کے طور پہ مائرہ کو سوچا تھا۔''

''تو پھر بتاؤ...... مجھے ان حالات میں کیا کرنا چاہیے، نہ سر ڈھکنے کو چھت میری ہے نہ پیر رکھنے کو زمین۔'' اس کا لہجہ بھرّا گیا۔ ''حد ہے۔ جب سے آئی ہوں اس گھر میں آزمائش آزمائش اور صرف آزمائش۔''

''میں سب سنبھال لوں گا حریم! تھوڑا عرصہ تم بس صبر کرو...... اجر ضرور ملے گا۔''

''صبر پہ ملتا ہے اجر...... جبر پہ نہیں۔'' وہ چیخی۔ اور اٹھ کر بستر پہ چلی گئی وہ وہیں بیٹھا اسے دیکھنے لگا اسے یاد آیا۔ جب سے وہ بیاہ کر آئی تھی اس نے کبھی حریم کو ہنستے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ ہمیشہ آنسو......

وہ گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اندر کا شور بڑھنے لگا تو وہ بالکنی میں نکل گیا۔ سوچنے کو بہت کچھ تھا لیکن حل فی الحال نظر نہیں آتا تھا۔

☆☆☆

نرس دروازہ دھکیل کر آئی سی یو میں داخل ہوئی، زیاد اس کی تقلید میں تھا، پٹیوں میں لپٹے مشینوں میں جکڑے عباد کو دیکھ کر زیاد کا کلیجہ حلق تک آیا۔ آنکھیں بے اختیار ہی اپنے ماں جائے کو اس دگرگوں حالت میں دیکھ کر نم ہوگئیں۔

''بھائی۔'' وہ بے اختیار ہی اس پر جھکا۔ عباد کی آنکھوں اور چہرے پر چوٹوں کی سوجن اور ونڈ اسکرین کی

کرچیوں کی خراشیں تھیں۔ اس کی آواز سنتے ہی عباد نے آنکھیں کھول کر نظر پھیر کر اسے دیکھا اس کے ماتھے کو ایک کپڑے کی بیلٹ کے ساتھ بیڈ کے ساتھ اٹیچ کیا گیا تھا کیونکہ وہ گردن ہلانے پہ قادر نہیں تھا اور اگلا لمحہ شاید زیاد کے لیے بھی اتنا ہی تکلیف دہ تھا جتنا عباد کے لیے۔ اپنی حالت اور بے بسی پر بے پناہ جذباتی ہو کر عباد کا تنفس تیز تر ہوا، بولنے کی کوشش کرتے ہوئے آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس کا سینہ سانس کھینچنے کے لیے تیزی سے پھول اور پچک رہا تھا۔

''مت بولو۔ کچھ مت کہو۔ میں یہیں ہوں تمہارے پاس۔'' زیاد تڑپ کر بولا۔

''مینو؟'' اس کی آواز سرگوشی سے زیادہ نہیں تھی نرمین کا نام لیتے ہی اس کی آنکھوں کے کونوں سے آنسو بہہ کر کنپٹی کے بالوں میں جذب ہونے لگے۔

''سب ٹھیک ہے برو! تم بس ایک بار پہلے جیسے ہو جاؤ صحت مند۔ بالکل ٹھیک ہو جاؤ۔ آئی پرامس! میں تمہیں بہت سنبھال کے رکھوں گا۔ میرو بھی بے چینی سے اپنے پپا کا ویٹ کر رہی ہے۔'' زیاد کی آواز آنسوؤں کی آمیزش سے بھاری ہو رہی تھی، دل کر رہا تھا دھاڑیں مار کر روئے، اندر کا سارا غم دکھ درد نکال دے۔ عباد نے بے یقینی سے زیاد کی طرف آنکھیں گھمائیں۔ بھلا جس ایکسیڈنٹ نے اس کے جسم کی ہڈیاں چور چور کر دی تھیں اس میں چھوٹی سی بچی کیسے بچ سکتی تھی۔

''سسٹر! آپ ذرا ان کی بیٹی کو لے آئیں۔ ان پر اچھا اثر پڑے گا اس سے مل کر۔'' زیاد نے نرس سے استدعا کی تو وہ سر ہلاتی باہر نکل گئی ذرا دیر میں وہ میرب کو اٹھائے ہوئے واپس آئی تو اسے صحیح سلامت کسی بھی خراش کے بنا دیکھ کر عباد رونے لگا۔

''شش...... پلیز برو! اپنے جذبات پہ کنٹرول رکھو، اعصاب پر برا اثر پڑے گا۔ پلیز...... ورنہ پھر کسی سے ملنے نہیں دیں گے تمہیں۔'' زیاد نے جھک کر ملتجیانہ اس کے کان میں سرگوشی کی۔ اس التجا میں اپنے بہت پیارے کو کھو دینے کا خوف تھا، کرلاہٹ تھی آنسوؤں کی نمی تھی۔ عباد نے آنکھیں موند لیں وہ خود کو پرسکون کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ صد شکر کہ اس کا دماغ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے عاری نہیں ہوا تھا ورنہ ڈاکٹرز کے مطابق اس کا وجود اتنی بری طرح گاڑی کے ساتھ ہی پچکا تھا کہ اس کا بچ جانا اور ہوش میں آ کر گھر والوں کو یاد کرنا ایک معجزہ ہی تھا۔ عباد کے بچ جانے کی خوشی پہ زیاد کو اس کی حالت کا دکھ بھاری لگ رہا تھا۔

''میرے بیٹے کو معاف کر دو مائرہ! وہ بہت تکلیف میں ہے۔'' آئی سی یو کے باہر عباد کے ہوش میں آنے کی معجزانہ خبر سن کر اب ماموں جان کی فیملی دوبارہ آ گئی تھی۔ نزہت نے مائرہ سے روتے ہوئے استدعا کی تھی۔

''پھپھو! کیسی باتیں کرتی ہیں آپ۔ دعا کریں وہ بالکل ٹھیک ہو جائے بس۔ آپ کے گھر کی خوشیاں پھر سے لوٹ آئیں گی۔''

نرمین جا چکی تھی اس دنیا سے اس کی میت فی الحال اسی ہاسپٹل کے سرد خانے میں رکھی گئی تھی کیونکہ کسی کے پاس تدفین کی رسومات کا وقت ہی نہیں تھا۔ فی الحال تو ان کی جان عباد میں اٹکی ہوئی تھی جو آئی سی یو میں زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا تھا۔ دوسرا یہ کہ نرمین کے میکے کا ماسوائے عباد کے کسی کو اتا پتا نہیں تھا ورنہ اس کی میت اس کے گھر پہنچا دی جاتی اور وہ لوگ آخری رسومات ادا کر دیتے۔ اللہ اکبر...... خوشیوں سے شروع ہونے والی کہانی آج سرد خانے اور آئی سی یو میں ختم ہو رہی تھی۔

باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ

منعم ملک

تپش سلگتی سی

"تم ذرا باہر نکل کر دیکھو، تمہیں احساس ہو کہ کیا چیز کس بھاؤ بکتی ہے۔ تمہاری اسی آرام پسندی نے مجھے کولہو کا بیل بنا دیا ہے۔ تم میرے لیے آخر کرتے ہی کیا ہو؟"

میں بے حد مشتعل ہو کر اس پر چلا رہی تھی۔ کئی دنوں کا چڑچڑا پن میرے صبر کا پیمانہ آج چھلکا گیا تھا۔ اب میں مسلسل بول رہی تھی اور یہ تمیز کیے بغیر بول رہی تھی کہ میرے کہے الفاظ وقت پلٹ کر میرے منہ پر بھی مار سکتا ہے......اور وقت بھی کتنا، محض پانچ دن......آہ!

سدا کے صابر پسند احسن کے چہرے کے زاویے بھی آج بگڑے ہوئے تھے۔ لہجے میں ترشی اُتر رہی تھی......شاید وہ بھی انسان تھے۔

"میں کوئی مفت کی روٹیاں نہیں توڑ رہا، مانتا ہوں، تم سے کم کماتا ہوں مگر سب تمہارے سامنے کرتا ہوں۔ کوئی جوا کھیلتا ہوں میں؟"

"یہ سب مجھے مت سناؤ جو میرے کانوں کے لیے تکلیف دہ ہے۔ چند ہزار دے کر آج طعنہ دے رہے ہو، کیا یہ بچے میرے ہیں یا میں جہیز میں لائی تھی۔" میں بری طرح سُلگ رہی تھی۔ دروازے کی اوٹ میں دیوار سے چپکے چاروں بچے ہمارے شور سے خوفزدہ ہو رہے تھے۔ احسن نے مٹھیاں بھینچیں۔

"میں بھی سارا دن کام کرتا ہوں۔ مجھے تمہاری مشقت کی قدر بھی ہے اور احساس بھی......اس لیے تمہیں آرام پہنچانے کی ہر ممکن کوشش بھی کرتا ہوں۔ نہیں ہوتا تم سے یہ سب تو مت کرو، تمہارا ہی کم میں گزارہ نہیں ہے، ورنہ میں ہڈ حرام نہیں ہوں۔"

"کون سی ہر ممکن کوشش......میرے حصے میں آج تک کون سی راحتیں آئی ہیں؟ تمہارے گھر کے اخراجات کیسے پورے ہوں گے۔ میں گھر بیٹھ جاؤں تاکہ لوگ ہنسیں ہماری حالت زار پر......"

"گھر کی ذمہ داریاں میرے کندھوں پر بھی ہیں۔ میں نے کبھی جتایا ہے یا جی چرایا ہے......بچوں کے خرچ، گھر کا راشن......"

"اوہو! کوڑیوں کے بھاؤ بکتا راشن، چند نوٹ خرچ کرتے ہو تو مت بھولو کہ گھر کی قسط میں ادا کرتی ہوں۔" میں نے کاری وار کیا۔

"بجلی کا بل......گیس کا بل، پانی کا بل......"

"بچوں کی فیس تو مجھ پر فرض ہیں نا۔"

"ٹیوشن کے بارے کیا خیال ہے؟" وہ طنزیہ بولے۔

"اس پہ کون سے پیسے لگتے ہیں۔"

"بچوں کا جیب خرچ......"

"بالٹی بھر لسی میں ایک گلاس پانی ملا دینے سے کوئی فرق نہیں پڑتا احسن صاحب! کتنے خواب تھے میرے، اپنا کشادہ گھر ہو ایک گاڑی ہو......آپ تو فیکٹری میں بیٹھ کر چائے پی کر بنا کام کیے آجاتے ہیں۔ درجن بھر کاپیاں اٹھائے بسوں میں دھکے مجھے کھانے پڑتے ہیں۔"

میں کسی صورت انہیں بولنے کا موقع نہیں دینا چاہتی تھی۔ غصہ سوا نیزے پر تھا۔ احسن بالآخر قدرے نرم پڑے تھے۔

"مجھے انکار نہیں ہے صاعقہ! کوشش کر تو رہا ہوں نا، نوکریوں کے حالات تمہارے سامنے ہیں جو ہے وہی غنیمت......"

''بس کر دیں۔ یہ کیوں نہیں کہتے کہ کام سے جی چراتے ہیں۔ اور لوگ بھی تو لاکھوں کماتے ہیں، ''محنت'' کرنی پڑتی ہے۔'' میں نے سارا زور ایک لفظ پر لگا دیا۔ وہ مجھے تیکھی نظروں سے گھورنے لگے۔

''تمہارے نزدیک صرف پیسوں کی اہمیت ہے میری عزت کی نہیں؟'' ان کے لہجے میں کچھ ٹوٹا تھا۔

''نرے بہانے......'' میں تلملائی۔

''میں تو کچھ کرتا ہی نہیں۔ میرا وجود ہی فالتو ہے...... پتا نہیں چلا یوں نہیں جاتا میں نہیں۔ یہ سن کر تو مجھے پتنگے لگ گئے۔

''ہاں ہاں چلے جاؤ۔ پال سکتی ہوں تو سب سنبھال بھی سکتی ہوں......تم ذرا باہر نکل کر دیکھو، تمہیں احساس ہو کہ کیا چیز کس بھاؤ بکتی ہے۔''

☆☆☆

میں بے حد تلخ ہو رہی تھی شاید بدمزاج بھی...... لیکن احسن نے باہر نکل کر دکھا دیا۔ دن بھر



میں سوئی رہی مگر وہ واپس نہیں آئے تھے۔ پھر دوسرا دن آگیا۔ احسن کو ہم سے بے خبر ہوئے...... دل ہی دل میں اپنی ناقدری پر دل میں اُبال اُٹھتا، کہیں دماغ میں ٹینشن کی لہر کروٹ بدلتی۔ تاہم اس بات پر تاحال قائم کہ اس گھر کی سربراہ میں خود ہی تھی۔

میری صبح طلوع ہونے کے تکلف میں نہیں پڑتی بلکہ ٹرین پر سوار ہو کر دوڑتی بھاگتی آتی ہے۔ شاید ہر اُس خاتون کی طرح جو جاب بھی کرتی ہے اور گھریلو ذمہ داریاں بھی دیکھتی ہے۔

لیکن یہ صبح تو مجھے ناکوں چنے چبوانے آئی تھی۔ حسب معمول کچن میں آئی تو نہ تو مطلوبہ چیزیں کاؤنٹر پر موجود تھیں نہ ہی رات کا گوندھا آٹا فریج سے باہر نکالا گیا تھا۔ اور تو اور رات کے برتن بھی سنک میں میری توجہ پانے کو تڑپ رہے تھے۔

میں وقت دیکھ کر ان سے زیادہ تڑپ گئی۔

عجلت میں خشک آٹے کی طرف لپکی اور جلدی جلدی اپنی جھنجھلاہٹ اُس پر اُتارنے لگی۔ کمروں میں اُودھم مچاتے بچے یقیناً جاگ چکے تھے۔ (میرے بچے بڑے ذمہ دار طبیعت کے ہیں۔) فرائی پین میں انڈے توڑ کر ڈالے تو ان کا غیر دلچسپ رقص دیکھنے کے بجائے بچوں کے لنچ باکس نکالے۔

میرے چار بچے ہیں، سب سے بڑی بیٹی حورین جو آٹھویں میں ہے۔ پھر سنی ہے۔ ساتویں میں اور باقی دونوں اس سے دو دو کلاسیں پیچھے......

میں درس و تدریس کے شعبے سے منسلک ہوں۔ اسکول جانے کے لیے لباس تبدیل کر کے اندر آئی تو تینوں بچوں کو رات کے حلیے میں بے پروائی سے لیٹا دیکھ کر میری آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ ان سب کو تیار ہو کر ناشتے کی میز پر ہونا چاہیے تھے جبکہ اس کے برعکس......

''تم لوگ بیماروں کی طرح کیوں پڑے ہو، اسکول نہیں جانا؟'' میں غصے میں آ گئی۔

''کسی نے تیار ہی نہیں کیا۔'' چھوٹے نے منہ بنا کر جتایا۔ میرا غصہ عود کر آیا۔

سر پیٹ کر میں نے حورین کو آواز دی۔

''حورین! آج ان کو ریڈی کرنے میں ہیلپ نہیں کی...... بچے دیر ہو رہی ہے۔''

''پہلے میں کب کرتی تھی مما...... پاپا ہی سب دیکھتے تھے۔ مجھے خود دیر ہو رہی ہے، انکل نخرے کرتے ہیں۔'' وہ بڑی بھی خود تیار ہو جاتی تھی۔ جبکہ اس کی بات سن کر میں چونک گئی۔

''پاپا...... کرتے تھے؟'' خیال حیرانی میں لپٹ کر مجھ پر وارد ہوا تھا۔ میں ذرا سا غور کرتی تو سچ بھی نظر آتا مگر میرے پاس کم از کم اس لمحے وقت ہرگز نہیں تھا۔

''جی! ان کی چیزیں وہی سیٹ کر کے رکھتے تھے۔''

خیال جھٹک کر میں نے تیزی سے انہیں گردن سے دبوچا اور واش روم میں دھکیل کر دانت برش کرنے کی تاکید کی۔ پھر ٹائی سے لے کر شوز جمع کرنے، بال سنوارنے اور ناشتہ کرانے تک ٹائم سر سے گزر چکا تھا۔ اتنی سی دیر میں دانتوں تلے پسینہ آگیا۔ کچھ دیر پہلے تک جو بچے ذمہ دار نظر آرہے تھے، درحقیقت ڈھیٹ اور سست واقع ہوئے تھے۔ احسن نے ان کی عادات کتنی بگاڑ رکھی تھیں۔

ابھی ناشتے کے آخری لقمے ان کے منہ میں تھے کہ وین والا اپنا تیز ہارن زور و شور سے بجا کر پوری کالونی کا درد سر بننے لگا۔

''چلو بچو، اُٹھو جلدی......'' میں نے بچوں کو بیگ تھما کر روانہ کیا اور خود چابیاں اُٹھا کر گھر کو بے ترتیب چھوڑے مقفل کرنے لگی۔ پہلے مجھے ہر صبح جلدی نکلنا ہوتا تھا کیونکہ میرا اسکول جلدی لگتا ہے اور بس مس ہو جانے کا خطرہ بھی، تو میں ہمیشہ پہلے روانہ ہو جاتی تھی...... بچوں کو وین تک چھوڑنے کی ذمہ داری اور گھر لاک کرنے کی ان ہی کے سپرد تھی۔ احسن ہم سب سے آخر میں کام پر جاتے تھے۔ ہم سب کے روٹ الگ الگ پڑتے تھے ورنہ شاید اتنی مشکل نہ ہوتی۔ آج یہ سب مجھے کرنا پڑ رہا تھا اور میں خاصی جھنجھلائی ہوئی تھی۔

''اور ابھی تو دوسرا دن ہے......'' تیز قدموں سے چلتے ہوئے میرے ذہن میں سوچ کا کانٹا زور سے چبھا۔ میں تقریباً آدھا گھنٹہ لیٹ ہو چکی تھی۔

☆☆☆

احسن ایک فیکٹری میں ملازمت کرتے تھے۔ سارا دن کا کام ہوتا مگر سیلری انتہائی کم ...... جو میری نظر میں نہ ہونے کے برابر تھی کہ میری اپنی سیلری بہت اچھی تھی۔ اس لیے مجھے کبھی ادراک نہیں ہوا تھا کہ احسن مجھ سے زیادہ لمبی ڈیوٹی کرتے ہیں، میرا کام اتنا محنت طلب نہیں جتنا احسن کا، پھر بھی ان کی تنخواہ مجھ سے کم ہے تو قصور ان کا نہیں ہے۔ مگر آئے روز انہیں میری تلخ باتیں سہنی پڑتی تھیں......

میں سوچتی تھی اگر میں جاب نہ کرتی تو اس گھر کا کیا ہوتا۔ احسن اگر زیادہ کماتے تو آج ہم بہت سے لوگوں کی طرح آرام دہ زندگی گزار رہے ہوتے۔ یہ ٹھیک تھا کہ ہم لوگ اب بھی کوئی برے حالوں میں نہیں تھے۔

اس روز سورج آگ کی لپٹوں میں تھا، شدید گرمی میں میرا وجود پانی بن کر بہہ جانے کو تھا۔ تیز کاٹتی دھوپ نے سڑک کو دہکا دیا تھا۔ اسکول سے چھٹی کے بعد میں باہر نکلی تو پیاس کا شدید احساس کسی ٹھنڈے یخ مشروب کی طلب میں بھٹکانے لگا۔ تب مجھ خیال آیا کہ بجلی کے بل کی تاریخ آخری سانسوں پر تھی۔ جو صبح میں لے کر نکلی تھی ...... سڑک کی دوسری سمت ڈاک خانہ کا بورڈ دیکھ کر میں گہری سانس لیتی آگے بڑھی۔ ایک تو پیاس، دوسرے شدید ٹینشن ...... پھر ڈاک خانے میں لمبی لائن دیکھ کر سچ مچ پارہ ہائی ہو گیا۔

"یہ دھکے بھی کھانے تھے۔" اتنے مردوں میں سب سے پیچھے کھڑی ہو کر بارے بے بسی کے آنسو آ گئے۔ بچوں کی فکر الگ تھی کہ بھوکے پیٹ کیسے گزارا کر رہے ہوں گے۔ خدا خدا کر کے لائن سرکی۔ دو گھنٹے کھڑے کھڑے شل ٹانگوں کے ساتھ میں باہر آئی تو سر چکرا رہا تھا۔

بچے پڑوسن کے گھر تھے۔ پہلے احسن لنچ بریک میں گھر آ کر بچوں کے لیے گھر کھول دیتے تھے، حورین نوڈلز وغیرہ بنا دیتی تھی۔ مگر اب تو احسن

"دیکھتی ہوں، کتنے دن ٹھوکریں سہہ سکتے ہیں۔" اندر ہی اندر میں کلس کر رہ گئی۔

صبح کی افراتفری کے بعد گھر طوفان کے بعد کا سماں پیش کر رہا تھا۔ ہمت کر کے کمر کسی اور صفائی شروع کر دی۔ چیزیں ٹھکانے لگائیں، جلدی جلدی گھر کو رہنے کے قابل بنایا اور جب تک کھانا تیار ہوا، عصر کا وقت ختم ہو چکا تھا۔ تھکن پورے وجود میں سرائیت کر رہی تھی۔

"مما! ہوم ورک کرا دیں۔" نہا کر نکلی تو چھوٹے بیٹے کی فرمائش حاضر تھی۔

"مما تھکی ہوئی ہیں۔" حورین نے ڈپٹا۔

"مما! پاپا نہیں آئیں گے؟" حورین کے اچانک سوال پر میں چونکی۔ "کیوں؟"

"مجھے یہ میتھس نہیں آتا، کوئی اکیڈمی جوائن کرا دیں۔" وہ منمنائی۔ شاید اداس تھی۔

"پہلے تو تمہیں کبھی ضرورت نہیں پڑی حوری۔" میں غصے میں جھنجھلا گئی۔

"پہلے پاپا ہیلپ کرتے تھے مما۔" وہ جتا کر بولی

"ہونہہ! انہیں خود کیا آتا ہے۔"

"پاپا بہت قابل ہیں مما۔" حورین برا مان گئی تھی۔

میں نے گہری سانس خارج کی اور بڑبڑانے لگی۔

"بہت قابل ہیں بس ذمہ داریاں نبھانے کے قابل نہیں۔ کرتی ہوں کچھ، زندہ ہے تمہاری ماں ابھی......"

مسئلہ یہ نہیں تھا کہ میں انہیں پڑھا نہیں سکتی تھی، مسئلہ یہ تھا کہ وہ مجھ سے کبھی نہیں پڑھتے تھے۔ اپنے بچوں پر رعب جھاڑنا...... وہ بھی پڑھائی کے معاملے میں انتہائی کٹھن، ماں کے لاڈ میں نخرے ہی ختم ہونے میں نہیں آتے شہزادوں کے۔ جذبات میں آ کر شاید میں دو کشتیوں میں سوار تو ہو گئی تھی مگر اب کٹھن چکر بنتی جا رہی تھی۔

آئے روز اپنی کلاس کو نالائقی کے طعنے دینے والی مس صاعقہ پر زبردست انکشاف ہوا کہ ان کے اپنے بچے کتنے کوڑھ مغز ہیں، یا وہ بالکل ہی دلچسپی نہیں لے رہے تھے۔ چار گھنٹے سر کھپانے کے بعد

آمنہ بچوں کو کیسے قابو کرتے تھے۔" پھٹتے سر کو تھامتے ہوئے میں نے سوچا۔ آخر کوئی حل تو نکالنا تھا۔ گھر کے کام، بچوں کے پیپرز کی تیاری، اسکول کے فرائض......اور میں اکیلی جان۔ اس سب میں، میں شاید توازن برقرار نہیں رکھ پا رہی۔

ورنہ کوئی انقلاب تو نہیں آ گیا تھا۔ وہی گھر تھا، وہی روٹین، وہی گھر کے افراد...... بلکہ ایک کم۔

بچوں کے کپڑے پریس کر کے صبح ناشتے کے لیے چیزیں ترتیب سے سامنے رکھیں۔ برتن دھوئے، کمرے میں آئی تو ٹیسٹ اور کاپیوں کا انبار چیک ہونے کو منتظر تھا۔ دل برا ہونے لگا مگر پرنسپل سے ہونے والی عزت افزائی کا ڈر...... رات بارہ بجے بستر پر گرتے ہی دل بھر آیا تھا۔

"لو ٹھنڈا پیو......کاپیاں میں چیک کر دیتا ہوں۔" کوئی مانوس سی آواز خاموش دیواروں سے ٹکرائی۔ میں نے غمگین جی کے ساتھ کروٹ بدل لی۔

☆☆☆

"کیا! یہ مریل سی بھنڈی اور اتنی مہنگی؟"

قیمت سن کر میرے ہوش اُڑ گئے۔

"بھنڈی کیا پہلے کشتی کرتی تھی جو آج مریل ہونے پر اعتراض کر رہی ہیں بی بی۔" سبزی فروش نے مذاق فرمایا۔

"باتیں نہ بناؤ اور ریٹ مناسب لگاؤ۔" میرے تنک کر کہنے پر وہ سنبھلا۔

"یہ ٹنڈے لے جائیں، یا پھر بینگن......"

"کس خوشی میں......میرے بچے نہیں کھاتے۔"

"تو پھر؟"

"یہ کچنار کیسے دیا؟"

"تین سو روپے کلو۔"

"اور سہانجنا؟"

"یہ بھی......"

"غضب خدا کا، ایسا بھی کیا اندھیر مچا ہے۔ تم تو کسی سبزی کو ہاتھ بھی نہیں لگانے دے رہے......اتنا سبزیاں لاتے ہیں۔" میں بالآخر اس پر برس پڑی تھی۔ اتنا تو شاید چکن کا مول تھا اور یہاں اس کے مزاج ہی نہیں مل رہے۔

"بی بی شاید آپ نے کبھی اپنے شوہر سے پوچھا نہیں......وہ بھی اتنی ہی مہنگی لاتے ہوں گے۔"

فرزانہ (پڑوسن) کو گھر پر بچوں کے ساتھ بٹھا کر میں آج مہینے بھر کا راشن لینے نکلی تھی۔ مصروفیت کے دنوں میں بار بار نکلا بھی کہاں جاتا ہے مگر اشیاء کی قیمتیں سن کر تو میرے ہوش اڑ گئے تھے۔ ہر بار میرا ہی کہا فقرہ منہ چڑاتا ہوا کانوں میں گونجتا تھا۔

"کوڑیوں کے بھاؤ بکتا راشن، چند نوٹ خرچ کرتے ہو تو مت بھولو کہ......"

بار بار دل میں ایک احساس جاگتا۔ نجانے زیادتی کا، ندامت کا یا پھر کیسا......شام ہونے سے قبل میں گھر واپس لوٹ آئی۔ بہت سی سوچوں، فکروں میں گھری ہوئی، فرزانہ کا اجازت لینے پر شکریہ ادا بھی نہ کر پائی۔ میری نگاہوں میں گھر کا گھومتا بجٹ تھا۔

"مما! میرا مڈٹرم کا رزلٹ بہت شاندار آیا۔ صرف آپ نے ہی مبارک باد نہیں دی۔" حورین پانی کا گلاس لے آئی اور لاڈ کرنے لگی۔ میں پھیکا سا مسکرا دی۔

"ویری گڈ بیٹا! بہت مبارک میری جان......اور کس نے مبارک دی، کیا پاپا نے؟" کسی خیال کے تحت میں چونکی۔

"نہیں مما! ان کی تو کال ہی نہیں آئی۔ وین والے انکل نے......" مایوسی سے بتا کر اُس نے گلاس تھاما تو میں نے سر ہلا دیا۔

"کہہ رہے تھے، اسی خوشی میں فوڈ پوائنٹ سے سموسے کھانے چلیں۔" حورین نے مگن انداز میں مزید بتایا تو خود کو چادر سے آزاد کرتے میرا سر بے ساختہ گھوما۔

"کیا؟" مجھے ایک دم زوردار دھچکا لگا تھا۔

"جی، اُنہیں ٹریٹ چاہیے تھی۔" وہ میری سنجیدگی نہیں سمجھی تھی۔

طیش کے میری زبان کانپنے لگ گئی تھی۔

''نہیں مما! میں نے کہا۔ میں آپ کو پیسے دے دوں گی۔ میں بھلا کیوں جاتی ان کے ساتھ ......''

اس کے جواب پر ایک سکون سا میرے اندر اترا مگر غصہ اپنی جگہ قائم تھا۔

''تمہارا بھائی کہاں تھا اُس وقت؟'' میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ ابھی جا کر اُس بدتمیز انسان کی ٹھیک ٹھاک طبیعت صاف کر کے آؤں جس کی ہمت بھی کیسے ہوئی تھی میری بیٹی سے ایسی بات کرنے کی ...... وہ آٹھویں کلاس میں تھی، کوئی اتنی بچی تو نہیں تھی کہ اُس سے ایسی بات کی جاتی ۔ حورین اب الجھی نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

''مما آپ کو علم تو ہے سنی نے ضد کر کے دوسرے اسکول میں ایڈمیشن لیا تھا۔ میرا اسکول تھوڑا پہلے پڑتا ہے نا ...... کیا ہوا ہے؟''

''حوری! کیا پہلے بھی اُس نے ایسا کچھ کہا تھا؟''

''نہیں مما! پہلے تو پاپا صبح وین میں بٹھاتے تھے واپسی پر بھی انہیں کال کرتے تھے۔ انہوں نے پوچھا تو سنی نے کہا، پاپا کہیں چلے گئے ہیں ...... اس لیے انہوں نے کہا کہ بازار سے کچھ لے آتے ہیں۔''

اسے پریشان ہوتا دیکھ کر میں نے لب بھینچے اور اسے پاس بٹھا کر محتاط الفاظ میں آدھا گھنٹہ زمانے کی اونچ نیچ سمجھاتی رہی کہ کس کے ساتھ کس طرح سے پیش آنا ہے اور سب سے پہلے مما کو آ کر بتانا ہے۔ اس کے باوجود میرے اندر ایک آگ سی لگی ہوئی تھی ......

کیا باپ کے ساتھ نہ ہونے پر اس کی جسارت بڑھی تھی؟

ایک ماں ہونے کے ناتے میں دنیا کے حالات سے بھی آگاہ تھی۔ حورین بچی تھی اور نا سمجھ بھی ...... بات بھلے چھوٹی سہی، یہ بات تو طے تھی کہ میں اس آدمی کے ساتھ دوبارہ اسے بھیجنے پر راضی نہیں ہو سکتی تھی۔

لیے پریشانیوں بھرا تھا۔ عصر کا باہر نکلا سنی ابھی تک گھر نہیں لوٹا تھا۔ میں لسٹ سنبھالے حساب کتاب میں الجھی ہوئی تھی۔ بچوں کی ٹیوشن فیس، مہینے بھر کا راشن، ضروریات کی چیزیں اور باقی سب۔ یہ کسی طور صرف میری تنخواہ سے قابو ہونے میں نہیں آرہا تھا ...... کیونکہ میری تنخواہ کا آدھا حصہ تو مکان کی قسط ادا کرتے ہوئے نکل جاتا۔ باقی سب احسن سنبھال لیتے تھے تو مجھے کبھی اتنی ٹینشن نہیں جھیلنی پڑی۔ تو کیا ہم دونوں میں سے فردِ واحد کچھ بھی نہیں تھا؟ میرے لیے احسن بھی سہارا تھے۔ اچانک مجھ پر میرا اپنا رعب ٹوٹنا شروع ہوا ...... وہ ایک ''میں'' کا وہم بھر بھرا سا رہا تھا۔

''تم گھبراؤ نہیں۔ میں اپنے بیٹے کو بھیجتی ہوں۔''

میں گھر پلٹ آئی مگر بار بار نگاہیں گلی کے نکڑ تک چکر کاٹ رہی تھیں۔ کافی دیر تک بھی لڑکوں کی واپسی نہ ہوئی تو اب میرے پیٹ میں بھیانک خدشات کے تحت گرہیں سی پڑنے لگیں

''کہاں گیا سنی، اللہ خیر کرے، احسن کو کال کروں۔'' بالکل ہاتھ پاؤں چھوڑ کر میں نے کسی آسرے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے شروع کیے۔

''مما! پاپا کو بلا لیں پلیز۔'' حورین الگ روہانسی ہو رہی تھی۔

''ٹھہر جاؤ صاعقہ! کیوں پریشان کرتی ہو انہیں۔ علی کہہ رہا تھا دوستوں کے ساتھ ویڈیو گیم کھیلنے جا رہا تھا سنی ...... بچہ گیا ہے نا بلانے۔'' فرزانہ خود بھی پریشان ہو رہی تھی مگر تسلی دینا ضروری تھی۔

میں نے ساری دعاؤں کا ورد کر ڈالا تو علی کے ساتھ سنی آتا دکھائی دیا۔ بے اختیار دل شکر کے کلمات بلند کرتے ہوئے سجدہ ریز ہوا تھا۔ سنی کو سامنے پا کر پریشانی فطری غصے میں ڈھلنے لگی۔

''کہاں تھے تم؟ اتنی دیر تک گھر سے باہر رہنے کی اجازت کس نے دی تمہیں، پتا ہے ماں بہن گھر

اپنے باپ کو...... کرتی ہوں میں شکایت تمہاری۔''
میری ڈانٹ کا شاید اس پر خاطر خواہ اثر نہیں ہوا کہ وہ الٹا ہنس پڑا تھا۔

''وہ نہیں آنے والے......اس دفعہ کہا ہے نا کہ نہیں آئیں گے واپس۔'' اس کی آنکھوں میں یقین تھا۔ کم عمری میں نظر آتی آزادی بھلی لگ رہی تھی۔ لیکن میں سن پڑ گئی تھی۔

''کیا بچے میرے ہاتھوں سے نکل جائیں گے...... پہلے حورین اب سنی؟ کہیں کچھ بھی ذرہ برابر کوتاہی ہوگئی تو میرا مقام کیا ہوگا؟''

''صاعقہ! احسن بھائی کا کہیں دور کام لگا ہے تو انہیں بلالو۔ دیکھو، بچوں پر باپ کا رعب ہوتا ہے ماں کی نسبت...... یہ بگڑ گئے تو پیسوں سے کیا حاصل؟''

مجھے پتا بھی نہیں چلا اور نجانے کب آنسو سلسلہ در سلسلہ میری آنکھوں سے چھلکتے جارہے تھے۔ میں بے جان قدموں سے اپنا بت توڑنے جارہی تھی۔ ہاں احسن کی کہی ایک ایک بات سچ تھی کہ میرے سکون کے لیے وہ ہر ممکن کوشش کرتے تھے...... گھر کے چھوٹے موٹے کام کرتے، بچوں کی ذمہ داری ان پر تھی، صبح مجھ سے پہلے جاگتے اور ناشتہ بنانے کے لیے سب کچھ مجھے سامنے ریڈی رکھا ملتا۔ لیکن میں ان کی محبت وا پنی ضرورت کو سمجھ ہی نہیں پائی...... میں نے موبائل کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ وہ پہلے بج اُٹھا۔

''احسن کالنگ''

''ہیلو احسن!'' میرا گلا بری طرح رندھ گیا۔ انہوں نے عین آخری لمحے میں میرا مان رکھ لیا تھا۔ میرا بھرم رہ گیا تھا۔

''کیسی ہو؟'' بھاری آواز، متفکر لہجہ۔ میں آنسو پینے لگی۔

''ٹھیک......''

''بچے کیسے ہیں؟'' اپنی آواز سے نجانے کیوں وہ بیمار لگ رہے تھے۔

آپ کو یاد کرتے ہیں۔ آپ ٹھیک ہیں؟'' میں نے ہمت کر کے پوچھا۔

''تھوڑا سا بخار ہوگیا یار۔ تم نے ٹھیک کہا تھا، مجھے صحیح پتا چل رہا ہے کہ کیا چیز کس بھاؤ بکتی ہے۔ ایک بار بھی کال نہیں کی......'' اداسی بھری ہنسی تھی۔ شکستہ، کتنی محبت تھی انہیں ہم سے۔

''نہیں احسن! آئی ایم سوری!'' میں پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔ کتنے دنوں کا غبار تھا، رک نہ سکا۔ روکا نہ گیا۔

''مجھے معاف کردیں احسن ......غلط تو میں تھی۔ ہمیں آپ کی ضرورت ہے احسن! بہت تنہا فیل کررہی ہوں۔ کیا آپ مجھے معاف کر پائیں گے؟'' میں فون پر گرفت جمائے انہیں پکار رہی تھی۔ شاید اتنی شدت سے کہ وہ تڑپ گئے تھے۔

''سب ٹھیک ہے نا صاعقہ! بلکہ رکو تم، میں ابھی آتا ہوں، بچوں کا بتاؤ۔ کچھ ہوا ہے کیا......''

وہ بوکھلا گئے تھے اور میں ہنس پڑی تھی۔ ایک دم ایسا لگنے لگا گویا کوئی محفوظ جائے پناہ میسر آ گئی ہو۔ کچھ ہی دیر میں، میرے گھر میں عجب سی رونق محسوس ہورہی ہے۔ یہ شاید بچوں کے چہروں پر ہے یا میرے دل سے پھوٹ رہی ہے...... بچے باپ سے شرارتیں کررہے ہیں، احسن ہنس رہے ہیں۔ نہیں معلوم کیا لائے ہیں۔ دیکھا نہیں، میں تو اس مکمل منظر کو دیکھ رہی ہوں۔

اور سوچ رہی ہوں......!

باپ، شوہر یا پھر ایک مرد......صرف پیسا کمانے والی مشین نہیں۔ اس کے علاوہ بھی اس سے تحفظ کے احساس جڑے ہیں۔ یہ ایک سائے کی مانند ہے۔ جس کی تپش بھی ضرورت پڑنے پر ریشمی حرارت کا احساس دلاتی ہے۔ جو زندگی کے لیے ضروری ہے۔

ہاں یہ ''میں'' ہی سوچ رہی ہوں......!!

☆

کشف بلوچ

کچا گھڑا

یہ اس روز کے کئی دنوں بعد کا واقعہ ہے جب گاؤں کے کنویں سے ایک لاش برآمد ہوئی اور اس کے چہرے پر...... مگر ٹھہریے...... یہ تو کہانی کا آخر ہے۔

ہر کہانی کا ایک آغاز ہوتا ہے۔ مگر جب تک چونکا دینے والا انجام سامنے نہیں آجاتا، کوئی بھی واقعہ کہانی نہیں بن سکتا۔



مگر یہ بھی سچ ہے کہ کہانی ہمیشہ ایک غیر معمولی واقعے سے شروع ہوتی ہے۔ جیسے کسی شے کی بنیاد میں معمولی سا ٹیڑھا پن آجائے اور جو بظاہر نظر بھی نہ آئے۔ مگر کبھی کبھی کہانی اسی زمین میں جنم لیتی ہے، جہاں بے دھیانی کا بیج بویا گیا ہو۔

اس کہانی کا جنم گاؤں کے کنویں پر ہوا، جہاں ایک روز بینو کسی سے چھپ کر باتیں کرتی دکھائی دی۔

اس سے اگلے روز بینو چار مرتبہ کنویں پر پانی بھرنے گئی۔ عموماً گاؤں کی عورتیں دن میں دو بار ہی کنویں پر پانی بھرنے جاتی تھیں۔ صبح کے وقت جب ڈھور ڈنگر اور مرد گھر سے باہر چلے جاتے اور جمع شدہ پانی ختم ہو جاتا۔ اور پھر سہ پہر کو وہ صبح تک کا پانی ذخیرہ کر لیتی تھیں۔

لیکن اس روز بینو تپتی دوپہر میں اکیلی گھڑا لے کر کنویں پر گئی اور واپسی پر ہانپتی کانپتی گھر میں داخل ہوئی۔ سینو (سر پر گھڑے کے نیچے رکھنے والا کپڑا) زمین پر پھینک کر گھڑا گھڑونچی پر رکھا۔ اور گرنے کے انداز میں چارپائی پر لیٹ گئی۔ تھوڑی دیر گزرنے کے بعد وہ چونک کر اٹھ بیٹھی۔ اور گلا دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا۔ زبان ہونٹوں پر یوں تیزی سے پھیرنے لگی کہ جیسے برسوں کی پیاسی ہو۔ فوراً گھبرا کر گردن کے گرد لپٹا دوپٹہ چارپائی پر پھینک دیا اور گھڑے میں منہ ڈال کر کہنے لگی۔

پیاس...... پیاس...... پیاس......

گھڑے کا پانی پینڈے سے جالگا۔ اس نے نیچے پڑا سینو اٹھایا اور گھڑونچی کے پاس بیٹھے چھوٹے بھائی کو پشت پر تھپڑ مار کر کہا۔

''کمینے سارے پانی سے مٹی گوندھ لی۔''

شوکے نے آنسو بھری نگاہوں سے بہن کو دیکھا۔ اور پھر جھک کر لاپروائی سے بچی ہوئی مٹی، جو اس نے ماں سے آنکھ بچا کر چرائی تھی، اس سے جلدی جلدی بیل بنانے لگا۔ اس کے ساتھ گھر گھر کھیلتی گلے نائی کی لڑکی مٹی کی ہانڈی میں جھوٹ موٹ کا آلو گوشت بنانے کی تیاری کر رہی تھی۔ اور اس کا بیل ابھی تک نہیں بنا تھا۔ بینو اسی وقت گھر کے ساتھ بنی ہٹی پر بیٹھی ماں کی آواز ان سنی کر کے کنویں کی جانب چل پڑی۔ کنواں اس وقت خالی پڑا ہوا تھا۔ اس کے اندر پیاس کی ایسی ہڑک جاگی کہ وہ کنویں کی تہہ میں اتر گئی۔ اس نے سوکھے ہونٹوں پر زبان پھیری اور کہا۔

پیاس...... پیاس...... پیاس......

کنویں کا پانی تہہ سے جالگا۔ اس نے باہر آ کر دیکھا کہ سہ پہر ہو چکی تھی۔ سب عورتیں اپنے گھڑے اٹھائے کنویں کے پاس کھڑی تھیں۔

''کوئی کہتی، نی میرا کاکا روتا ہے۔ مجھے گھڑا بھرنے دو۔'' دوسری رسی پکڑ کر کہنے لگی۔

''نی میری ساس آنکھوں سے محروم ہے۔ گھر میں اکیلی پڑی ہے۔ پہلے مجھے گھڑا بھر لینے دو۔'' ایسے میں تیسری بیچ میں بول پڑی۔

''نی میرا گھر والا بڑا شکی ہے۔ دیر ہوئی تو چپل ہاتھ میں پکڑ کر کہے گا۔ راستے میں کس یار کے ساتھ بیٹھ گئی تھی۔'' یہ سن کر سب ناک پر انگلی رکھ کر اسے حیرانی سے دیکھتی رہیں۔ اور پھر کہنے لگیں۔

''چل بی بی! تیری بدنصیبی۔ چل تو گھڑا پہلے بھر لے۔'' مگر جب اس نے رسی سے باندھا ڈول پانی میں پھینک کر اوپر کھینچا۔ تب خالی ڈول دیکھ کر حیران رہ گئی۔ آن کی آن میں خبر ننگے پیر بھاگتی ہوئی گاؤں پہنچ گئی۔ چرند پرند، ڈھور ڈنگر، بچے بوڑھے اور جوان سب دوڑے آئے۔ خالی کنویں کو دیکھ کر سب کو بلا کی پیاس لگنے لگی۔

دیکھتے ہی دیکھتے سورج کی تمازت بڑھنے لگی۔ دھوپ سب کے جسموں سے نمی چوسنے لگی۔ اور سب کے سب پیاس کی شدت سے زمین پر ایڑیاں رگڑنے لگے۔ تب بینو نے دیکھا کہ دور سے ایک مسافر کنویں کی طرف چلا آ رہا تھا۔ وہ اپنے

اونٹ کو سوکھے درخت کی شاخ سے باندھ کر بینو کے سامنے آ کھڑا ہوا۔اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کو جوڑ کر ایک پیالہ بنایا اور اپنے خشک ہونٹ ہتھیلیوں کے کنارے پر رکھ دیے۔

بینو نے اپنے خالی گھڑے کو دیکھا۔اور پھر بے اختیاری میں گھڑا اٹھا کر اوپر کر دیا۔یہ سوچے بغیر کہ اس کی پیاس کنواں خالی کر چکی تھی۔گھڑا فضا میں بلند ہو کر جب مسافر کی ہتھیلیوں کے قریب پہنچا۔تب خالی گھڑے سے پانی گرنے لگا۔مسافر نے خوب سیراب ہو کر پانی پیا اور پھر اوک میں بچی کچی بوندیں اس کی طرف اچھال دیں۔بوندوں نے اسے بھگو دیا۔اور اس نے چونک کر دیکھا کہ مسافر کے دور جاتے ہی زمین پر پڑے سب لوگ چلنے پھرنے لگے۔عورتیں کنویں میں ڈول ڈال کر پانی بھرنے لگیں۔مگر وہ حیرت سے اردگرد دیکھنے لگی کہ ایسا کچھ ہوا ہی نہیں۔وہ اس وقت کنویں پر تن تنہا تھی۔

بھری دوپہر میں وہ اکیلی ہی گھڑا بھرنے آئی تھی۔چلتے چلتے اس کے من میں وہم کا بیج پھوٹنے لگا۔اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔قطرے زمین پر پھیل گئے تھے۔وہ جہاں سے چلی تھی وہاں سے لے کر قبرستان تک پانی کے نشانات جیسے اس کے تعاقب میں چلے آ رہے تھے۔وہ گھبرا کر جلدی جلدی چلنے لگی۔

''اگر وہ اس کا پیچھا کرتا اس کے گھر آ گیا تو......؟''

یہ سوچ کر اس کا جی ہول گیا۔وہ پل میں ہیر کے روپ میں ڈھل گئی۔اسے یوں لگنے لگا جیسے دور کیکروں کے گھنے جھنڈ میں کوئی تاک لگائے بیٹھا تھا۔اور پھر تیز قدموں سے چلتے ہوئے اسے دور گھوڑوں کے ہنہنانے کی آواز سنائی دی۔جیسے وہ صاحباں ہو اور اس کے بھائی تیر کمان ہاتھوں میں لیے اس کی طرف دوڑے چلے آ رہے تھے۔

شام کو جب مٹی کی دیواریں تک تپ کر آگ برسانے لگیں۔وہ اپنی چارپائی اٹھا کر کوٹھے پر آ لیٹی۔یہاں ہوا گرم نہیں بلکہ مہربان تھی۔مگر پھر یکا یک بینو کے جسم کو تاپ چڑھ گیا اس کے جسم کی بوٹی بوٹی جیسے آگ میں تپنے لگ گئی۔اور وہ گلے میں لپٹے دوپٹے کو اتار کر کہنے لگی۔

پیاس...... پیاس...... پیاس......

تب کوٹھے کے گرد چھوٹی سی دیوار کے پار سے وہ نظر آیا۔اور بینو کی سانس رک گئی۔دیوار سے سرکتا سایہ اس کی جانب بڑھا۔اور اس کے پیروں کے نزدیک آ کر ٹھہر گیا۔

بینو کا وجود آگ میں جلتا گھڑا بن گیا۔اس نے اکثر اماں کے ساتھ مل کر گھڑوں کو آگ میں پکایا تھا۔اماں ذات کی ماچھن تھی۔مگر دینو کمہار کے ساتھ بیاہی تو کمہارن بن گئی۔اس نے دنوں میں ہی چاک پر رکھی بے ڈھب مٹی سے نفیس سا گھڑا بنانا سیکھ لیا۔وہ یوں مہارت سے گھڑے کو آگ میں پکاتی کہ اس کی رنگت تانبے سی چمکنے لگتی۔

آگ کے بھڑکتے شعلوں میں جیسے گھڑے کی رنگت تبدیل ہو جاتی۔ویسے ہی بینو سائے کو پاس آتے دیکھ کر انوکھے رنگوں میں بدلنے لگتی۔

اندھیری رات میں دو سائے ایک ہونے لگتے۔بجلی کے کھمبے پر لگے پیلے بلب کی مدھم روشنی میں سائے کے زاویے تبدیل ہوتے گئے۔کبھی سایہ پھول کی شاخ کی طرح نیچے کی طرف لٹک جاتا اور کبھی اونٹ کے کوہان کی طرح سختی سے ابھر آتا۔

کبھی چھوئی موئی کے پودے کی طرح سایہ انگ انگ سمیٹ لیتا۔اور کبھی پوری چارپائی پر پھیل جاتا۔آدھی رات تک سایے کی صورت بدلتی رہی اور چارپائی بوجھ سے چیختی رہی۔

بینو کی پیاس تھی کہ ختم ہی نہیں ہوتی تھی۔اس نے جیسے کنویں کا سارا پانی پی لیا تھا۔تب ہی تو دن

گزرتے گئے اور اس کا پیٹ پھولتا گیا۔اس کی ماں کی آنکھوں میں آگ کے شعلے مدھم پڑے تو اس نے بیٹی کو پہلی بار فرصت سے کھولا۔

ایک سوتی جوڑا، ایک کامدار شنیل کا سوٹ، دو جوڑے جارجٹ کے اور ایک سرخ موتیوں والا جوڑا، ایک جوتی ایڑیوں تک بند اور ایک انگوٹھے والی، دو پیتل کی بالیاں سونے کا پانی چڑھا چھوٹا سا ٹیکہ اور سرخ موتیوں والا ہار، کھانے پینے کے ضروری برتن اور ایک نہانے دھونے والی بڑی سی بالٹی۔

بینو کا جہیز مکمل تھا۔بخشو موچی کی بیوی نے چند ماہ پہلے اپنے بیٹے کے لیے اشاروں اشاروں میں بینو کے رشتے کی بات کی تھی۔سب کچھ مکمل تھا۔وقت سے پہلے۔

شاید کسی نقصان سے بھی پہلے۔

مگر یہ بات اس کی ماں کو بینو کو جہیز کی چیزیں دکھانے سے پہلے کہنی چاہیے تھی۔کیونکہ اس وقت بہت دیر ہو چکی تھی۔کافی مار پیٹ کے بعد جب بینو نے اس مسافر کا نام بتایا تو وہ دونوں چوہدری کی حویلی پہنچ گئیں۔

اب یہ بات صرف ان کی عزت کی نہیں رہی تھی۔حویلی کی عزت بھی شامل ہو گئی تھی۔کیکروں کے جھنڈ میں سے گزرتے ہوئے اس کی ماں نے دل میں سوچ لیا کہ اگر بڑی چوہدرائن نے بینو کو واپس گھر جانے سے روک دیا تو وہ اکیلی واپس آ جائے گی۔اور گھر جاتے ہی وہ بینو کی شادی کے لیے رکھے جوڑے گٹھڑی میں باندھ کر حویلی دے آئے گی۔البتہ باقی کا سامان وہ اپنے چھوٹے بیٹے شوکے کے ویاہ کے لیے سنبھال کر رکھ لے گی۔مگر حویلی میں داخل ہوتے ہی اس کے خیالات کے توتے چوہدرائن کی ایک تالی سے اڑ گئے۔برآمدے میں بڑے سے تخت پر کروفر سے بیٹھی چوہدرائن نے اس کی بات توجہ سے ضرور سنی تھی۔

مگر بات مکمل ہونے کے بعد ہنس کر یوں دونوں ہاتھوں سے زوردار تالی بجائی کہ برگد کے پیڑ پر بیٹھی چڑیاں گھبرا کر اڑ گئیں۔ہمیشہ کمیوں نے تھوڑے سے آٹے، گڑ شکر، کپڑے لتے، گندم، چاول یا پھر زیادہ سے زیادہ بیٹی کے جہیز کے لیے پانچ دس ہزار ادھار مانگے تھے۔اس سے بڑھ کر تو ان کمی کمینوں کی اوقات ہی نہیں ہوتی۔

مگر چوہدرائن کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ دینو کمہار کی بیوی اس کے اکلوتے بیٹے کی بہو تلاش کر کے اس کے پاس لے آئے گی۔یہی نہیں بلکہ آتے ہی یہ خوش خبری بھی سنا دے گی کہ مبارک ہو چوہدرائن جی جلد آپ دادی بھی بن جائیں گی۔ہے ناں ایک ٹکٹ میں دو مزے۔اب اس لطیفے پر چوہدرائن ہنستی نہیں تو اور کیا کرتی۔

چوہدرائن کی ہنسی تھمی تو برآمدے میں خاموشی چھا گئی۔اس نے پاس کھڑی بلقیسو سے چوہدری راحیل کی پینٹ کی بیلٹ منگوائی اور اس کے آنے تک حقے کی نے کو منہ سے نہ نکالا۔اس کے نتھنوں سے دھویں کے بجائے غصے کے شعلے نکلنے لگے۔

دینو کمہار کی بیوی نے آتے ہی سیدھے اس کے کلیجے پر ہاتھ ڈالا تھا۔اس نے ساتھ آئی لڑکی کی طرف دیکھنا تک گوارا نہ کیا۔بیلٹ ہاتھ میں آتے ہی چوہدرائن ان دونوں ماں بیٹی پر پل پڑی۔

کم بخت اپنی بیٹی کا نام چوہدری صاحب کے ساتھ لیتی تو تب اسے اتنا غصہ نہ آتا۔جتنا اپنے بیٹے کا نام لینے پر آ رہا تھا۔پورے اٹھارہ برس مزاروں کی مٹی چاٹی تھی۔دیسی گھی کے دیے جلائے، قیمتی چادریں چڑھائیں، تعویز گھول گھول کر پیے اور شہری ڈاکٹرنیوں پر پیسہ پانی کی طرح بہایا تب کہیں جا کر حویلی کا جانشین پیدا ہوا تھا۔

”نجانے ان عورتوں کی کوکھ کس مٹی کی بنی ہوئی

ہے کہ اپنے پرائے مرد کی نشانی سنبھال لیتی ہیں۔"

چوہدرائن ان دونوں کو پیٹ پیٹ کر ہلکان ہو گئی۔

"میرا پتر راحیل شہر کے کالج میں پڑھتا ہے۔ اور وہ امتحانوں کی وجہ سے تین مہینے سے گھر نہیں آیا تھا۔ اور تیری بیٹی کے پیٹ میں موجود پلا تو پورے چار ماہ کا تھا۔" آخری بار بیلٹ انہوں نے غصے کے مارے بینو کی ناف پر دے ماری تھی۔ بینو اس وار سے دوہری ہوگئی۔

یہ تو بھلا ہو حویلی میں آئے مہمانوں کا جنہوں نے ان ماں بیٹی کی جان بخشی کروائی ورنہ چوہدرائن نے تو انہیں مار دینے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔

☆☆☆

اگلی صبح گاؤں کے معتبر لوگوں کے گھروں میں چوہدری صاحب کے خاص تحائف پہنچ گئے۔ کمیوں کے گھروں میں بھی ایک ایک آٹے کا تھیلا بھجوا دیا گیا۔ پوچھنے پر پتا چلا کہ چوہدری راحیل کا دوسرے گاؤں کے چوہدری کے گھر سے رشتہ آیا تھا۔ گاؤں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔

بڑے لوگوں کی بڑی باتیں، رشتہ آ جانے پر گاؤں والوں میں اتنا سب کچھ بانٹ دیا۔ شادی ہونے پر تو گاؤں والوں کی عید ہو جانی تھی۔ گاؤں میں ہر جگہ یہی باتیں ہونے لگیں۔ عورتوں کے ہاتھ نیا شغل لگ گیا۔ کنویں پر آنے والی عورتیں یہ تک بھول گئیں کہ اب بینو ایک وقت بھی پانی بھرنے نہیں آتی تھی۔

جس دن وہ دونوں ماں بیٹی دائی سکینہ کے گھر سے لوٹی تھیں۔ بھوک پیاس ہی مر گئی تھی۔ شوکا کھانے کے وقت برتن اٹھا کر دیوار پر دے مارتا اور خالی گھڑوں کو پتھر پر مار کر پاش پاش کر دیتا۔ اور پھر تھک ہار کر سندری کے گھر جا کر کھانا کھا لیتا۔ لیکن وہ دونوں کئی دنوں تک چارپائی سے نہ اٹھیں۔ جوڑ جوڑ ہل گیا تھا۔ جسم پر جا بجا سرخ نشان تھے۔ چوہدرائن کے ملتانی کھسے نے ان کے ہونٹ چیر دیے تھے۔ ہنسنا تو دور رویا تک نہ جاتا۔

گاؤں والوں کی طرح ان کے گھر میں بھی حویلی سے ایک ملازمہ آئی تھی۔ مگر اس کے ہاتھ خالی تھے۔ نہ آٹا اور نہ گڑ شکر...... بس ایک حکم کہ چوہدری راحیل کی منگنی سے پہلے یہ گاؤں چھوڑ کر چلی جاؤ......

جس رات انہیں گاؤں سے جانا تھا۔ بینو کی ماں ہمت کر کے اٹھی۔ اور کوٹھری میں پڑے کچے گھڑے ایک ایک کر کے توڑ دیے۔ پتھر سے ضرب لگاتے ہوئے اسے لگتا جیسے تکلیف دل میں ہو رہی تھی۔ چٹائی پر گھڑے کے ٹکڑے نہیں بلکہ اس کے اپنے وجود کے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے۔ اس مختصر سے تکلیف دہ لمحے میں وہ تصور ہی تصور میں دینو کے ساتھ ابتدائی دنوں کے گزرے واقعات کو سلسلہ وار چھوٹی چھوٹی تصاویر کی صورت میں دیکھنے لگی۔ تلخ، شیریں اور پریشان کن احساسات اُس کے ذہن میں روانی سے گزرنے لگے۔

"رے دینو! یہ تو نے مجھے کس کام پر لگا دیا؟" پہلی بار جب دینو نے گوندھی ہوئی مٹی اس کے ہاتھ میں تھمائی تو وہ گھبرا گئی۔ اتنی چکنی مٹی کہ انگلیوں کی درزوں میں سے نکل گئی۔

"ری گھبرا کیوں رہی ہے۔ دوبارہ سے مٹی کو اٹھا، ہاتھوں کی مدد سے پھر سے یکجا کر اور پھر دھیرے دھیرے چاک پر رکھ کر کوئی بھی شکل بنانی شروع کر دے۔"

"اچھا گھبرا مت، یوں سمجھ کہ یہ ہماری بینو ہے۔ گول سی، لوتھڑے کی شکل میں اور تو نے اسے بندے کی شکل میں ڈھالنا ہے۔ تو بس اس کی بنیاد پر نظر رکھنا، اسے ٹیڑھا نہ ہونے دینا اور نیچے نظریں جمائے رکھنا۔ دیکھنا اس سے دھیان مت بھٹکانا۔"

وہ ایسے ہی کرتی گئی اور آہستہ آہستہ مٹی گھڑے میں تبدیل ہوتی گئی۔ وہ خوش تھی۔ یہ اس کی اپنی تخلیق تھی۔ مگر گھبرا بھی رہی تھی کہ کہیں اس کی انگلی غلط جگہ پر نہ لگ جائے۔ ساتھ ساتھ دینو کی ہدایات بھی جاری تھیں۔

"دیکھ نظریں اسی پر رکھنا۔ بن جائے تب بھی، دھوپ میں سوکھ جائے تب بھی اور آگ میں پکنے تک اسی کی جانچ کرتی رہنا۔ کیونکہ پختہ چیزوں کی حفاظت نہیں کرنی پڑتی۔ وہ اندرونی طور پر اتنی مضبوط ہو جاتی ہیں کہ کسی ضرب یا ٹھوکر سے بھی نہیں ٹوٹتیں۔"

وہ گھڑے پر اگلی ضرب لگاتے ہوئے ٹھہر گئی۔ اپنے بہتے آنسو پونچھے۔

بے دھیانی میں اس کی تخلیق بگڑ گئی تھی۔ مگر بے جان شے نہیں تھی کہ اسے توڑ دیتی۔

وہ آخری سلامت گھڑا اٹھا کر بینو کے پاس لے آئی۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے سامنے بٹھایا اور پھر دیر تک اسے گلے سے لگائے رکھا۔ بینو بھی یوں کھل کر روئی جیسے بیاہ کے سمے لڑکیاں روتی ہیں۔ لیکن جب اس کی ماں اٹھ کر ٹرنک سے ہار سنگھار کا سامان لے کر آئی تو وہ بدک کر کھڑی ہو گئی۔

وہ تو سمجھی تھی کہ آنسوؤں کی برسات سے اس کے پاپ دھل گئے تھے۔ مگر ماں کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ ہمیشگی والی رخصتی کا وقت آن ٹھہرا تھا۔ اس کی ماں کے ہاتھ بینو کے چہرے پر تیزی سے چل رہے تھے۔ چوہدرائن کے ہاتھوں سے بھی زیادہ تیز۔

جب بینو جہیز کا سرخ جوڑا پہن کر آئی تو ماں کے پیر پڑ گئی۔ ویسی ہی تکلیف ہو رہی تھی جیسے ناف پر آخری بیلٹ لگی تھی۔

یہ کیسی رخصتی تھی۔

کسی سزا جیسی......

موت جیسی......

چارپائی پر گھر کی ضروری چیزیں گٹھڑی میں باندھی ہوئی تھیں۔ شوکا ماں کی انگلی تھامے ہوئے جانے کے لیے تیار کھڑا تھا۔

مگر بینو کو کیوں رات کے اس پہر دلہن بن کر آخری گھڑا ابھرنے جانا تھا۔

"اب کس کو پیاس تھی؟"

"کون پیاسا تھا؟"

ماں نے بینو کی ہزار منتوں کے باوجود اسے کنویں پر آخری گھڑا ابھرنے کے لیے بھیج دیا۔ اور خود گٹھڑی اٹھا کر گھر سے باہر نکل گئی۔

رات کی تاریکی، گھڑا سر پر اور پیروں میں اونچی جوتی جس پر گلابی موتی لگے ہوئے تھے۔ بینو کے ہاتھ کپکپاتے تو چوڑیاں بج اٹھتیں۔ بے جان ہوتی ٹانگیں لڑکھڑاتیں تو پازیب گنگنا اٹھتی۔

سر پر رکھا گھڑا خالی تھا۔ مگر پہلی بار بینو کو بھاری لگ رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے ماں نے گھڑے میں اس کے سارے پاپ بھر دیے ہوں۔

اسے یوں لگ رہا تھا۔ جیسے اس کے پیر چلنے کے بجائے کچی زمین میں دھنس رہے ہوں۔ گناہوں کی دلدل میں۔

اس کا گلا خشک ہوتا تو اندر سے آواز آتی۔

پیاس...... پیاس...... پیاس......

ہرگز نہیں۔

اب اس کے اندر سے ایک ہی آواز ابھر رہی تھی۔

ڈر......ڈر......ڈر......

خوف......خوف......خوف......

موت......موت......موت......

وہ کنویں پر پہنچی تو وہ اس وقت بالکل سنسان تھا۔ شاید سارا گاؤں پانی بھر کر سو گیا تھا۔ بس آج اسے ہی گھڑا ابھرنا تھا۔ آخری گھڑا......

جس کے بعد سات جنموں کی پیاس تک بجھ

جاتی۔

جس وقت اس نے گھڑا اپنے نیچے رکھا۔ آسمان پر ٹمٹماتا آخری تارہ بھی بادلوں میں ڈوب گیا۔ پھر یکا یک تیز ہوا چلنے لگی۔ اور آسمان مزید بادلوں سے بھر گیا۔ اب بھی چاند کی مزاحمت جاری تھی۔ گہرے سیاہ بادل اس کے مکھ پر پردہ ڈال دیتے۔ جیسے کہہ رہے ہوں۔ پگلے نیچے زمین کا منظر نہ دیکھ...... مگر چاند کسی ڈوبتے کی طرح پھر سے ابھر آتا۔ بالآخر جب چاند نے آدھی مسافت طے کر لی۔ بادل جنگ کے طبل بجاتے ہوئے اسے قید کرنے لگے۔

اس وقت بینو کنویں پر جھکی اور رسی کنویں میں پھینک دی۔ ڈول پانی میں پھینکتے ہی ایک زور دار آواز ابھری۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کنویں میں ڈول نہیں کوئی انسان گرا ہو۔

جاتے چاند نے آخری بار نیچے کا منظر دیکھا۔

کنویں کے پاس اب دو سائے تھے...... یا شاید تین......

پھر اس کے بعد بارش نے سارے منظر دھندلا دیے۔

گھڑا کچا تھا
مجھے علم تھا کہ
میں درمیان تک پہنچ پاؤں گی
لیکن میں اس یقین کے ساتھ
دریا میں اتر گئی
کہ اگر محبت ہے تو
اگلا درمیان تم طے کرو گے
گھڑا کچا تھا
لیکن بہتے بہتے مجھے سمجھا گیا
کہ صرف گھڑے ہی کچے نہیں ہوتے

گاؤں میں اگلی صبح ہوئی تو ویسی ہی تھی جیسے روز ہوتی تھی۔ چڑیاں چہچہاتی ہوئی ڈال ڈال گھومنے لگیں۔ گھروں میں روز کی طرح چولہے جلائے گئے۔ بڑی بوڑھیاں مدھانی لے کر لسی بنانے لگیں۔ اور مرد باڑے میں منمناتی بھیڑ بکریوں کو چارہ ڈالنے لگے۔

عورتیں گھر کے کاموں سے فارغ ہوئیں تو رات کے قصوں کو دہراتے ہوئے کنویں پر پہنچ گئیں۔ پانی بھرنے کے لیے ڈول کھینچا گیا تو وہ اوپر آنے سے انکاری ہو گیا۔ یوں لگتا تھا جیسے اس پر بڑا بھاری بوجھ لدا ہو۔

مجبوراً کسی مرد کو بلایا گیا اور پھر بہت سے مردوں کو بلانے کا فیصلہ کیا گیا۔

''کنویں میں کسی کی لاش ہے۔'' اندر جانے والے آدمی کی چیخ سنائی دی۔ اور ہجوم کو سانپ سونگھ گیا۔

حویلی میں خاصی چہل پہل تھی۔ ملازمین پھولوں کی پتیوں سے بھری پلیٹیں اٹھائے گیٹ کے آس پاس ٹہل رہے تھے۔ چوہدرائن سونے سے لدی اپنے اکلوتے بیٹے کی منگنی کے انتظامات دیکھ رہی تھی۔

چوہدری صاحب مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے مہمانوں کے ساتھ خوش گپیوں میں مشغول تھے۔ البتہ گاہے بگاہے ایک اضطرابی نگاہ صوفے پر رکھے موبائل پر ڈال لیتے۔ کنویں سے نکالی جانے والی لاش سیدھی حویلی لائی گئی۔ اور پھر حویلی میں کہرام مچ گیا۔

چوہدرائن ہجوم کو چیرتے ہوئے لاش کی طرف لپکی۔ حویلی کے ملازمین لوگوں کو پیچھے دھکیلنے لگے۔

لاش پر سے کپڑا ہٹاتے ہی چوہدرائن غش کھا کر زمین پر گر پڑی۔ لاش کے چہرے اور گردن پر جا بجا گھڑوں پر نقش و نگار بنانے والی رنگین سیاہی کے دھبے تھے۔

صدف آصف

کہاں وقت

ہمیشہ سے وہ آسمان کی بلندیوں کی طرف پرواز کرنا چاہتی تھی مگر اس نے جب بھی اونچا اڑنے کی ذرا سی بھی کوشش کی تو فضول رسم و رواج کی تیز قینچی نے پر کتر ڈالے۔ چھوٹے سے گھر میں رہنے والی کہکشاں حیدر کی سبز آنکھوں میں بہت سارے رنگین خواب چھپے ہوئے تھے، اسی لیے جب اسے کوریئر کے ذریعے اپنی تعریفی سند موصول ہوئی تو اس کا جوش و خروش دیدنی تھا۔

"اماں...... اماں......" وہ شور مچاتی ہوئی ان کے کمرے جانب چل دی۔

"کیا...... ہوا کاشی؟" عالیہ حیدر اپنے بستر پر دھلے ہوئے کپڑوں کا ڈھیر پھیلائے انہیں تہ کرنے میں مصروف تھیں وہیں سے جواب دیا۔

"اماں۔ کیا کر رہی ہیں؟"

"کیوں چلا رہی ہو بیٹا! دیکھ تو رہی ہو، کام کر رہی ہوں؟" عالیہ نے ہاتھ میں پکڑا کرتا بستر پر ایسے ہی رکھا اور مڑ کر پریشانی سے اکلوتی بیٹی کی طرف دیکھا۔

"یہ دیکھیں۔ کالج نے میرا سرٹیفکٹ بھیجا ہے۔" اس نے مسکرا کر ماں کے کاندھے پہ ہاتھ رکھا اور اپنے ہاتھ میں پکڑی تعریفی سند ہوا میں لہرائی۔

"کر لی ناں اپنی مرضی۔ چلو بس اب سکون سے گھر پر بیٹھو اور کاموں میں میرا ہاتھ بٹاؤ۔" وہ بڑے نارمل انداز میں مسکرائیں۔

"اماں پلیز ابھی تو میرا سفر شروع ہوا ہے، مجھے بہت آگے جانا ہے۔" اس نے گھبرا کر ماں کا ہاتھ تھاما۔

"بس...... بس...... بہت ہو گیا۔" وہ غصہ ہوئیں اور بیٹی کا ہاتھ جھٹک دیا۔

"اماں پلیز، سمجھنے کی کوشش کریں، پتا ہے، میڈم انیسہ کہہ رہی تھیں کہ اپنی خداداد صلاحیتوں کی وجہ سے کاشی زندگی میں بہت آگے جائے گی۔" ماں کی جھاڑ پر اس نے لجاجت سے کہا۔

"کاشی! اب کوئی نئی ضد کر کے اپنے بابا کو مشکل میں مت ڈالنا، پہلے ہی تمہاری وجہ سے انہیں اپنے بھائیوں سے کافی کچھ سننے کو ملا ہے۔" عالیہ نے نرمی سے بیٹی کے گال چھوتے ہوئے سمجھانا چاہا۔



ناولٹ



"مگر اماں...... میں اپنی مہارت کو استعمال میں لاکر اپنے کام کو پروفیشنل طریقے سے آگے بڑھانا چاہتی ہوں۔" اس نے ہونٹ چبائے۔

"بس اسی لیے تمہارے بابا کو منع کرتی تھی، اب سلیقہ مند ہونے کا مطلب یہ تھوڑی ہے کہ لڑکی کو کھلی چھوٹ دے دی جائے۔" وہ بری طرح سے بدکیں۔

"یہی بات تو میں آپ کو سمجھانا چاہتی ہوں کہ گھر کی فضاؤں میں گھٹ کرنہیں جینا چاہتی ہوں اگر میرا ہنر دنیا کو نہ پتا چلے تو میری پڑھائی اور سب سیکھنے کا بھلا کیا فائدہ ہوگا؟" اس کے لہجے سے جھلکتی بغاوت کی جھلک نے عالیہ کو ڈرادیا۔

"جانتی بھی ہو، ہماری برادری میں لڑکیوں کا گھر سے باہر نکلنا پسند نہیں کیا جاتا، پھر بھی تمہاری ضد پر حیدر صاحب نے سب کی مخالفت مول لے کر تمہیں اتنی دور بھیجا، اب مزید کی امید نہ رکھنا، ورنہ یہ رشتے دار ہمیں جینے نہیں دیں گے۔" ان کے لہجے میں خوف سمایا ہوا تھا۔

"مگر میں اپنے پیروں پہ کھڑا ہونا چاہتی ہوں تاکہ اپنی ذات پر میرا اعتماد بڑھے۔" اس نے دھیرے سے گلابی لب کھولے۔

"بس...... بس...... بہت ہوگئی من مانی۔ میں رات کے لیے سبزی چڑھانے کچن میں جارہی ہوں تم ذرا اپنے بابا کے کپڑے سمیٹ کر میرا کمرہ صاف کردو۔" عالیہ نے ہاتھ اٹھا کر سختی سے بیٹی کو مزید کچھ کہنے سے روکا اور کام بتاتی باہر کی جانب بڑھیں۔

☆☆☆

چھٹی کا دن تھا۔ سہانا بڑے خوش گوار موڈ میں بغیر ناشتہ کیے صبح ہی میکے چلی آئی مگر ماں کو کچن میں مسلسل مصروف دیکھ کر اس کا منہ بن گیا۔ کچھ دیر تک انتظار کیا پھر خود ہی کیتلی میں پانی بھر چائے بنانے کے لیے چولہا آن کردیا، ساتھ ہی کیبنیٹ میں ہاتھ مارتے ہوئے نمکو کا پیکٹ بھی ڈھونڈ نکالا۔

"ایک کپ میرے لیے بھی۔" ماں کی شرارتی نگاہیں خود پر مرکوز دیکھیں تو منہ پھلاتے ہوئے شکوہ کیا۔

"آپ کے پاس تو میرے لیے ٹائم ہی نہیں ہے، سوچا اپنی خاطر میں خود ہی کرلوں۔" اس کے انداز پر نائلہ ہنس دیں۔

"کیا کروں بیٹا! تمہارے بھائی نمیر نے کل واپس چلے جانا ہے، اس لیے میں نے سوچا شامی کباب اور ایک دو سالن پکا کر پیک کرکے ساتھ دے دوں۔" نائلہ نے بڑے مصروف انداز میں کباب کی ٹکیہ بناتے ہوئے تفصیل بتائی۔

"ایک تو جب سے بھائی کا ٹرانسفر کراچی میں ہوا ہے۔ یہ بڑی مشکل ہوگئی ہے۔" سہانا نے نمکو منہ میں رکھتے ہوئے افسوس کا اظہار کیا۔

"ہاں۔ مگر اب کیا کریں۔ نوکری تو کرنا ہے۔" وہ مسکرائیں اور باکس میں کباب تہہ بہ تہہ سجا کر فریزر کرنے رکھ دیے۔

"یہ تو ہے ویسے بھی بھائی اب وہاں اچھا خاصا سیٹ ہوگئے ہیں۔" سہانا نے ماں کی ہاں میں ہاں ملائی۔

"ارے ہٹو بھلا اسے کوئی سیٹ ہونا کہتے ہیں، میرے بچے کی زندگی بالکل خانہ بدوشوں جیسی ہوگئی ہے نہ گھر کی روٹی ملتی ہے اور نہ ہی کوئی دوسرا آرام۔" وہ سنک کا نل کھول کر افسردگی سے ہاتھ دھوتے ہوئے بولیں۔

"ہاں تو کراچی جاکر رہنا ان کی اپنی چوائس ہے۔" سہانا نے دو کپوں میں چائے نکالی اور بولتی ہوئی ماں کے پیچھے لاؤنج میں چلی آئی۔ اس کا دماغ نمیر علی کے اس مسئلے کا حل ڈھونڈنے کے لیے ادھر سے ادھر دوڑنا شروع ہوگیا۔

☆☆☆

"یا اللہ۔ کیا لڑکیوں کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ بھی اپنی مرضی کی زندگی جی سکیں۔" کہکشاں نے

آسمان کی طرف منہ کر کے شکوہ کیا اور پھر سرد آہ بھرتے ہوئے بابا کے کپڑوں کو تہ کر کے سلیقے سے الماری میں جمایا اور کچھ سوچ کر ماں کے پیچھے کچن میں چلی آئی۔

"اماں! میں نے کہیں پڑھا تھا کہ اچھا کام شروع کرو تو پھر اسے رکنے نہ دو۔ جی جان سے محنت کرتے جاؤ، بہترین وہ خود بخود ہو جائے گا۔" وہ ان کے پیچھے کھڑے ہو کر رام کرنے والے انداز میں بولی مگر عالیہ جان بوجھ کر سنی ان سنی کرتے ہوئے رات کو پکانے کے لیے ترئی کی سبزی کھرچنے میں مصروف ہو گئیں۔

"ان پر کوئی اثر نہیں ہوگا۔" اس نے سرد آہ بھری اور فریج سے چکن نکالی۔ اس کا ارادہ دوپہر کے لیے فریش گرین سلاد کے ساتھ چکن جنجر سوپ بنانے کا تھا جو انتہائی زود ہضم اور صحت بخش لنچ تھا۔ گھر کا اکلوتا بچہ ہونے کی وجہ سے شروع سے اس کے لیے کھانا پکانا سب سے آسان اور صحت مند تفریح تھی وہ بچپن میں ہنڈکلیوں کا کھیل شوق سے کھیلتی، اسی لیے کافی کم عمری سے کچن میں ماں کا ہاتھ بٹانے لگی۔

کہتے ہیں...... "کھانا پکانا بھی ایک فن ہے اور شوقین لوگوں کے پاس ذائقوں کا محدود ساز و سامان ہوتا ہے جسے وہ اپنی صلاحیتوں سے بڑھاتے چلے جاتے ہیں۔ کاشی کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ وہ ماں کے سکھائے ہوئے روایتی انداز کے ایک سے کھانوں سے بور ہونے لگی تو اپنی تیکنک لگا کر اس نے ان میں جدت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اجزا وہی تھے مگر تھوڑی سی محنت سے اور چند نئی چیزوں کی آمیزش سے ان کا ذائقہ بالکل بدل کر رہ گیا۔ اسے اماں، بابا کے ساتھ ساتھ رشتے داروں کی طرف سے بھی داد ملنے لگی تو خود پر اس کا اعتماد بڑھنے لگا۔

اپنے شوق کی وجہ سے اس نے پہلے تو لائبریری سے کھانا پکانے کی کتابیں منگوا کر ان سے مدد لی پھر جیسے جیسے اس کی معلومات میں اضافہ ہوتا گیا اسے پتا چلا یہ تو پوری انڈسٹری ہے۔ یہیں سے اس نے مختلف ممالک کے کھانوں کی باقاعدہ تعلیم حاصل کرنے کا سوچا اور اس بارے میں معلومات ڈھونڈنے لگی، بڑی مشکلوں سے اسے اپنے گھر سے کافی دور ایک ووکیشنل کالج کے بارے میں پتا چلا جہاں مختلف قسم کی فنی کلاسز دی جاتی تھیں، اس نے باپ سے ضد کر کے باقاعدہ ایسوسی ایٹ ڈگری پروگرام میں داخلہ لیا۔

وہاں اسے بین البراعظمی کھانوں، فوڈ سیفٹی، کھانے کی اشیاء کی خریداری سے ٹیبل سروس تک کے بارے میں سکھایا گیا، ہاتھ میں ذائقہ تو پہلے ہی تھا مگر تھوڑی سی ٹریننگ سے کھانے کی تیاری، گارنشنگ اور پھر اس کو پیش کرنے تک اس کی مہارت کو جیسے چار چاند لگ گئے۔ روایتی کھانوں کو نئی جدت دینے میں کاشی کو کمال حاصل ہو گیا تھا۔ ڈگری حاصل کرنے کے بعد اس کا ارادہ تھا کہ وہ کوئی کام شروع کرے گی مگر اب عالیہ اس بارے میں مزید کچھ سننے کو بالکل تیار نہیں تھیں۔

☆☆☆

ماں بیٹی آمنے سامنے بیٹھ کر چائے پیتے ہوئے ٹی وی دیکھ رہی تھیں مگر وہ ابھی بھی بھائی کے بارے میں ہی سوچ رہی تھی، اچانک سہانا کے دماغ میں ایک خیال آیا۔

"ممی! بھائی ایک کام کیوں نہیں کرتے، یہ والی جاب چھوڑ کر یہاں واپس آجائیں، اتنے تعلیم یافتہ تو ہیں کہ انہیں دوسری جاب با آسانی مل جائے گی۔" وہ ماں کی طرف دیکھ کر بولی۔

سرورق کی شخصیت

ماڈل .... انمول
میک اپ .... روز بیوٹی پارلر
فوٹو گرافی .... موسیٰ رضا

اس کے کہنے کا اس کو نوکری چھوڑنا تو نہیں ہوا
ناں، وہ اپنی کمپنی میں سیٹ ہو چکا ہے، اس کی تو پروموشن ہونے والی ہے پھر وہ بھلا کیوں جاب چھوڑ کر یہاں شفٹ ہوگا؟" ان کے بتانے پر سہانا ایک بار پھر سوچ میں پڑ گئی۔

"ویسے میں کب سے میں تم بہنوں کے پیچھے پڑی ہوں کہ بھائی کے لیے کوئی اچھی لڑکی ڈھونڈ دو تاکہ میں اس کی شادی کر دوں، بہو ساتھ رہے گی تو میری فکریں بھی آدھی ہو جائیں گی۔" نائلہ نے بیٹی کی خاموشی پر منہ پھلاتے ہوئے اسے لیکچر دیا۔

"اوہ ممی! لڑکی سے یاد آیا پچھلی بار جب میں اپنی خالہ ساس کی طرف گئی تھی تو ان کی بیٹی کہکشاں سے ملی تھی، بہت پیاری ہے۔ بالکل ہمارے بھائی کے جوڑ کے مطابق ہے۔" سہانا نے کچھ دیر سوچا پھر یاد آنے پر ماتھے پہ ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

"ارے واہ۔ بچہ بغل میں، ڈھنڈورا شہر میں۔" نائلہ کے مثال دینے پر سہانا ہنس دی۔

"تو پھر دیر کس بات کی ہے فوراً بات چلاؤ، ویسے بھی ہمیں جہیز وہیز کا بالکل لالچ نہیں بس لڑکی اچھی اور گھریلو ہونا چاہیے۔"

"ہاں بات کرتی ہوں فراز سے مگر ڈرتی ہوں کہ کہیں انکار نہ ہو جائے۔" اس نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے سوچ کر کہا۔

"کیوں انکار کریں گے تمہاری شادی کو دس سال ہو گئے ہیں، اچھی نبھ رہی ہے، ہم ان کے آزمائے ہوئے لوگ ہیں پھر کس چیز کی کمی ہے، پڑھا لکھا نیک اور خوش شکل بچہ ہے میرا، جاب بھی بہت اچھی ہے۔" وہ حیران ہو کر بیٹے کی خوبیاں گنوانے لگ گئیں۔

"ارے بھائی میں تو کوئی کمی نہیں ہے مگر آپ جانتی تو ہیں میرے سسرال والوں کو۔ بڑے ہی پرانے خیالات کے مالک ہیں۔ پتا نہیں برادری سے باہر رشتہ دیں گے بھی یا نہیں۔" وہ تھوڑا جھجک کر بولی۔

"ارے ہاں، شادی کے بعد تم بھی تو ان کی برادری کا حصہ بن گئی ہو، خیر تم تو اپنا کام کرو باقی جو نصیب میں ہوگا وہ ہی ہوگا۔" نائلہ نے بیٹی کو رام کرتے ہوئے باقی کا سب قسمت پہ چھوڑ دیا۔

"چلیں...... میں گھر جاتے ہی عالیہ خالہ کو کال کرتی ہوں، دعا کیجیے گا یہاں بھائی کی بات بن جائے دراصل میرے پورے سسرال کی لڑکیاں ایک طرف اور کاشی دوسری طرف، بڑی ہی منفرد سی ہے، شکل وصورت میں یکتا، بات چیت میں اعلا اور اٹھنے بیٹھنے سے شائستگی وسلیقہ مندی جھلکتی ہے۔" سہانا نے کہکشاں کی تعریف کرتے ہوئے نائلہ کا اشتیاق بڑھایا ساتھ ہی اندر آتا ہوا نمیر بھی ماں بہن کی باتوں پر چونک گیا۔

"کاشی ...... کاشی...... نام تو بڑا پیارا ہے۔" اس نے کئی بار نام دہرایا۔

☆☆☆

صبح اٹھتے ہی کہکشاں نے طویل انگڑائی لی اور گزری باتوں کو ذہن سے جھٹک دیا۔ وہ ناشتے کے بعد خاموشی سے گھر کے کاموں میں ماں کا ہاتھ بٹانے لگی، عالیہ کو بیٹی کی سعادت مندی پہ بہت پیار آیا اور اپنے کل کے سخت انداز پر تھوڑا افسوس بھی ہوا۔

"میری لاڈو پری! اللہ تمہارا نصیب اچھا کرے، پھلو پھولو، خوشیوں میں کھیلو۔" بے اختیار بیٹی کا ماتھا چومتے ہوئے سراپا دعا بن گئیں۔

"میری پیاری اماں۔ اللہ جی آپ کو بھی یونہی سدا مسکراتا رکھے۔" اس نے بھی جواباً شرارتی انداز میں ماں کے ہاتھوں کا بوسہ لیا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے ہنس پڑیں۔

کاشی ماں کی باتوں پر کبھی بھی ناراض نہیں ہو سکتی تھی، کیونکہ اسے پتا تھا کہ عالیہ جو کچھ بھی کہتی ہیں، اس میں ذرا بھی لفاظی شامل نہیں، ان کے زیادہ تر سسرالی پاس پڑوس میں رہائش پذیر تھے، اسی لیے ایک دوسرے کی خبریں رکھنا آسان تھا۔ اس کے باوجود حیات خان نے صرف بیٹی کی ضد سے مجبور

ہو کر اپنے علاقے سے کافی دور واقع ... کالج میں اس کا ایڈمیشن کروایا، جہاں وہ دو بسیں بدل کر کلاس لینے جاتی تھی۔

اسے اکثر واپسی پر مغرب کا وقت ہو جاتا تھا۔ جب تک بیٹی گھر نہیں آتی تھی، عالیہ جلے پاؤں کی بلی کی طرح دروازے کے ارد گرد چکر لگاتی رہتی تھیں، ایسے وقت میں پڑوس میں رہنے والی دیورانی، جٹھانی کے معنی خیز سوالوں کے تسلی بخش جوابات دینا ان کے لیے سوہان روح ثابت ہوتا۔

''بھئی۔ ہم نے تو کبھی نہیں دیکھا کہ بیٹی کو کھانا پکانے کا کورس کرایا جائے، اپنی بچیوں کی تو ہم نے گھر میں ہی تربیت کی ہے، اب ایسا کھانا پکاتی ہیں کہ سسرالی انگلیاں چاٹتے رہ جاتے ہیں۔'' نور جہاں جب بھی ملتیں ناک چڑھا کر دیورانی کو سنانے لگتیں تو عالیہ سے صفائی میں کچھ کہا ہی نہیں جاتا۔

البتہ کاشی کو رشتے داروں کی بالکل پروا نہیں تھی۔ اسے اپنے ٹیکنیکل کالج میں بہت مزہ آتا تھا، وہاں لڑکیوں کو مختلف فنی علوم کی تربیت دی جاتی تھی تاکہ وہ اپنے پیروں پر کھڑی ہو سکیں۔ اس نے سوچ سمجھ کر پروفیشنل کوکنگ کا شعبہ منتخب کیا۔ اسے ایک کامیاب شیف بننا تھا مستقبل میں وہ اسی شعبے کو اپنا کیرئیر بنانا چاہتی تھی، اگر ریسٹورانٹ نہیں بھی کھول سکی تو کم از کم اپنے گھر سے کیٹرنگ تو شروع کر سکتی تھی۔

اس کی تائی اور چاچی جب بھی کاشی سے ملتیں اس سے یوں کرید کرید کر سوال کرتیں جیسے وہ کوکنگ سیکھنے نہیں بلکہ کسی سے افیئر چلانے باہر جاتی ہے، وہ بھی ان کو تحمل سے جواب دیتی اور ان کے طعنوں کو ہنس کر ٹال جاتی۔

☆☆☆

سہانا نے اپنی خالہ ساس عالیہ حیدر کو کال ملائی اور ادھر ادھر کی بات کرنے کے بجائے سیدھے مدعا پر آ گئی اور نمیر کا رشتہ پیش کر دیا۔

''ارے۔ فراز بہو! یہ تو بہت اچھی بات ہے۔'' عالیہ پہلے تو حیران ہوئیں پھر ایسے بولیں، جیسے من کی مراد پوری ہو گئی۔

''دیکھیں خالہ! ہمیں شادی کی بہت جلدی ہے، ممی کا بس چلے تو اگلے ہفتے ہی بھائی کا نکاح کر دیں، دراصل بھابھی نے بھائی کے ساتھ کراچی جا کر رہنا ہے، انہیں اب اکیلے وہاں کھانے پینے کی بڑی مشکل ہو رہی ہے۔'' اس نے مسکرا کر سادگی سے سچائی بیان کی۔

''اچھا...... مگر اتنی جلدی ایک دم سے سارا انتظام کیسے ہوگا؟'' وہ گھبرا کر اسی سے پوچھ بیٹھیں۔

''اس کی فکر مت کریں، ہمارے گھر میں اللہ کا دیا سب کچھ ہے، ممی کی بس ایک ہی خواہش ہے کہ لڑکی گھریلو، سلیقہ شعار اور ملنسار ہو، اور ہم سب کے ساتھ مل جل کر رہے۔''

''اچھا۔ تو صاحب زادے کرتے کیا ہیں؟'' عالیہ نے متانت سے نمیر کے بارے میں پوچھا۔

''خالہ! میں آپ کو بھائی کی تصویر اور دوسری ضروری تفصیلات بھیج رہی ہوں، آپ لوگ اپنی تسلی کروالیں۔'' سہانا نے بھی سنجیدگی سے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے فراز بہو! مجھے تو اس رشتے پر کوئی اعتراض نہیں مگر آخری فیصلہ تو تمہارے خالو کا ہی ہوگا۔'' عالیہ کی نیم رضامندی پر وہ خوش ہو گئی۔

''بالکل ٹھیک ہے، آپ خالو کو بتا دیں مگر پلیز، جواب ذرا جلدی دیجیے گا، دراصل ممی کو ایک دو لڑکیاں اور بھی پسند آئی ہیں مگر میں نے اصرار کیا کہ پہلے وہ کاشی کو دیکھ لیں۔'' اس نے اپنے بھائی کی ویلیو بڑھانے کے لیے جتایا۔

''تم بالکل فکر مت کرو، میں رات تک جواب دیتی ہوں'' عالیہ نے گھبرا کر اسے تسلی دی، وہ اتنا اچھا رشتہ ہاتھ سے نکلنے نہیں دینا چاہتی تھیں۔

☆☆☆

اس دنیا میں زیادہ تر انسان دو چہروں کے ساتھ جیتے ہیں اور ان کی کوشش ہوتی ہے کہ اپنا منفی

چہرہ چھپا کر معاشرے کے سامنے خود کو ویسا پیش کریں جیسا کہ اپنے آپ کو دکھانا چاہتے ہیں مگر کاشی ایسی نہیں تھی وہ جیسی باہر سے تھی ویسی ہی اندر سے بھی اجلی اور صاف و شفاف تھی، اسی لیے جو سوچتی، وہی بات بے جھجک اس کے لبوں پہ بھی آجاتی تھی۔

رات کے کھانے پر اس کا لٹکا ہوا منہ دیکھ کر باپ نے وجہ پوچھی تو اس نے کچھ چھپانے کی کوشش نہیں کی اور، اپنی خواہشات ان کے سامنے رکھ دیں۔

"کیا بات ہے کاشی بیٹا کوئی الجھن ہے؟"

"دیکھیں بابا۔ اماں کو تو میری بات سمجھ میں نہیں آرہی مگر پلیز آپ ہی میرا ساتھ دیں۔" اس نے ہاتھ میں تھاما ہوا لقمہ واپس پلیٹ میں رکھا اور ان کے استفسار پر جلدی سے کہا۔

"بس آرام سے کھانا کھاؤ، اور اپنے بابا کو بھی کھانے دو۔" عالیہ نے بیٹی کو فوراً ہی آنکھیں دکھاتے ہوئے مزید کچھ کہنے سے روکا۔

"کیا۔ اماں میں اپنی خواہش کا اظہار اپنے بابا سے نہیں تو پھر کیا تایا ابا کے پاس جا کر کروں گی؟" اس نے ناراضی سے ماں کو دیکھا۔

"کاشی بیٹا! گول مول باتیں مت کرو اور صاف صاف کہو کہ تم کیا چاہتی ہو؟" حیدر صاحب نے مسکرا کر بیٹی کو دیکھا۔

"ایک منٹ بابا۔ میں ابھی آئی۔" وہ باپ کے نرم لہجے پر مسکراتی ہوئی اندر کی جانب بھاگی۔

"میری بات سنیں، باجی راحیلہ کی بہو سہانا کا فون آیا تھا، اس نے ہماری کہکشاں کے لیے اپنے بھائی کا رشتہ مانگا ہے۔ مجھے تو یہ رشتہ دل سے قبول ہے۔" دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے عالیہ نے دھیرے سے بتایا۔

"یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ مگر آپ کون ہوتی ہیں قبول کرنے والی۔ کیا کاشی سے بھی اس بارے میں پوچھا ہے؟" انہوں نے لقمہ منہ میں رکھتے ہوئے خوشی کا اظہار کیا اور پھر ہلکے پھلکے انداز میں بیوی کی طرف دیکھا۔

"اس کا تو دماغ خراب ہے مگر ایک بات سن لیں نمیر بہت ہی قابل بچہ ہے، پھر کراچی میں اکیلا رہتا ہے ساس نندوں کا بھی کوئی جھنجھٹ نہیں ہوگا۔ ویسے بھی سہانا بہت سلجھی ہوئی بچی ہے، یقیناً اس کی فیملی بھی ایسی ہی ہوگی، میں اس رشتے کو ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتی ہوں۔" وہ شوہر کو پکا کرنے کے لیے مسلسل بول رہی تھیں۔

"بھئی۔ یہ آپ اچانک ہتھیلی پر سرسوں کیوں جمانے لگ گئیں؟" حیدر نے سر اٹھا کر بیوی کو دیکھا مگر اس سے پہلے کہ عالیہ کچھ کہتیں، کاشی اپنے ایک ہاتھ میں سرٹیفکیٹ اور دوسرے میں میڈل تھامے اندر داخل ہوئی۔

"بابا۔ دیکھیں یہ میں نے جیتا ہے۔" اس نے جوش سے سرٹیفکیٹ باپ کو پکڑایا۔

"ماشاءاللہ۔ یہ تو بہت اچھی بات ہے۔" ان کا لہجہ متاثر کن تھا، مسکرا کر بیٹی کی حوصلہ افزائی کی۔

"پتا ہے مجھے اپنے گروپ میں سے فرسٹ پرائز کے لیے چنا گیا ہے، ساتھ ہی بہت ہی کم کیلوریز والا کیک بنانے پر کالج نے خصوصی میڈل بھی دیا ہے۔" وہ بچوں کی سی معصومیت سے باپ سے اپنی کامیابیاں شیئر کرنے لگی۔

"میری بیٹی ہے ہی اتنی ٹیلنٹڈ۔" ان کی تعریف پر وہ چپ سی ہوگئی۔

"سچ مچ...... بابا؟" حیدر نے بیٹی کا سوال سنا اور چہرے کے بدلتے تاثرات کو بغور دیکھا۔

"ہاں بیٹا۔ مگر خوش ہونے کے بجائے تم اتنی پریشان کیوں لگ رہی ہو۔" انہوں نے کھانا چھوڑ کر بیٹی کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔

"اگر میں اتنی ہی ٹیلنٹڈ ہوں تو بابا آپ کو نہیں لگتا ہے کہ میرے ٹیلنٹ کا صحیح استعمال ہونا چاہیے؟"

"کچھ سمجھا نہیں میں" وہ چونک کر بیٹی کو دیکھنے لگ گئے۔

"میں...... اب کسی بڑے ہوٹل میں شیف

دکھانے کے باوجود اس کے منہ سے پھسلا۔

''کیا دماغ تو نہیں خراب ہوگیا ہے تمہارا یہ ناممکن ہے۔'' حیدر نے ایک دم چونک کر بیٹی کو ناگواری سے دیکھا۔

''اچھا تو پھر کیا میں گھر سے کیٹرنگ شروع کرسکتی ہوں؟'' اس نے باپ کے سامنے دوسرا آپشن رکھا۔

''ویسے یہاں کون تم سے کھانے پکوائے گا؟'' عالیہ نے طویل خاموشی کے بعد لب کھولے۔

''سب کچھ آن لائن سیل کروں گی، دیکھیں بابا اس کام میں بہت پیسے ہیں پھر یہ ہمارا فیملی بزنس بن جائے گا، شروع میں رعایتی نرخ پر اپنے کھانوں کو مارکیٹ میں لاؤں گی دیکھیے گا کہ کسٹمرز کی لائن لگ جائے گی۔'' اس نے جوش سے اپنے مستقبل کا منصوبہ بتانا شروع کیا تو ماں باپ اسے خاموشی سے تکنے لگے۔

''نہیں بھئی نہیں۔ پوری برادری میں ہماری ناک کٹ جائے گی۔ توبہ توبہ لوگ کیا کہیں گے میاں بیوی، بیٹی کو باورچن بنا کر اس کی کمائی کھا رہے ہیں۔'' عالیہ نے ہاتھ اٹھا کر فیصلہ سنا دیا۔

''میرے خیال میں تمہاری اماں ٹھیک کہہ رہی ہیں بیٹا،، ویسے بھی اس میں بہت دقتیں ہیں۔'' حیدر صاحب نے بات ختم کرتے ہوئے کہا۔

کاشی اپنی نم آنکھیں پونچھتی ہوئی میڈل اور سرٹیفکیٹ ہاتھ میں تھامے اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی اور دروازہ بند کرلیا۔

☆☆☆

سہانا نے ماں کے برابر میں بیٹھتے ہی، بیگ میں سے اپنا فون نکالا اور مسکرا کر بڑے فخر سے کہتے ہوئے موبائل ماں کے آگے کیا۔

''یہ دیکھیں میں نے بھائی کے لیے کیسی انمول لڑکی ڈھونڈی ہے۔''

''کس کی تصویر ہے؟'' بیٹی سے موبائل لیتے

''ارے بھول گئیں۔ وہ جو میں نے آپ سے عالیہ خالہ کی بیٹی کاشی کا ذکر کیا تھا ناں، انہوں نے اس کی تصویر بھیجی ہے۔ بتائیں کیسی ہے؟'' وہ کہتے ہوئے ماں کا چہرہ تکنے لگی۔

''ماشاءاللہ کتنی پیاری ہے یہ لڑکی۔'' نائلہ نے پہلے تو بغور تصویر دیکھی اور پھر تو جیسے اس پر لٹو ہوگئیں۔

''مزے کی بات تو یہ ہے کہ انہیں بھی نمیر بھائی پسند آگئے ہیں، ویسے یہاں بھی سسرال میں میری نیک نامی کام آئی ہے۔'' سہانا صوفے پر چوڑی ہوکر اتراہٹ بھرے انداز سے بولی۔

''یہ تو اور بھی اچھی بات ہے۔ ویسے وہ تمہاری ساس راحیلہ بیگم، سب سن کر ان کے کیا تاثرات تھے؟'' کچھ خیال آنے پر نائلہ نے بیٹی سے پوچھا

''ارے ممی۔ یہ ہی تو حیرت کی بات ہے، انہوں نے عادت کے مطابق کوئی بھی اعتراض نہیں اٹھایا الٹا بھابھی کا رشتہ لانے پر وہ تو میرے آگے پیچھے ہونے لگیں، اور تو اور عالیہ خالہ کو کال ملا کر نمیر بھائی کی ڈھیروں تعریفیں کیں۔'' سہانا نے مزے لے لے کر ماں کو سسرال کی باتیں بتائیں۔

''ہاں بھئی، آج کل کے دور میں اچھے رشتے ملتے کہاں ہیں؟ راحیلہ بیگم نے بھی سوچا ہوگا کہ بھانجی اچھے گھر میں بیاہی جائے گی تو برادری میں ان کی ناک اونچی ہوجائے گی۔'' نائلہ نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا تو سہانا نے سر ہلاتے ہوئے ماں کی بات سے اتفاق کیا۔

''شام کو نمیر کو کال کر کے بتاؤں گی کہ میں نے اس کے لیے لڑکی پسند کرلی ہے۔ آخر کب تک ایسے تنہا زندگی گزارے گا، وہ بھی خوش ہوجائے گا۔'' نائلہ نے مسکرا کر بیٹی کو دیکھا۔

''شام کو کیوں۔ ابھی کال کریں۔'' سہانا نے شرارتی نگاہوں سے ماں کو دیکھا۔

''ایسا کرتی ہوں ساتھ ہی میں بھائی کو کاشی کی

تصویریں بھی آج دی ہوں وہ تو تصویر دیکھتے ہی پہلی فلائٹ سے یہاں آجائیں گے۔" سہانا کے زور دینے پر نائلہ نے ہنستے ہوئے بیٹے کا کال ملادی مگر بیل جانے کے باوجود نمیر نے فون نہیں اٹھایا۔

☆☆☆

حیدر صاحب نے بیوی کے دباؤ ڈالنے پر کراچی میں رہائش پزیر اپنے ایک دوست مختیار خان کو معلومات حاصل کرنے کے لیے نمیر کے دفتر بھیجا، جہاں سے لڑکے کے بارے میں انہیں کافی تسلی بخش رپورٹ موصول ہوئی تو ان کا دل بھی بیوی کی طرح اس رشتے پر ٹھک گیا۔ کچھ سوچ بچار کے بعد انہوں نے اپنے دونوں بھائیوں کو فیملی سمیت رات کے کھانے کی خصوصی دعوت دے ڈالی۔

کاشی کے تایا ویسے بھی بڑے دنوں سے اپنی بھابھی عالیہ کے ہاتھوں کے پکے پائے کھانے کی فرمائش کررہے تھے۔ اس لیے ان لوگوں نے خوشی خوشی دعوت قبول کرلی۔ عالیہ شروع سے شوہر کی مزاج شناس تھی۔ پائے کی فرمائش کا مطلب یہ نہیں تھا کہ پتیلا بھر کر بس پائے پکا کر مہمانوں کے سامنے رکھ دیے جائیں۔ ایسے موقعوں پر حیدر صاحب دسترخوان پر کئی قسم کے پکوان دیکھنا چاہتے تھے۔ اس لیے عالیہ نے کاشی کو ساتھ لگا کر صبح ہی صبح دو طرح کا میٹھا بنالیا۔ ربڑی کھیر اور رس ملائی پر میوہ کاٹ کر سجانے کے بعد کاشی کو ہدایت کی کہ انہیں ٹھنڈا ہونے کے لیے فریج میں رکھ دے اور اس کے بعد جا کر پورے گھر کی اچھے طریقے سے ڈسٹنگ کرے۔

بہت دنوں بعد سسرال والے کھانے پر آرہے تھے اسی لیے عالیہ کوئی بدمزگی نہیں چاہتی تھیں۔ کاشی کی کچن کی طرف سے بے دلی پر وہ اس کی کیفیت سمجھ گئیں اور انہوں نے اسے صفائی کا ٹاسک دے دیا۔ وہ اپنی جٹھانی کو اچھی طرح سے جانتی تھیں، نور جہاں پوری برادری میں انگلی سے گرد چیک کرنے والی خاتون مشہور تھیں۔

اب وہ کچن میں کھڑی، چکن قورمہ، ماش کی بھنی دال اور ملائی کوفتہ پکانے کی تیاریوں میں لگ گئیں، ساتھ ہی پلاؤ کے لیے بکرے کے گوشت کی یخنی چڑھادی۔ پائے تو انہوں نے رات سے ہلکی آنچ پر باہر والے چولہے پر پکنے کے لیے رکھ دیے تھے، اپنے کام سے کافی مطمئن ہو گئیں تو ظہر کی نماز کی ادائیگی کے لیے کچن سے باہر نکل آئیں۔

☆☆☆

کاشی نے ڈرائنگ روم کی اچھی طرح سے جھاڑ پونچھ کی اور گل دان دھو کر ان میں کیاری سے توڑ کر تازہ گلاب سجائے، پھر دروازہ بند کر کے باہر نکلی تو، ایک دم سے اس کا فون بجنے لگا۔ وہ جھنجھلاتی ہوئی اپنے کمرے کی جانب بڑھی۔

"اس وقت کس کی کال آگئی؟" اس نے بڑبڑاتے ہوئے فون اٹھایا تو دوسری جانب اس کی ٹیچر انیسہ شاہ تھیں۔

"ارے ٹیچر۔ آپ اتنے دنوں بعد آپ کی آواز سن کر بہت خوشی ہوئی۔" ساری اداسی دور ہوگئی، چہکتا لہجہ، ایک ہی سانس میں سب کے بارے میں پوچھا۔

"اچھا سنو مجھے تم سے ایک ضروری کام ہے۔"

"جی...... جی...... حکم۔" اس نے ادب سے جواب دیا۔

"دراصل بات یہ ہے کہ......" نفیسہ نے اسے تفصیل بتانا شروع کی ان کے سرکل کی ایک مشہور بزنس وومین سہیلی شائنہ علاؤالدین کمرشل علاقے میں جاب کرنے والی خواتین کے لیے فاسٹ فوڈ کھولنے کا ارادہ رکھتی ہے، جہاں کا سارا اسٹاف خواتین پر مشتمل ہوگا۔ اس لیے انہیں وہاں کے لیے ایک ماہر شیف کی ضرورت ہے۔ انیسہ نے شائنہ کے پوچھنے پر کاشی کا نام تجویز کیا، وہ اسے معقول تنخواہ کے ساتھ پک اینڈ ڈراپ کی سہولت دینے کو بھی تیار تھی،" انیسہ کی پوری بات سننے کے بعد پہلے تو کاشی خوشی سے پاگل ہوگئی۔

"کیا آپ سچ کہہ رہی ہیں......؟" جب اسے

والدین کا خیال آیا تو جیسے اوس پڑ گئی۔ اس نے انہیں کل تک جواب دینے کا وعدہ کیا اور سلام دعا کے بعد فون رکھ دیا۔

''کاش کچھ ایسا ہوجائے کہ اماں بابا مان جائیں'' اس نے چشم تصور میں خود کو پروفیشنل شیف کے روپ میں دیکھا۔

☆☆☆

سہانا نے کہکشاں کی تصویر بھیجتے ہوئے بھائی سے اس کے بارے میں رائے مانگی مگر دفتری مصروفیت کی وجہ سے نمیر نہ ہی دن میں ماں سے بات کرسکا اور نہ ہی اس کو تصویر دیکھنے کا ٹائم ملا۔ وہ رات گئے جب تھکا ہارا گھر لوٹا تو بھوک سے بے تاب تھا کچھ اور سمجھ میں نہیں آیا تو چیز سینڈوچ کے ساتھ ایک کپ کافی کا بنا کر لاؤنج میں ٹی وی کے سامنے آکر بیٹھ گیا، ابھی اپنی فیورٹ مووی لگائی ہی تھی کہ۔ اسی وقت اسے موبائل پر بہن کا پیغام موصول ہوا۔

''کیسی لگی کاشی، ہم تو منگنی کا سوچے بیٹھے ہیں مگر جناب کوئی رسپانس ہی نہیں دے رہے۔''

''دیکھیں بھئی۔ ہمارے لیے بہن صاحبہ نے کون سا شاہکار پسند کیا ہے۔'' اس نے خود کلامی کرتے ہوئے واٹس اپ کھول کر تصویر دیکھی تو دیکھتا ہی رہ گیا۔

وہ جیسے کاشی کے معصوم حسن میں کھو سا گیا، اس نے اپنے بہت سارے دوستوں سے پہلی نظر کی محبت کے بارے میں سن رکھا تھا مگر وہ اتنی سرعت سے دل کو اپنا شکار بناتی ہے اس بات کا احساس آج پہلی بار ہوا تھا۔

کاشی...... تم اپنے نام کی طرح نازک وحسین ہو۔'' وہ تصویر سے بارہا مخاطب ہوا۔

دوسرے دن دفتر میں بھی اس کے ذہن پر وہ ہی سوار رہی، کام کے دوران جب ذرا سی بھی فرصت میسر آتی وہ سب کی نگاہوں سے بچتے ہوئے چپکے سے اس کی تصویر کو اشتیاق سے دیکھتا۔

اس نے گھر لوٹتے ہی جھٹ سے ماں کو کال ملائی اور چھوٹتے ہی اس رشتے کے بارے میں اپنی منظوری دے دی۔ نائلہ بیٹے کی کیفیت پر ہنس پڑیں انہوں نے سکون کا سانس لیا اور پھر فوراً ہی سہانا کو فون کر کے یہ خوش خبری دے دی۔

☆☆☆

دوسرے دن صبح کاشی نے سستی سے دعوت کے پھیلاوے کو سمیٹنا شروع کیا، تو اپنے ہاتھ سے لگائے گئے پودوں کی حالت دیکھ کر دل پکڑ کر بیٹھ گئی، چاچا کے چھوٹے بیٹے سنی نے کیاری اجاڑ کر رکھ دی تھی۔ منورہ چاچی نے اپنے بیٹے کو بہت بگاڑا ہوا تھا، وہ خود تو کچھ کہتی نہیں تھیں، کوئی اور ٹوکے تو بہت ہی برا مان جاتی تھیں، اسی لیے کاشی سنی کو تھپڑ رسید کرنے کی حسرت دل میں دبائے چپ چاپ انہیں سمیٹنے لگی۔

''کاشی کیا سارے دن پھولوں کا سوگ منانا ہے، اب یہاں آجاؤ اور میرے ساتھ مل کر ذرا برتنوں کا یہ انبار دھلواؤ۔'' ماں کے پکارنے پر وہ چونکی اور پھر جا کر ان کے ساتھ برتنوں کی دھلائی میں مدد دینے لگی۔ بڑے سے تھال پر صابن لگاتے ہوئے وہ ابھی عالیہ کو جاب کے لیے منانے کا سوچ ہی رہی تھی کہ عالیہ نے اسے مخاطب کر کے ایسی بات بتائی کہ تھال اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گرا۔

''کاشی بیٹا۔ تمہارے لیے سہانا کے بھائی نمیر کا رشتہ آیا ہے۔'' وہ مسکرا کر بولیں۔

''اماں...... ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟'' وہ شاک حالت میں انہیں تکتی رہ گئی۔

''کیوں بھئی۔ جہاں بیری ہوتی ہے پتھر تو آتے ہیں، ویسے بھی تمہارے بابا نے ساری انکوائری وغیرہ کروالی ہے، لڑکا بہت اچھا ہے، ہم لوگوں نے ہاں کردی ہے۔'' ان کے لہجے میں خوشیوں کا جوش وخروش تھا۔

''اماں...... پلیز......'' وہ منمنائی مگر عالیہ اپنی ہی کہے جارہی تھیں۔

''وہ لوگ اگلے مہینے شادی کرنا چاہتے ہیں،

ہماری بھی اپنی خاصی تیاری ہے۔" وہ ایک کے بعد ایک بم اس کے سر پر پھوڑتی چلی گئیں۔

"مجھ سے پوچھے بغیر......" کاشی نے خود پر قابو پاتے ہوئے دھیرے سے شکوہ کیا۔

"کیا اب ہمارا اپنی اولاد پر اتنا حق بھی نہیں کہ اس کے لیے بہتر فیصلہ کرسکیں۔" عالیہ نے جان بوجھ کر غصہ دکھایا۔

"مگر اماں میں تو اپنے لیے ایک سوٹ بھی پوری مارکیٹ چھاننے کے بعد پسند کرتی ہوں اور آپ لوگوں نے۔" اسے بڑی مایوسی ہوئی۔

"بیٹا یہ ایک سوٹ کی خریداری نہیں بلکہ زندگی بھر کا معاملہ ہے اسی لیے تمہارے بابا نے بہت اچھی طرح سے چھان پھٹک کے بعد اوکے کیا ہے ویسے بھی، لڑکا پڑھا لکھا ہے کراچی میں اس کی بہت اچھی جاب ہے، اپنا گھر ہے، کھاتا پیتا گھرانہ ہے، اس سے زیادہ کی ہماری خواہش نہیں۔" ان کے طویل لیکچر پر اس نے سرد آہ بھری۔

"مگر اماں! وہ جتنا بھی اچھا ہو مجھے ابھی شادی نہیں کرنی میرے تو بہت سارے خواب ابھی ادھورے ہیں، پتا ہے ایک بہت اچھی جاب کی آفر آئی ہے۔" خود پر قابو پا کر کچھ دیر بعد اس نے بتایا۔

"نہیں...... فیصلہ ہو چکا ہے اور تمہارے بابا اپنی زبان سے پھرنے والے نہیں۔" ان کے صاف انکار پر اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

"دیکھو کاشی! ہمارے جیسے سفید پوش لوگوں کے یہاں قسمت سے ایسا اچھا رشتہ آتا ہے۔" بیٹی کی آنکھوں کی نمی انہیں بے چین کر گئی مڑ کر اسے گلے لگاتے ہوئے سمجھایا۔

"بس۔ جاب واب کا خیال دل سے نکال دو اور خود کو ذہنی طور پر تیار کرلو۔ شادی کے بعد نمیر میاں تمہیں اپنے ساتھ کراچی لے جائیں گے، وہاں جا کر جو دل چاہے کرتی رہنا۔" اس خبر نے جیسے کاشی کے ہوش اڑا دیے مگر ماں کے انداز بتا رہے تھے کہ اس معاملے پر بحث بیکار ہے، اس رات اس نے اپنی ساری کتابیں اور دوسرا سامان ایک باکس میں بند کر کے رکھ دیا، جب وہ اس کو تالا لگا رہی تھی تو ایسا لگا جیسے اپنے خوابوں کو بھی قید کر دیا ہے۔

☆☆☆

نمیر کاشی کو پا کر سچ مچ میں بہت خوش تھا، کہکشاں بھی نمیر کی چاہت میں کھو کر سب کچھ بھول گئی تھی، اپنے بڑے بڑے دعوے، رنگین خواب، اور جاب کرنے کا ارادہ، اس کے لیے تو بس اب اپنی چھوٹی سی دنیا ہی زمین پر جنت جیسی بن گئی تھی۔

☆☆☆

شادی کے ایک ہفتے بعد ہی کاشی پلکوں تلے نئے خواب سجائے، نمیر کے ساتھ رخصت ہو کر اس کے چار کمروں کے لگژری طرز پر تعمیر شدہ فلیٹ میں چلی آئی جو شہر کے پوش ترین علاقے میں واقع تھا، اس کا شوہر ایک پڑھا لکھا، خوش شکل اور خوش مزاج انسان تھا، اس بات کا ادارک اسے شادی کے چند ہفتوں بعد ہی ہو گیا تھا۔ وہ ایک بڑے ادارے میں اکاؤنٹس منیجر تھا، اچھی تنخواہ اور دیگر مراعات کے ساتھ بہت اچھا گزارا ہو رہا تھا۔ وہ اس کی چھوٹی سے چھوٹی بات کا بھی بڑا خیال رکھتا تھا۔ عالیہ جب بھی بیٹی کو کال کرتیں پہلے سے زیادہ مطمئن ہو جاتیں دوسری جانب نائلہ کو بھی اب جا کر بیٹے کی طرف سے سکون حاصل ہوا تھا۔

کاشی بھی ماضی کو بھلائے اپنے حال میں مست ہو گئی، اب وہ اپنی مہارت اور ہنر مندی شوہر کے گھر پر دکھانے لگی، اس کے ہاتھ میں اتنا ذائقہ تھا کہ دال بھی پکاتی تو نمیر انگلیاں چاٹتا رہ جاتا۔ بہت جلد ہی وہ بیوی کے کھانوں کا شیدائی ہو گیا۔

"یہ روزمرہ کے کھانے بھی اتنے مزے دار کیوں لگنے لگے ہیں؟" نمبر کے پوچھنے پر وہ مسکرا کر اس کی پلیٹ میں چاول نکالنے لگی۔

"ڈارلنگ، کہیں تم نے کھانوں میں سامری جادوگر کے مسالوں کا استعمال تو نہیں شروع کر دیا ہے؟" اس نے افغانی پلاؤ کھاتے ہوئے اسے

چیٹرا۔

''چیزیں تو وہ ہی ہیں۔ بس پکانے کے انداز میں تبدیلی لائی ہوں۔'' اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

''اچھا تو یہ سامری جادوگر کا نہیں بلکہ ہماری مسز کے ہاتھوں کا جادو ہے۔'' کھانے کی میز سے اٹھتے ہوئے، اس کی انگلیاں چوم کر بولا تو کاشی ہنس پڑی اور برتن سمیٹ کر کچن کی جانب چل دی۔

کاشی نے اپنی نئی ریسیپی سے چینی کے بغیر آم کا میٹھا بنایا اور اسے ٹرائی کرانے کے لیے ٹرے میں سجا کر لے لاؤنج میں لے آئی جہاں وہ بیٹھا ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ اس نے چمچہ بھر کر میٹھا منہ میں رکھا اور سراہتی نگاہوں سے اسے دیکھا۔

''ایک بات بتائیں۔ کہیں بیوی کی ناراضی کے ڈر سے مسکا تو نہیں لگایا جا رہا؟'' اس کی کھنک دار ہنسی لاؤنج میں گونجی۔

''تمہاری قسم۔ سب کچھ بہت مزے دار ہے۔'' نمیر نے اسے پیار سے دیکھا اور اس کے سر پہ ہاتھ رکھ کر شرارتی انداز میں سر ہلایا۔

''اچھا مگر مجھے تو ابھی بھی لگتا ہے کہ آپ بٹرنگ کر رہے ہیں۔'' اس نے ناک سکیڑ کر اسے چھیڑا اور پیالی میں مزید میٹھا ڈالا۔

''بلیوی۔ میں نے شادی سے پہلے مجبوری کی حالت میں یہاں کے بڑے بڑے ریسٹوران کے پکوان ٹرائی کیے ہیں مگر ان میں وہ لذت نہیں، جو ہمارے گھر میں پکنے والے کھانوں میں ہوتی ہے، شاید تم اس میں اپنے پیار کی آمیزش بھی کرتی ہو۔'' وہ مسکرا کہتا چلا گیا تو کاشی کے گداز لبوں پہ مسکراہٹ بکھر گئی۔

اب وہ اسے کیسے بتاتی کہ جو کچھ اس نے سیکھا تھا، اس مہارت کا استعمال وہ شوہر کے لیے پکائے جانے والے کھانوں میں کرتی تو اسے عجیب سی تسکین محسوس ہوتی۔ ویسے بھی نمیر کی تعریف پر اسے اکثر اپنی کی اماں کی ایک بات یاد آجاتی تھی کہ ''کھانا پکانے میں عورت کے فن سے زیادہ اس کی گھر والوں سے محبت کمال دکھاتی ہے۔'' اور وہ تو اپنے کچن میں محبت اور مہارت دونوں کا استعمال برابر کے حساب سے کرتی تھی۔

☆☆☆

دفتر سے واپسی پر نمیر علی اپنے فلور پر جانے کے لیے لفٹ میں سوار ہوا تو پیچھے سے پڑوس والی آنٹی خالدہ نواز بھی ہاتھ کے اشارے سے لفٹ روکنے کا کہتی ہوئی ہانپتی کانپتی اندر داخل ہوئیں۔

''آجائیں...... آنٹی۔ آجائیں۔'' اس نے خوش دلی سے بٹن پریس کرتے ہوئے سر ہلایا۔

''لائیں، یہ سب مجھے پکڑا دیں۔'' اندر آنے پر نمیر نے جلدی سے ان کے ہاتھ سے بھاری شاپنگ بیگ لے کر نیچے رکھ دیے۔

''تھینک یو...... بیٹا......'' وہ ٹشو سے چہرہ پونچھتے ہوئے مسکرائیں۔

''ارے۔ اس میں ایسی کیا بات ہے آنٹی۔'' اس نے اخلاق دکھایا۔

''ویسے ہمیں شکریہ تو ایک اور بات کے لیے بھی ادا کرنا تھا۔'' وہ تھوڑا شوخی سے بولیں۔

''اچھا۔ وہ کس بات کا آنٹی؟'' نمیر چونک اٹھا اور ان کا چہرہ دیکھنے لگا۔

''ایک اچھے گنوں والی لڑکی سے شادی کر کے تم نے ہمارا پڑوس جو آباد کر دیا ہے۔'' ان کی بات اسے کاشی پر فخر محسوس ہوا۔

''یہ تو ہے۔ آنٹی! کاشی واقعی بہت پیاری ہے۔'' اس کے منہ سے بھی بے ساختہ تعریف نکلی پھر تھوڑا جھینپ سا گیا۔

''یہ سچ ہے کہ وہ بہت خوب صورت ہے مگر اس کی سیرت اس سے بھی زیادہ پیاری ہے۔'' خالدہ نے دل سے کہا۔

''شکریہ...... آنٹی!'' اس سے زیادہ بھلا اب وہ اور کیا کہتا۔

''پتا ہے۔ تمہارے انکل کب سے حلوہ کھانے کے لیے مجھے تنگ کر رہے تھے، اسی بات پر صبح، شام

بہادر کی ... رہی تھی، انہوں نے کاشی بیٹیا
کے سامنے اس بات کا ذکر کردیا کہ ''ان کے مٹاپے کی وجہ سے میٹھے پر پابندی لگائی ہوئی ہے، جس کی وجہ سے صاحب بہادر کا منہ پھولا ہوا ہے۔'' وہ بے چاری بچی نکل جانے کہاں سے ڈائٹ حلوے کی ترکیب ڈھونڈ ڈھانڈ کر ان کے لیے بنا کردے گئی، آپس کی بات ہے میں نے بھی چکھا، بہت ہی مزے کا تھا۔ سمجھو، ان کی تو لاٹری نکل آئی بہت دعائیں دے رہے تھے۔'' ان کے ہنس ہنس کر بتانے پر نمیر کو کاشی پر بے انتہا پیار آگیا۔

اکیلا ہونے کی وجہ سے خالدہ آنٹی نے نمیر کا کافی خیال رکھا تھا، اکثر اس کے لیے کچھ نہ کچھ پکا کر بھیجتی رہتی تھیں، اسی لیے اسے اپنی اس پڑوسن سے قدرتی طور پر انسیت سی ہوگئی تھی اور اس بات کا ذکر جب سے اس نے بیوی سے کیا تھا وہ اب ان کے لیے کچھ نہ کچھ پکا کر انہیں بھیجتی رہتی تھی۔ دراصل پڑوس میں رہنے والی خالدہ بیگم کی کوئی اولاد نہیں تھی میاں بیوی تنہا رہتے تھے اسی وجہ سے انہوں نے نمیر کو بیٹا بنالیا تھا، اور کاشی کو بھی انہوں نے جلد اپنالیا اور اپنی بہو کا درجہ دے دیا تھا۔

کاشی نے چند دنوں میں ہی اپنی سلیقہ مندی سے گھر کو سجا سنوار دیا، اور پھر تنہائی سے گھبرا کر پاس پڑوس والی عورتوں سے دوستی بڑھانے کی کوشش شروع کردی، اسکے مزاج میں شامل معصومیت اور ہر ایک کے کام آنے کی عادت کی وجہ سے خواتین کے گروپ نے اسے بڑی خوش دلی سے ویلکم کہا۔ کاشی بھی ان سب کی گیدرنگ میں گھل مل گئی اور اپنی اداسی بھول گئی۔

☆☆☆

''بھئی۔ تمہارے ہاتھوں کا جادو تو پوری بلڈنگ پر چل گیا ہے۔'' نمیر نے خالدہ آنٹی والا قصہ پورا سنانے کے بعد تعریف کی تو وہ مسکرادی۔

''پتا ہے نمیر! خالدہ آنٹی کہہ رہی تھیں کہ کیوں نہ میں چھوٹے پیمانے پر اپنا کیٹرنگ کا بزنس شروع کروں، بہت آرڈرز ملیں گے۔'' من میں چھپی خواہش نے پھر سے انگڑائی لی اور چائے دیتے ہوئے بات زبان تک آگئی۔

''کیٹرنگ...... اور تم...... آر یو جوکنگ؟'' اس نے مسکرا کر پوچھا اور چائے کا سپ لینے لگا۔

''ہاں۔ کچھ اتنا بڑا نہیں بس گھر سے کروں گی آرڈر پر بریانی، چائنیز یا مٹھائیاں اور کیک وغیرہ تیار کر کے سیل کروں گی۔'' اس کے لہجے میں اصرار تھا۔

''گھر سے؟ مطلب فضول میں خود کو تھکانے کی کیا ضرورت ہے؟'' نمیر ابھی تک اس کی بات کو مذاق میں اڑا رہا تھا۔

''دراصل کچھ آرڈرز خالدہ آنٹی کی وجہ سے ہی مجھے ملے ہیں، میں نے حساب لگایا ہے، اگر طریقے سے خریداری کی جائے تو اس کام میں خاصی بچت ہے۔'' اس نے شوہر کو سچائی سے پوری بات بتاتے ہوئے منانے کی کوشش کی۔

''کیا مطلب، اب تم بازاروں میں پھرو گی؟ یار! میں اچھا خاصا کماتا ہوں، لوگ کیا کہیں گے، ویسے اگر تمہیں کسی چیز کی ضرورت ہے تو مجھ سے کہو۔'' نمیر کو اب اس کی ضد ناگوار گزری تو لہجہ تلخ ہوگیا۔

''نہیں، بات صرف پیسے کی نہیں ہے، یہ میرا شوق بھی ہے'' وہ گڑبڑائی اور لہجہ تھوڑا اسا نم ہوگیا۔

''تو جان کون منع کر رہا ہے، آپ اپنا شوق گھر میں پکا کر پورا کرتی رہیں، میں ہوں ناں آپ کا ایک فین جو سو پر بھاری ہے۔'' اس نے کاشی کو خود سے نزدیک کر کے اس کی آنکھوں میں پیار سے دیکھا تو وہ بہل گئی مگر دماغ ابھی بھی وہیں اٹکا ہوا تھا۔

''مگر وہ خالدہ آنٹی کہہ رہی تھیں کہ مجھ میں اتنا ٹیلنٹ ہے تو اسے ضائع کرنے کی کیا ضرورت ہے اور پھر چار پیسے آتے کس کو برے لگتے ہیں۔''

''اب نمیر علی خان پر ایسا برا وقت بھی نہیں آیا کہ اس کی پیاری سی بیوی کو کک بن کر پیسے کمانے پڑ جائیں۔'' وہ اس کی ضد پر ناراض ہوگیا۔

خود تو آفس میں مصروف رہتے ہیں اور یہاں پورا دن میں اکیلی رہتی ہوں تو سوچا کہ......"
شوہر کی تیز نگاہوں پر کاشی نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"اکیلا رہنے کا مطلب یہ تھوڑی ہے، خیر ایسا کرو ڈرائیونگ سیکھ لو۔ میں تمہیں گاڑی خرید کر دے دیتا ہوں، جب دل چاہے شاپنگ کے لیے نکل جایا کرنا۔ اس طرح تمہاری طبیعت بہل جائے گی۔"

اس کی آنکھیں دوبارہ نم ہوتی دیکھ کر نمیر کو ترس آیا، اس نے مسکرا کر ایسا حل پیش کیا، جس سے کاشی کو کچھ خاص دلچسپی نہیں تھی، کیونکہ بلاوجہ کا پیسہ اڑانا اس کے مزاج کا حصہ نہیں تھا اس لیے چپ چاپ وہاں سے اٹھ گئی۔ نمیر کی پُرسوچ نگاہیں اس پر جم کر رہ گئیں اور دماغ الجھ گیا۔

☆☆☆

وہ ناشتے کے بعد چائے کا مگ تھامے ٹی وی لاؤنج میں چلی آئی۔ اسی وقت ڈور بیل بجی۔ اس نے جا کر دروازہ کھولا تو آنٹی خالدہ کے ساتھ فورتھ فلور والی شازیہ آنٹی بھی کھڑی تھیں۔

"شازیہ کو تم سے بات کرنی ہے۔"

"السلام علیکم...... آیئے ناں۔" اس نے مسکرا کر انہیں اندر آنے کا کہا اور ڈرائنگ روم میں بٹھا کر فوراً ہی تواضع کے لیے دو کپ چائے کے ساتھ گاجر کا حلوہ نکال کر لے آئی جو اس نے رات کو ہی نمیر کی فرمائش پر بنایا تھا۔ اس کے پھرتی دکھانے پر وہ دونوں مسکرا دیں۔

"جی آنٹی تو بتایئے، کیا بات ہے؟" کاشی نے ان کے مقابل رکھے صوفے پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"دراصل میں تمہارا شکریہ ادا کرنے آئی تھی اور یہ کچھ پیسے ہیں جو میں تمہیں دینا چاہتی تھی" انہوں نے ایک لفافہ اس کی جانب بڑھایا۔

"ارے نہیں آنٹی میں یہ نہیں لے سکتی ہوں۔ ویسے بھی ایک ہی بلڈنگ میں رہنے کی وجہ سے یہ تو میرا فرض تھا۔" وہ ایک دم سے ہچکچائی اور ان کے لفافے والا ہاتھ پیچھے کیا۔

"نہیں بیٹا یہ تو تمہیں لینا پڑے گا تم نے اتنی ایمرجنسی میں جو ڈنر ارینج کرنے میں ہیلپ کی اس کا تو کوئی بدلہ ہو نہیں سکتا البتہ ہماری بہت ساری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔"

شازیہ نے مسکرا کر کہا اور زبردستی لفافہ اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ خالدہ آنٹی کے اشارے پر اسے مجبوراً رقم لینی پڑی۔ اس نے ان دونوں کے جانے کے بعد لفافہ کھولا تو اس میں معقول اماؤنٹ تھی۔ اس کی محنت کی پہلی کمائی۔ پتا نہیں کیوں اس کے دل میں ایک الگ طرح کی خوشی جاگی۔ اپنے ہاتھ کی کمائی کا مزہ ہی کچھ اور تھا اور پھر ان کی تعریف سے جیسے نئی توانائی ملی۔ اس نے وہ پیسے سنبھال کر وارڈروب کی نچلی دراز میں رکھ دیے۔ کچھ سوچ کر اس نے گیلری میں رکھا ہوا باکس جھاڑ پونچھ کر کھولا جس میں اس نے شادی سے پہلے اپنی کھانے پکانے کی ترکیبوں کی کتابیں اور دیگر نوٹس پیک کر کے رکھ دیئے تھے۔ بڑے عرصے بعد اس کا دل جیسے شانت ہو گیا تھا۔

☆☆☆

کل ہوا کچھ یوں تھا کہ شازیہ کی بڑی بیٹی ماہرہ کے سسرال والوں کو ڈنر پر آنا تھا۔ وہ صبح سے تیاریوں میں لگی ہوئی تھی کوکنگ بھی گھر میں ہی کرنی تھی کیونکہ ماہرہ کی ساس خاصی نکتہ چیں خاتون تھیں اور بازاری کھانوں کو سخت ناپسند کرتی تھیں۔ اس لیے خالدہ کے ہاتھ پیر پھولے ہوئے تھے کہ سارا کام وقت پر مکمل ہو جائے۔

اسی بوکھلاہٹ میں اچانک ماسی سے واش روم دھلواتے ہوئے خالدہ کا پاؤں پھسل گیا، ان کے ہاتھ میں چوٹ آئی اور کچھ ہی دیر میں وہ بری طرح سے سوج کر کپا ہو گیا۔ اب پکانا تو دور کی بعد ان کے لیے تو چمچ ہلانا بھی مشکل ہو گیا تھا، ماہرہ کو نہ تو شوق تھا اور نہ وہ اتنی باصلاحیت تھی کہ تیس افراد کا کھانا اکیلے دم پر پکا سکے، ویسے بھی اسے اسکن

تسلیاں دیتی ہوئی گھر سے نکل گئی۔

شازیہ سر پہ ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئیں، اتفاق سے اسی وقت خالدہ نے خیر خیریت کے لیے اپنی سہیلی کو کال ملائی تو انہوں نے ساری بپتا سنا کر ان سے مدد مانگ لی۔ خالدہ کو ان کی بات پر فوراً کاشی کا خیال آیا اور اسے کال کر کے بات کی تو وہ ان کی پریشانی سن کر بخوشی دعوت کا کھانا تیار کرنے پر راضی ہوگئی۔ گھر میں کچھ سامان موجود تھا باقی کی لسٹ بنا کر اس نے خالدہ آنٹی کو تھمائی۔ ان کے شوہر نواز انکل گروسری کر کے مطلوبہ سامان لے آئے اور خالدہ خود کاٹنے پیٹنے میں کاشی کی مدد کرنے لگیں۔ اس نے وقت سے پہلے کافی ساری نئی طرز کی دیسی بدیسی ڈشز اور چند منفرد قسم کے میٹھے سجا کر شازیہ کے گھر پہنچا دیے اور دھڑکتے دل سے ان کے رسپانس کا انتظار کرنے لگی۔

ماہرہ کے سسرال والوں کو سارا کھانا بہت پسند آیا تھا ان لوگوں نے خوب تعریفیں کیں تو خالدہ نے دل ہی دل میں شکر ادا کیا کہ کاشی کی وجہ سے بیٹی کے سسرال میں عزت بنی رہ گئی۔

دوسری صبح وہ خالدہ بیگم کو ساتھ لیے کاشی کا شکریہ ادا کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی کیٹرنگ کی ادائی کرنے بھی چلی آئیں۔ اس طرح سے نہ چاہتے ہوئے بھی اسے زندگی کا پہلا آرڈر مل گیا اس کے بعد تو جیسے لائن لگ گئی، اور اس کی اپنی ایک پہچان بنتی چلی گئی۔ جس کے لیے پڑوسی انکل، آنٹی بہت مددگار ثابت ہوئے۔

خالدہ بیگم کی وجہ سے اسے چھوٹے بڑے آرڈر ملتے اور وہ چاہتے ہوئے بھی انکار نہیں کر پاتی، خالدہ اور شازیہ کے توسط سے اس کا نمبر کئی خواتین میں بٹ گیا، جو اکثر اسے کیک، مٹھائی، حلوے یا چھوٹی موٹی پارٹیوں کے آرڈر دیتی رہتی تھیں۔

اس کے جہیز کے بڑے بڑے پتیلے اور دوسرے برتن وغیرہ جو ایسے ہی پیک پڑے تھے، وہ ایسے کون پر ان کے بہت کام آئے اور دھیرے دھیرے اس کے پاس ٹھیک ٹھاک رقم بھی جمع ہونا شروع ہوگئی ــــ جس میں سے وہ خالدہ آنٹی کا حصہ الگ کر کے ان کو پہنچا دیتی تھی، جہاں وہ اپنی اس روٹین سے خوش تھی، وہیں اس بات کا بھی دھڑکا لگا رہتا کہ جب نمیر کو اس بارے میں پتا چلے گا تو جانے اس کا ردِ عمل کیا ہوگا۔ وہ اپنے چھوٹے سے بزنس کے بارے میں بتانے کے لیے مناسب موقع ڈھونڈ رہی تھی جو ابھی تک اسے نہیں مل پایا تھا۔

ان دنوں نمیر کے دفتر میں کلوزنگ چل رہی تھی، وہ آفس کے کاموں میں اتنا مصروف تھا کہ، اس لیے ان باتوں کی خبر نہیں ہو پائی اور وہ کچھ محتاط بھی تھی اسی لیے بہت خفیہ انداز میں شوہر کے دفتر جانے کے بعد ہی اپنے آرڈر کی تیاری کا کام کر کے بھجواتی تھی۔

جو بھی تھا اسے نمیر سے بہت پیار تھا اور شوہر کی نافرمانی کرنے پر خود کو روزانہ ملامت کرتے ہوئے پیچھے ہٹنے کا سوچتی مگر پھر گھر کا اکیلا پن اور کلائنٹ کی جانب سے ملنے والی پذیرائی اس کا حوصلہ بلند کر دیتی اور وہ دوبارہ اپنے کاموں میں مگن ہو جاتی۔

☆☆☆

اس دن نمیر کی کولیگ صائمہ کی برتھ ڈے تھی۔ اس نے اپنے چند قریبی ساتھیوں کو گھر پر لنچ کی دعوت دی۔ وہ سب لنچ ٹائم میں ایک ساتھ آفس سے اٹھے اور اس کے گھر پہنچ کر گرما گرم کھانے پر دھاوا بول دیا۔ بریانی اور چکن کڑھائی کھاتے ہوئے جانے کیوں نمیر کو ذائقہ بہت جانا پہچانا سا لگا۔

کھانے کے بعد قہوہ پیتے ہوئے صائمہ نے سب کے سامنے کپ کیک کی ٹرے لا کر رکھی تو چکھتے ہی، ان سب کے منہ سے بے ساختہ تعریف نکل گئی۔

''یہ تو بہت مزیدار ہیں کہاں سے منگوائے۔'' نمیر نے مسکرا کر صائمہ سے پوچھا۔

''ارے بھئی، کسی بڑی بیکری سے نہیں منگوائے ہیں بلکہ ایک لڑکی نے بنائے ہیں۔'' صائمہ نے بتایا۔

ہے۔'' فرحین نے دوسرا کپ کیک پلیٹ میں رکھتے ہوئے تعریف کی۔

''اس بار میں نے کسی ریسٹورنٹ سے کھانا منگوانے کے بجائے اسے ہی آرڈر دیا اور دیکھو، ساری چیزیں لاجواب ہیں، اس کے ہاتھ میں نہ صرف ذائقہ ہے بلکہ وہ کھانے کی پریزنٹیشن بھی اتنی اچھی کرتی ہے کہ دیکھنے والے کے منہ میں فوراً ہی پانی آجاتا ہے۔'' صائمہ نے بڑی تفصیل سے بتایا۔

''واقعی میں۔ ہر چیز پرفیکٹ ہے۔'' ایک اور کولیگ نے سر ہلا کر مثبت رائے دی۔

''ہاں بھئی، سمجھو وہ فرشتہ ہے فرشتہ، انتہائی مناسب ریٹ پر صاف ستھرا ذائقے دار کھانا وقت پر تیار مل جائے تو ہماری جیسی ورکنگ لیڈیز کے لیے اس سے زیادہ اور کیا آسانی ہوگی۔ میرے دل سے تو سچ مچ میں بہت دعائیں نکلی۔'' صائمہ نے کھلے دل سے تعریف کی۔

''ویسے کون ہے یہ لڑکی؟'' نمیر کی چھٹی حس بیدار ہوئی دھیرے سے کریدا۔

''میں اسے ذاتی طور پر تو نہیں جانتی مگر اپنی فرینڈ کے توسط سے اس کا نمبر ملا تھا، وہ اپنے گھر سے کیٹرنگ کرتی ہے۔'' اس نے قہوے کی پیالیاں سمیٹتے ہوئے بتایا۔

''اچھا کیا۔ اس کا کوئی کارڈ وغیرہ ہے؟'' فرحین نے تجسس سے پوچھا، اگلے ہفتے اسے ذرا بڑے پیمانے پر اپنے سسرال والوں کی دعوت کرنی تھی، اس لیے فوراً ہی اسے آرڈر دینے کا سوچا۔

''نہیں یار! مجھے تو بس اس کا نمبر ملا تھا، میں نے فون پر آرڈر دے دیا۔ اس نے کھانا پکا کر پیک کر کے نواز انکل کے ہاتھ بھجوادیا۔ اس کے پڑوسی ہیں، اضافی ڈیلیوری چارج لے کر کھانا گھر گھر پہنچا دیتے ہیں۔'' صائمہ کے تفصیل بتانے پر نمیر نے ڈرتے ڈرتے اپنی کولیگ سے کیٹرنگ والی کا نمبر مانگا تو اس کا خدشہ ٹھیک نکلا، وہ کسی اور کا نہیں بلکہ اس

کے پاس سے اٹھ گیا اور گھر لوٹ آیا۔

☆☆☆

ڈور بیل بجنے پر کہکشاں نے دروازہ کھولا تو خلاف توقع شوہر کو وقت سے پہلے گھر آتا دیکھ کر خوش ہوگئی۔

''ارے۔ آج آپ جلدی آگئے؟'' اس نے بھرپور مسکراہٹ سے نمیر کا استقبال کیا۔

''اچھا نہیں لگا۔ واپس چلا جاؤں؟'' وہ تھوڑے خشک انداز میں بولا۔

''توبہ ہے۔ چلیں۔ اندر آئیں۔'' وہ اس کے اندر ابلتے لاوے سے بے خبر تھی مسکرا کر بیگ تھام لیا۔

اس کی آج کیٹرنگ تھی۔ صبح سے کچن میں مصروف ہونے کی وجہ سے حلیہ کافی خراب ہو رہا تھا۔ چائے کا پانی رکھ کر اپنا آپ دیکھا اور وہ چولہا ہلکا کر کے، جلدی سے باتھ روم میں گھس گئی۔ فریش ہو کر، اپنا جہیز کا بلو راسلک کا کرتا پہنا، لبوں پہ ہلکی سی لپ اسٹک لگانے کے بعد لمبے بالوں کو پشت پر ایسے ہی کھلا چھوڑ دیا۔

نمیر خلاف معمول چپ چپ سا ٹی وی کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے تھکن پر محمول کیا اور دو کپوں میں چائے نکالنے کے بعد کچھ سوچ کر مائیکرو ویو میں رکھے کپ کیک پلیٹ میں سجائے مسکراتی ہوئی لاؤنج میں چلی آئی۔

''تم نے کپ کیک۔ بہت مزے کے بنائے ہیں۔'' اس نے کھائے بغیر تعریف کی۔

''آپ کو کیسے پتا چلا؟'' کاشی نے چونک کر شوہر کو دیکھا دل کا چور زور سے اچھلنے کودنے لگا۔

''ارے یار۔ اس کی ٹاپنگ بتا رہی ہے۔'' نمیر کے جواب دینے پر کاشی نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے چائے کا سپ لیا۔

''ویسے کیسا عجیب اتفاق ہے نا، میری کولیگ صائمہ کی برتھ ڈے پر بھی میں نے ایسا ہی کپ کیک

کا چہرہ فق ہوگیا۔

"منہ میں رکھتے ہی تمہارے ہاتھ کا ذائقہ یاد آگیا۔" نمیر کے مزید جتانے پر، کاشی کو بہت زور کا پھندا لگا۔

"ایک منٹ۔ میں پانی لاتا ہوں۔" وہ اس کے کھانسنے پر پریشان ہو کر کچن کی جانب دوڑا۔

کاشی کو یاد آیا کہ صبح صائمہ نامی خاتون کا ہی تو آرڈر اس نے پیک کر کے بھجوایا تھا، اب اسے کیا پتا تھا کہ قسمت سے وہ نمیر کی کولیگ نکل آئے گی۔

"تھینک یو......" اس نے نمیر کے ہاتھ سے پانی کا گلاس لے کر دھیرے سے کہا۔

"یو ویلکم مائی وائف۔" اس کے پیار بھرے انداز میں بھی اسے طنز کی آمیزش محسوس ہوئی۔

پانی کا گلاس اسے واپس پکڑانے کے بعد وہ مجرموں کی طرح سر جھکائے بیٹھی رہی۔ انتظار تھا کہ نمیر کب اس پر چیخے چلائے گا مگر حیرت کی بات تو یہ ہوئی کہ اس کے بعد نمیر نے مزید ایک لفظ بھی منہ سے نہیں نکالا، بلکہ ہلکے پھلکے انداز میں ادھر ادھر کی باتیں کرتے ہوئے ڈنر کیا اور پھر وہ دونوں سونے چلے گئے۔ پورے وقت وہ غائب دماغی سے سوچتی رہی کہ "کیا اسے سب کچھ پتا چل گیا ہے۔"

☆☆☆

چھٹی کا دن تھا چہار سو خاموشی چھائی ہوئی تھی، نمیر ابھی تک بیڈ پر پڑا سو رہا تھا۔ کاشی چپکے سے بستر سے نکلی اور فجر کی نماز پڑھنے کے بعد کچن کی جانب قدم بڑھائے۔ اسے کل رات ہی اچانک اپنی ایک پرانی کسٹمر سلمیٰ کی کال آئی تھی، جنہیں ارجنٹ شوگر فری مٹھائی چاہیے تھی۔ پہلے تو اس نے انکار کر دیا مگر پھر ان کے بے انتہا اصرار پر مجبوراً راضی ہونا پڑا۔ وہ نمیر کے جاگنے سے پہلے اپنا سارا کام مکمل کرنا چاہتی تھی تاکہ کچن صاف کر کے اس کے لیے ناشتا بنائے، اسی لیے اس کے ہاتھ بڑی تیزی سے چل رہے تھے۔

نے اچھی طرح سے پلاسٹک سے ریپ کیا اب وہ کھڑی کیبنٹ میں سے کوئی چھوٹا پلاسٹک بیگ ڈھونڈ رہی تھی تاکہ باکس اس میں رکھ کر پڑوس میں ڈیلیوری کے لیے دے آئے۔

اس کی کیٹرنگ، انکل نواز کو آگے سپلائی دینے جانا ہوتا تھا۔ دونوں میاں بیوی اس کے لیے گوشت، سبزیوں کی شاپنگ کے ساتھ دوسرے بہت سارے کاموں میں مددگار بن گئے تھے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد انہیں معقول آمدنی ہونے لگی تھی جس سے وہ بہت خوش تھے اور اس طرح سے کاشی کو بھی گھر سے باہر قدم نہیں نکالنے پڑتے تھے۔

"افوہ۔ اب یہ خالی بیگ کہاں چلے گئے، ویسے ہی دیر ہوگئی ہے؟" اس نے پورا کیبنٹ چھان مارا مگر وہاں ایک بھی پلاسٹک بیگ نہیں ملا تو جھنجھلاتے ہوئے خود کلامی کی۔

"میں نے اٹھا کر ڈسٹ بن میں پھینک دیے ہیں...... آئندہ سے تم اس پیپر بیگ میں رکھ کر اپنا آرڈر ڈیلیور کرو گی۔" نمیر کی آواز پر وہ ایک دم ششدر ہو کر مڑی۔

"آپ...... یہاں؟" وہ فق سی اسے دیکھتی چلی گئی۔

"افوہ دیر مت کرو، اب جا کر اسے خالدہ آنٹی کو دے آؤ۔" اس نے پارسل بیوی کو پکڑایا، مٹھائی کا ڈبہ کاغذ کے پرنٹ والے بیگ میں رکھا ہوا تھا جس پر "کاشیز فوڈ" چھپا ہوا تھا۔

"یہ...... کیا ہے نمیر؟" اس نے بیگ تھامے بغیر گھبرا کر پوچھا۔ اس کی حالت سے محظوظ ہوتے ہوئے نمیر خود ہی پارسل برابر میں جا کر دے آیا۔

☆☆☆

کہکشاں کے ہاتھ پاؤں کی لرزش کسی بھی طرح کم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی، نمیر کو بیوی کی حالت پر بہت ترس آیا، اس نے کاشی کو بازوؤں سے تھام کر صوفے پر بٹھایا اور نرمی سے بولا۔

"ادھر بیٹھو اور میری بات سنو۔"
"جی...... کہیں؟" وہ بری طرح خوف زدہ تھی۔
"کھانا پکانا تمہارا شوق ہے ناں؟" اس نے پوچھا۔
"ہاں مجھے شروع سے ہی بہت شوق تھا اور میں نے اس کی باقاعدہ ڈگری بھی لی ہے۔" وہ بے اختیار بولی۔
"اور اب تم نے اپنے بنائے ہوئے کھانوں کو بیچنا بھی شروع کر دیا ہے؟" اس کے لہجے میں تھوڑی سختی آئی تو کاشی نے سر جھکا لیا۔
"کب سے چل رہا ہے یہ سب؟" نمیر نے انگلی سے اس کا چہرہ اوپر کیا اور آنکھوں میں دیکھ کر پوچھا۔
"وہ...... ابھی۔ چند دن پہلے ہی سے شروع کیا ہے۔" کاشی نے نگاہیں چرائیں۔
"صرف...... چند دن پہلے...... پکا۔ ناں؟" اس نے مسکرا کر جھوٹ پکڑا۔
"میرا مطلب ہے...... چند مہینے ہی ہوئے ہیں، میں...... بس آپ کو بتانے ہی والی تھی مگر......" وہ شرمندگی کے مارے بات پوری نہ کر سکی۔
"جان ایک بار مجھ سے شیئر تو کیا ہوتا۔ تو شاید یہ کام زیادہ اچھے طریقے سے ہو جاتا۔" اس نے کاشی کا ہاتھ تھام کر نرمی سے کہا۔
"مجھے معاف کر دیں نمیر! مگر یہ سب اچانک ہی ہوا ہے مگر میں نے آپ کے حکم کے مطابق گھر سے باہر قدم نہیں نکالا، بس کھانا پکاتی تھی، باقی باہر کا سارا کام خالدہ آنٹی اور نواز انکل نے سنبھالا ہوا ہے۔" وہ ایک دم روتے ہوئے اپنی صفائی دیتی چلی گئی۔
"نہیں یار! معافی تو مجھے مانگنی چاہیے جو یہ بات سمجھ ہی نہیں سکا کہ میری بیوی کو اس کام سے کتنی خوشی حاصل ہوتی ہے۔" نمیر نے اس کے گالوں سے بہتے آنسوؤں کو ٹشو سے پونچھا۔
"پلیز...... آپ کہیں گے تو میں سب کچھ ختم کر دوں گی۔ آئندہ ایک آرڈر بھی نہیں لوں گی۔" وہ

اس طرح سے معافی تلافی پر اتر آئی تو نمیر کے دل میں اس کا پیار مزید بڑھ گیا۔

"مجھے افسوس تمہارے بزنس شروع کرنے کا نہیں بلکہ اس بات کا ہے کہ میری بیوی چند مہینوں سے اپنا کام کر رہی ہے اور ڈھنگ سے ایک کارڈ تک نہیں چھپوا سکی" اس کے کہنے پر وہ رونا بھول کر سر اٹھا کر اسے معصومیت سے تکنے لگی۔

"ہیں...... کیا مطلب...... کارڈ...... کیا کہہ رہے ہیں۔ آپ؟"

"ہاں۔ بھئی...... آخر ہر کام کا ایک طریقہ ہوتا ہے۔" وہ مسکرایا تو اس کی جان میں جان واپس آئی۔

"نمیر! آپ ناراض نہیں ہیں۔" اسے تو جیسے دنیا مل گئی، شوہر کا ہاتھ تھام کر سوالیہ انداز میں دیکھا۔

"اچھا۔ سنو تو...... میں نے تمہارے لیے بیگ پرنٹ کروائے ہیں اور ساتھ ہی کچھ کارڈ بھی چھپوادیے ہیں، آج کے بعد سے تم اپنے کلائنٹس کو باقاعدہ کارڈ دینا جس پر فون نمبر اور ایڈریس چھپا ہوا ہے تاکہ دنیا کو پتا تو چلے نمیر علی خان کی بیوی کا بزنس ہے، کوئی مذاق تھوڑی ہے۔" اس نے ہلکے پھلکے انداز میں اسے اپنے ساتھ لگاتے ہوئے کہا تو وہ اس کے کاندھے سے سر ٹکا کر شانت ہوگئی۔

☆☆☆

کہکشاں جو ہمیشہ سے خود کو ماہر سمجھتی تھی، اب جا کر اسے سمجھ میں آیا اصل مہارت کیا ہوتی ہے، اگر اس کے والدین کی ماہر نگاہوں نے نمیر جیسے ہیرے کو اس کے لیے نہیں چنا ہوتا تو زندگی اتنی خوش گوار نہیں ہوتی، اسے اکثر اپنی اماں بابا کی مہارت پر پیار آتا، انہوں نے نمیر جیسا پیارا شخص اس کی زندگی کا ساتھی بنایا، جس کے لیے اس کی انا سے زیادہ بیوی کی چاہت اہم تھی۔

"کہاں کھوئی ہوئی ہو۔ یہ لو تمہاری فیورٹ آئس کریم۔" وہ اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا تو کاشی ماضی سے حال میں واپس چلی آئی۔

کہکشاں نے شوہر کے ساتھ جا کر شوروم سے کچھ اپنے جمع شدہ اور باقی نمیر کے ملائے ہوئے پیسوں سے چھوٹی سی گاڑی خرید لی تاکہ وہ خود بھی کبھی بازار کا چکر لگا سکے۔ وہ آج کل روزانہ نمیر سے ڈرائیونگ سیکھ رہی تھی۔

گاڑی صاف شفاف سڑک پر چلاتے ہوئے اسے کارنر پر اپنا فیورٹ آئس کریم پارلر نظر آیا تو اس نے گاڑی لے جا کر اس کے سامنے روک دی اور شرارتی نگاہوں سے شوہر کو دیکھا۔ نمیر کاندھے اچکاتا ہوا گاڑی سے اتر کر آئس کریم خریدنے چلا گیا۔

"ایک بات پوچھوں؟" اس نے مزے سے نمیر کے آئس کریم کپ سے چمچہ بھر کر منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں بھئی، بیگم صاحبہ پوچھیں۔ آپ کو کبھی کوئی روک سکا ہے۔" اس نے ہنس کر چھیڑا۔

"پہلے تو آپ میرے گھر سے کام کرنے کے بہت خلاف تھے، پھر اچانک......" اس نے جان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑ دی۔

"دیکھو ڈارلنگ! جب تم نے کیٹرنگ کی بات کی تھی میں نہیں چاہتا تھا کہ میری بیوی ان سب باتوں میں الجھ کر خود کو پریشانی میں ڈالے مگر پھر جب میں نے اپنی کولیگ کے یہاں تمہارے کھانوں کی تعریف سنی تو احساس ہوا کہ نمیر علی سے ہٹ کر بھی کہکشاں کی اپنی ایک پہچان ہے جو اس نے اپنے ٹیلنٹ کے بل بوتے پر بنائی ہے۔ بس فیصلہ کر لیا کہ تمہیں اس چیز کا حق حاصل ہے، کہ اپنی مرضی کا کام کرو۔" اس نے مسکرا کر پوری بات بتائی۔

"اوہ...... نمیر...... یو آر رئیلی آ جنٹلمین۔" اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"اس لیے محترمہ! میں بھی آپ کے کاموں میں شامل رہوں گا، جب بھی میری مدد چاہیے ہو، کہہ دینا بندہ حاضر ہو جائے گا۔" نمیر نے بیوی کی چھوٹی سی ناک پیار سے دبا کر آفر کی تو کہکشاں کے چہرے سے پھوٹتی خوشی اس کے اپنے وجود میں پھیلتی چلی گئی۔

☆



ہاجرہ ریحان

سفر مبارک

"میں اچھی طرح سمجھتی ہوں...... یہ سب اس کتنی نے سکھایا ہے ناں...... ارے وہی تھی...... وہی تھی اس خاندان کی دشمن...... جب سے اس کے قدم اس گھر میں پڑے ہیں...... تباہی ہی مچائی اس نے...... اللہ کا شکر ہے جان چھوٹی، بری بلا بن کر چمٹ گئی تھی...... پورے خاندان کے بڑے کیا بچوں

تک کا بیڑا غرق کر کے رکھ دیا...... جس کو دیکھو منہ اٹھائے اسی کی طرف بھاگتا چلا جاتا تھا...... ایسی بھی کیا انوکھی بیاہ کر آئی تھی جو سب کی مت ہی مر جاتی تھی اس کے آگے...... اور ابھی بھی کوئی بدلاؤ کہاں آیا ہے ارے جو کہہ گئی کرتے چلے جاؤ گے؟ اپنی عقل استعمال نہیں کرو گے؟ بولتے کیوں نہیں؟''

امی جان کب سے اپنی بھاوج کی شان میں زمین آسمان ایک کر رہی تھیں، ہم تینوں بھائی بہن ایک دوسرے کو نظروں ہی نظروں میں، پی جا ایام کی تلخی کو بھی ہنس کر نا صبر، جیسی تلقین کر رہے تھے......

☆☆☆

کس قدر عجیب بات ہے...... ماں باپ جان ہی نہیں پاتے کہ کب ان کے گودوں کے کھلائے معصوم سیدھے سادے بچے بڑے ہو گئے ہیں، اب وہ دنیا جہاں کی عقل رکھنے لگے ہیں نہ تو وہ رات میں بھوت کا تذکرہ سن کر آنکھیں میچتے ہیں اور نہ ہی والدین کی نظر میں کسی ناپسندیدہ رشتہ دار کو دیکھ کر آنکھیں پھیرتے ہیں...... وہ اب خود اس قدر سمجھ دار ہو چلے ہیں کہ کون ان سے کتنا مخلص ہے اور کون ان کو محض استعمال کرنا چاہ رہا ہے...... سب سمجھ لیتے ہیں......

افسوس جان بھی ایسی ہی انجان نادان والدہ تھیں اور ہم تینوں کے پاس اس کے سوا چارہ نہیں تھا کہ ان کے منہ سے ممانی جان کی تعریف ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال باہر کریں...... کیونکہ یہ بات طے تھی کہ ممانی جان جو کہتی تھیں جو بھی مشورہ دیتی تھیں وہ ہمارے اچھے کے لیے ہوتا تھا......

خاندان کا سب سے پہلا اور بڑا بچہ ہونے کے باعث مجھے ممانی جان کا ہمارے خاندان میں شامل ہونا اچھی طرح یاد ہے...... یہ بھی یاد ہے کہ ممانی جان کے گھر میں قدم پڑنے سے پہلے ہماری ہی امی جان صبح و شام ممانی جان اور ان کے اعلا خاندان کی تعریف ہر آنے جانے والے سے کرتی تھیں اس وقت تو امی جان کو ممانی جان کا لنگڑا پن بھی کچھ برا نہ لگتا۔

ماموں جان، امی جان سے دو سال چھوٹے تھے مگر ہمیشہ بڑے بھائیوں کی طرح ان کے سر پر دست شفقت رکھتے تھے...... ہمارے والد کے انتقال کے بعد سے تو ماموں جان نے جیسے اپنا معمول ہی بنا لیا تھا کہ ہر ماہ ہمارے اسکولوں کی فیس، گھر کا راشن، اس کے علاوہ گرمی سردی میں کپڑے لتے دلاتے رہتے۔ حالانکہ ابو جان کی پنشن اتنی تھی کہ امی جان اس سے تھوڑا ہاتھ ہلکا رکھ کر مہینہ بھر اچھا چلا سکتی تھیں مگر امی جان کو بھی جیسے ماموں جان سے اپنے اور اپنے بچوں کے لیے یہ سب کروانا اچھا لگتا تھا...... جسے وہ بہن کا مان کہتیں...... جب حکومت کی طرف سے گھر خالی کرنے کا موقع آیا تو ممانی جان جو کہ اپنی حالت کے باعث بہت ہی کم گھر سے باہر نکلتی تھیں باقاعدہ ماموں جان کے ساتھ آ کر بہت ہی عزت و احترام کے ساتھ امی جان اور ہم سب کو اپنے ساتھ اپنے گھر لے گئیں...... جہاں چند دنوں ایک ہی منزل میں رہنے کے بعد ہمیں ماموں جان نے اوپری منزل بنوا دی اور یوں ہم تینوں بہن بھائی الگ ہو کے بھی تقریباً سارا دن ہی ممانی جان کے ساتھ گزارنے لگے......

شروع میں تو امی جان کو بالکل بھی برا نہیں لگتا...... اسکول سے آتے ہی گھر پر یونیفارم بدل کر ہم تینوں نیچے اتر جاتے...... ممانی جان کے والدین کے زمانے سے رکھے گئے باورچی فضلو بابا نے ہم تینوں کے لیے دوپہر میں کھانے پینے کا اچھا انتظام کیا ہوتا خوب ڈٹ کر کھاتے اور پھر ممانی جان کچھ دیر اسکول کی پڑھائی کے بارے میں پوچھ کر قرآن شریف کی تعلیم شروع کرتیں...... اس سے فارغ ہوتے تو شام کی چائے پر بسکٹ، سموسے، پکوڑے ملتے اور پھر شام کو نیچے ہی صحن میں کھیل کود کر اسکول ہوم ورک کروایا جاتا اور پھر رات کا کھانا کھا کر ہی

اوپر جاتے...... شاید ہی ایسا کوئی دن ہوتا تھا کہ امی جان کو ہماری فکر لاحق ہو اور وہ ہمیں جلدی اوپر آنے کا کہیں...... اکثر ہم میں سے کسی کی طبیعت خراب ہوتی تو ممانی جان ہی ڈاکٹر دوائی کا انتظام کرتیں......

اس وقت تو خیال نہیں آتا تھا مگر اب احساس ہوتا ہے کہ اوپر کی منزل میں باورچی خانہ ہونے کے باوجود امی جان کا کھانا بھی ہمیشہ نیچے سے اوپر جاتا تھا...... ایسے میں کوئی رشتہ دار آ جاتا تو دکھاوے کے لیے امی جان اس کو اوپر لے جاتیں مگر ناشتہ پانی اس کا بھی ممانی جان کے باورچی خانے سے ہی کیا جاتا تھا......

☆☆☆

ماموں جان، ابو جان کی طرح حکومتی ادارے میں اچھی پوسٹ پر ملازمت کرتے تھے اور اکثر کہتے سنائی دیتے کہ میں حرام نہیں کھاتا اور ایسی نوکری کی حلال کمائی میں دو گھروں کو سنبھالنا...... ان اکیلے کی تنخواہ کے بس کی بات تھی یا نہیں، یہ تو میرا ننھا ذہن اس وقت سمجھ نہ پاتا مگر میں یہ ضرور دیکھتا تھا کہ خاندان میں کسی کی بھی شادی ہو...... انتقال ہو...... کسی کے ہاں ولادت ہو یا برسی...... ماموں جان کو باقاعدہ بہت اہتمام سے بلایا جاتا تھا...... ان کو ہر معاملے میں سب سے آگے رکھا جاتا تھا...... کیونکہ ان کی ہم قدم ہمیشہ ممانی جان ہوتی تھیں......

بہت بعد میں مجھے سمجھ میں آیا کہ ان خاندانی لین دین میں دراصل ممانی جان مطلوب تھیں ماموں جان تو صرف حکایت پوری کرنے جاتے تھے اور یہاں دین ہی دین تھا...... لین تو تھا ہی نہیں...... ممانی جان کے ہاں کوئی اولاد ہی نہیں تھی...... وہ خاندان بھر کے بچوں کی سالگرہ یاد رکھ کر ان کو تحائف دیتیں...... پڑھائی کا سال مکمل کرنے پر بھی لفافے میں بند رقم انعام کے طور پر پکڑا دیتیں...... اس کے علاوہ ان کے ہاں جب بھی کوئی رشتہ دار اپنے کسی بچے کو ساتھ لاتا تو بچے کی قسمت جیسے کھل جاتی واپسی پر اس کی پسند کی کوئی نہ کوئی چاکلیٹ یا کھلونا ضرور اس کے ساتھ ہوتا...... اسی لیے شاید ہمارے خاندان میں ہر بچے کی پسندیدہ جگہ ممانی جان کا گھر اور پسندیدہ شخصیت ممانی جان تھیں......

پھر یوں بھی ہوتا کہ ایک ساتھ تین چار شادیوں، منگنیوں، برسی یا سالگرہ کو نمٹانے کے بعد یعنی کے خوب خرچا کر لینے کے بعد ممانی جان کچھ دنوں کے لیے زمانے سے پردہ کر لیتیں...... اور کچھ مہینوں کے لیے سوائے ہم تینوں بھائی بہن کے ممانی جان سے کوئی بھی ملنے نہ پاتا اور اگر کوئی زبردستی آ ہی جاتا تو اسے امی جان کے پاس اوپر روانہ کر دیا جاتا......

مجھے اس وقت ممانی جان پر بے حد ترس آتا کیونکہ امی جان اسی زمانے میں آنے والوں کے ساتھ مل کر ممانی جان کی شان میں زمین آسمان ایک کرنے لگتیں اور باریابی نہ ملنے پر رشتہ دار بھی پچھلے تمام احسانات بھول کر فوراً ممانی جان کے خلاف امی جان کے ساتھ مل جاتے۔

"ارے بڑی گھنی ہے...... طبیعت خراب تھوڑی ہے...... مکاری کر رہی ہے...... ارے چھوڑو...... میں تو اپنے بھائی کی قسمت کو روتی ہوں...... میرا اتنا اسمارٹ ہینڈسم بھائی...... دیکھو ناں بے اولاد مر جائے گا...... اوپر سے نفسیاتی بھی ہے...... ایسے ایسے قنوطیت کے دورے پڑتے ہیں کیا بتاؤں...... ارے مجھے دیکھو میں بھی تو شوہر کے بغیر اپنے یتیم بچوں کو ہمت سے سنبھال رہی ہوں...... اس کی طرح کوئی منہ لپیٹ کر بیٹھی ہوں...... مجال ہے کسی کو پاس بھی بھٹکنے دے...... میں تو بچوں کو بھی روکتی ہوں ایسے میں نہ جایا کریں نیچے اللہ جانے کیسا دورہ پڑ جائے کوئی بھروسا ہوتا ہے نفسیاتی لوگوں کا......؟

یہ سنتے کے ساتھ ہی جیسے مجھے پتنگے لگ جاتے میں رات دن شام دیکھے بنا جھٹ ممانی جان کے پاس پہنچ جاتا اور دیکھتا بقول امی جان وہ نفسیاتی

خاتون اپنے ٹیپ ریکارڈ پر ہلکے سروں کی غزلیں لگائے ...... سر جھکائے کچھ لکھ رہی ہیں یا پھر سامنے رکھے کینوس پر خوب صورت سا کوئی منظر پینٹ کر رہی ہیں...... مجھے بڑا تعجب ہوتا کیونکہ امی جان کی نفسیات کی تعریف ممانی جان پر بالکل بھی ٹھیک نہ بیٹھتی تھی...... میں ان کو غور غور سے دیکھنے لگتا تو وہ بھی چونک — جاتیں......

"کیا ہوا؟ کوئی کام؟" ممانی جان کے پوچھنے پر میں گڑبڑا جاتا......

"آپ...... آپ ٹھیک ہیں ناں؟"

میں شاید ایسا ہی کوئی ادھورا آدھا سا سوال کر پاتا اور بچہ ہونے کے باوجود ان کی گہری آنکھوں میں اترتی نمی کو محسوس کر لیتا......

ایک معصوم چھوٹے بچے سے اس کی پسندیدہ شخصیت کا خاکہ تیار کرنے کو کہا جائے تو اکثر وہ اجڑے بال، چھوٹی چھوٹی آنکھیں، موٹی ناک اور بھدا موٹا جسم بنا کر آپ کو اس یقین کے ساتھ دکھائے گا جیسے وہ دنیا کی کوئی حسین ترین شخصیت کا پردہ آپ کے سامنے کھول رہا ہے...... آپ حیران رہ جاتے ہیں...... اس تصویر کے اعتبار سے اس شخصیت میں ایسی کیا بات ہے جو بچے کو اس کا گرویدہ کر گئی ہے...... یہ بات بچہ نہیں بتا سکتا......

یہ تو ہم بڑے ہونے کے بعد سمجھتے ہیں کہ کیوں ہمیں اپنی ماں ہی سب سے خوب صورت حسین لگتی تھی کیوں ہمیں اپنا باپ ہی دنیا کا اسمارٹ ترین شخص محسوس ہوتا تھا...... لہٰذا میں بچپن میں ممانی جان کے نازک سراپے اور چمک دار لمبے بالوں سے اکثر آدھا ڈھکے ان کے سیدھے شانوں کے درمیان لمبی گردن پر دھرے تیکھے نقوش والے چہرے پر فریفتہ نہیں تھا...... بلکہ مجھے ان کی گہری کالی آنکھوں کی نمی دیکھنے کا جنون تھا...... جو باتوں ہی باتوں میں ہم تینوں بھائی بہن کی کسی بات یا شرارت پر اچانک ان کی آنکھوں میں بھرتی اور چند ہی لمحوں میں غائب ہو جاتی۔

چند ہی دنوں بعد ممانی جان پھر سے ملنے ملانے لگتیں...... ان کے ہاں رشتہ داروں کا ویسا ہی آنا جانا لگ جاتا......

★ ★ ★

وقت گزرتا گیا اور ہم سب بڑے ہو گئے۔ میں نے اے سی سی اے میں اچھے گریڈ سے کامیابی حاصل کر لی اور ایک اچھی فرم میں اچھی تنخواہ پر اکاؤنٹنٹ لگ گیا۔ امتحان میں کامیابی پر ممانی جان کی طرف سے انعام کے طور پر اسکوٹر مل گئی اب تو وارے نیارے ہو گئے...... نئی نئی جاب اور کچھ خود پر مان جیسے پیر زمین پر ہی نہ لگتے...... اکثر اوقات گھر سے باہر رہتا......

ماموں جان اب دورے پر شہر سے باہر جانے لگے تھے اور اکثر اوقات ممانی جان فضلو بابا کے بڑھاپے کے باعث خود بھی باورچی خانے اور گھر کے کاموں میں لگی رہتیں......

میں ایک دن گھوم پھر کر شام ڈھلے گھر پہنچا تو امی جان کا پارہ چڑھا ہوا پایا...... وہ اب اکثر ہی چھوٹی بہن شرمیلا کو کسی نہ کسی بات پر ڈانٹ رہی ہوتی تھیں۔ شرمیلا شروع سے ہی ہم دونوں بھائیوں کے ساتھ ساتھ رہتی تھی لہٰذا اکثر اوقات وہ تو کیا ہم سب ہی بھول جاتے کہ وہ لڑکا نہیں لڑکی ہے...... بات بھی لڑکوں کے انداز میں، کرتا ہوں، کروں گا، کرتی اور جب اس کو کسی کام کا کہا جاتا تب تو ایسا بے ڈھنگا پن کر کے دکھاتی کہ کام کہنے والا اپنا سر پیٹ لے......

میں نے اسے معمول کی بات سمجھ کر اپنے کمرے کی راہ لینا چاہی تو چھوٹا بھائی سر پر آ پہنچا......

"کیا کرنا ہے پھر...... بولیں؟"

بھائی کے پوچھنے پر میں بے خیال میں ہاتھ ہلا کر اسے دور فٹ کرنا ہی چاہتا تھا کہ اچانک امی جان زور زور سے ہم دونوں بھائیوں کو آواز دینے لگیں۔ ناچار ہم دونوں ان کے حضور جا پہنچے۔

"حرکت دیکھی تم نے اپنی چھوٹی بہن کی......

پھر نیچے بھاگ گئی...... ارے کیا کروں اس لڑکی کا میں؟ کیا ہوگا اس کا؟"

"امی جان ٹھیک ہی تو ہے۔ ممانی جان کی طبیعت بہت خراب ہے ان کے پاس کوئی تو رہے اور آپ بھی تو جا سکتی ہیں ناں؟" چھوٹا بھائی منمنایا۔

"کیا کہا تم نے ...... یہ سکھا کر بھیجا ہے اس نے۔ اب میں جاؤں مہارانی کی خدمت کرنے؟ ارے اپنی ماں سے ایسی بات کرتے شرم نہیں آئی۔ غیرت نہیں آئی تم کو؟"

اب مجھے موقع کی نزاکت کا احساس ہوا......

"ممانی جان کی طبیعت صبح سے خراب ہے بہت تیز بخار ہے۔ شرمیلا اسی لیے ان کے پاس تھی انہوں نے ضد کی کہ بخار کی دوائی کھالی ہے بخار اتر جائے گا مگر ابھی شرمیلا نے تھرمامیٹر لا کر دکھایا بخار اور تیز ہو گیا ہے...... ڈاکٹر کو لانا ہوگا۔"

میری سوالیہ نگاہوں پر چھوٹا بھائی جلدی جلدی کہہ گیا کہ کہیں پھر امی جان اپنی طرف نہ متوجہ کر لیں۔

چھوٹے بھائی کی بات پر امی جان پھر سے طیش میں آنے لگیں تو میں بھاگم بھاگ باہر نکل آیا...... چھوٹا بھائی سمجھ گیا تھا کہ میں محلے کے ڈاکٹر کو لینے جا رہا ہوں جو اکثر اپنے کلینک جانے سے پہلے محلے کے چند ایک مریضوں کو ان کے گھر پر دیکھ لیتے تھے...... ڈاکٹر صاحب چند ہی منٹوں میں دستیاب ہو گئے ان کے کلینک جانے کا وقت ہو گیا تھا...... ان کو لے کر گھر پہنچا تو اب کی بار چھوٹا بھائی بھی نیچے ملا...... شرمیلا ڈاکٹر صاحب کو لے کر ممانی جان کے کمرے میں چلی گئی اور ہم دونوں بھائی باہر ہی کھڑے رہے......

کئی دنوں سے اب ہم ممانی جان کے سمجھانے پر ان کے کمرے میں بچپن کی طرح ہر وقت اور بلاجھجک نہیں جاتے تھے بلکہ اکثر ان کے کمرے کے دروازے پر کھڑے ہو کر آواز دے کر باہر بلا لیتے۔ جبکہ شرمیلا کو ابھی بھی کوئی روک ٹوک نہ تھی۔

کا ایک پرچہ پکڑا دیا اور اپنا ازلی جملہ دہرا دیا۔

"یہ وائرس تو آج کل پھیلا ہوا ہے دو چار دنوں کی احتیاط اور دوائی کے باقاعدہ استعمال سے بخار اتر جائے گا...... پریشانی کی کوئی بات نہیں۔"

اب ان کو کیا کہا جائے کہ یہ وائرس ممانی جان کو لگا ہی کیسے وہ تو گھر سے باہر جاتی ہی نہیں...... مگر ہوتا ہوگا وائرس کا کوئی اپنا خفیہ طریقہ کار...... ہم دونوں بھائی ابھی ڈاکٹر صاحب کو دروازے تک چھوڑ کر آئے ہی تھے کہ دیکھا شرمیلا صاحبہ بہت ہی اہتمام اور چاہ سے سوپ کا پیالہ ٹرے میں رکھے ممانی جان کے کمرے میں داخل ہو رہی ہیں......

"دیکھ رہے ہیں بھیا...... کتنی مکار ہے...... سب کے سامنے کیسی لڑاکا بنی رہتی ہے...... ابھی اس نے سوپ کیسے بنایا؟ کوئی پوچھے اس سے؟"

چھوٹے بھائی نے چڑ کر اونچی آواز میں شرمیلا کو ٹوکا وہ بھی لڑاکا مرغ کی طرح غرا کر پلٹی۔

"تو ___ تم جیسے مسٹنڈے کے لیے بنایا کروں سوپ؟"

چھوٹا بھائی بھی چوکنے والا نہ تھا۔

"ہاں ناں، سوپ نہ بناؤ۔ چائے تو بنا سکتی ہو، تم تو وہ بھی نہیں بنا کر دیتیں کبھی؟ ہاں ہم ممانی جان کی طرح انعام جو نہیں دیتے ہر وقت جیب جو گرم نہیں کرتے تو یہ ہوگا پھر ہمارے ساتھ؟"

شرمیلا تلملا گئی اور اپنا ایک خالی ہاتھ ہی ہمارے سامنے نچاتی بولی......

"تمہارے خیال میں یہ سب میں انعام کے لیے کر رہا ہوں...... مطلب مجھے ممانی جان کی بالکل پرواہ نہیں ہے بس پیسے کے لیے یہ سب جتا رہا ہوں؟"

شرمیلا واقعی سنجیدہ ہو گئی تھی اور ان دونوں کی نوک جھونک میں جب ایسا موقعہ آتا تو میں بڑا بھائی ہونے کے ناتے دونوں کو بہلا پھسلا کر توجہ ہٹا دیا کرتا۔

"شرمیلا اندر جا کر ممانی سے کہو، ہم دونوں بھی

شرمیلا ٹرے سنبھالتی اندر چلی گئی اور چند منٹوں بعد واپس آکر ہمیں بھی اندر بلالیا...... خلاف توقع ممانی جان بستر کے بجائے اپنی آرام کرسی پر کمبل اوڑھے دراز تھیں......

''ناحق تم نے ڈاکٹر کو بلایا میں نے تو فون پر شہزاد بھائی کو پہلے ہی حالت بتا کر دوائیاں لکھوالی تھیں ابھی ڈرائیور کو بھیج کر منگوانے ہی والی تھی۔''

ممانی جان کے بڑے بھائی شہزاد شہر کے مانے ہوئے ڈاکٹر تھے اور ممانی جان کا باقاعدہ علاج بھی وہی کررہے تھے...... میں نے دوائیاں خود لاکر دینے کا کہہ کر ان کا حال احوال پوچھا اور اپنی مصروفیت کے بارے میں بات کر کے چھوٹے بھائی اور شرمیلا کو ہمیشہ کی طرح ممانی جان کے سامنے ایک بار پھر سے جھگڑا کرتے دیکھ کر کمرے سے باہر آگیا۔ پتا نہیں کیوں آج ممانی جان کو دیکھ کر دل اداس ہوگیا تھا' وہ بہت بدل گئی ہیں۔

ان کے لمبے سیاہ چمکدار بال اب ویسے لمبے چمک دار نہیں رہے ان کے سیدھے کندھے جھک سے گئے تھے اور ان کے چہرے کے تیکھے نقوش اب بہت حد تک دب سے گئے تھے یہاں تک کہ ان کی کالی گہری آنکھیں اب گہرے حلقوں میں جیسے اندر دھنسی ہوئی لگ رہی تھی...... ماموں جان اکثر ہنسی مذاق میں ہم بچوں کے سامنے ہی ممانی جان کو کہا کرتے......

''ارے آپ بوڑھی ہو ہی نہیں سکتیں...... کبھی بھی نہیں...... آپ تو نام کی بھی بہار ہیں اور دیکھ لیجیے گا ہمیشہ سدا بہار رہیں گی......''

ماموں جان صرف مذاق کرتے تھے کیونکہ اگر وہ سنجیدہ ہوتے تو ابھی ممانی جان کو دیکھ کر کیا کہتے ہوں گے؟ ایک عجیب سا احساس رائیگانی میرے اندر سرایت کرگیا۔

ہم بازار سے خریدی گئی سفید چمکیلی برف کسی برتن میں سنبھالتے ہی ہیں کہ وہ پگھلنا شروع ہوجاتی لگ جاتے ہیں ورنہ برف ایک بار پگھل گئی تو کبھی واپس نہیں ملتی...... ہمارے اپنے پیارے ہم سے محبت کرنے والے ہمارے مخلص ہم سے اسی طرح ملتے ہیں اور آہستہ آہستہ ہمارے ہاتھوں سے برف کی طرح پگھل کر پانی کی مانند بہہ جاتے ہیں...... دوبارہ کبھی نہ ملنے کے لیے۔

ماموں نے بتایا تھا ممانی جان ہمیں بہت جلد چھوڑ کر چلی جائیں گی ان کی بیماری ہی ایسی ہے...... ڈاکٹروں نے جواب پہلے ہی دے دیا تھا اور جب سے اس بیماری کی خبریں عام ہوئی ہیں امی جان کا پارہ بھی بہت ہائی رہتا تھا۔ وہ ہم تینوں بھائی بہن کو ممانی جان کی خدمت میں دیکھ کر اور غصہ کرتی تھیں۔

اکیلے میں ماموں جان کو مکان اور دیگر زمین وجائیداد کا حساب کتاب ممانی کے ساتھ طے کر لینے کے مشورے دیتی رہتی تھیں اور میں کیونکہ اب بہت کچھ سمجھنا اور پرکھنا جان گیا تھا، اپنی ماں کی ایسی باتوں پر دل ہی دل میں جھنجھلا کر بھی خاموش رہنے پر مجبور تھا مگر میں حیران ہوتا تھا کہ امی جان کے دل میں ممانی کے لیے کیسے عجیب اور نفرت انگیز خیالات تھے...... اور سب سے بڑی بات یہ کہ امی جان اب کھلے عام ہم بھائی بہن، ماموں جان یا رشتہ داروں کے سامنے ایسے خیالات بہت فخریہ بیان کرتی رہتی تھیں۔

☆☆☆

صحیح بات ہے اب ہم میں سے کسی کو بھی ممانی جان کی ضرورت نہیں رہی تھی بلکہ بیماری کے باعث وہ اکثر ہم تینوں میں سے کسی نہ کسی کی مدد لیتی رہتی تھیں۔ ایسے میں امی جان کا ظرف کھل کر سامنے آگیا تھا۔ پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ یہ صرف کتابی باتیں ہیں کہ محبت سے لوگ بدل جاتے ہیں۔ ساری عمر محبت کرتے رہنے کے باوجود ہر طرح کے احسان کر چکنے کے باوجود آپ سے نفرت کرنے والے آپ سے نفرت ہی کرتے رہیں گے اور یہ بھی سمجھ

اصل بات نفرت کو محبت میں بدلنا نہیں ہے اصل مقصد تو بس بے لوث کرتے چلے جانا ہے...... کیونکہ معاملہ انسان کا انسان سے نہیں بلکہ اللہ کا انسان سے ہے۔

بے لوث لوگ مرتے نہیں...... نفرت، حسد، جلن کی آگ ان کی زندگی مشکل کر سکتی ہے مگر وہ دنیا سے جا کر بھی دلوں میں رہتے ہیں۔

ممانی جان کے چلے جانے کے بعد جیسے اس سوچ اس خیال نے جڑ پکڑ لی......

☆☆☆

دن گزرتے گئے ہم تینوں بھائی بہن اپنی زندگیوں میں آگے بڑھنے میں بہت مصروف ہو گئے تھے۔ مگر ابھی بھی ہمارے درمیان ملنے اور مل کر ممانی جان کو یاد کرنے والا ایک معمول باقی رہ گیا تھا اور اکثر اوقات ایسا لگتا کہ بس وہ ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئی ہیں مگر کہیں قریب ہی ہیں اور شاید یہی سوچ کر میں نے یامین کو پسند کر لیا...... میری چچا زاد جس کے خاندان کے پاس اپنی امارات دکھانے یا جتانے کے لیے دنیا کی دولت نہیں تھی نہ ہی اس کے خاندان میں کوئی ممانی جان جیسی بیاہ کر آئی تھی...... اور شاید یہی بات امی جان کو میری پسند سے متنفر کر گئی تھی کیونکہ میں امی جان کو دوٹوک فیصلہ سنا چکا تھا تو انہوں نے اپنی تمام تر توجہ مجھ سے ہٹا کر ممانی جان کو کھل کر باتیں سنانے اور ماموں جان کو مجھے سمجھانے پر مرکوز کر رکھی تھی۔

"آپ نے بھی ممانی جان کو ان کی تمام تر کمزوریوں کے ساتھ قبول کیا تھا۔ کیا آپ کی زندگی پرسکون اور خوشحال نہیں گزری؟"

ایک دن ماموں جان کے باقاعدہ سمجھانے پر میں نے جواز پیش کیا۔

"میری بات اور تھی...... میں ایسی قدر روشن مستقبل اور مضبوط حال نہیں رکھتا تھا...... تمہیں تو ایسی کوئی مجبوری نہیں۔ تم بھلا کیوں اپنے سے کمتر اپنانے لگے؟"

"ماموں جان نے مسکرا کر مجھے جواب دیا۔

"تو کیا مجبوری میں ہی اپنے سے کمتر کو اپنانے کے فیصلے کیے جاتے ہیں؟ کسی کی بھلائی — کسی پر احسان کے لیے نہیں؟ اگر ایسا ہے تو ممانی جان کے ساتھ کیا مجبوری تھی کہ انہوں نے آپ سے شادی کے بعد بھی ساری عمر احسان کی روش نہیں چھوڑی؟"

ماموں جان لاجواب ہو کر مسکرا دیے۔

"تمہاری امی جان بہت پریشان ہیں۔ اپنی ماں کو دکھ دے کر کیا پاؤ گے؟"

ماموں جان نے اپنی طرف سے توجہ ہٹانے کی خاطر کہا۔

"میں، امی جان کو دکھ اپنی خودغرضی میں تو نہیں دے رہا...... ان کو تنہا تو نہیں چھوڑ رہا...... ان کے ساتھ کوئی زیادتی تو نہیں کر رہا۔ ماں باپ اگر غلط کام پر اکسائیں تو کیا میں وہی کروں جبکہ میں جانتا ہوں کہ ان کی بات غلط ہے۔"

ماموں جان کئی منٹ تک سوچتے رہنے کے بعد میری تائید میں سر ہلا کر فیصلہ کن لہجے میں گویا ہوئے۔

"تمہاری ممانی جان اکثر کہا کرتی تھیں کہ نیکی کرتے چلے جائیں چاہے چھوٹی سی ہی کیوں نہ ہو۔ وہ بہت ننھی سی نیکی بھی دل میں کہیں چھپ کر بیٹھی رہتی ہے اور کبھی نہ کبھی نا چاہتے ہوئے یا انجانے میں اپنی راہ بنا کر پھر سے زندہ ہو جاتی ہے...... میں ان کی بات پر ہنستا تھا کیونکہ اکثر ان کی نیکیاں دریا میں ڈوب جاتی تھیں اور ان کی زندگی تک تو کبھی واپس نہ ملیں مگر ان کا انتظار اپنی جگہ قائم رہا۔ جیسے ہر روز وہ ایک بیج زمین میں دباتیں، اس امید پر کہ یہ پودا بن کر باہر نکلے گا مگر ہر روز کوئی پرندہ زمین کھود کر وہ بیج ہڑپ کر جاتا...... مگر تم...... پتا نہیں تم ہی ننھی سی نیکی ہو جس کا ان کو انتظار تھا یا پھر کوئی ان کی طرح کا ہی سر پھرا مسافر جبکہ ان کا ہمسفر ہونے کے باعث میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ یہ ایک بہت صبر آزما، کٹھن سفر ہے پھر بھی...... سفر مبارک۔"

☆

آفشین نعیم

ہم ایک ہیں

''یہ گول میز کانفرنس کس سلسلے میں ہو رہی ہے؟''
ارحم کی آواز پر گول دائرے کی صورت قالین پر بیٹھے پانچوں نفوس نے سر اٹھا کر آواز کی سمت دیکھا۔

''گول میز نہیں، بغیر میز کانفرنس......'' زیام نے تصحیح ضروری سمجھی۔

''گول میز یا بغیر میز؟ مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ مجھے ایجنڈا جاننے میں دلچسپی ہے۔'' ارحم دھپ سے ولی کے برابر بیٹھتے ہوئے بولا۔

تمام لوگوں نے تھوڑا تھوڑا پیچھے کھسک کر دائرے کو مزید بڑا کیا تاکہ ارحم کو فٹ کیا جاسکے۔

''جی......تو اب بتاؤ۔ کیا چل رہا ہے؟'' اس نے عین سامنے خود سے دو برس چھوٹی مرحا کی طرف سوال اچھالا۔

''یہ کچھ نہیں بتاسکتی۔'' جواب ولی کی طرف سے آیا۔

''گو، یہ تمہاری بہن ہے مگر یہ وفاداری کا حلف اٹھا چکی ہے۔ سو اب اس سے بلکہ کسی سے بھی کچھ پوچھنا بے کار ہے۔''

''اور یہ تقریب حلف برداری کب منعقد کی گئی؟ ابھی آدھا گھنٹہ پہلے، جب میں بڑی امی کو لے کر گھر سے نکلا تھا۔ تب تک تو ایسی کوئی بات نہیں تھی۔'' ارحم نے ایک ایک کو گھورتے ہوئے، آخر میں نظریں گینگ کے سربراہ ولی پر جمائیں۔

''وقت کی کمی کے باعث ہمیں یہ اہم کام تمہارے بغیر ہی سرانجام دینا پڑ گیا۔''

زیام نے کھسیاتے ہوئے وضاحت دی۔
باقی سب نے تائید کی۔

''بھئی ولی! جلدی سے اس سے بھی حلف اٹھوالو نا۔ وقت کم ہے۔ چھ بجے جنازہ ہے۔ مردوں نے تو قبرستان سے ہی سیدھے گھر آجانا ہے۔'' ثوما بے تابی اور بے زاری کی ملی جلی کیفیت میں گویا ہوئی۔

''او کے...... میرے ساتھ ساتھ بولو۔'' ولی نے دایاں ہاتھ اٹھا کر بایاں سینے پر رکھتے ہوئے ارحم کو دیکھا۔

ارحم نے جلدی سے تقلید کی۔

''میں حلف اٹھاتا ہوں کہ بڑوں کو کسی بھی بات کی خبر ہونے کی صورت میں، میں کوئی راز فاش نہیں کروں گا اور نہ ہی اپنے گروپ کا ساتھ چھوڑ کر بھاگوں گا۔''

ارحم، ولی کے پیچھے پیچھے الفاظ دہراتا چلا گیا۔ باقی سب انتہائی عقیدت مندی سے سر جھکا کر سنتے رہے۔

ولی کے خاموش ہوتے ہی برزہ نے ارحم کو بریفنگ دینی شروع کی۔

''یہ مین روڈ پر جو ''چٹخارہ ہاؤس'' والوں کی نئی برانچ کھلی ہے نا۔ وہ ڈیل آفر کر رہے ہیں۔ تین ہزار میں ایک لارج پزا پر ایک فری پزا اور اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔'' بتاتے بتاتے ہی برزہ کے منہ میں پانی آنا شروع ہو گیا۔

''ہم وہ ڈیل آرڈر کر رہے ہیں۔'' ثوما نے بات آگے بڑھائی۔

''لیکن ایک مسئلہ ہے۔'' زیام سر کھجاتے ہوئے بولا۔

ارحم نے سوالیہ نظروں سے اس کو دیکھا۔

''چونکہ مہینہ ختم ہونے میں صرف تین دن باقی ہیں، لہٰذا سب کی جمع پونجی اختتام و انجام کو پہنچ چکی ہے۔ ہم میں سے کسی کے پاس بھی پیسے نہیں ہیں۔'' رقت آمیز انداز میں کہتے مرحا نے بات مکمل کی۔

''میرے پاس بھی پیسے نہیں ہیں۔ ابھی



موٹر سائیکل میں پیٹرول بھی بڑی امی نے ڈلوا کر دیا ہے۔" ارحم نے دونوں ہاتھ اٹھا کر اعلان کیا۔ مبادا اس سے کوئی امید نہ باندھ لی جائے۔

"بھئی ولی! جلدی سے فون کرو نا...... آرڈر ڈیلیور ہونے میں بھی وقت لگے گا۔" ثوما کے عجلت بھرے انداز پر ارحم نے حیرت سے ثوما کی شکل دیکھی۔

"بغیر پیسوں کے ڈیل......؟ مطلب بعد میں وہاں جا کر برتن دھونے کی بھی کوئی ڈیل ہوئی ہے؟"

"اوہو......" ثوما جھنجلائی۔

"ابھی ولی پیسے دے گا۔ بعد میں مطلب پہلی پر سب اپنی اپنی پاکٹ منی سے پانچ پانچ سو روپے ولی کو جمع کرا دیں گے۔"

ثوما نے ارحم کو وضاحت دی، ساتھ ہی ساتھ ولی کو اشارہ کیا کہ وہ آرڈر نوٹ کروائے فون کر کے۔

[illegible] کروا کر اور
ایڈریس سمجھا کر فارغ ہوا۔ اتنی دیر میں ارحم کے دماغ میں کئی سوال سر اٹھا چکے تھے۔

"یہ مہینے کی آخری تاریخوں میں تمہارے پاس تین ہزار کہاں سے آئے؟" ارحم نے مشکوک نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"میرے پاس تو پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہے۔" ولی نے سر دائیں بائیں ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

"مطلب......؟" ارحم زور سے چیخا۔

باقی نے اپنے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں۔

"جی، مطلب...... شاہی خزانہ۔" ولی نے اطمینان سے جواب دیا۔

ارحم نے باقی سب کی شکل دیکھی۔ سب ہی نے باجماعت زمین کو گھورنا شروع کر دیا۔

"کیسے بددیانت اور خائن انسان کو دادی نے اپنا خزانچی مقرر کر رکھا ہے۔" ارحم افسوس سے سر ہلاتے ہوئے بولا۔

"چٹخارہ ہاؤس والوں کی آفر کا آج آخری دن ہے۔ وہ ہمارے پاس پیسے آنے کا انتظار نہیں کریں گے۔" ثوما کی بکری جیسی منمناتی آواز ارحم سمیت سب نے بخوبی سنی۔

"اور ویسے بھی یہ سنہری موقع بھی کہاں ملتا ہے۔ جب گھر میں کوئی نہ ہوں۔" ولی دور کی کوڑی لایا۔

باقی سب نے زور و شور سے گردن ہلائی۔

"کتنے پیسے ہیں دادی کے بٹوے میں؟" ارحم نے سوالیہ نظروں سے ولی کو دیکھا۔ (دادی کے تمام مالی معاملات کا نگران ولی تھا۔)

"دس ہزار۔" جواب زیام کی طرف سے آیا کہ ولی نے سب کے سامنے رقم گنی تھی۔

"اور جو دادی کو خبر ہو گئی کہ تین ہزار غائب ہیں تو دادی کے جوتے صرف خزانچی کھائے گا یا پیزے کی طرح ان کی بھی برابر تقسیم ہو گی۔" ارحم کے سوال پر سب نے دائیں بائیں دیکھنا شروع کر دیا۔

"کچھ نہیں ہوتا۔ صرف تین چار دن کی تو بات ہے۔ پھر [illegible] واپس رکھ دیں گے پیسے۔" ثوما [illegible] دینے والے انداز میں بولی۔

"اور ویسے بھی دادی نے یہ پیسے بیسی کے لیے رکھے ہوتے ہیں اور پانچ تاریخ سے پہلے تو دادی کبھی بیسی بھجواتی نہیں ہیں۔ سو فی الحال اس فکر میں گھلنے کی ضرورت نہیں ہے۔" ولی کا اطمینان قابل دید تھا۔

مگر ارحم کی تسلی نہیں ہو رہی تھی۔

بیل کی آواز پر ولی اور زیام گیٹ کی طرف بھاگے، جب کہ ثوما، مرحا اور برزہ کچن کی سمت برتن لینے۔

صرف پانچ منٹ میں وہ سب کھانے کے لیے ریڈی تھے۔ بھاپ اڑاتا گرما گرم پزا پورے گھر میں خوشبو میں پھیلا رہا تھا۔

"ہاں جی......"

"تو پانچ حصے بناؤں یا چھ......" برزہ نے ارحم کا تذبذب دیکھتے ہوئے پوچھنا ضروری خیال کیا۔

"بھئی ارحم! اگر تم چوری شدہ پیسوں کا پزا کھانا غلط تصور کرتے ہو تو ہم تمہیں مجبور نہیں کریں گے۔" ولی اطمینان سے کہتے ہوئے مسکرایا۔ "تم جا سکتے ہو۔"

"اور ویسے بھی بڑی امی کے ہاتھ کے بنے بینگن تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔ تم وہ کھالو جا کر۔"

برزہ چھ حصے بنا چکی تھی۔

سب اپنا اپنا حصہ اٹھا کر اس سے انصاف کرنے میں مگن تھے۔ ارحم ایک ٹھنڈی سانس بھرتا اٹھ کھڑا ہوا اور کچن کی سمت بڑھا۔

"ہاہ...... ضمیر کی آواز......" ولی نے پزے کا ٹکڑا کانٹے سے نگلتے ہوئے فقرہ کسا

"ویسے بینگن اتنے بھی برے نہیں ہوتے۔" ثوما نے کولڈ ڈرنک کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

ارحم چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا کچن میں داخل ہو چکا تھا۔ چمچ، کانٹے، پلیٹیں ان سب کے کھنکنے کی آوازوں نے فضا میں عجیب طرز کا شور برپا کیا ہوا تھا۔

"یہ ارحم والی پلیٹ مجھے دے دو۔" ولی کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

"جی نہیں۔ اس میں سے بھی برابر حصے بنیں

کے سب کے۔ یہ مرحا ہے۔ ارحم کی چھوٹی بہن۔ بس چند سیکنڈ لگے اس کو فیصلہ کرنے میں۔

وہ تیر کی سی تیزی سے واپس آیا۔

''ادھر لاؤ میری پلیٹ...... '' ارحم ان کے سروں پر کھڑا تھا۔ ''میں ہاتھ دھونے گیا تھا۔''

چچا میاں کو دفنایا جاچکا تھا۔ بڑے گھر واپس آنے کی تیاریاں کررہے تھے۔

چھوٹے اپنے جرم کے نشان مٹانے میں مصروف تھے۔

زیام کے ذمہ پڑے کے ڈبے دور کوڑے کے پلاٹ میں جاکر پھینکنے کا کام لگایا گیا۔

برزہ، ثوما اور مرحا برتن دھونے لگیں۔

ولی اور ارحم نے مل کر کمرہ سمیٹا۔

آج کا دن یادگار تھا۔

☆☆☆

''ارے بھیا! بہت ہی مشکل سے وہاں بیٹھی رہی میں۔ اب اتنی دیر بیٹھا نہیں جاتا مجھ سے۔''

برزہ چائے کے ساتھ کباب تل کر لائی تو دادی اپنی خالہ زاد بہن کو بتارہی تھیں۔ جن کو وہ جنازے کے بعد اپنے ساتھ لے آئی تھیں۔

''اکٹھے رہتے ہیں سب بچے......؟'' انہوں نے دادی سے سوال کیا۔

''ہاں......اللہ کا شکر ہے۔'' دادی نے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔

''ٹھہرو۔ میں تمہیں اپنے پوتے پوتیوں سے ملواتی ہوں۔'' دادی نے برزہ کو اشارہ کیا کہ سب کو بلا کر لائے۔

جنازے کے بعد دادی تو اپنی کزن کو لے کر بڑے بیٹے کے ساتھ واپس آ گئی تھیں۔ باقی سب بہوئیں اور بیٹے ابھی ادھر ہی تھے۔ وہ چھ کے چھ سامنے موجود تھے۔

''یہ ارحم اور مرحا ہیں۔ میرے بڑے بیٹے انوار کے بچے۔ ارحم سے بڑی بھی ایک بیٹی ہے اس کی شادی کردی ہے۔''

دادی کی کزن بہت خوشی سے ان سب سے مل رہی ہیں۔

''آخری مرتبہ انوار کی شادی پر ہماری ملاقات ہوئی تھی نا توقیر!'' انہوں نے دادی کو یاد کروایا۔

انہوں نے مسکرا کر تائید کی۔

اب توقیر فاطمہ چھوٹے بیٹے کے بچوں سے انہیں متعارف کروارہی تھیں۔

''عذرا! یہ افتخار کے بیٹے ہیں دونوں۔ زیام اور ولی۔ اور یہ سب سے چھوٹے آفاق کی بیٹیاں ثوما اور برزہ۔ اور تیسرے نمبر والا بیٹا فاروق بے اولاد ہے۔ اس کے بچے نہیں ہیں۔'' ان کی آواز میں یاسیت گھلی۔

''چلو...... جیسے اللہ کی مرضی۔'' عذرا نے انہیں تسلی دی۔

''اچھا۔ زیام اور ارحم تم دونوں کو ایک کام کرنا ہے۔'' توقیر فاطمہ کو اچانک ہی یاد آیا۔

''جی دادی۔'' دونوں مؤدب ہو کر بولے۔

''ولی بیٹا۔ جانا ذرا، میرا کمیٹی والا بٹوہ تو لانا۔''

ان چھ نفوس کا سانس ایک ساتھ خشک ہوا۔

''جی......'' ولی کے حلق سے پھنسی پھنسی سی آواز برآمد ہوئی۔

وہ مرے مرے قدموں سے اندر کمرے میں گیا اور بٹوہ لا کر دادی کے ہاتھ میں تھمایا۔

''بھئی۔ یہ دس ہزار فاروق کو دے کر آؤ۔'' انہوں نے نوٹ نکالے اور بغیر گنے زیام کی سمت بڑھائے۔

''صبح کا ناشتا میری طرف سے ہوگا۔ میں فاروق سے کہہ آئی تھی، پیسے بھجوادوں گی انتظام کرلینا۔''

''یہ......بیسی کے پیسے الگ سے رکھے ہوتے ہیں میرے پاس۔ بیسی تو پہلی کے بعد ہی بھرنی ہے۔ چلو یہ کام ہوجائے۔ ایسے ہی وقت میں اپنے کام آتے ہیں۔'' دادی اپنی کزن سے مخاطب تھیں۔

زیام نوٹ ہاتھ میں تھامے، ہاتھوں کو گھوررہا تھا اور باقی سب زمین کو۔

آج کی رات یادگار ہونے جارہی تھی۔ آج کے دن کی طرح۔

☆

قصے پُرنم نہیں رہے اس میں
جب ترے غم نہیں رہے اس میں

آپ کس دل کی بات کرتے ہیں
اب وہ عالم نہیں رہے اس میں

غمِ دوراں سے دل ہے یوں بہلا
تیرے ماتم نہیں رہے اس میں

اب تو کردار داستاں کے کہیں
آپ کچھ جم نہیں رہے اس میں

سچ یہ ہے، جسم بھی ہے تھکنے لگا
ہم بھی تو کم نہیں رہے اس میں

ہر ضرورت کہے نچوڑ دو اسے
تھوڑا بھی دم نہیں رہے اس میں

آنکھ نے دیکھی ہے حیات ابرک
اشک اب تھم نہیں رہے اس میں
اتباف ابرک

کوئی خواہش مگر نہ کی ہم نے
شام یونہی گزار دی ہم نے

جلنے والے کو تو نہیں روکا
آنے والے کو راہ دی ہم نے

کیا گلہ اور کیوں کسی سے یہاں
جب توقع ہی نہ رکھی ہم نے

یا کوئی خواب، خواب میں دیکھا
شے کوئی زہر جیسی پی ہم نے

جس سے دُنیا دکھائی دیتی تھی
راہ دیکھی نہیں وہی ہم نے

وہ عمارت نہ ہو سکی تعمیر
پہلے بنیاد تو رکھی ہم نے
کامی شاہ



جذبات زیرِ گردشِ حالات ہو گئے
چھائی گھٹا تو رندِ خرابات سو گئے

تاروں نے ہم کو دیکھ کے شبنم سے یہ کہا
یہ بدنصیب وقتِ مناجات سو گئے

کیا دلگداز موسمِ گُل کا تھا انتظار
فصلِ بہار آئی تو نغمات سو گئے

آنکھوں میں ہم نے کاٹ دی شامِ غمِ فراق
آیا کوئی جو پہرِ ملاقات سو گئے

اک خواب کے سوا ہے یہ ہستی تمام خواب
آئی ہے جن کے ذہن میں یہ بات سو گئے

واصف علی واصف

لاحاصل

جانتا ہوں کہ ہم تم بچھڑ جائیں گے
جانتا ہوں کہ دونوں ملے بھی کہاں
رات لیکن
مرے آسماں
مری آرزو کا سمندر تجھے چھو رہا تھا

اسد محمد خان

شگفتہ جاہ

رنگ رنگ پھول

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

ابن عمرؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت فرماتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا۔

"اے عورتوں کی جماعت! تم (خاص طور پر) صدقہ دیا کرو اور زیادہ استغفار کیا کرو کیونکہ دوزخیوں میں زیادہ تعداد میں نے عورتوں کی دیکھی ہے۔"

ان میں سے ایک ہوشیار عورت بولی۔

"یارسول اللہ! ہم نے کیا قصور کیا ہے کہ ہم دوزخ میں زیادہ جائیں گی؟"

آپؐ نے فرمایا "تمہیں (باہم گفتگو میں) لعنت کرنے کی زیادہ عادت ہوتی ہے اور تم اپنے شوہر کی بھی بہت ناشکری کرتی ہو۔ میں نے تم جیسا دین و عقل میں ناقص ہو کر پھر ایک دانش مند شخص کو غالب آجانے والا کسی کو نہیں دیکھا۔"

صاحب ایثار،

پھل نہ درخت کے ڈالے کو لگتا ہے اور نہ اس کے مضبوط تنے کو، پھل جب بھی لگتا ہے، لہنے والی شاخ کو لگتا ہے اور جہاں بھی لگتا ہے، کانپتی ہوئی ڈالی کو لگتا ہے۔ شاخ جس قدر رکوع میں جانے والی ہوگی، اسی قدر زیادہ پھل کی حامل ہوگی اور فائدہ درخت کو اس سے یہ ہے کہ کلہاڑے سے محفوظ رہتا ہے اور تنا بھی۔ درخت کی بھی عزت ہوتی ہے اور درخت کی وجہ سے سارا باغ عزت دار بن جاتا ہے۔

ایک جملہ ہزار جواب،

ایک پروفیسر نے اپنی کلاس کے لڑکوں کو نامکمل فقرہ دے کر اسے مکمل کرنے کو کہا۔ ہر طالب علم نے اس فقرے کو اپنی اپنی سوچ کے مطابق مکمل کرنا تھا۔

نامکمل فقرہ یہ تھا۔

"ہر بڑے آدمی کے پیچھے ایک عورت ہوتی ہے......"

بچوں کے جواب۔

٭ ہر بڑے آدمی کے پیچھے ایک عورت ہوتی ہے پھر بھی وہ بڑا آدمی بن جاتا ہے۔

٭ ہر بڑے آدمی کے پیچھے ایک عورت ہوتی ہے، جس سے ہوشیار رہنا بہت ضروری ہے۔

٭ ہر بڑے آدمی کے پیچھے ایک عورت ہوتی ہے، جو اسے بار بار بتاتی ہے کہ قسمت کا پھیر ہے ورنہ اس کے لیے اچھے رشتے تو اور بہت تھے۔

٭ ہر بڑے آدمی کے پیچھے ایک عورت ہوتی ہے، جسے یہ علم نہیں ہوتا کہ اس کے آگے کھڑا آدمی واقعی ایک بڑا آدمی ہے۔

٭ ہر بڑے آدمی کے پیچھے ایک عورت ہوتی ہے جو اس پر ہمیشہ شک کرتی رہتی ہے۔

٭ ہر بڑے آدمی کے پیچھے ایک عورت ہوتی ہے۔ جو یہ سوچ کر حیران ہوتی رہتی ہے کہ دنیا اس بے وقوف آدمی کو بڑا آدمی کیوں کہتی ہے۔

٭ ہر بڑے آدمی کے پیچھے ایک عورت ہوتی ہے جو اس کے کان میں کہتی رہتی ہے کہ میرے بغیر تم کچھ نہیں ہو۔

سب سے دلچسپ جملہ یہ تھا۔

٭ ہر بڑے آدمی کے پیچھے ایک عورت ہوتی ہے، جو دوسری عورتوں کو اس کے قریب پھٹکنے نہیں دیتی۔

احترام،

لندن کے ایک سب سے خوبصورت علاقے کے میدان میں ایک کرکٹ ٹورنامنٹ کا فائنل کھیلا جارہا تھا۔ ایک کھلاڑی بال کو ہٹ لگانے کے لیے تیار کھڑا تھا کہ سڑک سے گزرتے جنازے کو دیکھ کر رک گیا۔ اس نے بلا زمین پر رکھ دیا اور اپنا ہیلمٹ اتار کر احتراماً سر کو جھکا دیا۔

جنازہ گزر جانے کے بعد قریب کھڑے کھلاڑی نے اس سے کہا۔

"مجھے یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ تم جنازے کا احترام کرتے ہو۔"

بیٹسمین نے اطمینان سے جواب دیا۔

"مجھے اتنا احترام تو کرنا ہی چاہیے تھا۔ آخر مرحومہ نے پندرہ سال تک بیوی کی حیثیت سے میرا ساتھ دیا تھا۔"

تعلیم،

چیونٹی کے بارے میں یہ بات مشہور ہے کہ جب اس کا بچہ جنم لیتا ہے تو وہ بحیثیت ماں دو چیزیں بڑی محنت سے اپنے بچے کے ذہن میں بٹھاتی ہے۔ ایک اتفاق اور دوسری سمت کی پہچان۔

اس کا بچہ جہاں بھی چلا جائے، وہ گھر نہیں بھولتا حتیٰ کہ آندھی ہو یا بارش، کوئی بھی اسے اس کے گھر جانے سے نہیں روک سکتی اور ہم اشرف المخلوقات ہونے کے باوجود اپنے بچوں کو یہ باتیں نہیں سکھاتے۔ کاش ہم اس ننھی سی مخلوق سے ہی کچھ سبق حاصل کر سکیں۔

آنے والے کل کے نام،

اب مجھے نیند بھی نہیں آتی
دن ترے دھیان میں گزرتا ہے
رات تیرا خیال لاتی ہے
اور مجھے نیند یوں نہیں آتی
(غزالہ نگار)

افلاطون،

افلاطون کی شہرت جب یونان سے باہر نکلی تو ایک پڑوسی ملک کے بادشاہ نے اسے اپنے دربار میں بلا کر کتاب "جمہوریت" کی بہت تعریف کی اور فرمائش کی کہ افلاطون اس ملک کے لیے بھی کوئی آئینی خاکہ تیار کرے اور ملک چلانے کے گر بتلائے۔

افلاطون نے شاہی فرمان کے مطابق مہمان بن کر کام شروع کر دیا۔ پانچ ماہ بعد بادشاہ نے عظیم فلسفی کو دربار میں بلوایا اور پوچھا۔

"تم نے ہمارے ملک کے لیے جمہوری دستوری خاکہ تیار کیا یا نہیں؟"

افلاطون نے عرض کیا۔

"خاکہ تو میں نے تیار کر لیا ہے مگر اس میں جہاں پناہ کہیں نظر نہیں آتے۔"

ثمرہ عاقب۔ گرین سٹی

گوگل اور فیس بک کے کرشمے،

گوگل اور فیس بک نے جن خواتین کو گھر بیٹھے شاعرہ بنا دیا ہے، ان کی پوسٹ پڑھنے لائق ہوتی ہے۔ ایک محترمہ نے شعر لکھا۔

"کاش میں آسمان بن جاؤں...
اور کاش تم پرندے بن کر میری طرف اڑتے ہوئے فوراً چلے آؤ۔"

نیچے واہ واہ کی لائن لگ گئی۔ ایک صاحب نے فرطِ جذبات سے مغلوب ہو کر لکھا۔

"بانو قدسیہ کے بعد آپ ہی عظیم شاعرہ ہیں۔"

ایک اور فین کا تبصرہ تھا۔

"سویٹ آپی! آپ کے اشعار بھی آپ ہی کی طرح خوبصورت ہیں اور ان میں کہیں کہیں میر تقی میر کا رنگ جھلکتا ہے۔"

لڑکیوں کو پتا ہوتا ہے کہ کس بات پہ ٹولیاں بھاگتی ہوئی آئیں گی۔ لہٰذا یہ کبھی کبھار الجھا ہوا اسٹیٹس بھی اپ ڈیٹ کر دیتی ہیں مثلاً "بریک اپ۔"

اب اس لفظ میں ایک ہزار معانی پوشیدہ ہوتے ہیں۔ لہٰذا لگ بھگ ایک ہزار ہی کمنٹس آجاتے ہیں۔ جن میں زیادہ تر تسلی دیتے نظر آتے ہیں کہ دکھ کی ان اتھاہ گہرائیوں میں وہ اپنی آپی کے ساتھ ہیں۔

ایسی لڑکیاں عموماً صرف مردوں میں ہی پاپولر ہوتی ہیں ورنہ حرام ہے جو ان کی فرینڈ لسٹ میں کوئی تصویر والی لڑکی بھی نظر آئے۔ بظاہر یہ بہت دین دار بنتی ہیں، اقوال زریں لگاتی ہیں، اچھی اچھی باتیں کرتی ہیں۔ انہیں ہر روز اپنی وال پر گڈ مارننگ اور گڈ نائٹ کا ڈیزائن لگانے کا بھی شوق ہوتا ہے۔ عموماً ایسی لڑکیاں ——— گوگل سے اداس لڑکیوں اور تتلیوں کی تصویریں کاپی کر کے پھیلانا صدقہ جاریہ سمجھتی ہیں۔ یہ اکثر اپنے مہندی لگے، چوڑیوں والے ہاتھ کی تصویر بھی لگاتی ہیں حالانکہ تصویر کی ریزولوشن بتا رہی ہوتی ہے کہ یہ کسی نہایت اچھے کیمرے سے کھینچی گئی ہے جو بہرحال ساڑھے تین ہزار والے موبائل کا نہیں ہو سکتا۔ یہ جو بھی اسٹیٹس اپ ڈیٹ کرتی ہیں، اس میں اردو کی ایسی ایسی شاندار غلطیاں کرتی ہیں کہ فوراً ہی ان کی لیاقت ظاہر ہو جاتی ہے۔ ایک بی بی نے لکھا۔

"یہ شعر آج بھی میری ڈائری میں لکھا ہوا ہے کہ....

بیچھڑا کچھ اس ادہ سے کے رُت ہی بدل گئی
ایک شخص سارے شہر کو ویرہ آن کر گیا

نیچے کسی دل جلے نے لکھ دیا۔

"اچھا ہی ہوا کہ بچھڑ گیا ورنہ اس نے آپ کی اردو پڑھ کے خودکشی کر لینی تھی۔"

فوراً آپی کے ایک ہمدرد نے غصے سے لکھا۔

"سویٹ آپی! حکم کریں تو اس گستاخ کو مزا چکھا دوں؟"

آپی نے متانت کا عظیم مظاہرہ کرتے ہوئے فوراً لکھا۔

"نہیں پیارے بھائی! ایسے ان پڑھ اور جاہلوں کے منہ لگنا مناسب نہیں۔"

اخلاق کی تعریف،

ہندوستان کے مشہور صوفی بزرگ حضرت داتا گنج بخش ؒ نے اپنی مشہور کتاب "کشف المحجوب" میں یہ بات نقل کی ہے۔

ایک مرتبہ امام زین العابدین رضی اللہ عنہ سے کسی نے دریافت کیا۔

"اخلاق کیا ہوتا ہے؟"

انہوں نے جواب دیا۔

"اخلاق یہ ہے کہ جب تم کسی سے راضی ہو تو باطل کی طرف جھکو نہیں اور جب کسی سے ناراض ہو تو حق کو چھوڑو نہیں۔"

خالدہ جیلانی

میری بیاض سے

ارم ذوالفقار ______ گلستان جوہر

کسی کو دینا یہ مشورہ کہ وہ بچھڑنے کا دکھ بھول جائے
اور ایسے لمحوں میں آنسو اپنے چھپا کے رکھنا کمال ہے

نادیہ یاسر ______ گوجر خان

نہ باہر کی خبر ہم کو، نہ اندر کا پتا ہم کو!
نہ جانے کتنے عرصے تک ہمیں خاموش رہنا ہے

آسیہ جاوید ______ علی پور چٹھہ

نہ جانے کب طوفان بنے اور رستہ رستہ بچھ جائے
بند بنا کے سوچ رہا ہوں دریا آخر دریا ہے

سدرہ عرفان ______ میلسی

تھا سبھی کے لیے مسیحا وہ
بس مرا درد ہی نہ سمجھا وہ
مجھ میں تو خود بڑے سمندر ہیں
تھا کوئی اور ہی جزیرہ وہ

مدیحہ، ایمان ______ کراچی

کرتے ہیں سب ہجوم مصائب میں بندگی
یاد خدا بغیر ضرورت بھی چاہیے

فضہ بلال ______ ڈیفنس

مرا وجود مری ذات کو کھٹکتا ہے
میں آئینہ ہوں مگر جھوٹ بولنے والا
اس سے بڑھ کے مجھے کیا عذاب دے گا کوئی
کہ خود سے روٹھ گیا مجھ سے چھوٹنے والا

ندا طارق ______ لاہور

ٹوٹ کر امید اپنی کرچیوں میں بٹ گئی
ریزہ ریزہ ہو گئے ارمان پتھر کی طرح

صبا ریاض ______ پشاور

قدرت کے فیصلوں کا بھی لازم تھا احترام
دل ورنہ چاہتا تھا میرے ساتھ تو رہے

ارم کمال ______ فیصل آباد

صبح کی ہوا تجھ سے ملے تو کہہ دینا
شام کی منڈیروں پر دیے ہم جلائیں گے
ہم تیری محبت کے جگنوؤں کی آمد پر
تتلیوں کے رنگ سے رستے سجائیں گے

زینب ______ کراچی

اس سے پہلے کہ ثابت ہو جرم خاموشی
ہم اپنی رائے کا اظہار کرنا چاہتے ہیں
کسی کو کیسے بتلائیں بھلا، کہ ہم خود بھی
تیرے بچھڑنے کے اسباب کم ہی جانتے ہیں

آسیہ جاوید ______ علی پور چٹھہ

عمر گزری ہے عذاب جاں سہتے
دھوپ میں زیر آسماں رہتے
ہم ہیں سنسان راستوں کے شجر
جو کسی کو بھی کچھ نہیں کہتے

نوال افضل ______ گجرات

خواب، صندل، لکڑی
انتظار، دیمک، روگ
لگ جائے جن نینوں کو
اڑتے پھول، بکھرے سوگ

ثمرہ، اقرا ______ گوجرہ

خواب بن کر نگاہوں میں کوئی نہیں آئے گا
ان جزیروں میں اب رت جگوں کا موسم ہے

روبینہ نعیم ______ کے ڈی اے

محفل آرا تھے، مگر پھر کم نما ہوتے گئے
دیکھتے ہی دیکھتے ہم کیا سے کیا ہوتے گئے
ناشناسی دہر کی، تنہا ہمیں کرتی گئی
ہوتے ہوتے ہم زمانے سے جدا ہوتے گئے

امت الصبور

جاؤوں کی ڈائری

روبینہ

مجھے ڈائری سے

شاعر کا کام محض مشاہدہ نہیں مجاہدہ بھی اس پر فرض ہے۔ قید و بند مصائب صعوبتیں بھی فیض کو اس راہ سے نہ ہٹا سکیں جو مقتل کو جاتی تھی۔ ان کی یہ نظم آج کی بھی آواز ہے۔

نثار میں تیری گلیوں پہ اے وطن کہ جہاں
چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اٹھا کے چلے
جو کوئی چاہنے والا طواف کو نکلے!
نظر چرا کے چلے، جسم و جاں بچا کے چلے

ہے اہلِ دل کے لیے اب یہ نظمِ بست و کشاد
کہ سنگ و خشت مقید ہیں اور سگ آزاد

بہت ہے ظلم کے دستِ بہانہ جو کے لیے
جو چند اہلِ جنوں تیرے نام لیوا ہیں
بنے ہیں اہلِ ہوس، مدعی بھی، منصف بھی
کسے وکیل کریں، کس سے منصفی چاہیں

مگر گزارنے والوں کے دن گزرتے ہیں
تیرے فراق میں یوں صبح شام کرتے ہیں

بجھا جو روزنِ زنداں تو دل یہ سمجھا ہے
کہ تیری مانگ ستاروں سے بھر گئی ہو گی
چمک اٹھے ہیں سلاسل تو ہم نے جانا ہے
کہ اب سحر ترے رخ پر بکھر گئی ہو گی

غرض تصورِ شام و سحر میں جیتے ہیں
گرفتِ سایۂ دیوار و در میں جیتے ہیں

یونہی ہمیشہ الجھتی رہی ہے ظلم سے خلق
نہ ان کی رسم نئی ہے، نہ اپنی ریت نئی
یونہی ہمیشہ کھلائے ہیں ہم نے آگ میں پھول
نہ ان کی ہار نئی ہے نہ اپنی جیت نئی

اسی سبب سے فلک کا گلہ نہیں کرتے!
تیرے فراق میں ہم دل برا نہیں کرتے

گر آج تجھ سے جدا ہیں تو کل بہم ہوں گے
یہ رات بھر کی جدائی تو کوئی بات نہیں
گر آج اوج پہ ہے طالعِ رقیب تو کیا
یہ چار دن کی خدائی تو کوئی بات نہیں

جو تجھ سے عہدِ وفا استوار رکھتے ہیں
علاجِ گردشِ لیل و نہار رکھتے ہیں

حمدہ خان

مجھے ڈائری سے

وقت گزر جائے تو صرف یادیں ہی رہ جاتی ہیں۔ خوش گوار یادیں۔ ایک کسک سی دل میں جگاتی ہیں۔ اسی کیفیت کو اقبال طارق اس غزل میں بیان کر رہے ہیں۔

خواہشوں کی کتاب تھے جب تھے
زندگی کا نصاب تھے جب تھے

اپنی انگلی پکڑ کے چلتے تھے
خود کو ہم دستیاب تھے جب تھے

اپنی آنکھوں میں اب کھٹکتے ہیں
چشمِ یاراں کا خواب تھے جب تھے

طاقِ ماضی کے یہ اُداس دیے
شوق میں آفتاب تھے جب تھے

اب میسّر نہیں ہیں خود کو بھی
ہم ترے بے حساب تھے جب تھے

یہ جو آنکھیں بجھی بجھی ہیں ناں
ان میں بھی چند خواب تھے جب تھے

اب جو سوکھے پڑے ہیں قبروں پہ
یہ بھی تازہ گلاب تھے جب تھے

سلمیٰ مسرت کی ڈائری سے

ایک عمر گزار کر انسان کی سمجھ میں آتا ہے کہ زندگی تو ایک سراب تھی، ایک دھوکا۔ حاصل تو کچھ بھی نہیں کچھ پایا تو بچا نہیں۔ جو کھویا وہ تو اپنا ہی نہیں تھا۔ رائیگانی کے اسی احساس کی ترجمانی کرتی یہ غزل آپ کی نذر۔

کیسے ہم تجھ سے گفتگو کرتے
یارِ من تو کبھی ملا ہی نہیں

چُپ کے جالے لگے ہیں ایسے کہ
کوئی اس گھر میں جھانکتا ہی نہیں

اس سے بڑھ کر بھی کیا گلہ ہوگا
تجھ سے پیارے کوئی گلہ ہی نہیں

عشق کی بات یارا رہنے دے
عشق کی کوئی انتہا ہی نہیں

زندہ رہنا بھی ایک عادت ہے
زندگی کا کچھ پتا ہی نہیں

جسم میں اس قدر ہے سناٹا
جیسے سینے میں دل رہا ہی نہیں

عمر ساری ہی رائیگاں گزری
کام کوئی پورا ہوا ہی نہیں

ثنا اسلم رانا کی ڈائری سے

حبیب جالب نے انقلابی اور مزاحمتی شاعری کے ساتھ روایتی غزلیں بھی لکھی ہیں اور بلاشبہ اور اچھی لکھی ہیں۔ ان کی یہ غزل آپ کی نذر۔

یہ اور بات ہے تیری گلی میں نہ آئیں ہم
لیکن یہ کیا کہ شہر ترا چھوڑ جائیں ہم

مدت ہوئی ہے کوئے بتاں کی طرف گئے
آوارگی سے دل کو کہاں تک بچائیں ہم

شاید بہ قیدِ زیست یہ ساعت نہ آسکے
تم داستانِ شوق سنو اور سنائیں ہم

بے نور ہو چکی ہے بہت شہر کی فضا
تاریک راستوں میں کہیں کھو نہ جائیں ہم

اس کے بغیر آج بہت جی اداس ہے
جالبؔ چلو کہیں سے اسے ڈھونڈ لائیں ہم

سانحہ ارتحال

منشاء محسن کی دادی رضائے الٰہی سے وفات پا گئیں۔
انا للہ وانا الیہ راجعون
بزرگ ہمارے لیے اللہ تعالیٰ کی رحمت ہوتے ہیں۔ ان کے دم سے گھر میں رونق ہوتی ہے۔ دادی کی وفات منشاء محسن کے لیے بڑا صدمہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو صبر دے اور مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے، آمین۔

میری امی آج بھی بات کرتی ہیں تو رنجیدہ ہو جاتی ہیں۔

ایک بہت معیاری ماہنامہ...... کہانیوں کے ساتھ جس کی طباعت بھی بہت اعلا ہے۔ بہت باتیں ہیں، اب تو جب جی چاہا، کھٹاک سے میسج ہو جائے گا۔ تھوڑی تھوڑی گزری ہوئی باتوں، یادوں، کہانیوں، پیاری لکھاریوں کا ذکر ہوتا رہے گا۔ جو جو کہانی دل کو چھو کر گزری، جو دل میں اتری، سب کی باتیں ہوں گی۔ یہ ادارہ...... دعا ہے کہ ہمیشہ تناور درخت بنا، اس کڑکتی دھوپ میں، جہاں لکھنے والوں کا کال ہے تو پڑھنے والے بھی نایاب...... اپنی چھاؤں دیتا رہے کہ ہم جیسے راہ رو، جنہیں پڑھے بنا چین نہیں آتا۔ دو چار گھڑی چین سے بیٹھ جاتی ہیں۔

☆ پیاری بہن! اتنا اچھا خط لکھا ہے آپ نے کہ ہمیں افسوس ہو رہا ہے، ہم نے پہلے کیوں رابطے کا یہ ذریعہ نہیں اپنایا۔ یہ بتائیے کہ آپ نے کبھی افسانہ نگاری پر توجہ دی؟ آپ ضرور اس طرف توجہ دیں۔ اندازہ ہوتا ہے کہ آپ باصلاحیت ہیں۔

خواتین ڈائجسٹ کی ایک خوش قسمتی یہ بھی ہے کہ اسے مصنف ہی بہت اچھے نہیں ملے، اس کے قاری بھی بہت ذہین ہیں، بہت شکریہ۔ رابطہ رکھیے گا۔

فائزہ ثمرین...... ڈی آئی خان

اس خط کو لکھنے کے لیے میں بہت ایکسائیٹڈ تھی۔ "رقص شرر" کی اشاعت پر اپنی خوشی آپ سے کیسے شیئر کروں گی، اس کی اشاعت سے پہلے کی اپنی بے یقینی (کہ پتا نہیں شائع ہو گا بھی کہ نہیں) اور پھر ناامیدی (کہ نہ شعاع میں شائع ہوا اور نہ ہی خواتین کی شعاع میں شائع ہونے والی فہرست میں تھا) سوچتی تھی کیسے بیان کروں گی اور ہاں، آپ کا شکریہ بھی تو ادا کرنا تھا۔ میرے لفظوں کو پذیرائی بخشنے کا، مگر سب گڈمڈ ہو گیا۔

میں خالدہ جیلانی صاحبہ کے بارے میں زیادہ نہیں جانتی۔ مگر آپ سب کے ان کے بارے میں احساسات، سچ میں لگا کوئی بڑا نقصان ہو گیا ہو۔ مجھے شاعری سے اتنا شغف نہیں ہے مگر...... خواتین ڈائجسٹ کے اشعار دل پر دستک دیتے تھے۔ ان میں وہ عامیانہ پن مفقود تھا جو اکثر دوسرے ڈائجسٹ کے اشعار میں ہوتا ہے اور طبیعت مکدر



نادیہ خاتون

خط بھجوانے کے لیے پتا۔
خواتین ڈائجسٹ۔ 37۔ اردو بازار کراچی۔
Email:Info@khawateendigest.com

ام فاتح...... نامعلوم شہر

رابطہ اتنا سہل بھی ہو سکتا ہے، یہ کبھی گمان بھی نہ گزرا۔ بہت خوشی ہو رہی ہے کہ گھر بیٹھے، بچہ گود میں لیے آپ سے مخاطب ہیں اور پلک جھپکتے ہی پیغام تمام حدود قیود کو توڑتا، پھلانگتا آپ تک پہنچ بھی جائے گا۔ عمر کے ابتدائی سالوں سے ہی اس ماہنامہ کی ورق گردانی شروع ہو گئی تھی اور آج تک جاری ہے۔ بعض دفعہ کیا، اکثر ایسا ہوتا کہ کسی ناول کی آخری قسط پہلے پڑھ لی اور پہلی قسط سالوں بعد پڑھی کہ حالات اجازت نہیں دیتے کہ اپنا رسالہ لے کر پڑھا جائے۔ میں تو خط بھی لازمی پڑھتی تھی کہ پتا چل جاتا کہ پچھلے ماہ کون سی کہانی ہٹ رہی۔ محمود

کردیتا ہے اور اس کا سہرا یقیناً خالدہ جیلانی صاحبہ کے سر ہی جاتا ہے۔

نئے آنے والے بہت اچھے سہی مگر جانے والوں کو بھلانا آسان تو نہیں، جیسے آسیہ رزاقی صاحبہ، حیا بخاری......

اس دفعہ کا خواتین ڈائجسٹ زبردست تھا۔ نگہت سیما مجھے بہت پسند ہیں۔ ان کی کہانیوں میں دکھ کی جو ایک کیفیت ہوتی ہے۔ ایک غمگین سا ماحول، اختتام چاہے خوش گوار ہی کیوں نہ ہو۔ پوری کہانی میں غم کی ایک عجیب سی کیفیت پائی جاتی ہے اور اس ناول میں تو پھر اختتام بھی خوش گوار نہیں تھا، خیر...... ادب پڑھنے والوں کو اچانک رونما ہونے والے المیہ کے لیے خود کو تیار رکھنا چاہیے۔

''کرم تم بھی نہ فرماؤ'' از عطیہ خالد۔ اس دفعہ شاید آپ نے سب کو اداس کرنے کا سوچ لیا تھا۔ خیر، ٹھیک تھی کہانی، اچھی تھی۔ جیسا کرو گے ویسا بھرو گے کی عملی تفسیر تھا ناولٹ۔

فریدہ بتول کا ناول اچھا تھا۔ پسند آیا۔ خاص کر زینب کی محنت۔ ہمارے گھر میں بھی تعمیرات کا کام ہو رہا ہے۔ ہم تو دیکھ دیکھ کر ہی تھک گئے کہ پتا نہیں کب مکمل ہوگا۔ ایسے میں زینب کی محنت نے کچھ زیادہ ہی دل پر اثر کیا۔ بلکہ میں نے تو تھوڑی بہت خود بھی کوشش کی، مگر ہاتھوں پر چھالوں، ابو کی ڈانٹ کے علاوہ اور کچھ وصول نہ ہوا ''ہیر نہ آکھو کوئی'' سائرہ رضا پسند ہیں۔ مگر مہ پارہ کا فیصلہ پسند نہ آیا۔ اتنی جلدی ہمت ہار دی اور پھر مرید...... آہ! واقعی مرد ہوتے ہی بے وفا ہیں۔ ویل ڈن سائرہ جی! باقی سارے افسانے اچھے تھے۔ سلسلے وار ناول بھی سارے اچھے ہیں۔ راحت جبین مائی فیورٹ۔ ان کے ناول میں بہت دل سے پڑھتی ہوں، ان کے کردار حقیقی ہوتے ہیں بہت۔ ہمارے اردگرد سے ہی لیے ہوئے اور کہانی کی بنت...... زبردست۔

اور آخر میں اپنی کہانی کے بارے میں۔ تھوڑی مزاحیہ لکھنے کی کوشش کی ہے۔

☆ پیاری فائزہ! کہانی اچھی ہے لیکن حقیقت سے کوسوں دور۔ ہمیں لگتا ہے کہ آپ ہلکی پھلکی اور سنجیدہ کہانیاں زیادہ اچھی لکھ سکتی ہیں۔ سمیرا احمید کے لیے جو سوالات بھجوائے ہیں، وہ ہمیں نہیں ملے۔ آپ ہمیں واٹس ایپ یا میسج کے ذریعے بھیج دیں۔

شازیہ الطاف ہاشمی...... نجاح آباد

بہت سارے دنوں بلکہ مہینوں بعد میرا دل چاہا کہ مجھے خط لکھنا چاہیے، اتنا پیارا شمارہ ہے کہ یہ دوپہر، تپتی دوپہر لگ ہی نہیں رہی۔ موسم ایک دم خوش گوار ہو گیا ہے یہ شمارہ دیکھ کر۔ یہ میرے محبوب شماروں میں سے ایک ہے، اس میں میری فیورٹ رائٹر عالیہ بخاری جو موجود ہیں۔ عالیہ جی آپ کی جگہ میرے دل میں ہے۔

جب بھی آپ کو پڑھوں، مجھے لگتا ہے جیسے کسی نے میرا دل صفحات پر بکھیر دیا ہو، زعفرانی زردہ میں بھی بناتی ہوں۔

عالیہ جی! میں آپ کو نویں جماعت سے پڑھ رہی ہوں۔ میری طرف سے آپ کے لیے بہت سارا پیار اور لمبی عمر کی دعائیں۔

محمود ریاض صاحب کے لیے مغفرت کی دعا۔ اللہ ان کے درجات بلند فرمائے۔ سارے شمارے ایک سے بڑھ کر ایک۔ سائرہ رضا کے کسی گاؤں، دیہات والے ناول کا بھی انتظار ہے۔ انہیں اب اور انتظار نہیں کروانا چاہیے۔

☆ پیاری شازیہ! عالیہ بخاری اور سائرہ رضا تک آپ کے جذبات ان سطور کے ذریعے پہنچا رہے ہیں۔

نبیلہ شاہد...... نامعلوم شہر

میں 97ء سے ڈائجسٹ پڑھ رہی ہوں اور پسند بھی بہت کرتی ہوں۔ آج صرف آپ کا شکریہ کہنا چاہوں گی کہ آپ نے ہمیں رفعت ناہید سجاد سے ملوایا پھر ساجدہ حبیب اور رفعت سراج نے متاثر کیا۔ اس کے بعد ثمرہ بخاری کی سادگی نے ہاتھ تھام لیا۔ اس کے بعد عمیرہ احمد، فرحت اشتیاق سے دوستی کر لی۔ نمرہ احمد نے مجھے بہت کچھ سکھایا ہے۔ سمیرا احمید کو سلام۔ آپ نے میری سوچ کو بدلا ہے۔

فرزانہ کھرل کو میں نے ان کی کاسٹ کی وجہ سے ایک سال تک نہیں پڑھا اور جب پڑھا، پرانے رسالے چھان مارے کہ کہیں ان کی اسٹوری ملے گی۔ فرزانہ کھرل کا لکھا ہر لفظ جکڑ لیتا ہے۔

حسنہ حسین کے ''عسر یسرا'' کو آہستہ پڑھتی ہوں کہیں ختم نہ ہو جائے، ویل ڈن حسنہ! شاہین رشید شکریہ!

سے ملنے کی بہت حسرت ہے۔ اقبال بانو کے شوہر کی وفات کا سن کر بہت افسوس ہوا، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے، آمین۔

واقعی بات تو تعلق کی ہے، بات تو انسیت کی ہے اور محبت کی ہے۔

☆ پیاری نبیلہ! فرزانہ کھرل کو ان کی کاسٹ کی وجہ سے نہیں پڑھا۔" بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔

آج کل ہمیں زیادہ تر خطوط ان قارئین کے موصول ہو رہے ہیں، جن کا خواتین اور شعاع سے دیرینہ تعلق ہے۔ سچ یہ ہے کہ تعلق جتنا پرانا ہو، اتنا ہی لطف دیتا ہے۔ پرانے دوستوں سے ملاقات ہو تو گزرے دنوں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ پرانے منظر یاد آتے ہیں، جب ہماری دیرینہ قارئین ہمیں خط لکھتی ہیں تو ہم اسی کیفیت سے گزرتے ہیں۔ آپ نے یاد کیا، بہت شکریہ۔ اب ہماری محفل میں شرکت کرتی رہیے گا۔

ندا...... جی۔ ایم

اللہ کے لیے اپنی مصنفات سے کہیں کہ اب شادی اور ساس بہو کے جھگڑوں سے نکل کر کچھ مثبت موضوعات کی طرف آئیں۔ پھوپھی، مامی کی سازشیں اور ہیروئن کی منگنی تڑوا کر اپنی بیٹی سے کروانے کی کہانیاں بہت پڑھ لیں، اب بس کر دیں۔ اس امت کا مقصد بہت بڑا ہے اور خاص طور پر آج کل کے حالات جس طرف جا رہے ہیں، اس میں عاشقی معشوقی کر کے شادی ہو جانا زندگی کی معراج ہرگز نہیں۔ پھر جس کو نامحرم سے حرام محبت ہو جائے، اس کو تو دیوتا بنا دیتے ہیں اور جو محبت نہ ملی تو اس سے بڑا دنیا میں کوئی دکھ نہیں۔

میری آپ سے گزارش ہے، اب بس کر دیں اور امت کی ماؤں کی ایسی تربیت کریں جس سے آئندہ آنے والی نسلوں کو عروج ملے۔ میں مانتی ہوں، کچھ کہانیاں اب بھی ان روایتی گھسی پٹی محبت کی کہانیوں سے ہٹ کر ہوتی ہیں لیکن ان کی تعداد بہت کم ہوتی ہے۔

آپ کو اللہ نے اتنا بڑا پلیٹ فارم دیا ہے، اس سے معاشرے میں تبدیلی لائیں۔

☆ پیاری ندا! ایک اچھا، پرسکون گھر...... ایک اچھی معاشرے کی۔ جب ایک گھر میں ساس بہو پر تنقید کرنے میں اور بہو ساس کو نیچا دکھانے میں مصروف رہے گی، جب نند اور بھاوج اچھے رشتوں کے حصول کے لیے ایک دوسرے کی بیٹیوں میں کیڑے نکالتی رہیں گی۔ جب دیورانی جٹھانی آپس میں مقابلہ کرتی رہیں گی تو وہ گھر کیسا ہو گا اور اس گھر میں بچوں کی خاک تربیت ہو گی۔ وہ معاشرے میں تبدیلی جیسے بڑے مقاصد کے بارے میں تو جب سوچیں گے، جب انہیں گھر کے جھگڑوں سے فرصت ہو گی۔

ہمارا پرچا خواتین کا ہے۔ اس کا مقصد خواتین کی ذہنی تربیت ہے کہ وہ اچھی بیٹی، اچھی بیوی، اچھی ماں بن سکیں۔ ان چھوٹی موٹی باتوں کے بجائے اپنے گھر، شوہر اور بچوں پر توجہ دیں۔ گھر کا ماحول خوش گوار بنائیں۔

کوئی اچھا لگ سکتا ہے کہ ایک خاص عمر میں جذبات عقل پر حاوی ہوتے ہیں لیکن باوقار رویہ اختیار کریں۔ محبت کو تماشا نہ بنائیں۔ اپنی اور اپنے والدین کی عزت کا خیال رکھیں۔ ایسی خواتین ہی ان سپوتوں کو جنم دیں گی جو معاشرے میں تبدیلی لائیں گے۔

آپ نے خط لکھ کر ہماری رہنمائی کی، بہت شکریہ۔ اگر کہیں کوتاہی ہے تو مزید محتاط رہیں گے۔

سعیدہ افضل ہاشمی...... کراچی

شعاع اور خواتین ڈائجسٹ سے متعارف ہونے کے باوجود پورا رسالہ پڑھنا مشکل تھا۔ تمام مندرجات پر یکسوئی سے خط لکھنا میرے لیے اس سے بھی زیادہ مشکل تھا۔ وجہ میں آپ کو بتاتی ہوں، 1990 میں شادی ہوئی اور بیاہ کر سیالکوٹ چلی گئی، کراچی واپسی پر وہاں سے ساس میرے ساتھ آئیں، چھٹیاں ختم ہوئیں تو دفتر آنا جانا شروع کیا۔ شروع میں صرف ساس ہوتی تھیں گھر میں۔ پھر چھوٹے جیٹھ آ گئے۔ نند کا داماد، دوسری نند کا بیٹا پہلے سے کراچی میں رہتے تھے۔ ان کا کراچی میں کام، یہ دونوں بھی ہمارے پاس آ گئے۔

شعاع میں نے پہلی مرتبہ اپنے دفتر میں ایک خاتون کے ہاتھ میں دیکھا تھا۔ اخبار والے سے لینا شروع کر دیا۔ رات میں تھوڑا ٹائم نکال کر پڑھتی تھی۔ جیسے

کرتے۔ انہیں یہ فکر کہ رسالے میں میری دلچسپی بڑھی تو گھر میں کام کون کرے گا۔ گھر میں افراد بھی زیادہ۔ ان کے دوبئی جانے والے اور آنے والے رشتے دار بھی ہمارے گھر میں قیام کرتے، بے پناہ مصروفیت۔ رسالے کا ساتھ چھوٹ گیا۔ لگا تار بچوں کی پیدائش، ان کی بیماریاں، دفتر کی ذمہ داریاں پنجاب کا آنا جانا، ہر چھ مہینے بعد ساس کو ان کے بچوں سے ملوانے کے لیے پنجاب جانا۔ شادیوں میں شرکت۔ 1995 میں ساس کا انتقال ہوگیا اللہ مغفرت کرے (آمین) بہت اچھی خاتون تھیں۔ بوڑھی ہونے کے باوجود کافی ساتھ دیا۔

اب ذمہ داریاں اور بڑھتی چلی گئیں۔ اس کے باوجود میں نے شعاع اور خواتین ہر ماہ لینے شروع کردیے۔ کیونکہ شوہر سمجھ گئے تھے (آٹھ سال بعد) کہ اپنی ذمہ داریاں پوری کرلیتی ہے۔ ایڈجسٹ ہونے میں بہت دشواری ہوئی (کلچر الگ، زبان الگ، صوبہ الگ)

اب آتی ہوں رسالوں کی طرف، یقین جانیے میری زندگی میں جو ٹھہراؤ آیا ہے۔ وہ انہیں رسالوں کی وجہ سے آیا۔ صبر، شکر، برداشت، زندگی گزارنے کا ڈھنگ، ہر حال میں خوش رہنا۔ ان رسالوں نے میری شخصیت بنائی ہے۔ میرے بچوں کی تعلیم وتربیت میں انہیں کا ہاتھ ہے۔

(شوہروں اور والدین سے میری گزارش ہے۔ کہ وہ اپنی بیویوں اور بچیوں کو رسالے پڑھنے دیں)

یہ تربیت کا ذریعہ ہیں۔ جن کہانیوں سے میری حوصلہ افزائی ہوئی ہے۔ اور میرے بے پناہ دکھ اور سختی کا گزرا وقت خوشیوں میں بدلا ہے۔ انہیں کہانیوں کے کرداروں نے میرے بہتے آنسو پونچھے ہیں۔ بچی کی موت کا دکھ، چھوٹے چھوٹے دو بچوں کا ساتھ، بوڑھی دادی، بیان کرنے سے قاصر ہوں۔ خوشیاں حاصل کرنے کے لیے خود کوشش کرنی پڑتی ہے۔ یہ بھی مجھے ان رسالوں نے سکھایا ہے۔ اب میں ذکر کروں گی اپنی ان پیاری رائٹرز کا اور ان کی کہانیوں کا جنہیں پڑھ کر میں نے بہت کچھ سیکھا

''دربار دل''، عمیرہ احمد کی یہ تحریر تین مرتبہ پڑھی ہے۔ مہر کا مراد سے کہنا۔ ''کیا حق پہنچتا تھا تمہیں کسی کی پارسائی کون کرے گا۔ ہم کیا خدا تھے۔ زبردست جملہ آج تک نہیں بھولا۔

آسیہ رزاقی ''بڑی آزمائش''، ''بہت کڑا تھا سفر'' سخت آزمائشوں سے گزرنے والی ہیروئنیں۔ تحریر میں روانی۔

عالیہ بخاری بے انتہا اچھی رائٹر ''ریزہ ریزہ عکس'' خوب صورت۔ تحریر ساجدہ حبیب 1971 کے سانحے کی روداد غمگین سی تحریر ''وعدہ، وردی اور وفائیں''۔

کنیز نبوی خوب صورت نام ''آتش عشق''، نقش قدم، ''دل زندہ کی صدا'' جانب علی شاہ، سدوری بہترین کردار ''صنم سے صمد تک'' لاجواب تحریر۔

راحت جبیں ان کے سارے ناول، ناولٹ پڑھ چکی ہوں۔ تمام خاندانی رشتوں کا ذکر۔ موسموں پھولوں، برسات کا ذکر۔ رنگ برنگے دوپٹے، جھولے، ہری مرچ آلو پیاز کے گرم گرم پکوڑے املی پودینے کی چٹنی کے ساتھ کیموں کی کنجبین، ٹھنڈے ٹھار آم، ٹھنڈے پانی کی بالٹیوں میں رکھے۔ کیا سین کری ایٹ کرتی ہیں راحت ہی نے اپنے حالیہ انٹرویو میں کہا تھا کہ آئندہ میری تحریروں میں تھوڑا چینج ہوگا۔ ''تتلی جیسا پیار'' اور ''زندگی ہم تجھے گزاریں گے۔'' پڑھ کر مزا نہیں آیا۔ راحت آپ اپنے پرانے انداز میں لکھیں۔ بہت اپنائیت محسوس ہوتی ہے جب آپ کی تحریروں میں اپنے قریب کا ماحول ملتا ہے۔

فائزہ افتخار ''جب آنکھ کھلی'' مزاحیہ تحریر ''چاچا ٹائم پاس'' کا کردار بہترین تھا۔ ''روگ'' رلانے والی تحریر۔

ثمرہ بخاری ''سوچنے کی بات'' بے انتہا اچھی تحریر ''ہم سے ہے زمانہ'' جوادی، شبلی پرلطف کردار، ثمرہ جلدی سے آجاؤ اور اپنے پرانے انداز میں لکھو۔

رخسانہ نگار عدنان یہ میری رائٹر انگلش میں ماسٹرز بے انتہا اچھی اردو کے ساتھ خوب صورت ناول لکھتی ہیں۔

نمرہ احمد، منفرد انداز بہت خوب صورتی سے زندگی کو مذہب کے تابع کیا۔ ''مصحف'' کمپلیٹ ضابطہ حیات قرآن پاک سمجھنے میں آسانی ہوئی۔ ''قراقرم کا تاج محل'' بہترین ریسرچ ورک۔ ''جنت کے پتے''، ہدایت کا راستہ، نمل اچھی کاوش۔

سائرہ رضا، ''خالی آسمان''، ''کپاس کے پھول''،

"سمیرا حمید"، "یارم"، "برہا بہاک کی مینا"، اداکارہ مینا کماری اور کمال امر ہوی۔ ریسرچ واک "اری او جھیگری" صحرا کی مظلومیت بنیادی ضرورتوں سے محروم لوگوں کی کہانی۔ دوسری رائٹرز نعیمہ ناز، آمنہ ریاض، تنزیلہ ریاض، فرح بخاری، فرزانہ کھرل، بہت سارے نام جو اس وقت ذہن میں نہیں آرہے (معذرت) ان سب کی تمام تحریریں حددرجہ متاثر کرتی ہیں۔

میرے شوہر افضل ہاشمی کا 28 اکتوبر 2020 کو انتقال ہوگیا ہے۔ میں عدت میں تھی۔ 2 جولائی 2020 کو بڑے بیٹے ذین افضل ہاشمی کی شادی کی ہے۔ بہت خوش تھے۔ سارے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ستمبر 2020 کو بہن کی تعزیت کے لیے سرگودھا گئے تھے، ہارٹ اور شوگر پیشنٹ تھے۔ بہن کا صدمہ زیادہ لے لیا۔ 28 اکتوبر لاہور میں انتقال ہوگیا۔ اللہ مغفرت فرمائے۔

ج: پیاری سعیدہ! یہ آپ اور آپ جیسی قارئین کی محبت اور تعاون ہے کہ خواتین ڈائجسٹ آج بہنوں کے پسندیدہ ترین پرچوں میں شمار ہوتا ہے۔ آپ نے پچھلے تیس سالوں کا بڑی خوب صورتی سے احاطہ کیا۔ آسیہ رزاقی اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ وہ ہماری بہت اچھی مصنفہ تھیں۔ ان کی کمی ہمیں بھی بہت محسوس ہوتی ہے۔ اسی طرح بہت سی مصنفین جو لکھنا چھوڑ چکی ہیں۔ ہمیں بہت یاد آتی ہیں۔ ثمرہ بخاری آج کل ٹی وی پر مصروف ہیں۔ انہوں نے بھی بہت اچھی اور یادگار کہانیاں لکھی ہیں۔ اسی طرح کنیز نبوی جو گھر داری اور بچوں میں مصروف ہوکر لکھنا چھوڑ چکی ہیں، ان کی کمی بہت محسوس ہوتی ہے۔

فائزہ افتخار جو بے مثال مزاح لکھتی تھیں۔ وہ بھی ٹی وی پر مصروف ہیں۔ رخسانہ نگار عدنان، عالیہ بخاری اور سائرہ رضا نے ٹی وی کے پرانے تعلق کو بھی برقرار رکھا ہے۔ یہ ان کی محبت ہے۔

صدف ناصر...... گوجرانوالہ

"ٹائٹل" زبردست ہے بھئی۔ دونوں گرلز "جڑواں" لگ رہی ہیں۔ ڈریسنگ، جیولری، ہیراسٹائل کمال کے ہیں۔ کو بھی "عید مبارک" اور دعاؤں کا تحفہ۔ غیرت کا شدید ترین جھٹکا تو "محمود شام" سے مل کر لگا۔ خواہ جیسے بھی سہی آپ نے "نظر کرم" تو فرمائی۔ "بات تعلق کی ہے۔" واقعی شان دار تھا۔ "منشا محسن" یقین کریں آپ کہ ایسی "تخیلاتی ملاقاتیں" ہم بھی ہزاروں مرتبہ خواتین، شعاع والوں سے فرما چکے ہیں کیونکہ بات پھر وہی تعلق کی ہی آجاتی ہے۔

"عید، خوشیوں کی نوید" سروے بہترین رہا۔ سب بہنوں کے جوابات اچھے ہیں۔ "ربیعہ نسرین" کے جوابات کافی معلوماتی تھے۔ اچھے لگے بہت۔

"شاہین رشید" زبردست "مشن" پر نکلی ہیں جناب! ماضی کے فنکاروں کو لا رہی ہیں۔ ہم بھی خوش، فنکار بھی خوش، اگرچہ "نیلوفر علیم" سے یکسر لاعلم ہیں۔ مگر طویل انٹرویو پسند آیا۔ "زباب رانا" سے ملاقات سو سو رہی۔ اس کی جگہ "کچن کارنر" کو جگہ دے دیتے آپ۔ سوری! "ہمارے نام" میں گوشی جمال کا خط حسب روایت دلچسپ "زندگی ہم تجھے گزاریں گے" حسب عادت سب سے پہلے پڑھا۔ دل بند ہوتا رہا بار بار۔ زرینہ خانم لغاری کی طرح۔ پورا شک تھا۔ ہمیں بھی۔ کہ "منشی کم بخت شادی میں پسوڑی ضرور ڈالے گا۔" مگر "راحت جبین" سے گزارش ہے۔ اب "نکاح" نہ کروا دیجیے گا منشی اور نرمین کا ورنہ سب قاری بہنوں کے دل "باجماعت" ٹوٹ جائیں گے۔

"مکمل ناول" سوئے صفر "عنیزہ سعید" کی سوسیڈ اسٹوری، چلو ہوگئی ناں اولاد سے غلطی۔ والدین کو چاہیے تھا نا کہ معاف کردیتے۔ سب کے ہاتھ کیا آیا پھر سوائے پچھتاووں کے جب کہ اکلوتی اولاد تھی۔ "ماہین"، "کھیل" میں پیاری رائٹر "ضامن" کو بھی خاصا گھٹر دکھایا۔ سوچا تھا یہ ناول عید والے دن کے لیے بچا رکھتے ہیں۔ مگر "نعیمہ ناز" شروع سے ہی اتنے دلچسپ اور گھریلو پیرائے میں لکھتی ہیں کہ "ہم تو ناول تو چھوڑتے ہیں ناول ہمیں نہیں چھوڑتا"۔

ناولٹ "خوشی کی محبت" کے ساتھ "عالیہ بخاری" کو واپسی مبارک باد! اتنا اچھا، سادہ سا ناولٹ مگر یہ کیا بھئی؟ ایک منٹ میں لپیٹ لپٹا کر "اینڈ" بھی کردیا۔ "عفان" اور "فرزین" کہاں سے کیسے حالات میں سامان اٹھا کے

تھا۔ ''شش...... شی'' اس ماہ کی ''فنی تحریر'' پڑھ کر ہنستے رہے۔ ٹینشن فری ہوتے رہے۔ ''امت العزیز'' کہاں سے ڈھونڈی آپ نے ایسی '' خالہ'' قسم سے بڑی زبردست خالہ ہیں۔ موبائل کی تو جان نہیں چھوڑی انہوں نے۔ ''عبدالرحیم'' اور ''طہور'' نے اچھا فیصلہ کیا۔ ''راشدہ رفعت'' نے ''عید کا جوڑا'' ہمیں پیش کیا اور کیا خوب کیا۔ ''زرقا سکندر'' کو کافی عرصہ بعد ہماری یاد آئی۔ اور واقعی ''عید تو مبارک ہے''، ''ثانیہ مرتضیٰ'' کے افسانے سادہ اور پیارے ہوتے ہیں۔ ''ندا رفیق'' کی پہلی تحریر ہی چھوٹی سی اور اچھی سی ہے۔

''رنگا رنگ پھول'' میں سبھی ''پھول'' پسند آئے۔ مگر ''خاتون کی ڈائری'' بہت اچھی لگی۔ ''فرزانہ جبیں'' کی ''اے ستارۂ شب زندگی نے رلا دیا۔ ''موسم کے پکوان'' دیکھ کر منہ میں پانی آ گیا۔ اس عید پر ''خالدہ جیلانی'' کا ساتھ نہیں ہے۔ سب مرحومین کے لیے دعائے مغفرت! ''پلاؤ، مرغ پشاوری کڑاہی بنانے کا پکا ارادہ ہے۔ ان شاء اللہ۔

''عدنان بھائی'' سے نفسیات کی کلاس لی۔ ہمیشہ کچھ نہ کچھ سیکھ کر ہی اٹھتے ہیں۔ شکریہ عدنان بھائی۔ بس آپ سے گزارش ہے کہ آپ ''شاہین رشید'' کو اپنا ایک ''لمبا چوڑا'' انٹرویو ہی دے دیجیے۔ نادرہ خاتون''، ''عدنان بھائی'' رضیہ جمیل اور محمود شام، واصفہ سہیل وغیرہ کے انٹرویوز لیں۔

ج: پیاری صدف! آپ کے تبصرے کے بارے میں کیا کہیں تبصرہ ہمیشہ ہی بہت جامع اور خوب صورت ہوتا ہے۔ آپ نے جن لوگوں کے انٹرویو کی فرمائش کی ہے ضرور پوری کریں گے۔ ان شاء اللہ۔

گوشی جمال...... منڈی یزمان

اس دفعہ شمارہ ایسے دنوں میں موصول ہوا۔ جب عید سر پر آن کھڑی تھی۔ کچھ شاپنگ اور کچھ گھریلو کاموں میں مشغول، اوپر سے اسمارٹ لاک ڈاؤن کا شوشا اس لیے شمارے کو بچوں کی پہنچ سے دور کر کے محفوظ کر لیا تا کہ عید کے شور و غل سے فراغت پا کر مطالعہ کی سعادت حاصل

... بچوں نے اس کا نام و نشان مٹا دیتا تھا۔ بھابھیاں ٹھٹھے اور قہقہے بکھیرتی ٹائم سے دھمکیں جبکہ بڑی بھابھی کی سلائی مشین چاند رات کو گڑگڑ کرتی رہی۔ بھتیجی موصوفہ جو خاصی ضدی واقع ہوئی ہیں۔ ان کی فرمائش تھی۔ ریڈ کلر کا جوڑا چاہیے صبح چار بجے تک مکمل کر کے سلائی مشین اور بھابھی کی خلاصی ہوئی۔ اور پھر ان کی آنکھ ایسے لگی کہ ''شیر خورما'' بنانے کی فرصت نہ ملی۔

ان کا گھر ہم سے ایک گلی کے فاصلے پر ہے۔ صبح بڑے بھیا ''نان خطائی'' پکڑے دھوتی۔ بنیان پہنے آگ بگولہ ہوئے کچن اور گھر میں چکر کاٹے جا رہے ہیں اور بھابھی کی کلاس بھی لے رہے ہیں۔ اوپر سے عید کی نماز کا ٹائم ہوتا جا رہا تھا۔ اماں نے اپنے نواسے انس کو ''سویاں'' دیں کہ بڑے ماموں کے گھر دے آؤ۔ حالانکہ اماں کو آج تک بڑے بھیا نے عید کے نام پر ایک دھیلا تک دیا۔ لیکن ماں تو پھر ماں ہوتی ہے۔ انس میاں بوکھلائے سے ماموں کے گھر داخل ہوئے اور آگے سے کون مہندی ہاتھ میں پکڑے ماموں کی بیٹی ناز عجلت میں انس سے ٹکرا گئیں اور سویوں کا پیالہ زمین بوس ہو گیا اور دونوں کھی کھی کرنے لگے۔

اچانک عید ہو گئی اور سارے کام بھی عجلت میں انجام پذیر ہونے لگے۔ مجھے اس بات کی آج تک سمجھ نہ آئی یہ مولوی حضرات رات گیارہ بجے کے بعد کہاں سے چاند ڈھونڈ لاتے ہیں؟ ساری خوشی کا بیڑا غرق ہو جاتا ہے۔

اماں کہتی ہیں کوئی ''سواد'' نہیں عید کا۔''

ایک طرف کو روتا منہ پھاڑے کھڑا اور اوپر سے مولوی حضرات شاک دینے سے باز نہیں آئے۔ بہرحال عید کا ٹائٹل دیکھ کر دل خوش ہو گیا۔ ''کرن کرن روشنی'' رمضان کے آخری عشرہ کی مناسبت سے زبردست ''اندر کیا ہے۔ کچھ نہیں۔'' بالکل صحیح فرمایا! اکثر اوقات ایسا ہی جھٹکا لگتا ہے۔ ''بات تعلق کی ہے۔'' محمود شام جی! پڑھ کر دائیں آنکھ کا دایاں کونہ بھیگ گیا۔ ''زباب رانا'' سے ملاقات سرسری سی کی۔ البتہ ڈیسنٹ پرسنالٹی ''نیلو فر

ڈرامے شوق سے دیکھے۔ خاصے "تو لیلے" کردار کیا کرتی تھیں۔

"رنگ ریز میرے" پر نظر پڑی تو فوراً اوراق پلٹ دیے کہ اگلے ماہ پڑھ لیں گے، کیا پتا اگلے ماہ ان کا دیدار حاصل کرنے کا شرف ہمیں پھر نصیب نہ ہو۔ معذرت "عنیزہ سید" بہت معتبر نام اور کام بھی عمدہ "سو سے صفر" کمال کردیا آپ نے۔ باقی ابھی پڑھا نہیں۔ کام کرکر کے ابھی تو ہلکان ہوئے پڑے ہیں۔ بھائی، بھابھیاں کھاپی کر اپنے اپنے محلوں کے اندر جا گھسیں۔ پیچھے سارا سیاپا ہم پر اور بڑی دونوں آپا پر جو دونوں کام بھی سمیٹتی رہیں اور بڑبڑ بھی کرتی رہیں۔ سارا غصہ ایک دوسرے پر نکال کر ہلکان ہوتی رہیں۔

ج: پیاری گوشی! جیسے اچانک "عید" ہوئی ایسے اچانک بہت سے کام ہورہے ہیں، قیمتوں کو ہی لے لیں صبح کچھ ہوتی ہیں۔ شام کو کچھ ہوتی ہیں۔ کس کس بات کو روئیں ہر طرف ایسی ہی افراتفری کا عالم ہے۔ ایسا لگتا ہے سب نے طے کرلیا ہے کہ اپنا کام ٹھیک سے نہیں کرنا ہے۔ بے چارے مولوی بھی کیا کریں۔ جو آرڈر ملے ان کو تعمیل کرنا ہی ہوتی ہے۔ اللہ سے دعا کریں کہ ہم پر رحم فرمائے۔ گوشی! اس ماہ خوش نظر آرہی ہیں۔ شاید عید کی وجہ سے اسی طرح خوش رہا کریں۔

بسمہ شیراز...... گاؤں حاوا راولپنڈی

میں شعاع وخواتین کی باقاعدہ قاری چار یا پانچ سال سے ہوں (باجی ادیبہ کی مہربانی) لیکن کبھی محفل میں شرکت کرنے کا حوصلہ نہ ہوا۔ خط لکھتے ہوئے جھجک محسوس ہوتی تھی۔

1۔ بمبئی کی بانو از امثل عزیز شہزاد

2۔ برہا بہاگ کی مینا از سمیرا حمید

یہ دو انتہائی خوب صورتی سے لکھی گئی تحریریں۔ دل کو اداس کردینے والی۔ اپنے ساتھ اسی زمانے اور ماحول میں لے جانے والی۔ ان دو تحریروں کو پڑھنے کے بعد تعریف کو خود پہ فرض جانا میں نے۔

☆ بہت شکریہ بسمہ! آپ کی تعریف امثل عزیز

دعا مصطفیٰ...... خیرپور میرس

عید نمبر حسب معمول بلکہ اس سے بھی بڑھ کر اچھا لگا، قسط وار سلسلوں پر تبصرہ، سب سے پہلے (زندگی ہم تجھے گزاریں گے) بہت ہی برے اور دکھی موڑ پر آگئی ہے، خیر یہ لوئر مڈل کلاس گھر کی اسٹوری بہت پیاری ہے۔ "رنگ ریز میرے" یہ بہت ہی انٹرسٹنگ موڑ پر ہے لگتا ہے جلد ختم ہونے والی ہے۔ باقی سب سلسلے اچھے رہے اور دوسری کہانی خاص "سو سے صفر" یہ بہت ہی اچھی اور نصیحت آموز تھی۔ مینو بے چاری کی زندگی مجھے اس کہانی میں معید کا کردار بہت پسند آیا عنیزہ سید آپی سچ مچ کی جادوگرنی ہیں۔

ہانیہ تبسم ہانی بھٹی...... گجیانہ نو، شیخوپورہ

ماڈل بہت پیاری تھی ماشاء اللہ سب سے پہلے "کہنی سننی" پڑھی، میں بڑے غور سے سنتی ہوں۔ "کرن کرن خوشبو" ماشاء اللہ اچھی ہدایات۔ "بات تعلق کی ہے" سمیرا جی کیا کہنے آپ کی کوئی مثال نہیں آپ بے مثال ہیں۔ "قانتہ رابعہ سے ملاقات" مت پوچھیں کہ خوشی کی اہمیت کیا ہوتی ہے۔ "زندگی ہم تجھے گزاریں گے" اوہ مراد کو پولیس لے گئی۔ اب کیا ہوگا زمین کا؟ یہ کارستانی فرخ کی لگی ہے (بدتمیز) "بوہے باریاں" منشا جی آپ چھا گئیں۔ "حالم" میں نہیں پڑھتی (سوری) "سو سے صفر" اگر عنیزہ جی کی ہر ماہ تحریر ملتی رہی تو میں کافی سمجھ دار ہوجاؤں گی (بچی) "بانٹ" ہر گھر کا ماحول ایسا ہی ہونا چاہیے۔ ہم ناسمجھ ہوتے ہیں۔ بڑے بہتر جانتے ہیں۔

ج: پیاری ہانیہ! لیٹ موصول ہونے کی بنا پر پچھلے ماہ آپ کا خط شامل نہ ہوسکا، اس ماہ شامل ہے۔

خواتین آپ کو پسند آیا، یہ جان کر خوشی ہوئی۔

خبریں وبریں

واصفہ سہیل

ضرورت

کیمبرج امتحانات کو منسوخ نہ کرنے اور اس کے بعد کیے جانے والے فیصلوں کے حوالے سے طلبہ کی جانب سے وفاقی وزیر تعلیم شفقت محمود کے خلاف نامناسب الفاظ کے استعمال پر عائشہ عمر نے برہمی کا اظہار کیا ہے۔ شفقت محمود نے بھی طلبہ کے ردعمل پر مایوسی کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا کہ ٹوئٹر پر جو کچھ ہو رہا ہے، مجھے افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے کہ جس قسم کی زبان یہ بچے استعمال کر رہے ہیں، مجھے لگتا ہے کہ یہ حکومت، والدین اور اساتذہ کی اجتماعی ناکامی ہے (ویسے یہ بچوں کی آڑ میں بڑے تو نہیں)۔

طلبہ کے اس ردعمل پر اداکارہ عائشہ عمر نے بھی برہمی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ یہ بہت شرمناک بات ہے۔ کیا ہم ایسی قوم پروان چڑھا رہے ہیں جو دوسروں اور بڑوں کا بالکل احترام نہیں کرتے۔ تنقید یا اختلافات کسی کو بے عزت کرنے کا باعث نہیں ہونے چاہئیں۔ آپ کسی سے اتفاق نہیں کرتے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ آپ اس کی تذلیل یا تضحیک کریں۔ ہمیں درحقیقت دوبارہ سوچنے کی ضرورت ہے، خاص طور پر والدین کو کہ ان کے بچے کیا کر رہے ہیں۔

افسوس

کبھی کبھی ہم زندگی میں کچھ ایسے قدم اٹھا لیتے ہیں جو آگے جا کر پچھتاوے بن جاتے ہیں۔ کچھ ایسی ہی صورت حال شائستہ لودھی کے ساتھ بھی پیش آئی۔ شائستہ لودھی کا کہنا ہے کہ کبھی کبھی حالات ایسے ہو جاتے ہیں کہ علیحدہ ہونا ہی بہتر ہوتا ہے۔ وقار (سابق شوہر) سے اپنی طلاق کے معاملے کو میں ایک مختلف انداز سے دیکھتی ہوں، ہماری بارہ سالہ خوب صورت ازدواجی زندگی نے ہمیں خوب صورت بچے دیے۔ طلاق کے معاملے میں ایک شخص ہی برا نہیں ہوتا، بعض اوقات ایسی صورت حال پیدا ہو جاتی ہے کہ چیزیں اچھی نہیں جا رہی ہوتیں اور راستے جدا کرنا ہی بہتر ہوتا ہے۔ ہمارے معاملے میں بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔

طلاق کے وقت میں نے اپنے رشتے سے متعلق بہت کچھ کہا، جو غلط تھا۔ شاید اس وقت ہمارے معاملات ٹھیک ہو جاتے، میں سمجھتی ہوں کہ مجھے اس وقت خاموش رہنا چاہیے تھا۔ مجھے اب اس کا بہت افسوس ہے۔

ضرورت

ترک حکومت نے پاکستان کے مقبول اداکار عمران عباس کو خیر سگالی سفیر مقرر کر دیا ہے۔ ترک حکومت اور ان کی وزارت مذہبی امور کی جانب سے خیر سگالی سفیر مقرر کیے جانے کے بعد عمران عباس نے ترکی کے نامور اداکاروں کے ساتھ تنزانیہ اور کئی افریقی ممالک کا دورہ کیا اور ان ممالک کے لوگوں کو پانی، خوراک، تعلیم اور دیگر ضروریات کا سامان فراہم کیا گیا (ان سب چیزوں کی ضرورت تو پاکستان کے لوگوں کو بھی ہے؟) اس موقع پر مسلمانوں کو ہزاروں قرآن پاک کا تحفہ بھی دیا گیا۔

عمران عباس نے ترکی سے رمضان ٹرانسمیشن کی میزبانی بھی کی۔

عمران عباس نے ترک حکومت کا شکریہ ادا کرتے ہوئے سفیر منتخب کیے جانے کو اپنے لیے اعزاز قرار دیا ہے۔

کڑا وقت

گلوکار راحت فتح علی خان نے ایک لمبے عرصے کے بعد اپنے چہرے کی ساخت تبدیل کی ہے۔ جس پر طرح طرح کے تبصرے سامنے آ رہے



ہیں۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ راحت فتح علی خان کافی عرصے سے بولی وڈ سے آؤٹ ہو چکے ہیں، ان کے سارے پروجیکٹ پاکستان میں ہی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ان پر جو عروج کا دور آیا تھا، وہ اب گزر چکا ہے اور یہ زوال صرف راحت فتح علی خان پر ہی نہیں آیا، ان کے ہم عصر گلوکار بھی اس کی زد میں آئے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ ہر عروج کو زوال ہے۔ راحت فتح علی خان بھی اسی دور سے گزر رہے ہیں، کسی نے انہیں موچھیں رکھنے کا کہا ہے کہ شاید اسی طرح ان پر حاوی کڑا وقت گزر جائے (سنا ہے کہ ایک بھارتی گلوکارہ کے کہنے پر موچھیں رکھی ہیں، ویسے کئی سال پہلے اپنی بیگم کے کہنے پر انہوں نے کلین شیو کیا تھا)۔

آج کل ایف بی آر بھی کافی حرکت میں ہے اور فنکاروں کے اثاثے چیک کرتا پھر رہا ہے (ویسے آپس کی بات ہے، ایف بی آر والوں کے اثاثے کون چیک کرتا ہوگا؟)

کچھ ادھر اُدھر سے

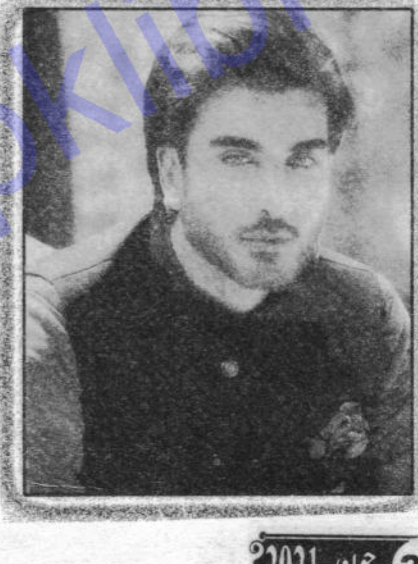
★ اقوام متحدہ کے سیکریٹری جنرل انتونیو گوتریس نالہ خواں ہیں کہ......

"دنیا میں کہیں جہنم ہے تو وہ غزہ کے بچوں کے لیے ہے۔"

(امتیاز عالم......انگیخت)

☆ ہمارے بزرگوں نے جنگلوں میں شہر بنائے، ہم اپنے شہروں کو جنگل بنا رہے ہیں۔ یہ شہر، یہ قصبے، یہ گاؤں محبت بھی کھل کر کرتے ہیں لیکن کبھی ناراض ہو جائیں تو ان کا انتقام بھی سخت ہوتا ہے۔ اپنی اولادوں کی رہنمائی کریں۔ اپنے شہر کی معیشت کو سمجھیں اور شہر کی نفسیات بھی۔ کچھ شہر کم بولتے ہیں، کچھ بولتے ہی رہتے ہیں۔ شہروں کی صبح کبھی غور سے دیکھیں، یہ امنگوں، تمناؤں، امیدوں سے بھری ہوتی ہے۔

(محمود شام......مملکت اے مملکت)



آپ کا باورچی خانہ

فہمیدہ جاوید

آپ سب کو میرا اسلام۔ جو کہوں گی سچ کہوں گی، سچ کے سوا کچھ نہ کہوں گی۔ مقبول ترین سلسلے باورچی خانہ میں حاضر ہوں۔ آپ سب کی محبت اور توجہ کی طلب گار ہوں۔ میری آمد کیسی لگی، سب بتانا۔ ویسے میرے خطوط کی وجہ سے تو قاری بہنیں شاید مجھے ناپسند کریں مگر کیا کروں جو دل میں ہے وہی کہتی ہوں۔ بلاوجہ تعریف نہیں کرتی اور خامیاں بھی اصلاح کے لیے بتاتی ہوں۔

میں ہوں فہمیدہ جاوید۔ میکہ سکھر نیو پنڈ اور سسرال ملتان میں ہے۔ میرے میاں جاوید۔ میرے چار بیٹے جنید، فراز، ایان ، فیضان اور بیٹی جیا میری جنت ہیں۔

میری چھوٹی نندیں ثمینہ اور روبینہ۔ بھانجی بلی بھی خواتین شوق سے پڑھتی ہیں۔ جب بہنوں کے دلچسپ سوالات رسالے میں دیکھے تو دل چاہا کہ میں بھی شرکت کروں تو چلیں، تیار ہو جائیں۔ کچن میں بڑے دلچسپ سوالات آپ سب کا اور میرا بے صبری سے انتظار کر رہے ہیں۔

س: کھانا پکاتے وقت کن باتوں کا خیال رکھتی ہیں، پسند/ناپسند؟

ج: جو گھر کی روٹین ہے، کبھی سب گھر والوں کا پسندیدہ کھانا بنتا ہے اور کبھی ناپسندیدہ کہ ہر ایک کی اپنی پسند ہے (ارے بھئی کھانے میں، وہ نہیں)۔ بڑے بیٹے جنید کو (جو باقاعدگی سے ماجد بک سینٹر بوہر گیٹ سے رسائل لاکر دیتا ہے اور مستقبل میں سائیکالوجسٹ بننے کا ارادہ رکھتا ہے)۔ کھانے میں میرے بنائے ہوئے کوفتے، کڑاہی گوشت، میتھی اور اروی کے پتے تو بہت ہی پسند ہیں۔ میاں جی قیمہ کریلے پسند کرتے ہیں اور بچے تو میگی وغیرہ پسند کرتے ہیں۔ کھانے میں مرچیں تیز ہوں تو بچے بولتے ہیں، مما اتنی مرچیں اور باہر کے گول گپے اور شوارما کیسے شوق سے کھاتے ہیں۔ روزانہ مسئلہ کیا بناؤں، بچے بھنڈی، توری، ٹنڈے اور کدو شریف نہیں کھاتے تو پایا تو انڈا بنا کر دو ورنہ پھر نخرے۔ زیادہ ہی بھوک ہو تو پھر مجبوراً کھا ہی لیتے ہیں کہ بھوک میں جو مل جائے ٹوٹ پڑو...... اب میں جمپ لگا کر چلتی ہوں، اگلے سوال کی طرف۔

س: گھر میں مہمان آجائیں تو اچانک کون سی ڈش بنا کر پیش کرتی ہیں؟

ج: جواب طویل ہوگا بہنوں حوصلہ رکھنا۔ میری ماشاء اللہ آٹھ نندیں تھیں۔ بڑی والی پیاری رئیسہ باجی وفات پا گئیں، باقی سات نندیں آتی رہتی ہیں۔ ان کے بچے جو خود ماں باپ بن چکے ہیں، وہ سب بھی آتے ہیں۔ پیل، صبا، روبینہ، ثمینہ اور زرینہ باجی کا ذکر کرنا چاہوں گی میری پیاری نندیں ہیں۔ ان کے بچے بھی آتے ہیں (پیاری سحرتم آتی رہا کرو)۔ ابتدا میں تو بوتل، یعنی کولڈ ڈرنک پیش کرتی ہوں۔ اگر کھانے کا وقت ہے تو کوشش ہوتی ہے کہ قورمہ بناؤں۔

گوشت بازار قریب ہونے کی وجہ سے آسانی سے مہیا ہوتا ہے۔ لہسن اور ادرک کا پیسٹ پہلے سے تیار ہوتا ہے، جلدی جلدی قورمہ بناتی ہوں یا اچار گوشت، پیکٹ کا مسالا استعمال کرتی ہوں۔ اگر اچانک گوشت بنانا ہو تو......

عید کے موقع پر قیمہ (جو پہلے پسوا لیا جاتا ہے) کے کباب یا بھنا سالن مہمانوں کی آمد پر بنتا ہے۔ اس ٹیکنالوجی اور سائنس کی ترقی نے اخلاقی اقدار ختم کر دی ہیں تو اگر کوئی مہمان آئے بھی تو اس کی عزت کریں کہ ہر

چلتی ہوں کہ پہلے جمپ لگانے کی وجہ سے کرگئی ہائے میری کمر...... کوئی تو اٹھاؤ ڈاکٹر کو بلاؤ مجھے دکھاؤ۔

س: صبح کا ناشتا کیا اہمیت رکھتا ہے آپ کیا بناتی ہیں؟

ج: میں شروع سے جلدی اٹھتی ہوں اور میں تو چائے پاپے کھاتی ہوں، بس عادت ہوگئی ہے پھر بچے اور میاں جی اٹھتے ہیں تو رات کے سالن سے یا پھر بازار سے آلو اور کھٹائی والے چنے آئیں گے یا پھر میاں جی اپنے موڈ میں پائے، نہاری یا حلیم لاتے ہیں۔ ویسے میرے فرمائش کرنے پر بھی لا دیتے ہیں۔ ناشتے سے یاد آیا، میرے والد مرحوم محمد علی میرے لیے حلوہ پوری لاتے تھے، کیا دن تھے۔ ہر طرف محبت ہی محبت تھی۔ سات بھائیوں اور بڑی بہن فریدہ اور ماں باپ کا اتنا پیار اور اپنے لاڈ اٹھوانا۔ اب تو بس یادیں ہی ہیں، اب اپنا شوہر اور بچے ہی ہیں۔ ان میں ہی خوش رہنا ہے۔

س: کچن عورت کی سلیقہ مندی کا آئینہ ہوتا ہے، آپ کیا اور کس طرح کچن کی صفائی کا اہتمام کرتی ہیں؟

ج: صفائی تو لازمی کرنی ہوتی ہے مگر گندگی سے الجھن ہوتی ہے۔ میرے پولیس والے بھائی سرور بہت ہی زیادہ صفائی پسند ہیں تو میں بھی ان پر ہوں۔ جی روزانہ جھاڑو ٹاکی اور ڈسٹنگ کچن کی کرتی ہوں اور ہفتے میں ایک بار یا اگر سستی آئے تو مہینے میں ایک بار کچن کا تمام سامان باہر نکال کر تمام برتن دھوتی ہوں اور کچن کی سلیب بھی واش ہوتی ہے، کھڑکی بھی دھلتی ہے۔

س: گھر سے باہر کھانا فیشن بن گیا، آپ مہینے میں کتنی بار باہر جا کر کھاتی ہیں؟

ج: ارے یہ تو حسرت ہی رہے گی جب جنید کی نوکری لگے گی پھر ہی حسرت پوری ہوگی۔ چلے ہی نہ جائیں میاں جی باہر ڈنر کروانے۔ کوئی بھی فرمائش ہو یا تو گھر پر بنتی ہے یا پھر بازار سے آجاتی ہے۔ شوہر ہوٹل میں سپر وائزر ہیں تو ہوٹل سے بھی کھانا لاتے ہیں۔ بریانی، مچھلی، پلاؤ اور سالن وغیرہ بھی کبھی کبھی اور رائتہ سلاد تو تقریباً روزانہ آتا ہے۔ باہر کھانے کی ضرورت نہیں پڑتی مگر ہوٹل میں جا کر ٹھاٹ سے میڈم بن کر کھانے کا اپنا

س: کیا کھانا پکاتے وقت موسم مدنظر رکھتی ہیں؟

ج: ہاں بالکل۔ جیسے ہی سردیاں آتی ہیں تو ساگ، میتھی، پالک، مکس سبزی اور گاجر کا حلوہ وغیرہ بنتا ہے۔ آئس کریم تو ہر موسم میں پسندیدہ ہے۔ سردی سے ٹھٹھر رہے ہوں پھر بھی آئس کریم زندہ باد۔ ذرا تصور کریں کہ سردیوں کے دن ہوں، برستی بارش اور آپ صحن کے قریب گرم ستاروں والی شال پہن کر جھولے یا کرسی پر بیٹھ کر گرم کافی یا چائے پی رہی ہوں اور صرف بارش کی بوندوں کا ہر طرف شور ہو، ہاتھوں میں خواتین، شعاع یا کرن ہو تو کیا ہی مزا آئے گا۔ اسی طرح گرمیوں میں بھنڈی، کریلے، کڑھی اور دوسری گرمی کی سبزیاں اور ساتھ ساتھ لسی یا پھر دوپہر کو دہی، ٹماٹر، پودینے، نمک اور مرچ کا ٹھنڈا رائتہ پیاز کے ساتھ بنتا ہے اور مختلف مشروبات آئس کریم سوڈا کی بوتلیں گرمی میں گھر میں شوق سے پی جاتی ہیں۔

س: کرن، شعاع یا خواتین کے تازہ شمارے آئیں اور کچن میں کام زیادہ ہو تو کیا کیفیت ہوتی ہے؟

ج: دل کرتا ہے سب چھوڑ کر بس تنہائی میں رسالے میں گم ہو جاؤں مگر کام کیا ماسی کرے گی، جب ماسی نہیں ہے تو پھر مجبوری ہے۔ بس جلدی جلدی کام کرکے ڈائجسٹ ہوتا ہے اور ہم......

س: کچن کی کوئی ٹپ دینا چاہیں؟

ج: کچن میں آئے چھپکلی اور آپ ہوں پریشان تو لاؤ ایک انڈا کرو اس میں سوراخ، دھاگے سے لٹکاؤ دیوار پر اور چھپکلی سے بے فکر ہو کر کرو کچن میں کام۔ اگر میاں جی اور بچے کھانے میں زیادہ نقص نکالیں تو اونچی آواز میں چیخ کر کہیں، جاؤ بازار سے لاؤ کھانا یا پھر خود کچن میں جا کر بناؤ۔ زیادہ جو نخرے کر رہے ہو، مذاق یار۔ میری کوشش رہی کہ اس سلسلے میں منفرد اور پرمزاح جوابات دوں، اب آپ سب بتائیں کتنا کامیاب ہوئی "آپ کا باورچی خانہ" مزے دار بنانے میں۔

☆

موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

ٹھنڈائی

اجزاء:۔

دودھ	ایک کلو
خربوزے کے چھلکے	تین بڑے چمچے
بادام	دو کھانے کے چمچے
کاجو	دو کھانے کے چمچے
خشخاش	دو کھانے کے چمچے
کالی مرچ	آدھا چائے کا چمچہ
سونف	ایک کھانے کا چمچہ
زعفران	ایک چٹکی
سبز الائچی	پانچ عدد
عرق گلاب	آدھا کپ
کیوڑہ	چند قطرے
چینی	سات کھانے کے چمچے

ترکیب:۔

سب سے پہلے بادام کو ابلتے ہوئے پانی میں ایک منٹ ڈال کر نکال لیں اور ٹھنڈے پانی میں ڈال کر چھلکا اتار لیں اور ایک طرف رکھ دیں۔

ایک کپ میں دودھ لے کر اس میں اوپر دیے گئے تمام اجزاء ڈال کر اچھی طرح پیس لیں۔ اب باریک کپڑے سے چھان لیں اور چھانے ہوئے دودھ میں باقی دودھ شامل کر دیں۔ اب تین سے چار گھنٹے کے لیے فریج میں رکھیں اور گلاس میں پیش کریں۔

پودینہ آم پنا

اجزاء:۔

کیری	ایک پاؤ
چینی	ایک پاؤ
ثابت زیرہ	ایک چائے کا چمچہ
پودینہ	تین کھانے کے چمچے

ترکیب:۔

پریشر ککر میں تین سے چار کپ پانی ڈالیں۔ ثابت کیری، پودینے کے پتے اور زیرہ ڈال کر پکنے کے لیے رکھ دیں۔ کیری اچھی طرح گل جائے اور دو کپ پانی باقی رہ جائے تو چولہے سے اتار کر ٹھنڈا ہونے کے لیے رکھ دیں۔ کیری ٹھنڈی ہو جائے تو انگلیوں کی مدد سے دبا کر گودا نکال کر پانی میں شامل کر دیں۔ چھلکا اور گٹھلی نکال دیں۔ پودینے کے پتوں کو ہاتھ سے دبا کر ان کا رس پانی میں شامل کر کے پانی کو چھان لیں۔

اسے سوس پین میں ڈال کر دھیمی آنچ پر رکھ دیں۔ چینی شامل کر کے دو سے تین منٹ تک پکنے دیں۔ چولہے سے اتار کر ٹھنڈا کر کے کسی بوتل میں محفوظ کر لیں۔

مینگو اینڈ پیچ کولاڈا

اجزاء:۔

آم	ایک عدد
آڑو	دو عدد
کوکونٹ ملک	دو کپ
برف	حسب پسند
کریم	ایک کپ
چینی	حسب پسند

ترکیب:۔

گرائنڈر میں آم کا گودا، ایک کپ کوکونٹ ملک، دو چائے کے چمچے چینی، آدھا کپ کریم اور برف ڈال کر پیس کے گلاس میں نکالیں (گلاسوں کو آدھا بھرنا ہے)۔ گرائنڈر کو دھو کر اس میں آڑو، بقیہ کوکونٹ ملک، کریم، دو چائے کے چمچے چینی اور برف ڈال کر پیس کر لیں اور گلاس میں نکالے ہوئے مینگو مکسچر کے اوپر ڈالیں۔ پودینے کے پتوں سے سجا کر پیش کریں۔

کیری کا اچار

اجزاء:۔

کیری	آدھا کلو
نمک	ایک کھانے کا چمچہ
ہلدی	ایک کھانے کا چمچہ
رائی	ایک چائے کا چمچہ
کلونجی	ایک چائے کا چمچہ
میتھی دانہ	ایک چائے کا چمچہ
سونف	ایک کھانے کا چمچہ
سرسوں کا تیل	ایک کپ

ترکیب:۔

کیری کو باریک کاٹ لیں۔ اب ایک پین میں چار کھانے کے چمچے سرسوں کا تیل ڈالیں۔ اس میں رائی، کلونجی، میتھی دانہ ڈال کڑکڑا۔ لیں۔ اب کیری میں ہلدی، نمک لگا کر مکس کرکے اس مسالے میں ڈال دیں اور ہلکی آنچ پر دس منٹ دم دے دیں اور بقیہ تیل ڈال کر بوتل میں محفوظ کرلیں۔ اچار تیار ہے۔

اسٹفڈ ہری مرچیں

اجزاء:۔

بڑی ہری مرچیں	ایک پاؤ
پسا ادرک لہسن	ایک چائے کا چمچہ
ہلدی	تین چوتھائی چائے کا چمچہ
پسی لال مرچ	دو چائے کے چمچے
بھنا اور کٹا ہوا دھنیا	دو چائے کے چمچے
بھنی ہوئی خشخاش	دو چائے کے چمچے
پسی کھٹائی	ایک چائے کا چمچہ
کلونجی	ایک چائے کا چمچہ
دہی	آدھا کپ
تیل	آدھا کپ
ثابت سفید زیرہ	ایک چائے کا چمچہ
ثابت لال مرچ	چھ عدد
پسا لہسن	ایک چائے کا چمچہ
نمک	ایک چائے کا چمچہ
ٹماٹر پیسٹ	آدھا چائے کا چمچہ

ترکیب:۔

ہری مرچوں کو درمیان سے چاک کرکے بیج نکال دیں۔ ایک پیالے میں پسا ادرک لہسن، آدھا چائے کا چمچہ ہلدی، ایک چائے کا چمچہ پسی لال مرچ، بھنا اور کٹا دھنیا، خشخاش، کھٹائی، کلونجی اور دہی ڈال کر مکس کرلیں۔ اب یہ مسالا چاک کی ہوئی ہری مرچوں میں بھر دیں۔ باقی بچا ہوا مسالا الگ رکھ دیں۔ ایک برتن میں تیل گرم کریں۔ اس میں زیرہ، ثابت لال مرچ، ایک چائے کا چمچہ پسی لال مرچ، پسا لہسن، ایک چوتھائی چائے کا چمچہ ہلدی، نمک، ٹماٹر پیسٹ اور ایک چوتھائی کپ پانی ڈال کر اچھی طرح بھون لیں۔ پھر اس میں بھری ہوئی مرچیں اور بچا ہوا دہی کا آمیزہ بھی شامل کردیں۔ آخر میں اسے ہلکی آنچ پر دم پر رکھ دیں۔

پاستا سلیڈ

ضروری اشیاء

ابلا ہوا پاستا	ایک پیکٹ
شملہ مرچ	ایک کپ
کھیرا	ایک کپ
چھوٹے ٹماٹر	ایک کپ
ہری پیاز	آدھا کپ
مکس زیتون	آدھا کپ
کونیج چیز کدوکش	ایک کپ

ڈریسنگ کے لیے

سرکہ	دو کھانے چمچے
نمک	حسب ذائقہ
کالی مرچ	حسب ذائقہ
اوریگانو	ایک چائے کا چمچہ
زیتون کا تیل	چوتھائی کپ
پارسلی یا بیزل	چوتھائی کپ

ڈریسنگ کے تمام اجزا کو مکس کریں اور پھر اس میں سلیڈ کے تمام اجزا ملا کر سرو کریں۔

عدنان

نفسیاتی ازدواجی الجھنیں

رخسانہ احمد۔ راولپنڈی

س: عدنان بھائی! میرا مسئلہ سن کر مجھے بری لڑکی نہ سمجھیے گا میں نے اب تک کی زندگی بہت صاف ستھری گزاری ہے۔ اس وقت میری عمر پینتالیس سال ہے۔ آپ جانتے ہیں اس عمر میں جوش کم ہوتا ہے۔ ہوش زیادہ۔ میں گورنمنٹ کالج میں لیکچرار ہوں۔ اس وقت اٹھارہ گریڈ میں ہوں۔ کالج میں مجھے محنت، دیانت داری اور کارکردگی کی بنا پر بہت سراہا جاتا ہے۔ شادی اب تک کیوں نہیں ہوئی اس کی وجہ وہی پرانی ہے۔ والد کے انتقال کے بعد بہن بھائی چھوٹے تھے۔ مجھے گھر سنبھالنا پڑا۔ ابھی بھی مجھ پر ایک بھائی اور بہن کی ذمہ داری ہے۔ باقی سب بہن بھائی اپنے پیروں پر کھڑے ہو چکے ہیں۔ اس سب میں اپنے لیے سوچنے کا وقت ہی نہیں ملا۔ کچھ لوگ میری طرف بڑھے ضرور لیکن یا تو ان کے جذبوں میں وہ شدت نہیں تھی کہ ٹھہرتے یا میری طرف سے توجہ نہ پا کر پیچھے ہٹ گئے۔ اب اس عمر میں آ کر تو میں نے یہ باب ہی بند کر دیا تھا۔ کالج میں پرانے لیب اسسٹنٹ کی ریٹائرمنٹ کے بعد نئے لیب اسسٹنٹ نے جوائن کیا۔ ایف ایس سی کر کے اس نے تعلیم کو خیر باد کہہ دیا تھا۔ مختلف چھوٹی موٹی ملازمتیں کرتا رہا تھا۔ تعلق لوئر مڈل کلاس سے تھا گھر میں بے پناہ غربت کے ساتھ ساتھ بیماری بھی تھی۔ گھر بھی اپنا نہیں تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ پڑھ لکھ کر ڈاکٹر بنے گا تو گھر کے حالات بہتر ہو جائیں گے لیکن والد پر اچانک فالج کا حملہ ہوا اور وہ معذور ہو کر بستر پر آ گئے۔ مجبوراً اسے پڑھائی چھوڑ کر ملازمت کرنا پڑی۔ مختلف کام کرتا رہا۔ جس میں پیزا ڈیلیوری سے لے کر ڈرائیونگ تک شامل تھی پھر کسی مہربان کی سفارش سے اسے یہ گورنمنٹ جاب مل گئی۔ تنخواہ گو کم تھی لیکن باقاعدگی سے ملتی تھی۔ کام میں محنت نہیں تھی۔ سب سے بڑھ کر اس ملازمت میں اسے آگے پڑھنے کا موقع مل سکتا تھا۔ یہ سب باتیں اس نے کام کے دوران مختلف وقتوں میں بتائیں۔ میں نے اس کی تعریف کی اور اس کی ہر ممکن مدد کرنے کا بھی کہا۔

اس کی عمر چوبیس سال تھی۔ وہ مجھ سے اتنا چھوٹا تھا کہ میں اس کے متعلق کچھ اور سوچ ہی نہیں سکتی تھی۔ ہمیشہ اس سے بچوں کی طرح پیش آتی۔ وہ میری تعریف کرتا تو میں ہنس دیتی۔

ایک دن اس نے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ اس کو آج کل کی لڑکیاں پسند نہیں۔ اسے سنجیدہ اور زندگی کو سمجھنے والی لڑکی کی ضرورت ہے۔ جو زندگی کے اونچے نیچے راستوں پر اس کے ساتھ چل سکے۔ میں تو ہکا بکا رہ گئی۔ اسے سختی سے ڈانٹ دیا لیکن اس نے ہمت نہ ہاری۔ اس بات کو ایک سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔ اس کا اصرار بدستور جاری ہے۔ وہ ایک دن اپنی ماں، بہنوں کو لے کر ہمارے گھر آیا۔ مجھ سے مل کر ان لوگوں کے تاثرات زیادہ حوصلہ افزا نہ تھے۔ صاف لگ رہا تھا کہ انہیں اس رشتے پر اعتراض ہے۔ سپاٹ چہرے کے ساتھ ملیں۔ رسمی باتوں کے بعد امی سے رشتہ کی بات کی۔ چائے کے ساتھ ہم نے کچھ لوازمات رکھے تھے۔ انہوں نے کسی چیز کو ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ یہاں یہ بتا دوں کہ اس کی دو بہنوں کی شادی ہو چکی ہے۔ دو پڑھ

رہی ہیں۔اس سے چھوٹا ایک بھائی ایم بی اے کے فائنل ایئر میں ہے۔ والد کا انتقال ہو چکا ہے۔
میں پہلے ہی اس رشتے سے خوف زدہ تھی۔اس کی ماں کے تاثرات دیکھ کر اور پریشان ہوگئی ہوں۔ سمجھ میں نہیں آتا، کیا کروں۔اس کا بے پناہ اصرار، محبت کا اظہار اور توجہ دیکھ کر سوچتی ہوں کہ یہ رسک لے ہی لوں پھر سوچتی ہوں کہ بعد میں اس نے چھوڑ دیا تو کیا کروں گی۔

ج: اچھی بہن! اس شادی میں رسک ضرور ہے لیکن اگر غور کریں تو ہر شادی میں رسک ہوتا ہے۔ آئے دن طلاقیں ہوتی ہیں۔ میاں بیوی میں جھگڑے ہوتے ہیں۔ سسرال والے طعنے دیتے ہیں۔ یہ سب شادیاں سسرال والوں کی پسند سے نہایت چاؤ سے کی جاتی ہیں۔ عمروں کا فرق بھی نہیں ہوتا پھر بھی آپس میں نہیں بنتی۔
آپ اللہ پر بھروسا کریں۔ اور یہ شادی کرلیں۔ شادی کے بعد اگر آپ نے اپنا خیال رکھا تو کچھ عرصے بعد یہ فرق محسوس بھی نہیں ہوگا۔
اس لڑکے میں کوئی خرابی نہیں ہے۔ جہاں تک اس کے گھر کے حالات کا تعلق ہے تو ان کو ٹھیک ہونے میں اب زیادہ وقت نہیں ہے خوشیوں پر آپ کا بھی حق ہے، آپ نے اپنے گھر والوں کے لیے جو کچھ کیا ہے ممکن ہے قدرت آپ کو اس کا صلہ دینا چاہتی ہو۔
اس سے ایک بات طے کرلیں کہ جب تک آپ کا بھائی اپنے پیروں پر کھڑا نہیں ہو جاتا، آپ اپنے گھر کی سپورٹ جاری رکھیں گی۔

سبین......کراچی

س: ہم چار بہنیں ہیں۔ والد کا انتقال ہو چکا ہے۔ امی نے ہماری پرورش اور تعلیم وتربیت میں کوئی کمی نہیں کی۔ والد کا انتقال ہوا تو انہوں نے ایک دکان اور مکان کے سوا کچھ نہیں چھوڑا تھا۔ امی نے دکان کے کرایہ سے ہماری پرورش کی۔ پھر آہستہ آہستہ گھر میں اوپر کی منزل تعمیر کرائی اور اسے کرائے پر چڑھا دیا۔
میں بہنوں میں تیسرے نمبر پر ہوں۔ میٹرک کا امتحان دیا ہے ہمارے گھر کی اوپر کی منزل میں جو کرائے دار آئے ہیں ان کا لڑکا مجھے بہت اچھا لگتا ہے، وہ سیکنڈ ایئر میں ہے وہ کہتا ہے کہ تم بھی مجھے بہت اچھی لگتی ہو۔ میں نے اس سے کہا رشتہ بھجواؤ۔ اس نے اپنی امی سے بات کی تو اس کی امی نے طوفان کھڑا کر دیا، ابا نے بھی پٹائی لگائی۔ پھر وہ ہمارا گھر چھوڑ کر چلے گئے۔ اب میں اسے فون کرتی ہوں تو وہ فون نہیں اٹھاتا۔ پتا نہیں وہ لوگ کہاں گئے ہیں۔ میں تو یہ بھی نہیں جانتی۔ عدنان بھائی مجھے بتائیں میں کیا کروں۔ میں بہت پریشان ہوں۔

ج: اچھی بہن! آپ کا 15 صفحات پر مشتمل خط ملا۔ آپ بہت پیاری بچی ہیں۔ جی ہاں بچی۔ ابھی آپ اپنی پڑھائی پر توجہ دیں۔ تھوڑی بڑی ہو جائیں۔ تعلیم مکمل ہو جائے تو تب عدنان بھائی کو خط لکھیں۔ اگر اس وقت تک آپ کے جذبات یہی رہے تو عدنان بھائی آپ کو ضرور مشورہ دیں گے۔ اس عمر میں انسان کی عقل ناپختہ ہوتی ہے، یہ صرف صنف مخالف کی کشش ہوتی ہے جسے وہ محبت سمجھ بیٹھتا ہے آپ کے ساتھ بھی یہی مسئلہ ہے۔
ویسے بھی آپ خود سوچیں اس لڑکے کو پڑھ لکھ کر کچھ بننا ہے اگر وہ ابھی ان چکروں میں پڑ گیا تو اس کا کیا بنے گا۔

بیوٹی بکس

افشاں......لاہور

س: میں شادی شدہ اور ایک بیٹے کی ماں ہوں۔ میری عمر تیئیس سال ہے۔ میرا مسئلہ کچھ یوں ہے کہ میں بہت کمزور ہوں۔ وزن میرا شادی سے پہلے چالیس کلو تھا جبکہ اب شادی کے بعد کبھی اننچاس اور کبھی پچاس کلو ہو جاتا ہے۔ قد پانچ فٹ ایک انچ ہے، پلیز میں کچھ صحت مند ہونا چاہتی ہوں۔

ج: حنا بہن! قد کے حساب سے آپ کا وزن بہت زیادہ کم نہیں۔ آپ وزن کی کمی کو مسئلہ نہ بنائیں۔ دس کلو وزن کا اضافہ کافی ہے۔ اہم چیز وزن کا کم یا زیادہ ہونا نہیں ہے۔ صحت مند جسم، چمک دار آنکھیں، چمکتی ہوئی شفاف جلد اہمیت رکھتی ہے۔

جن لوگوں کا وزن کم ہے۔ ان کے لیے سب سے ضروری چیز آٹھ سے دس گھنٹے تک کی پرسکون نیند ہے۔ رات کو سونے سے پہلے غسل کریں اور ایک گلاس گرم دودھ پئیں۔ آپ کو پرسکون نیند آئے گی۔ اس سے آپ چند ہفتوں میں نمایاں فرق محسوس کریں گی۔

اپنی غذا پر خصوصی توجہ دیں۔ آج کل آم کا موسم ہے۔ خوب پیٹ بھر کر آم کھائیں۔ آم سے خون بنتا ہے اور یہ وزن میں بھی اضافہ کرتا ہے۔ آم کا رس دودھ میں ملا کر پئیں۔ آپ کے گال بھر جائیں گے۔ دوپہر کے کھانے میں خربوزہ، پپیتا ضرور شامل کریں۔ ایک عدد کیلا، تین کھجوریں، ایک گلاس دودھ میں بلینڈر میں ڈال کر ملک شیک بنا کر پئیں۔ وزن میں اضافہ ہو جائے گا۔

بشریٰ ناصر......حیدر آباد

س: میری عمر بائیس سال ہے اور میری جلد بہت زیادہ چکنی ہے۔ جس کی وجہ سے جلد کے مسام بہت زیادہ کھل گئے ہیں۔ رنگ تو صاف ہے مگر جلد پر دانوں کے نشان، باقی ہیں۔ باجی! اب تو میری پلکیں بھی کافی زیادہ ٹوٹ رہی ہیں بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ تیزی سے گر رہی ہیں اور آنکھوں میں بہت زیادہ حلقے ہو رہے ہیں جو جلد سے الگ لگتے ہیں۔ آنکھوں کے نیچے بہت زیادہ لکیریں ہو گئی ہیں۔

ج: نورین بہن! آپ کا خط پڑھ کر میں اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ آپ کا پیٹ صحیح نہیں ہے۔ جن خرابیوں کا آپ نے ذکر کیا ہے، ان کی بنیادی وجہ قبض ہے۔ آپ سب سے پہلے اس طرف توجہ دیں۔ آم، خربوزہ اور پپیتا آپ کے کھانے میں ضرور شامل ہونا چاہیے۔

آنکھوں کے حلقے کے لیے آپ پودینہ کی پتیوں کا عرق ہفتے میں دو مرتبہ رات سونے سے پہلے لگائیں۔ سیاہ حلقے پانی کی کمی، ٹینشن اور نیند کی کمی سے پڑتے ہیں۔ روزانہ کولڈ کریم لگائیں۔ آہستہ آہستہ مساج کریں لیکن ہاتھوں کو بہت نرمی سے حرکت دیں۔ پانی کا استعمال زیادہ سے زیادہ کریں اور نیند پوری لیں۔ حلقے اور لکیریں دور ہو جائیں گی۔

پلکوں پر کیسٹر آئل لگائیں۔ چہرے کو تروتازہ اور شاداب رکھنے کے لیے دو چائے کے چمچے شہد، آدھا چمچ لیموں کا رس ملا کر دو سے تین منٹ تک لگا رہنے دیں، پھر دھو ڈالیں۔